ماہنامہ

مسٹری میگزین

اس ماہ کی خاص کہانی

شکار

اس ماہ پڑھیے دنیا کی **16** بہترین اور منتخب کہانیاں







قلب و روح کو منور کرتا ہوا اسلامی سلسلہ

روشنی

اسلامی حکومت کی خصوصیات

بھائیو! دوستو! بزرگو!

اسلامی ریاست کی خصوصیات بیان کرنے سے پہلے اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ اسلامی ریاست اور مسلم ریاست میں کیا فرق ہے۔

مسلم ریاست ایسے خطہ ارض کو کہتے ہیں جہاں اکثریت مسلمانوں کی آبادی پر مشتمل ہو اور حکمراں بھی مسلمانوں پر مشتمل ہوں لیکن طرز حکومت اسلامی قوانین اور اصول و ضوابط پابند نہ ہو مسلم ریاست کہلائے گی۔

اسلامی ریاست ایسا خطہ ارض جہاں اکثریت مسلم آبادی کی ہو لوگ زیادہ تر اسلامی قوانین کی عملی طور پر پابندی کرتے ہوں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل پیرا ہوں نیز طرز حکومت مکمل طور پر اسلامی نظام قانون کے پابند ہوں تو یہ اسلامی ریاست کہلائے گی۔

آج دنیا کے نقشہ پر شاید ہی کوئی ایسا اسلامی ملک ہو جسے ہم اسلامی ریاست کہہ سکیں البتہ بعض عرب ریاستوں میں کچھ اسلامی حدود کے قوانین نافذ ہیں جن کا اثر یہ ہے کہ ان ریاستوں میں چوری ڈکیتی شراب زنا اور قتل و غارت کی وارداتیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔

اسلامی ریاست کی خصوصیات

(1) اقتدار اعلیٰ (2) نیابت اللہ (3) کلمتہ الحق کی سربلندی
(4) احتساب کا عمل (5) غربت و عسرت کا خاتمہ (6) کمزور و غربا کا اختیار

اقتدار اعلیٰ

آج کرہ ارض پر جتنی مملکتیں آباد ہیں ان میں افراد نے بنائے ہوئے قوانین و دساتیر رائج ہیں اور اقتدار اعلیٰ کا اختیار اکثر ممالک میں سربراہان مملکت کو حاصل ہوتا ہے۔ یہ اختیار اتنا موثر ہوتا ہے کہ بیشتر ممالک کے سربراہ اکثر قوانین کی گرفت سے بالاتر شمار کیے جاتے ہیں انہیں عدالت میں طلب نہیں کیا جا سکتا ان پر مقدمہ دائر نہیں کیا جا سکتا ان کے خلاف رپورٹ درج نہیں کی جا سکتی گویا کہ وہ اس مملکت کے باشندے نہیں کسی اور سیارے کی مخلوق ہو گئے۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں حکمراں و عوام میں تفریق پیدا ہوتی ہے نیز بڑے چھوٹے کا احساس جاگزیں ہوتا ہے اور یوں احساس محرومی پروان چڑھ کر معاشرہ مختلف اقسام کی برائیوں میں گھر جاتا ہے۔

اسلام میں اقتدار اعلیٰ کا تصور بالکل واضح اور عیاں ہے یعنی قرآن و حدیث کی رو سے اقتدار اعلیٰ کا کلی اختیار صرف رب العزت کو حاصل ہے وہی سیاہ و سفید کا مالک ہے وہی جلانے اور مارنے پر قادر ہے وہی بناتا ہے اور وہی تخلیق کرتا ہے لہٰذا اقتدار اعلیٰ کے اختیار کا حق اس سے زیادہ کسی ذات کو نہ زیب دیتا ہے نہ ہی اس کا کسی کو کوئی حق ہے۔

نیابت اللہ

اسلامی ریاست کا ایک بڑا امتیاز یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ حکمرانی کے منصب پر فائز ہیں وہ مالک و مختار نہیں بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نائب

اور خلیفہ ہیں اور جو لوگ صحیح معنی میں اس منصب کو نبھاتے ہیں اپنے آپ کو حاکم کے بجائے خادم تصور کرتے ہیں تو رب العزت ان کی نہ صرف غیب سے مدد کرتا ہے بلکہ وہ لوگوں کے لیے مشعل راہ بن جاتے ہیں زندگی میں انہیں کوئی تکلیف نہیں ہوتی مرنے کے بعد یا اپنے عہدے سے سبکدوشی کے بعد انہیں رعایا اچھے کلمات سے یاد کرتی ہے

کلمتہ الحق کی سربلندی

اسلامی ریاست کے وظائف میں اگر ایک طرف یہ بات شامل ہے کہ وہ قانون کی بالادستی قائم کرے انصاف کا بول بالا ہو لوگ امن و آشتی کی زندگی بسر کریں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کا خوف دل میں نہ ہو۔ تو دوسری طرف ان کا یہ فریضہ بھی ہے کہ وہ توحید و رسالت کے پیغام کو ان مقامات تک پہنچائیں اور عام کریں جو علاقے اس نعمت عظمیٰ سے محروم ہیں۔ اگر اس پر دیانتداری سے عمل کیا جائے تو جان لیں کہ اسلامی ریاست اپنے تمام وظائف کی ذمہ داری سے خوش اسلوبی کے ساتھ سبکدوش ہوگی۔

احتساب کا عمل

اسلامی ریاست میں ایک عام فرد سے لے کر سربراہ مملکت تک کوئی بھی فرد قانون سے بالاتر نہیں' قانون کے ہاتھ ہر فرد کے گریبان تک بے خوف و خطر پہنچ سکتے ہیں۔ کسی بھی فرد کے خلاف سمن جاری ہو سکتا ہے' ایف آئی آر کٹوائی جا سکتی ہے۔ عدالت کے کٹہرے میں بلا کر کھڑا کیا جا سکتا ہے قطع نظر اس کے کہ اس کا منصب' مقام' مرتبہ اور عہدہ کیا ہے تا کہ اس فرد سے فرد جرم ختم نہ ہو جائے دین اسلام نے احتساب کا ایسا سخت نظام قائم کیا ہے کہ خلیفہ دوئم سے بھرے مجمع میں ایک عام فرد زیب تن کیے ہوئے کرتے کے متعلق سوال کرنے کی جرأت کرتا ہے کہ ہمارے سب کے حصے میں ایک ایک چادر آئی اور ایک چادر سے یہ کرتہ نہیں بن سکتا تو جواب کے لیے خلیفہ نے اپنے بیٹے کو مخاطب کیا جس نے یہ کہہ کر سب کو مطمئن کر دیا کہ میں نے اپنے حصہ کی چادر اپنے والد کو دے دی تھی اور اس سے آپ نے کرتہ بنوایا۔ بات صرف عمل کرنے کی ہے اگر عمل کر لیا جائے تو آج بھی ہم اپنے سچے الہامی دین کے فوائد سے دین دنیا کی نعمتوں کو حاصل کر سکتے ہیں اور اپنے مسائل کے حل کے لیے کفار کے آگے کاسہ گدائی دراز کرنے سے باز رہ سکتے ہیں۔

غربت و عسرت کا خاتمہ

کائنات کی اس سرزمین پر جب سے افراد آباد ہوئے ہیں اس وقت سے لے کر آج تک لوگوں کی معاشی حالت کبھی یکساں نہیں رہی ہے کیونکہ یہ قانون فطرت ہے کہ کوئی امیر و کبیر ہے تو کوئی غریب اور نان شبینہ کو محتاج! ہاں! البتہ اتنا ضرور ہے کہ جہاں بھی اسلامی ریاست قائم ہوتی ہے اس کی یہ ذمہ داری بھی ہوتی ہے کہ وہ رعایا کا اس معاملے میں ہاتھ بٹائیں اور ان کی مدد کریں کہ کوئی شخص کسی کا دست نگر نہ رہے کیونکہ ہر فرد کی معاشی حالت بہتر کرنے کا اختیار کسی فرد کے بس کی بات نہیں ہے لیکن اس میں بہتری اور سہولت کے امکانات پیدا کیے جا سکتے ہیں اگر اسلامی ریاست صرف اتنا ہی عمل کرنے میں کامیاب ہو جائے کہ کوئی فرد بھیک مانگتا نظر نہ آئے تو جان لیں کہ ریاست نے ایک بہت بڑا معرکہ سر کر لیا۔

کمزور و غربا کا اختیار

جس معاشرہ میں افراد اور حکمراں طاقت ور ہوتے ہیں وہاں عام طور سے قوانین کمزور اور ناتواں بن جاتے ہیں اسی لیے اسلامی ریاست میں قوانین کی بالادستی اور انصاف کی صحیح حکمرانی پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ اسلامی ریاست میں عملاً اگر قانون کی حکمرانی قائم ہے تو غریب سے غریب اور کمزور سے کمزور فرد بھی توانا اور مضبوط ہوگا کیونکہ سچائی ہمیشہ طاقتور ہوتی ہے اسی لیے اگر ہم کچھ عرب ریاستوں کی طرف دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ وہاں شرطے (یعنی پولیس والے) سولہ سے بیس سال کے جوان لڑکے ہوتے ہیں اور انہیں قوانین نے جو طاقت دی ہے اس کے آگے وہاں کا وزیر و امیر بھی بے بس و مجبور نظر آتا ہے یہی اسلامی طرز حکومت کی ادنیٰ سی عملی مثال ہے۔ صرف بات ہے عمل کرنے کی!

اسلامی ریاست/ حکومت کے فرائض

اسلامی ریاست کے واجبات/ فرائض مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) امر بالمعروف و نہی عن المنکر (2) خلافت و نیابت
(3) بیت المال کا قیام (4) فرضیت علم کا اجراء

(5) الہامی قوانین کا نفاذ
(6) مضبوط عدالتی نظام
(7) مؤثر انتظامیہ
(8) امن عامہ کا نظام
(9) دفاعی تحفظ حکمت عملی/تحفظ
(10) جان مال اور آبرو کی حفاظت
(11) صحت و صفائی و طبی سہولتیں
(12) پولیس کا کردار

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

اس عنوان کے تحت ریاست کی بھرپور حکمت عملی یہ ہونا چاہیے کہ جس قدر ممکن ہو سکے افراد کو دین پر عمل کرنے کی طرف راغب و پابند کیا جائے جس بات کا حکم قرآن و حدیث نے دیا ہے اس پر عمل کیا اور کروایا جائے اور جن امور سے باز رہنے کے لیے کہا گیا ہے ان امور سے افراد کو روکنے اور خود رکنے کی مؤثر تدابیر اختیار کرنی چاہیے۔

خلافت ونیابت

حکمران اگر ایک طرف بہت سے امور میں بااختیار ہوتے ہیں تو دوسری طرف وہ اللہ کے نائب اور خلیفہ ہوتے ہیں اس طرح ایک طرف اگر وہ عوام کے سامنے جوابدہ ہیں تو دوسری طرف وہ اللہ تعالیٰ کی باز پرس سے آزاد نہیں ہیں۔

بیت المال کا قیام

کسی بھی دور میں دولت و ثروت کی اہمیت کم تو ہوئی ہے لیکن ختم کبھی نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی ہوگی یہ اتنی اہم شے ہے کہ اسے کنٹرول کرنے کے لیے دین اسلام نے ایک باقاعدہ نظام "بیت المال" کی شکل میں قائم کر کے عملاً اس کے فوائد اور خوبیوں کو ہمارے لیے آشکار کر دیا۔ بیت المال سے اگر ایک طرف حکومت کے ملازمین کی تنخواہوں کی ضرورت کو پورا کیا جاتا ہے تو دوسری طرف ریاست کے عام افراد کی ہر قسم کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اسے استعمال کیا جاتا ہے اگر صحیح معنی میں اسے متحرک کر دیا جائے تو معاشرے میں قلیل عرصے کے اندر خوشحالی کا دور دورہ ہو سکتا ہے۔

فرضیت علم کا اجراء

علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے اس علم سے مراد اسلام کا بنیادی علم ہے جس کے ذریعے افراد روزمرہ کی زندگی دین اسلام کے مطابق بسر کر سکیں اس کے ساتھ ہی ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس بنیادی دینی علم کے ساتھ ساتھ کم از کم آج کے حساب سے ابتدائی (پرائمری) لازمی تعلیم کا حاصل کرنا ہر فرد کے لیے ضروری قرار دے کر اس پر عمل کے مؤثر مواقع مہیا کرے۔

الہامی قوانین کا نفاذ

اسلامی ریاست چونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے قاعدے و قوانین کے تحت جاری و ساری کی جاتی ہے لہٰذا اس امر کا بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ اسلامی ریاست میں وہی قوانین نافذ ہوں جو قرآن و حدیث کے آئینہ دار ہیں۔ اگر ہمیں کچھ اچھی باتیں باہر سے لینی پڑیں تو اس میں بھی بنیادی یعنی کسوٹی ہمارے لیے قرآن و حدیث ہی ہوگی یعنی اس کسوٹی پر اگر کوئی قانون پورا اترتا ہے تو اسے اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن اگر اس میں کوئی سقم یا ٹکراؤ ہے تو اس سے احتراز کرنا پڑے گا۔

مضبوط عدالتی نظام

اسلامی ریاست میں اگر صحیح عدالتی نظام قائم ہو تو ہمیں کہنے میں کوئی عار نہیں کہ اصل حکمران ہمارا عدالتی نظام ہی ہے کیونکہ حکمران بھی اسی نظام کے آگے سر تسلیم خم کرتے نظر آتے ہیں لیکن یہ سب کچھ اسی صورت میں ممکن ہوگا کہ ہمارا عدالتی نظام اتنا مؤثر، سچا، مستحکم ہو ۔۔۔ نمائی نہ کی جا سکے۔

مؤثر انتظامیہ

عدالتی نظام کے ساتھ ساتھ بہتر اور بااختیار انتظامیہ کے کردار کو قطعی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ عدالتی فیصلہ صادر کر سکتی ہے اس پر عمل کرانے کا اختیار انتظامیہ کو حاصل ہے اگر انتظامیہ کرپٹ نہیں ہے تو عدالتی فیصلوں کے ثمرات سے افراد مستفید ہوتے رہیں گے بصورت دیگر وہی حال ہوگا جو آج کل عام طور پر ملکوں میں دیکھنے میں آتا ہے۔

امن عامہ کا نظام

کسی بھی ملک کی ترقی و خوشحالی کی ضمانت اس کے اندرونی حالات و واقعات پر منحصر ہوتی ہے اسی لیے اسلامی ریاست کی یہ ذمہ

داری بھی ہے کہ وہ مملکت میں ایسے سازگار حالات پیدا کرے کہ امن عامہ میں خلل واقع نہ ہو اگر کبھی بدامنی کی کیفیت پیدا بھی ہو جائے تو وہ وقتی اور عارضی ہی ہو کیونکہ زیادہ عرصے تک بدامنی کی کیفیت مملکت کی جڑوں کو کمزور و ناتواں بنا دیتی ہے۔

دفاعی تحفظ، حکمت عملی

اوائل زمانہ اسلام میں بھی افراد جنگی تربیت حاصل کرتے تھے۔ لیکن کوئی مربوط تربیت کا نظام قائم نہ تھا۔ ادھر اعلان جہاد ہوا ادھر گھر گھر سے مجاہدین جذبہ شہادت سے سرشار ہو کر شمشیر برہنہ کے ساتھ برآمد ہو جاتے تھے لیکن بعد کے زمانے میں باقاعدہ فوج بنانے اور رکھنے نیز اس کی تربیت کا بہتر اور مؤثر طریقہ کار وضع کیا جانے لگا اور آج باقاعدہ یہ مکمل شعبہ زندگی کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ چونکہ اس کا تعلق ملک کی سرحدوں کی حفاظت اور افراد کی جان و مال کے تحفظ سے ہے لہٰذا پوری دنیا میں آج ترجیحی بنیادوں پر اس شعبہ پر زیادہ خرچ کیا جاتا ہے مملکت اسلامیہ کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس شعبہ میں دیانت محنت اور ترجیحی طور پر خصوصی توجہ دے کر اسے مستحکم ترین شعبہ بنا دے جو دشمن کے ہر قسم کے وار سے محفوظ ہو۔

جان، مال، آبرو کی حفاظت

ان تینوں چیزوں کا تعلق افراد کی انفرادی حیثیت سے تو ہے ہی لیکن جب لوگ اجتماعی طور پر ساتھ رہ رہے ہوں جہاں آبادی ہزاروں لاکھوں میں نہیں بلکہ کروڑوں نفوس پر مشتمل ہو تو بہت سی ایسی اجتماعی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں جہاں افراد انفرادی طور پر اپنی جان، مال و آبرو کی حفاظت کرنے میں ناکام رہتے ہیں اسی مرحلے/موقع کے لیے مملکت کی ذمہ داری شروع ہوتی ہے کہ وہ اس معاملے/بارے میں اپنا کردار ادا کر کے لوگوں کی جان و مال و آبرو کی حفاظت کے سلسلے میں مددگار و معاون ثابت ہو۔

صحت و صفائی و طبی سہولتیں

افراد اپنے گھر اور خاندان کی حد تک اگر چاہیں تو صحت و صفائی اور طبی ضروریات کو بروئے کار لاتے ہوئے اس سلسلے میں اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں لیکن اجتماعی طور پر لاکھوں افراد کی صحت و صفائی اور طبی ضرورتوں کا پورا کرنا چند افراد کے بس کی بات نہیں اسی لیے اس سلسلے میں حکومت اپنا کردار ادا کرتے ہوئے اجتماعی صفائی، ستھرائی، بنیادی صحت اور ممکنہ طبی سہولتوں کی فراہمی کے سلسلے میں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔

پولیس کا کردار

غالباً مسلم حکمرانوں میں حضرت امیر معاویہ پہلے حکمران تھے جنہوں نے اپنی حفاظت کے لیے باڈی گارڈ کے طریقہ کار کو رائج کیا اور یہی بڑھتے بڑھتے آج ہمارے معاشرے اور پوری دنیا میں ایک باقاعدہ نظام کی شکل اختیار کر گیا جسے پولیس کہتے ہیں لیکن ہر ملک میں پولیس کے علیحدہ علیحدہ واجبات ہوتے ہیں کیونکہ تمام ممالک کی ضروریات مختلف ہیں۔ ہر ملک کا وضع کیا ہوا قانون بھی مختلف ہے جو پولیس کے کردار پر اثر انداز ہوتا ہے مثلاً برصغیر اور دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں مسلمان والدین اپنی اولاد کو تادیب کے طور پر جسمانی سزا دے سکتے ہیں لیکن یورپ امریکہ میں اگر والدین نے اولاد کو مارا پیٹا اور بچے نے پولیس کو فون کر دیا تو والدین حوالات کی سیر کو مجبور ہو جائیں گے۔ بہر حال پولیس کا عام کردار دو طرح کا ہوتا ہے ایک وہ پولیس جو صرف ٹریفک کے حال احوال کی درستگی اور اسے جاری رکھنے پر مامور ہے۔ دوسری وہ پولیس ہے جو حکومت کے کاموں میں مدد کرتی ہے۔ جرم و غلط کاموں کو ختم کرنے میں عوام کی مدد کرتی ہے اور یہ ایسا کردار ہے جو تمام ممالک میں یکساں طور پر ادا کیا جاتا ہے لہٰذا ایک اچھی ریاست کی یہ پہچان بھی ہے کہ وہاں کی پولیس کا نظام کتنا مؤثر ہے یا کتنا کمزور و خراب ہے۔

ماخذ
"اسوۂ"
اسلامی تہذیب و تمدن
از
سرور حسین خان

☆ ☆ ☆

مخبر نامہ

محترم قارئین ۔ السلام علیکم!

مسٹری میگزین فروری 2018ء کا شمارہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں اس اُمید کے ساتھ کہ یقیناً آپ کو ہماری کاوشیں پسند آئیں گی۔ ہماری ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ آپ کو زیادہ سے زیادہ معیاری اور دلچسپ میگزین دیا جائے لیکن کبھی کبھار نہیں کوئی خامی رہ ہی جاتی ہے جس کی نشان دہی آپ لوگ کر دیتے ہیں اور وہ ہماری نظر میں آ جاتی ہے۔ بہرحال آپ کی محبتوں اور چاہتوں کے ساتھ ہم نے اب تک طویل سفر طے کرلیا ہے اور ہمیں اُمید ہے کہ یہ سفر اسی طرح جاری رہے گا کچھ شکوے ہوں گے کچھ شکایتیں ہوں گی اور کچھ محبت کی ادائیں ہوں گی آپ ہوں گے ہم ہوں گے اور یہ راہیں ہوں گی۔

ملکی حالات پر نظر ڈالیں تو عجیب منظر نامہ سامنے دکھائی دیتا ہے۔ مہنگائی کے عفریت نے لوگوں کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے اور یہ عفریت روز بہ روز زیادہ سے زیادہ طاقتور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مختلف قسم کے بحرانوں نے بھی ملک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے مثلاً بجلی، گندم، گھی، چینی، آٹا یہ سب بحران بھی عوام کے لیے عذاب جان بنے ہوئے ہیں، اس کے علاوہ ٹریفک، سڑکوں، سیوریج اور بے روزگاری جیسے مسائل بھی موجود ہیں۔ ہمیں بڑے افسوس کے ساتھ یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ سابقہ حکومت کے دور میں مہنگائی تیزی سے بڑھ رہی تھی، عوام کو یہ اُمید تھی کہ آنے والی نئی حکومت اپنی ترجیحات میں مہنگائی اور بے روزگاری جیسے مسائل کو رکھے گی لیکن موجودہ حکومت بھی اس سلسلے میں اب تک کوئی سنجیدہ کارکردگی دکھانے میں ناکام رہی ہے حالات اس قدر دگرگوں ہو چکے ہیں کہ بے روزگاری اور مہنگائی کی وجہ سے لوگ آئے دن خودکشی کر رہے ہیں، ہم اربابِ اقتدار سے درخواست کریں گے کہ وہ ان مسائل کی طرف سنجیدگی سے توجہ دیں تاکہ جن دعووں اور وعدوں کی بناء پر عوام نے انہیں منتخب کیا ہے وہ پورے ہو سکیں۔

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ آپ اپنے خطوط میں کس طرح اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔

زاہد علی صدیقی، کراچی سے رقم طراز ہیں۔ مسٹری میگزین کا سرورق اس مرتبہ جاندار رہا۔ روشنی ایک روح پرور سلسلہ ہے جسے میں سب سے پہلے پڑھتا ہوں۔ کہانیوں میں خونی چیک، تختہ ستم، ثبوت جرم، رشتے، فرائض اور وہ کون تھی بہت پسند آئیں۔ قسط وار کہانیوں میں میری پسندیدہ کہانی دیدہ ور ہے جسے الف صدیقی نے نہایت اچھے انداز میں تحریر کیا ہے اور کہانی بھی اچھی جا رہی ہے۔

☆ زاہد صاحب ہم آپ کے مشکور ہیں کہ آپ نے میگزین کے بارے میں اپنا اظہار خیال کیا، ہم اُمید کرتے ہیں کہ آپ آئندہ بھی اسی طرح اپنی محبت کا اظہار کرتے رہیں گے۔

عقیل احمد، ڈھوک فرمان علی سے لکھتے ہیں۔ عرصہ دراز سے ماہنامہ مسٹری کا قاری ہوں۔ ہمیشہ مہینہ کی

11-12 تاریخ کو بکسٹال پر موجودگی کا طالب ہوتا ہوں گزشتہ ماہ 10 تاریخ کو ملا مگر خیر دیر سویر تو ہماری زندگی کا حصہ ہے۔ کوئی خاص بات تحریر کرنے سے پہلے عرض کرتا ہوں۔ روشنی کا سلسلہ نہایت ہی سبق آموز اور اصلاح معاشرہ کی ایک شاہراہ سے تشبیہ دیا جا سکتا ہے تعریف و تنقید سلسلہ وار تحریریں۔ دیدہ ور رفتار دھیمی مگر دلکش خاص تحریریں 7 خوف پارے اور سچ بیتیاں اچھی کاوشیں تھیں۔ جس سے انسان سچی تاریخ سے فیضیاب ہوتا ہے۔ راشد سعید صاحب کی احتیاط پسند ایک ایسا سبق دیتی ہے کہ علم کو تحریر سے محفوظ کرلو۔ ماضی کو بھی سچ کے ساتھ اپنے الفاظ میں ڈھال کر عوام کی خدمت کرنا نہایت عظیم عمل سا ہے۔ راشد سعید صاحب کو سلام و آداب خاص۔ میرا یہ خط شاید تیسرا چوتھا ہے مگر ہر بار مسٹری کے صفحات میں جگہ بنانے سے قاصر رہتا ہے۔ کوئی بات نہیں خط لکھنے کے بعد اور پوسٹ کرنے کے بعد میں یہ یقین کرلیتا ہوں کہ مدیر صاحب اسے پڑھ لیتے ہوں گے اور میرا خیال اور تجویزیں ان تک پہنچ جاتی ہیں۔ میں ایک تحقیقی ادارے میں ملازمت کرتا ہوں اور ایک پروجیکٹ Pre Post Partition Memoir اکٹھے کیے ہیں۔ میری دلی خواہش ہے کہ ایک سلسلہ قصہ 60 سال پہلے کا قصہ 6 عشرے پہلے کا کے عنوان سے شروع کیا جائے اور مہاجرین/ مقامی لوگ ... کے پہلے کے واقعات اور تقسیم ہند کے وقت کے واقعات اس میں لکھیں۔ آپ کے جواب کا منتظر۔

☆ عقیل صاحب! آپ کی تجویز نوٹ کرلی گئی ہیں کوشش کریں گے کہ جلد از جلد ان پر عمل کریں اس سے قبل آپ کے خطوط موصول نہیں ہوئے ورنہ ضرور شامل اشاعت کیے جاتے۔

سہیل احمد، راولپنڈی سے یوں اظہار خیال کرتے ہیں اس مرتبہ آپ نے شکایت کا موقع نہیں دیا اور ہمیں صحیح وقت پر میگزین مل گیا۔ میں سب سے پہلے سلسلہ وار کہانیاں پڑھتا ہوں۔ تمام کہانیوں میں مجھے سب سے زیادہ "وہ کون تھا" پسند ہے ایم الیاس ایک کہنہ مشق رائٹر ہیں میں ان کا فین ہوں۔ ان کی کہانی بڑی کامیابی سے آگے بڑھ رہی ہے دیگر کہانیوں میں تختہ ستم، خونی چیک، ثبوت جرم، مشق لاحاصل، لو ڈوب گئے، نیا وصیت نامہ اور مرحلہ تمام اچھی تھیں۔ راشد سعید کا سلسلہ علم الاعداد بھی بہت زبردست ہے۔

☆ سہیل احمد صاحب میگزین پر تبصرے کا بہت بہت شکریہ۔ کوشش کریں گے کہ آپ کی یہ شکایت جلد از جلد دور کردی جائے۔

شاہدہ عقیل، لاہور سے لکھتی ہیں۔ میں عرصہ دراز سے مسٹری میگزین پڑھ رہی ہوں۔ یہ میرا پسندیدہ میگزین ہے۔ روشنی بہت اچھا سلسلہ ہے۔ اس سے دینی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ میں اشتیاق فاطمہ کی کہانی بڑے شوق سے پڑھتی ہوں۔ اس کے علاوہ نیلم خاتون، شباب شیخ اور عبدالرب بھٹی میرے پسندیدہ رائٹر ہیں۔ ابھی تک ان ہی رائٹرز کی کہانیاں پڑھتی ہوں۔ باقی میگزین زیرِ مطالعہ ہے۔

☆ شاہدہ صاحبہ! ہمیں خط لکھنے کا بہت بہت شکریہ۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ آپ ہمیں آئندہ بھی اس طرح خط لکھتی رہیں گی۔

جاوید الرحمن خان، پشاور سے لکھتے ہیں۔ میں مسٹری میگزین کا پرانا قاری ہوں۔ میں سب سے پہلے روشنی پڑھتا ہوں جس سے دل کو بہت سکون ملتا ہے۔ ویسے تو آپ کا مسٹری میگزین بہت اچھا ہے اور آپ نے اس میں 'سچ بیتیاں' ایک اچھا سلسلہ شروع کیا تھا لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس میں کوئی تاریخی کہانی بھی شروع کی جائے۔ کہانیوں میں احتیاط پسند، تختہ ستم، دروں زندگی، خونی چیک، وہ کون تھی اور نیا وصیت نامہ بہت پسند آئیں۔

☆ جاوید صاحب، ہم نے آپ کی تجویز نوٹ کر لی ہے اور کوشش کریں گے کہ جلد از جلد کوئی تاریخی کہانی شروع کریں۔

شازیہ عنبرین، کراچی سے لکھتی ہیں مسٹری میگزین اس بار صحیح وقت پر ملا اس لیے کوفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ فرائض منصبی، لوڈ وب گئے، رشتے، ثبوت جرم اور خونی چیک بہت اچھی کہانیاں تھیں۔

☆ شازیہ صاحبہ! ہم آپ سے گزارش کریں گے کہ اگر آپ میگزین پر تفصیلی روشنی ڈالا کریں تو بہتر ہے امید ہے کہ ہماری خواہش کا خیال کریں گی۔

منیر خان سواتی، سوات سے لکھتے ہیں۔ جنوری 2018ء کا شمارہ دیکھا۔ سب سے پہلے 'روشنی' پڑھا روح منور ہوگئی۔ اس کے بعد عائشہ انور کی تحریر 'رشتے' اچھی تھی۔ خونی چیک، احتیاط پسند، لوڈ وب گئے بھی اچھی رہیں۔ ''علم الاعداد'' ایک اچھا سلسلہ ہے۔ روزنامچہ زندگی، پروفیسر ایڈم، مرحلہ ناتمام، دروں زندگی، تختہ ستم، مشق لاحاصل، نیا وصیت نامہ، وہ کون تھی، ثبوت جرم اور فرائض درجے کی کہانیاں تھیں۔ تمام سلسلہ وار کہانیاں اچھی جارہی ہیں۔

☆ منیر صاحب! میگزین پر تبصرے کا بہت بہت شکریہ، اُمید ہے کہ آئندہ بھی اس طرح آپ ہمیں خط لکھتے رہیں گے۔

سلیم چانڈیو، سکھر سے رقم طراز ہیں۔ مسٹری میگزین کا پرانا ریڈر ہوں۔ اس بار اپنے دوست انور چانڈیو کی کہانی پڑھی بعد میں وہ مجھے ملا تو اس نے بتایا کہ اس کی کہانی شائع ہوئی ہے۔ یہ واقعہ وہ مجھے پہلے سنا چکا تھا۔ لیکن آپ لوگوں نے اس کے واقعے کو بڑے خوب صورت انداز میں کہانی کا رنگ دیا، پڑھ کر مزہ آ گیا۔ ایک ایسا واقعہ میں بھی بھیجنا چاہتا ہوں، کیا شائع ہو جائے گا؟

☆ سلیم صاحب! یہ آپ ہی لوگوں کا میگزین ہے اس لیے آپ کی تحریر ضرور شائع کی ہوگی، آپ ہمیں جلد از جلد روانہ کر دیں۔

☆☆

یہ تھے قارئین کے خطوط اب اگلے ماہ تک کے لیے اجازت

فہمیدہ

محبوب الٰہی

[illegible]

اللہ رب العزت خالق کائنات مالک دو جہاں فرماتے ہیں جو میرے دوست بن جاتے ہیں میں ان کا دوست بن جاتا ہوں جو میری جانب ایک قدم بڑھاتا ہے میں دس قدم اس کے قریب ہو جاتا ہوں جو میرے بن جاتے ہیں میں ان کا ہو جاتا ہوں حتیٰ کہ میں ان کی آنکھ کان زبان اور ہاتھ بن جاتا ہوں یعنی من دلو کا فاصلہ ختم ہو جاتا ہے۔ جو میرے عشق میں سوختہ ہو جاتے ہیں میں ان کا بدن ان کی روح بن جاتا ہوں پھر ان کی زبان سے نکلنے والا ہر ہر لفظ میرا کہا بن جاتا ہے ان کا اشارہ میرا حکم بن جاتا ہے ان پر قدم میری منشا بن جاتا ہے وہ جو دیکھتے ہیں میری آنکھ سے دیکھتے ہیں وہ جو سنتے ہیں میری سماعت سے سنتے ہیں بے شک میں اپنے چاہنے والوں کو تنہا نہیں چھوڑتا۔

کسی سائل نے کسی عالم سے سوال کیا عشق اور عبادت میں فرق کیا ہے تو انہوں نے فرمایا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایک خاتون نے کہا اے موسیٰ السلام آپ روزانہ اللہ سے ہم کلام ہوتے ہیں آج اللہ تعالیٰ سے پوچھیے کہ مجھے اولاد کیوں نہیں ہوتی۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ کلیم اللہ نے کوہ طور پر رب کریم کے حضور بنی اسرائیل کی اس خاتون کا سوال رکھا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس عورت کے نصیب میں اولاد نہیں۔ اللہ کے نبی نے اللہ تعالیٰ جواب اس خاتون کے گوش گزار کر دیا خاتون دل برداشتہ آنسو بہاتی رخصت ہوگئی تاہم ایک سال بعد وہ دوبارہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئی تو اس کی گود میں ایک بچہ تھا۔ اس نے شکوہ بھرے انداز میں کہا اے اللہ کے نبی علیہ السلام آپ نے کہا تھا کہ میرے نصیب میں اولاد نہیں مگر ایک مجذوب کی دعا نے مجھے صاحب اولاد بنا دیا حضرت کلیم اللہ نے اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ صورت حال پیش کی تو حکم خداوندی ہوا اے موسیٰ علیہ السلام ایک پلیٹ اور تیز چھری لو اور بستی بستی جا کر کہو کہ اللہ تعالیٰ کو انسانی گوشت کی ضرورت ہے۔ اللہ کے نبی نے ایسا ہی کیا مگر کہیں سے گوشت نہ ملا ایک ویرانے میں ان کی ملاقات ایک دیوانے سے ہوئی جس نے آواز دے کر پکارا اے موسیٰ پریشان کیوں ہو۔ حضرت موسیٰ نے اسے اللہ تعالیٰ کی فرمائش سے آگاہ کیا۔ دیوانے نے چھری اور پلیٹ لی اور پوچھا کہ رب نے کہاں کا گوشت طلب کیا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نا یہ تو اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا۔ یہ سن کر دیوانے نے دیوانہ وار اپنے جسم پر چھری چلانا شروع کر دی کہ پتا نہیں میرے محبوب کو جسم کے جس حصے کا گوشت پسند آئے آپ سارا گوشت لے جائیں۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ اب بتا میں ایسے عاشق کی دعا کیسے رد کرتا اگر تو بھی اس عورت کے حق میں دعا کرتا تو یقیناً میں تجھے بھی خالی نہ لوٹاتا مگر اس عاشق نے مجھ سے فرمائش کی تھی چناں چہ میں نے اس عورت کا مقدر بدل دیا۔ تو یہ ہے عشق کی انتہا۔

ایسے ہی اللہ کے عشق میں فنا ہو جانے والی ہستی کا تذکرہ جسے اللہ نے اپنے محبوب کا درجہ دے دیا اور دنیا اسے محبوب الٰہی کے نام سے پکارنے لگی۔

میرے مضطرب قدم بدایوں شریف کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بدایوں بریلی سے جانے والی چھوٹی لائن پر یوپی کا مشہور شہر ہے۔ اس قدیم شہر نے ہر دور میں نامور شخصیتیں پیدا کیں مگر بدایوں جس وجہ سے ہندوستان کا

مدینہ کہلاتا ہے وہ بزرگانِ دین اور شہدا کرام کی کثرت ہے۔ آپ کو نہیں معلوم کہ آپ جہاں کھڑے ہیں وہاں کسی ولی یا شہید کی قبر ہے۔ کافروں سے ایک خوفناک جنگ میں یہاں اللہ کے بے شمار نیک بندے شہید ہوئے۔ چند مخصوص بزرگوں کو چھوڑ کر باقی اولیاء کی قبروں کے نشانات تک معدوم ہیں۔ اس لئے جن لوگوں کو خدا نے نظر بخشی ہے وہ جب بھی بدایوں کی حدود میں داخل ہوتے ہیں تو بہت احترام اور خوف کے ساتھ ایک ایک قدم اُٹھاتے ہیں۔ میں اہلِ نظر کے قدموں کی خاک بھی نہیں مگر بزرگانِ دین اور اللہ کے راستے میں شہید ہونے والے انسانوں کے جلال سے لرزتا ہوا حضرت سلطان العارفین اور حضرت سید بدرالدینؒ کے مزارات مقدسہ پر حاضری دینے بدایوں شریف آیا تھا۔ چشتیہ اور سہروردیہ کے سلسلے کے یہ دونوں بزرگ آپس میں حقیقی بھائی تھے۔ چھوٹے بھائی حضرت سید بدرالدینؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ انتہائی جلالی بزرگ تھے۔ یہ بات مجھ جیسا گناہ گار شخص محسوس کرسکتا تھا تو وہ لوگ جو اعلیٰ کردار کے مالک ہیں یقیناً ایک مرد خدا کی ہیبت سے لرزہ براندام ہوجائیں گے۔ ان دونوں بزرگوں کے بارے میں مشہور ہے کہ جن بیماریوں کو ہندوستان کے تمام ڈاکٹر لاعلاج قرار دیتے ہیں انہیں خداوند ذوالجلال بدایوں میں شفا بخش دیتا ہے۔ میرے علم میں بھی کئی ایسے واقعات ہیں۔ آئندہ جب کبھی ان بزرگوں پر تفصیل سے لکھا جائے گا تو آپ حضرت سید سلطان العارفینؒ اور حضرت سید بدرالدینؒ کی کرامتیں پڑھ کر حیرت زدہ رہ جائیں گے۔ فی الحال تو یہ بتانا مقصود ہے کہ ان دونوں محترم شخصیتوں کی وجہ سے بدایوں میں ہر وقت میلہ سا لگا رہتا ہے۔ ہندوستان کے گوشے گوشے سے سیکڑوں مسلمان اور ہندو یہاں آتے ہیں۔ جنہیں خدا ان پاک آستانوں کے سبب ناکام و نامراد نہیں لوٹاتا۔

جب میں مزاراتِ مقدسہ پر حاضری دے کر رخصت ہونے لگا تو کچھ مقامی لوگوں نے مجھے بتایا کہ یہاں ساگرتال میں بھی بہت سے بزرگوں کے مزارات ہیں۔ اس حقیقت کا علم ہوجانے کے بعد یہ ممکن نہ تھا کہ میں زیارت کئے بغیر واپس چلا آتا۔ غرض دل میں عقیدت کے عجیب سے جذبات لئے میں ساگرتال پہنچا۔ ممکن ہے ساگرتال کسی زمانے میں بہت بڑا تالاب ہو مگر اب وہ بڑی حد تک خشک ہوچلا ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ محفوظ میاں صاحب ان مزارات کے سجادہ نشین ہیں۔ محفوظ میاں سے ملاقات ہوئی تو طبیعت کو عجیب سی خوشی کا احساس ہوا محفوظ میاں ایک خوبصورت اور پاکیزہ اخلاق کے نوجوان ہیں۔ میں نے اُن کے بارے میں مزید جاننا تو ان کے بارے میں اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ محفوظ میاں کا تعلق حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خاندان سے ہے۔ مجھے یہ سن کر تعجب ہوا۔ کیونکہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے شادی نہیں کی تھی۔ ایسی صورت میں آپ سے نسل چلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی بہن کی اولاد بھی نظامی کہلاتی ہے۔ بہر حال سلطان المشائخ سے کسی بھی عنوان رشتہ ہو میرے لئے اس قسم کے تمام افراد محترم ہیں۔

جب میں نے محفوظ میاں سے ان کی سجادہ نشینی کے بارے میں پوچھا تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ ساگرتال میں ہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے والد اور دادا آرام فرما رہے ہیں۔ مجھے اپنی قسمت پر رشک ہوا کہ میں جو صرف حضرت سلطان العارفینؒ اور حضرت سید بدرالدینؒ کی زیارت کے لئے بدایوں آیا تھا مگر خدا کا عجیب کرم ہوا کہ مجھے دو اور نامور بزرگوں کی زیارت بھی نصیب ہوگئی۔ میں کچھ دیر بعد محفوظ میاں کے پاس سے اُٹھ کر سید احمد شاہ بخاریؒ اور سید احمد علی بخاریؒ کے مزارات پر حاضر ہوا۔ دونوں بزرگوں کے مزارات

انتہائی سادگی سے تعمیر کئے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ قبروں پر کوئی سائبان تک نہیں ہے۔ میں نے فاتحہ کے دوران کئی بار سوچا کہ جو شخص زندگی میں ہندوستان کا بے تاج بادشاہ کہلاتا تھا اور جس کی قدم بوسی کی تمنا میں کئی شاہانِ وقت دنیا سے ناکام چلے گئے' اُس کے بزرگ ساگرتال میں دفن ہیں۔ بے شمار عقیدت مندوں میں سے چند ہی یہ راز جانتے ہوں گے۔ ورنہ بہت سے لوگوں کو یہ پتہ نہیں کہ محبوب الٰہی کا بچپن بدایوں کی گلیوں میں گزرا ہے۔ یہیں سلطان المشائخ یتیم ہوئے' یہیں اُن کے دل میں معرفت کی آگ لگی اور پھر اسی آگ میں سارا ہندوستان جل گیا۔

حضرت سید احمد علی بخاریؒ اور حضرت سید احمد شاہ بخاریؒ کے مزارات پر حاضری دینے کے بعد میں کچھ بے قرار سا ہوگیا اور محبوب الٰہی کے دیدار کی آرزو شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی۔ پھر ایک روز مجھ گناہ گار کو خواہش دید نے مجبور کر ہی دیا کہ میں دہلی کی طرف رختِ سفر باندھوں۔

اور جب میں دہلی میں حضرت قطب الدین بختیارؒ کے مزار پر حاضری دے کر خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے دربار کی حدود میں داخل ہوا تو اچانک میری نظر ایک قبر کی لوح پر پڑی اور مجھے محسوس ہوا کہ دنیا کس قدر بے اعتبار ہے۔ یہ قبر گردشِ ماہ و سال کے سبب اپنی آب و تاب اس حد تک کھو چکی تھی کہ اس پر کسی لاوارث انسان کی قبر کا گمان ہوتا تھا میں بہت دیر تک کھڑا چشم حیرت سے یہ عبرتناک منظر دیکھتا رہا۔ میں نے بار بار اُس شخص کو ڈھونڈنے کی کوشش کی جو اس قبر پر فاتحہ پڑھتا مگر کوئی نہیں آیا۔ جیسے کسی کو یہاں آنے کی فرصت نہیں دعا کے لئے کسی کے ہاتھ نہیں اُٹھے۔ جیسے تمام دنیا والے مرنے والے سے ناراض ہوں عجیب بے کسی کا عالم تھا۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ وہ کس کی قبر تھی......؟ وہ شخص جو زیرِ زمین سو رہا تھا جس کی قبر پر نہ کوئی چراغ روشن تھا اور نہ کوئی فاتحہ پڑھنے والا۔ اس مجبور و بے کس شخص کو لوگ اُس کی زندگی میں ظل الٰہی (اللہ کا سایہ) کہتے تھے اور اس کا نام محمد شاہ رنگیلا تھا۔ مغل حکومت کے آخری تاجداروں میں سے ایک۔ میں نے کسی بھکاری کی قبر پر بھی اتنا سناٹا نہیں دیکھا۔ کہنے کو یہ مقام عبرت تھا جسے دیکھ کر ہر مسلمان کی آنکھ سے آنسو ٹپکنا چاہئے۔ مگر مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ وہ فقیر جو اپنی زندگی میں جو کی سوکھی روٹیاں کھاتا تھا مرنے کے بعد دہلی کا بادشاہ ٹھہرا اور جو واقعتاً دہلی کا بادشاہ تھا اُسے فقیر کے برابر تو کجا ایک ایسے کونے میں جگہ ملی جہاں نہ کوئی غمخوار یہ پوچھنے جاتا ہے کہ کس حال میں ہے اور نہ کوئی ہمدرد دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھاتا ہے کہ اس کی مغفرت ہوجائے۔ بس یہی فرق ہے دنیا اور آخرت کی بادشاہت میں۔

اس واقعہ سے آپ کو شاید حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے دربار کی عظمتوں کا کچھ اندازہ ہوگیا ہوگا۔ مجھ گناہ گار کی جہاں تک رسائی تھی اُس کا ذکر کرچکا۔ اب میرے مضطرب قدم حضرت امیر خسروؒ کے مزار مبارک کی طرف بڑھ رہے تھے تاکہ میں محبوب الٰہیؒ کے اُس حکم پر عمل کرسکوں جس میں آپ نے واضح طور پر فرمایا تھا۔

"اگر کوئی شخص نظام الدینؒ کے مزار پر آنا چاہتا ہے تو اس کے لئے لازم ہے کہ وہ خسرو کی قبر پر حاضری دے۔"

اس حکم کے بعد زائرین کے لئے ضروری ہوگیا ہے کہ وہ پہلے حضرت امیر خسروؒ کے مزار پر حاضری دیں۔ اس کے بعد محبوب الٰہی کے دربار میں شرف باریابی حاصل کریں۔ اگر کوئی شخص اس حکم کے خلاف عمل کرتا ہے تو میں یہ نہیں کہتا کہ وہ کسی جرم کا مرتکب ہوا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اُسے محبوب الٰہی کے مزار پر جانے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا...... ممکن ہے کچھ لوگوں کی سمجھ میں بات نہ آئے لیکن میرا ذاتی تجربہ یہی ہے۔

جب میں نے پہلی مرتبہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ

کے مزار اقدس پر حاضری دینے کا پروگرام بنایا تو محبوب الٰہی کے اس حکم کو نظر انداز کر دیا اور اس کے ساتھ ہی اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ میں پہلے "محبوب الٰہیؒ" کے مزار پر حاضری دوں گا اس کے بعد حضرت امیر خسروؒ کی قبر پر فاتحہ پڑھوں گا۔ اس حکم کو نظر انداز کرنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں نے اپنی حد تک یہی مناسب سمجھا۔ محض اس لئے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ حضرت امیر خسروؒ کے پیر و مرشد تھے اور منطق کے اعتبار سے پہلے پیر و مرشد کے مزار پر ہی حاضری دینا چاہئے۔ اپنی اسی عقلی دلیل پر عمل کرتے ہوئے میں نے اپنا سامان حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مزار مبارک سے ملحقہ تبلیغی جماعت کے دفتر میں رکھا اور محبوب الٰہی کی بارگاہ میں پہنچ گیا۔ جیسے ہی مزار مبارک کے احاطے میں داخل ہوا میں نے دیکھا کہ قبر مبارک خوبصورت چادروں سے جگمگا رہی ہے اور چاروں طرف عقیدت مندوں کا ہجوم ہے۔ جو دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے ہوئے ہیں۔ میں نے بھی بڑی عاجزی اور ادب سے حاضری دی۔ اس کے بعد تبلیغی جماعت کے دفتر چلا گیا تاکہ کچھ آرام کر سکوں مجھے دوسرے دن صبح اجمیر شریف جانا تھا۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا اس لئے سونے کی کوشش کرتا رہا مگر نیند نہیں آئی۔ کئی گھنٹے اسی طرح کمرے میں لیٹے ہوئے گزر گئے آخر مغرب سے کچھ دیر پہلے مجھ پر ایسی وحشت طاری ہوئی کہ بیان نہیں کر سکتا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔ مختصر یہ کہ اس وحشت سے نجات پانے کے لئے میں کمرے سے نکلا اور دوبارہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مزار مبارک کے قریب آکر کھڑا ہوا۔ ابھی مجھے کھڑے ہوئے کچھ دیر ہی گزری تھی کہ اچانک میرے کانوں میں قوالوں کی آوازیں آنے لگیں۔ میں حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ یہ قوالی کہاں ہو رہی ہے اور مزار مبارک سے دور کیوں ہو رہی ہے۔ بالآخر جدھر سے آوازیں آ رہی تھیں اُس سمت کا اندازہ کر کے میں ایک تنگ سے راستے میں داخل ہو گیا اور جب وہ راستہ ختم ہوا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک بہت کشادہ صحن میں دوسرا مزار جلوہ گر ہے۔ جیسے ہی مزار مقدس کی لوح پر میری نظر پڑی میں سناٹے میں آ گیا۔ لوح پر تحریر تھا۔

"درگاہ محبوب الٰہیؒ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ۔"

"پھر میں نے کچھ دیر پہلے کس کے مزار پر حاضری دی ہے؟ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟" میں شدید حیرت کے عالم میں بار بار اپنے آپ سے یہ سوال کرتا رہا۔ بعد میں یہ راز کھلا کہ پہلے میں نے جس قبر پر فاتحہ پڑھی ہے وہ حضرت امیر خسروؒ کی آرام گاہ ہے۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ حضرت محبوب الٰہی کے اس فرمان کا کیا مفہوم ہے؟

"جو نظام الدینؒ کے مزار پر آنا چاہتا ہے اُسے لازم ہے کہ وہ پہلے خسروؒ کے مزار پر حاضری دے۔"

چونکہ میں نے ایک غلطی کی تھی اس لئے میری آنکھوں پر پردے ڈال دیئے گئے اور میں امیر خسروؒ کے مزار کو محبوب الٰہی کا مزار سمجھتا رہا۔ حاضری کی یہی تو شرط تھی تا...... اکہ آنے والا پہلے امیر خسروؒ کے مزار پر آئے۔ میں بھی پہلے امیر خسرو کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ اب یہ علیحدہ بات ہے کہ لاشعوری طور پر سہی۔ بہرحال محبوب الٰہی کا حکم نہیں ٹالا جا سکا۔ تمام منطقیں بیکار ثابت ہوئیں...... اس کے علاوہ آپ نے محبوب الٰہی کی اس نوازش پر غور نہیں کیا کہ بغیر حاضری دیئے میرا واپس جانا بھی گوارا نہیں تھا۔ اگر اُس وقت مجھ پر دہشت طاری نہ ہوتی تو میں امیر خسروؒ کے مزار کو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ سمجھتا رہتا اور اپنی پیشانی پر اُس آستانے کی خاک ملے بغیر چلا جاتا۔

اس عجیب سے مرحلے کے بعد جب میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مزار مبارک پر فاتحہ پڑھ رہا تھا اُس وقت مجھے سیالکوٹ کا ایک نوجوان یاد آ رہا تھا جس کا نام

محمد اقبال تھا۔ اس نوجوان نے دہلی پہنچ کر محبوب الٰہی کے ایک عزیز جو اس وقت درگاہ کے سجادہ نشین تھے' یہ درخواست کی تھی کہ اُسے مزار میں تنہا جانے دیا جائے التجا سن لی گئی اور نوجوان بے شمار عقیدتیں لئے ہوئے قدمبوسی کے لئے اندر چلا گیا۔ محبوب الٰہی کے پائے مبارک کے قریب کھڑے ہو کر نوجوان نے بڑے تاثر انگیز لہجے میں اپنی نظم پڑھی

بھلا ہو دونوں جہاں میں حسن نظامی کا
ملا ہے جن کی بدولت یہ آستاں مجھ کو

اس نظم میں نوجوان نے محبوب الٰہی کو عجیب سرمستی کے عالم میں نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے۔ جب نوجوان کے اعصاب ایک مردِ خدا کے جلال سے متاثر ہو جاتے ہیں تو وہ بے اختیار پکار اُٹھتا ہے۔

کرم کرم کہ غریب الدیار ہے اقبال

اور پھر نوجوان کا حرفِ تمنا اس طرح لبوں پر مچل جاتا ہے۔

شگفتہ ہو کے کلی دل کے پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

اب آپ اس نوجوان کو یقیناً پہچان گئے ہوں گے کہ محبوب الٰہی کے آستانے پر گریہ زاری کرنے والا کون تھا؟ ہاں وہی حکیم الامت' شاعر مشرق علامہ اقبالؒ۔ علامہ نے انگلینڈ جانے سے قبل محبوب الٰہی کے مزار پر حاضری دی تھی اور محبوب الٰہی کے عزیز خواجہ حسن نظامیؒ نے اقبالؒ کے لئے خصوصی طور پر حاضری کا اہتمام کیا تھا...... اس کے بعد علامہ انگلینڈ تشریف لے گئے اور جب واپس آئے تو اُن کی طبیعت میں کتنا بڑا انقلاب آ چکا تھا۔ اب آپ بتائیں کہ شاعر مشرق نے محبوب الٰہی کے دربار میں حاضر ہو کر جو دعائیں مانگی تھیں وہ قبول ہوئیں یا نہیں؟

ایک علامہ اقبالؒ پر ہی کیا منحصر ہے عقیدت سے سر جھکائے ہوئے اس دربار میں کون نہیں آیا۔ نواب آئے مہاراجہ آئے' انتہا یہ ہے کہ آزاد ہندوستان کا سب سے بڑا لیڈر پنڈت نہرو بھی بھکاریوں کی طرح گردن کو خم کئے ہوئے آیا۔

جسے کروڑوں لوگ ہندوستان کا بے تاج بادشاہ کہتے تھے وہ بدایوں کے ایک مفلس گھرانے میں پیدا ہوا۔ یہ نہیں کہ اس کے بزرگوں کو دولت مل نہیں سکتی تھی وہ اگر خزانہ طلب کرتے تو اُن کے دامن میں ڈال دیا جاتا لیکن جب دل ہی فقر و قناعت کی طرف مائل ہو تو پھر دولت کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی تھی۔ محبوب الٰہی کے والد ماجد حضرت سید احمد بخاریؒ جو اپنے وقت کے قطب تھے اُن کی عمر فقر و فاقہ میں بسر ہوئی۔ ابھی محبوب الٰہی کا بچپن ہی تھا کہ حضرت سید احمد بخاریؒ کا انتقال ہو گیا۔ غربت و افلاس اور یتیمی کا عالم بڑا کربناک زمانہ تھا۔ پھر بھی آپ کی والدہ محترمہ نے ہمت نہیں ہاری اور مزید فاقے کر کے محبوب الٰہی کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا جب آپ ذرا ہوشیار ہوئے تو آپ کو کلام الٰہی کی تعلیم کے لئے بدایوں کے ایک مشہور عالم مولانا شاداں کے مکتب میں بھیجا گیا۔ جب آپ دوسری دینی تعلیمات حاصل کرنے کے ساتھ قرآن پاک حفظ کر چکے تو مدرسے کی طرف سے آپ کو دستار باندھی گئی۔ اس کے بعد مزید تعلیم کے لئے آپ کو مولانا شمس الملکؒ کے پاس بھیجا گیا۔ مولانا شمس الملکؒ اُس دور کے ایک عالم و فاضل بزرگ تھے۔ بادشاہ وقت غیاث الدین بلبن اُن کی بہت عزت کرتا تھا۔ مولانا کی یہ عادت تھی کہ وہ جس طالبعلم پر خصوصی توجہ دیتے تھے اُسے اپنے کمرے میں بلا کر سبق دیتے۔ محبوب الٰہی سے پہلے صرف دو طالب علم قطب الدین ناقلہ اور برہان الدین عبدالباقی اس خاص درجے تک پہنچے تھے۔ مگر جب حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے اپنی صلاحیت اور کوشش سے ثابت کر دیا کہ وہ بھی اسی توجہ کے مستحق ہیں تو یہ تینوں آدمی مولانا کے کمرے میں جا کر سبق پڑھا کرتے اور تینوں آپس میں

گہرے دوست بن گئے۔

تمام علوم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد محبوب الٰہی دہلی تشریف لائے۔ آپ کی بچپن سے یہ خواہش تھی کہ بادشاہ وقت قاضی شہر کے عہدے کے لئے آپ کا انتخاب کرے تعلیم مکمل کرنے کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ اپنے آپ کو اس اعلیٰ ترین عہدے کا جائز حقدار سمجھ رہے تھے۔ پھر بھی آپ دہلی کے مشہور بزرگ حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا۔

''بلاشک وشبہ آپ کا شمار اللہ کے پسندیدہ بندوں میں ہوتا ہے آپ دعا فرمائیں کہ میں جس مقصد سے دہلی آیا ہوں خدا اُس میں مجھے کامیابی عطا فرمائے اور میں قاضی شہر کی ذمہ داریوں کو پورا کرسکوں۔''

حضرت نجیب الدین متوکلؒ نے پُر جلال نظروں سے محبوب الٰہی کی طرف دیکھا اور بے اختیار ہو کر جذب کے عالم میں فرمایا۔

''اے اللہ! نظام الدینؒ جو کچھ بننا چاہتا ہے تو اُسے وہ نہ بنا۔ میری آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں تو اُسے صرف وہ بنا دے۔''

محبوب الٰہی نجیب الدین متوکلؒ کی یہ دعا سن کر اداس ہوگئے۔ جس عہدے کو حاصل کرنے کے لئے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے لئے دُعا کر رہے تھے۔ چونکہ حضرت نجیب الدین متوکلؒ، حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے خلیفہ تھے اس لئے احتراماً زبان سے تو کچھ نہ کہہ سکے مگر دل میں... غم وملال لئے ہوئے واپس چلے آئے۔

دوسرے دن حضرت نظام الدین اولیاءؒ جمعے کی نماز پڑھ رہے تھے۔ جب امام نے قرآن حکیم کی یہ آیت تلاوت کی۔

''کیا اہل ایمان کے لئے بھی وہ وقت نہیں آیا ہے
کہ اُن کے دل خدا کے حضور جھک جائیں۔''

تو حضرت محبوب الٰہیؒ کے جسم پر لرزہ طاری ہوگیا اور آپ نماز ختم کرتے ہی دہلی سے اجودھن کی طرف روانہ ہوگئے۔ آپ کے ذہن سے قاضی شہر بننے کا خیال اس طرح نکل گیا۔ جیسے یہ جذبہ کبھی آپ کے ذہن میں پیدا ہی نہ ہوا تھا۔ اب آپ کے دل میں بس ایک ہی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح اجودھن پہنچ کر حضرت بابا فرید الدین شکر گنجؒ کی قدمبوسی کا شرف حاصل کریں۔

روایت ہے کہ جیسے ہی نظام الدین اولیاءؒ خانقاہ کی حدود میں داخل ہوئے۔ حضرت بابا فریدؒ نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر دروازے پر آپ کا استقبال کیا اور بے ساختہ فارسی کا یہ شعر پڑھا۔

اے آتش فراقت دل ہا کباب کردی
سیلاب اشتیاقت جان ہا خراب کردی

(تیرے فراق کی آگ اور تجھ سے ملنے کے اشتیاق میں بے شمار جانیں خراب ہوگئی ہیں۔) محبوب الٰہی نے بہت چاہا کہ اپنے دل کی کیفیت بیان کریں۔ لیکن حضرت بابا فریدؒ کی ہیبت اس قدر تھی کہ زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہ کرسکے اور بے اختیار روتے ہوئے چشتیہ سلسلے کے اس نامور بزرگ کے قدموں سے لپٹ گئے۔

حضرت بابا فریدؒ نے محبوب الٰہی کو سینے سے لگایا اور اپنے مریدانِ خاص کے حلقے میں داخل کرتے ہوئے کہا۔

''میں چاہتا تھا کہ ولایت ہندوستان کسی اور کو دوں۔ ناگاہ غیب سے ایک آواز آئی کہ ابھی ٹھہرو۔ نظام الدین بدایونیؒ آتے ہیں۔''

مرید ہونے کے بعد آپ نے دیکھا کہ بابا صاحبؒ کی محفل میں تمام مرید سر منڈھائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ آپ چونکہ بنیادی طور پر عالم دین تھے اس لئے بال صاف کرا کے قلندر بننے کے لئے تیار نہیں تھے اور محفل میں شریک ہونے کی پہلی شرط ہی یہ تھی کہ انسانی زینت و آرائش کی خاص علامت کو ختم کردیا جائے۔ آپ کئی روز تک کشمکش کا شکار رہے پھر ایک دن آپ نے دیکھا کہ مولانا اسحاق بدر الدینؒ جیسے عالم بزرگ سر منڈھائے چلے آرہے ہیں۔ فوراً آپ نے سر منڈھایا اور شریک محفل ہوگئے۔

حضرت بابا صاحب کی تربیت نے محبوب الٰہی کے دل میں پیدا ہونے والی خواہش دنیا کو اس طرح فنا کردیا کہ نشان تک باقی نہ رہا۔ اپنے پیرومرشد کے شب و روز دیکھ کر محبوب الٰہی کی سمجھ میں آیا کہ فقیر کس شے کا نام ہے اور قلندر کسے کہتے ہیں؟ حضرت نظام الدین اولیاءؒ بابا صاحبؒ کی معمولی غذا دیکھ کر حیران رہ جاتے۔ شہنشاہ سلطان شمس الدین التمش کا داماد اور سوکھی روٹیاں......؟ بغیر نمک کی اُبلی ہوئی ترکاریاں اپنے پیرومرشد کی زندگی کا یہ عجیب وغریب پہلو دیکھ کر محبوب الٰہی بھی دنیا کے ہر عیش وآرام سے بے نیاز ہوگئے۔ پیرومرشد اور دوسرے فقیروں کے لئے سالن پکانے کا انتظام آپ کے سپرد تھا۔ محبوب الٰہی کو یہ دیکھتے ہوئے بہت دن ہوگئے تھے کہ بابا صاحبؒ بادشاہ وقت کے داماد ہونے کے باوجود معمولی قسم کی اُبلی ہوئی ترکاریاں کھاتے تھے۔ یہاں تک کہ باباؒ کی زبان نمک کی لذت سے بھی آشنا نہیں تھی۔ یہ خیال کرکے آپ کو عجیب سا احساس ہوا اور پیرومرشد کی محبت نے اس حد تک بے قرار کردیا کہ آپ نے پڑوسی بنیے سے نمک قرض لے کر ترکاری میں ڈال دیا۔

جب بابا صاحبؒ کھانا کھانے کے لئے بیٹھے اور پہلا نوالہ منہ میں لینے کا ارادہ کیا تو اچانک باباؒ کا ہاتھ رک گیا اور آپ نے بڑے اضطراب کے عالم میں فرمایا۔

''آج مجھے اپنا ہاتھ بہت بھاری معلوم ہورہا ہے۔ سالن کس نے پکایا تھا۔''

''پیرومرشد! میں نے۔'' محبوب الٰہی نہایت ادب سے بولے۔ ''کیا آج تم نے سالن میں کچھ تبدیلی کردی ہے؟'' باباؒ نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے پوچھا۔

''پیرومرشد میں نے حسب معمول کھانا پکایا ہے۔ بس آج کے سالن میں صرف اتنا فرق ہے کہ اس میں نمک شامل کردیا گیا ہے۔'' محبوب الٰہی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''نمک کہاں سے آیا؟ خانقاہ کے کسی گوشے میں تو نمک کا وجود نہیں۔'' باباؒ کے چہرے پر ہلکے سے غصے کے آثار پیدا ہوگئے۔ باباؒ کی کیفیت دیکھ کر محبوب الٰہیؒ سمجھ چکے تھے کہ اُن سے نادانی میں بہت بڑی غلطی ہوگئی ہے۔ پھر بھی آپ جھوٹ نہیں بول سکتے تھے اس لئے شرمسار ہوتے ہوئے آپ نے کہا۔

''میں نے پڑوسی بنیے سے تھوڑا سا نمک قرض لیا تھا۔ مجھ سے یہ حالت دیکھی نہیں جاتی تھی کہ آپ روزانہ بے نمک اور بے مزہ ترکاریاں کھائیں۔''

''نظام الدینؒ! درویش فاقے سے مرنا گوارا کرلیتا ہے مگر کسی سے قرض لینا گوارا نہیں کرتا۔ یاد رکھو کہ توکل اور قرض ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔'' یہ کہہ کر باباجیؒ نے حکم دیا کہ آج کا کھانا فقیروں میں تقسیم کردیا جائے۔

محبوب الٰہیؒ کے دل پر اس واقعے کا اتنا اثر ہوا کہ جو کچھ خواہش لذت وعیش باقی رہ گئی تھی وہ بھی فنا ہوگئی اور آپ دنیاداری کی باتوں سے نفرت کرنے لگے۔

آخر جب اجودھن سے رخصت ہو کر دہلی جانے کا وقت آیا تو بابا صاحبؒ نے محبوب الٰہی کو اپنے پہننے کا ایک جوڑا دیتے ہوئے فرمایا۔

''نظام الدینؒ! کمر بند مضبوطی سے باندھ لے۔''

محبوب الٰہی فوراً سمجھ گئے کہ پیرومرشد کا اشارہ کس طرف ہے اپنے شیخ کے اسی حکم کی تکمیل کرنے کے لئے آپ نے شادی نہیں کی۔

اس کے بعد بابا صاحبؒ نے فرمایا۔ ''اپنے دشمنوں کو ہر ممکن طریقے سے خوش کرنے کی کوشش کرنا پھر تجھے نفس کی کشمکش سے نجات مل جائے گی۔'' غرض پیرومرشد کی بے شمار دعاؤں کے سائے میں محبوب الٰہیؒ اجودھن سے دہلی کی طرف روانہ ہوئے۔ آپ کے ہمراہ تقریباً چالیس درویش تھے۔ جن کے پاس تن کے کپڑوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

جب یہ قافلہ دہلی پہنچا تو مردان خدا کا عجیب عالم تھا۔ اجودھن (پاک پتن شریف) سے دہلی کے طویل سفر میں ان فقیروں نے مشکل سے ایک دو وقت کا کھانا کھایا ہوگا۔ دہلی پہنچ کر محبوب الٰہیؒ نے غیاث پور میں قیام کیا۔ فقر و فاقے کا عجیب عالم تھا۔ کئی کئی وقت بغیر کچھ کھائے پئے گزر جاتے تھے۔ آخر ایک روز حضرت کے پڑوس میں رہنے والی بڑھیا آدھ سیر چاول لے کر محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ آپ نے ایک مفلس عورت کی عقیدت و محبت کا خیال کرتے ہوئے وہ چاول قبول کر لئے اور اپنے ایک ساتھی درویش سے چاول پکانے کے لئے کہا اور آپ خود عبادت میں مشغول ہو گئے۔

ابھی چاول اچھی طرح پکنے بھی نہیں پائے تھے کہ ایک کمبل پوش فقیر آیا اور کچھ کھانے کے لئے مانگنے لگا۔ مولانا کمال الدین نے کچھ دیر انتظار کرنے کو کہا مگر فقیر بے انتہا بھوکا تھا اس لئے بے صبری کا مظاہرہ کرنے لگا اور جب فقیر کا اصرار حد سے زیادہ بڑھ گیا تو محبوب الٰہی اپنی جگہ سے اُٹھے اور چاول کی ہانڈی فقیر کے سامنے رکھ دی۔ فقیر نے چاولوں کے ٹھنڈا ہونے کا بھی انتظار نہ کیا اور کئی وقت کے بھوکے انسان کی طرح گرم چاول کھانے لگا۔ محبوب الٰہی کے تمام ساتھی درویش اُس فقیر کو حیرت سے دیکھتے رہے۔ ابھی چند منٹ بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ فقیر نے چاولوں کی ہانڈی خالی کر کے زمین پر دے ماری۔ محبوب الٰہی اور دوسرے درویش کبھی ہانڈی کے ٹکڑوں کو دیکھتے تھے اور کبھی فقیر کے منہ کو۔ فقیر کا یہ طرز عمل کسی کی بھی سمجھ میں نہ آیا تھا۔ ابھی تمام لوگ حیرت میں گم تھے کہ فقیر نے محبوب الٰہی کے چہرے پر ایک بھرپور نظر ڈالی اور قلندرانہ لہجے میں بولا۔

"درویش نظام الدینؒ! حضرت بابا صاحبؒ نے تجھے نعمت باطنی عطا کی ہے لیکن میں نے تیرے فقر و فاقے کے برتن کو توڑ دیا ہے۔"

یہ کہہ کر فقیر نے عجیب سے قلندرانہ انداز میں اپنے کمبل کو سمیٹا اور چلا گیا۔ اس کے بعد محبوب الٰہی کی خانقاہ میں دہلی کے امیروں اور وزیروں نے اتنی نذریں بھیجیں کہ لوگ حیران رہ گئے۔ مگر بابا فریدؒ جیسے قلندر کے مرید نے کوئی نذر قبول نہیں کی اور اپنے ساتھی درویشوں کو حکم دیا کہ ایک لنگر خانہ کھول دیا جائے جس میں دہلی کے تمام بھوکے جی بھر کر کھانا کھا سکیں۔ چند ماہ بعد خدا نے محبوب الٰہی کے لنگر خانے کو اتنی وسعت دی کہ صبح و شام ہزاروں بھوکے اپنے پیٹ کی آگ بجھاتے تھے اور محبوب الٰہی......؟ آپ نے تمام عمر روزے رکھے۔ افطار و سحر میں نمک کے پانی کے ساتھ جو کی ایک روٹی۔ بس یہی آپ کی غذا تھی۔

محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاؒ شب و روز فرض نمازوں کے علاوہ پانچ سو نفل پڑھتے۔ اپنے بے شمار مریدوں کو قرآن حکیم اور حدیث پاک کا درس دیتے اور پھر جب ساری دنیا سو جاتی تو آپ اپنے رب کے حضور گم ہو جاتے اور اتنا روتے کہ داڑھی آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔

صبح سے شام تک آپ کے دروازے پر ضرورت مندوں کی بھیڑ لگی رہتی۔ آپ ایک ایک شخص پر توجہ فرماتے۔ شاید ہی کوئی بدنصیب شخص ایسا ہو جو آپ کے آستانے سے خالی ہاتھ واپس گیا ہو۔ محبوب الٰہیؒ کی ان ہی نوازشات نے آپ کو ہندوستان کا بے تاج بادشاہ بنا دیا تھا۔ دہلی کے تمام امیروں اور وزیروں کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی کہ آپ کی صحبت میں رہیں لیکن محبوب الٰہی اس طبقے کے لوگوں کو سخت ناپسند کرتے۔ شاذ و نادر ہی کوئی وزیر رئیس زادہ ایسا ہوگا جسے حضرت نے اپنی خانقاہ میں آنے کی اجازت دی ہوگی۔ انتہا یہ ہے کہ سلطان علاؤالدین خلجی جیسا رعب و جلال رکھنے والا شہنشاہ تمام عمر آپ کی قدم بوسی کے لئے ترستا رہا۔ جب آپ کسی طرح ملاقات پر راضی نہ ہوئے تو علاؤالدین خلجی نے

حضرت امیر خسروؒ سے اپنی دلی خواہش کا اظہار کیا۔ امیر خسروؒ علاؤالدین خلجی کے درباری شاعر تھے اور بادشاہ کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ محبوب الٰہی خسروؒ کی بات کسی طرح نہیں ٹالیں گے۔ بادشاہ کی یہ عقیدت دیکھ کر امیر خسروؒ نے اپنے پیر و مرشد سے اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا کہ ایک دن حضرت نظام الدین اولیاؒ نے درس کے دوران فرمایا کہ۔

"جس طرح زمین و آسمان آپس میں نہیں مل سکتے اسی طرح ایک فقیر اور بادشاہ میں بھی کوئی رشتہ قائم نہیں ہو سکتا۔"

محبوب الٰہی کی زبان مبارک سے یہ جملے سن کر حضرت امیر خسرو سمجھ گئے کہ پیر و مرشد کا اشارہ کس طرف ہے۔

دوسرے ہی روز حضرت امیر خسروؒ نے علاؤالدین خلجی سے صاف صاف کہہ دیا کہ "یہ ملاقات ممکن نہیں۔" یہ سن کر سلطان کے جذبہ کو ٹھیس پہنچی اور اس نے ذرا بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

"خسروؒ! تم نے ہم سے وعدہ کیا تھا۔"

"مجھے یاد ہے۔ اب زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ میری عہد شکنی کی وجہ سے ناراض ہو جائیں اور آپ کی ناراضگی میری دنیا خراب کر دے۔ لیکن اگر پیر و مرشد مجھ سے خفا ہو گئے تو میری عاقبت خراب ہو جائے گی۔ بہرحال میں دنیا کے لالچ میں اپنی عاقبت خراب نہیں کر سکتا۔" حضرت امیر خسروؒ کا جواب اس قدر بے ساختہ تھا کہ سلطان علاؤالدین خلجی دم بخود رہ گیا۔ اس کے ہونٹوں کو جنبش تک نہ ہوئی۔

مگر قدم بوسی کی تمنا سلطان کو کسی طرح سے بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔ مجبور ہو کر اس نے محبوب الٰہی کو بڑے عاجزانہ انداز میں خط لکھا اور قدم بوسی کی خواہش ظاہر کی۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ علاؤالدین خلجی نے دوسرا خط لکھا۔ اس مکتوب میں قدم بوسی کی آرزو پہلے سے زیادہ شدت اختیار کر گئی تھی۔

محبوب الٰہی نے جواب میں لکھوایا۔

"فقیر کے گھر کے دو دروازے ہیں۔ تو اگر ایک سے داخل ہوگا تو میں دوسرے سے باہر نکل جاؤں گا۔ اگر زیادہ تنگ کرے گا تو تیرا ملک چھوڑ دوں گا۔ کیونکہ خدا کی زمین تنگ نہیں ہے۔"

محبوب الٰہی کی ناراضگی دیکھ کر سلطان علاؤالدین خلجی لرز اُٹھا اور اس نے فوراً ہی تیسرا خط لکھا۔

"میں اپنی خواہش کا گلا گھونٹ دوں گا مگر آپ دہلی نہ چھوڑیں میں تو صرف اس لئے قدم بوسی کی اجازت چاہتا تھا کہ حضرت سے اپنی سلامتی کے لئے دعا کرا سکوں۔"

محبوب الٰہی نے جواب میں دوسرا خط لکھا۔

"تجھے یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔ تو عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کر۔ میں تیرے لئے دعا کرتا رہوں گا۔"

سلطان محبوب الٰہی کے اس خط کو پا کر بہت خوش ہوا اور اُس نے اپنے درباریوں سے کہا کہ "اب میری حکومت گردش ماہ و سال سے محفوظ ہو گئی ہے۔" تاریخ گواہ ہے کہ علاؤالدین خلجی نے طویل و عریض ہندوستان پر انتہائی شان و دبدبے سے حکومت کی۔ فرمانروائی کے دور میں بڑے بڑے ہنگاموں نے سر اُٹھایا لیکن محبوب الٰہی کی دعاؤں سے تمام فتنے دب گئے اور علاؤالدین خلجی وقت کی سازشوں سے محفوظ رہا۔

ہوشمند بادشاہوں کے علاوہ ہندوستان کے کچھ حکمران ایسے بھی تھے جنہیں اقتدار کے نشے نے بدحواس کر دیا تھا اور وہ دہلی کے اس قلندر کو طرح طرح سے تکلیفیں پہنچاتے تھے تاکہ ہندوستان کا یہ بے تاج بادشاہ اپنے عقیدت مندوں کی نظروں میں ذلیل و رسوا ہو جائے سلطان غیاث الدین بلبن بھی اسی کم ظرفی اور حسد کا شکار تھا۔ سلطان کے خوشامدی وزیروں اور بدکردار مشیروں نے اس کے دماغ میں یہ بات اچھی طرح بٹھا دی تھی کہ "ہندوستانی عوام کے دلوں میں

محبوب الٰہی کی حکومت ہے۔ وہ جب چاہیں سلطان کی حکومت کا تختہ اُلٹ سکتے ہیں۔ اقتدار اتنی بری شے ہے کہ یہ جاہلانہ بات غیاث الدین بلبن کے ذہن میں جم کر رہ گئی اور وہ اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے حضرتؒ کی دشمنی پر اُتر آیا اس جاہل نے یہ نہیں سوچا کہ جس مردِ خدا نے سلطان علاؤ الدین خلجی جیسے شہنشاہ سے ملنا تک گوارا نہ کیا وہ دہلی کی حکومت لے کر کیا کرے گا۔

ان حقائق کے باوجود سلطان غیاث الدین بلبن کو کچھ نظر نہیں آیا اور وہ حضرت کے چاروں طرف سازشوں کا جال بچھانے لگا۔ محبوب الٰہی کو بھی اس قسم کی خبریں ملتی رہتی تھیں مگر آپ ہمیشہ مسکرا کر رہ جاتے تھے۔

اچانک ایک روز سلطان بیمار پڑا اور اس کا پیشاب رُک گیا۔ شاہی طبیبوں سے لے کر ہندوستان کے تمام حکیموں تک ہر شخص نے علاج کیا مگر پیشاب نہیں اُترا اور بادشاہ پر جان کنی کا عالم طاری ہوگیا۔ غیاث الدین بلبن کی ماں کو اس بات کا علم تھا کہ سلطان محبوب الٰہی سے عداوت رکھتا ہے اور اُن کی شان میں نازیبا کلمات بھی کہتا ہے۔ بوڑھی عورت فوراً سمجھ گئی کہ اُس کے بیٹے پر خدا کا جو کچھ قہر نازل ہوا ہے وہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی دل آزاری کے سبب ہے۔

آخر وہ ایک ماں تھی، جب بیٹے کی تکلیف برداشت نہ کر سکی تو روتی ہوئی محبوب الٰہی کی خانقاہ میں چلی گئی اور گڑگڑاتے ہوئے حضرت نظام الدینؒ سے اپنے بیٹے کی صحت کے لئے دُعا کی طالب ہوئی۔ محبوب الٰہیؒ نے انتہائی صبر و ضبط کے ساتھ بوڑھی عورت کی رودادِ غم سنی اور فرمایا۔

''میں اُس کے لئے اُس وقت دُعا کروں گا جب وہ ہندوستان کی بادشاہت میرے نام لکھ دے اور اس معاہدے پر دربار کے تمام امیروں کے دستخط ہوں۔''

جب سلطان غیاث الدین بلبن کو محبوب الٰہی کی اس عجیب و غریب شرط کا علم ہوا تو وہ سناٹے میں آ گیا مگر وہ اذیت ناک بیماری کے ہاتھوں مجبور تھا۔ آخر شدید عالمِ بے کسی میں بادشاہ اور اس کے وزیروں نے معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ اب حکومتِ ہندوستان جو کی روٹیاں کھانے والے ایک درویش کے حوالے کی جا چکی تھی۔ بوڑھی ماں یہ معاہدہ لے کر محبوب الٰہی کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ آپ نے اُس کا فلیتہ بنا کر ارشاد فرمایا۔

''اس فلیتے کو طشت میں رکھ کر بادشاہ کو پیشاب کراؤ خدا اُسے تکلیف سے نجات دے گا۔''

سلطان کی ماں نے ایسا ہی کیا۔ غیاث الدین بلبن کو اس اذیت ناک بیماری سے چھٹکارا مل گیا اور جب اُس کے حواس بجا ہوئے تو وہ محبوب الٰہی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اپنی پست حرکتوں کی وجہ سے وہ سخت نادم تھا۔ اُس کی گردن جھکی ہوئی تھی اور شرمندگی کے اسی عالم میں سلطان نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے کہا۔

''میں معاہدے کے تحت ہندوستان کی بادشاہت آپ کے حوالے کرنے آیا ہوں۔''

''جس بادشاہت کی قیمت انسانی پیشاب کے برابر ہو، تو مجھے وہ غلیظ شے دینے آیا ہے؟ جا اپنا کام کر اور بندگانِ خدا کو ستانے سے باز آ۔'' یہ کہہ کر محبوب الٰہیؒ نے بادشاہ کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ سلطان غیاث الدین بلبن کچھ دیر ندامت کے پسینے میں ڈوبا ہوا خاموش بیٹھا رہا اور پھر گردن کو خم کیے ہوئے محبوب الٰہی کی خانقاہ سے اُٹھ کر چلا گیا۔

سلطان غیاث الدین بلبن کے علاوہ خلجی شہنشاہ قطب الدین بھی محبوب الٰہی کی دل آزاری کیا کرتا تھا۔ اپنی حکومت کے آغاز میں تو قطب الدین حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے ادب کے ساتھ پیش آتا رہا مگر کچھ دن گزرنے کے بعد وہ محبوب الٰہی کی طرف سے بدظن ہوگیا۔ اس بدگمانی کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ قطب الدین نے خضر خان کو معزول کر کے ہندوستان کی حکومت حاصل کی تھی اور خضر خان پر اس قدر مظالم ڈھائے تھے کہ اس کی

آنکھیں تک نکلوالی تھیں۔ محبوب الٰہی قطب الدین کے اس ظلم وتشدد سے خوش نہیں تھے کیونکہ خضر خان آپ کا مرید تھا اور ایک مرید کی تکلیف سے کوئی پیر خوش نہیں ہوسکتا۔ مگر قطب الدین ان تمام چیزوں سے بے نیاز ہو کر خضر خان پر ظلم ڈھاتا رہا۔ خدا کو یہی منظور تھا محبوب الٰہی کرتے بھی تو کیا کرتے۔ صرف آسمان کی طرف دیکھ کر خاموش ہوجاتے۔ آپ کو عرش اعلیٰ کے فیصلے کا انتظار تھا۔ وہ فیصلہ جو آسمانوں پر ہوچکا تھا مگر جس کے زمین پر ظاہر ہونے کا ابھی وقت نہیں آیا تھا۔

قطب الدین اپنے انجام سے بے خبر محبوب الٰہی کے مرید خضر خان پر ظلم ڈھاتا رہا اور خوشامدی درباریوں کے ہجوم میں گھرا ہوا اپنے ہاتھ سے اپنی قبر کھودتا رہا۔ جب ذلیل کردار رکھنے والے درباری' حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خلاف کوئی سازش نہ کرسکے تو انہوں نے ایک اور جاہلانہ منصوبہ بنایا جس سے بادشاہ کا متاثر ہونا یقینی امر تھا۔ قطب الدین اور دوسرے بادشاہوں کے دور میں یہ رسم تھی کہ جب بھی پہلی تاریخ کا چاند نظر آتا تھا تو دہلی کے تمام مولوی اور وزیر دربار میں حاضر ہو کر بادشاہ کو مبارکباد دیتے تھے اور حکومت کی سلامتی کے لئے دعائیں مانگا کرتے تھے۔ یہ بھی خوشامد کا ایک درباری انداز تھا جسے زر پرست مولویوں نے مختلف نام دے رکھے تھے۔ محبوب الٰہی کے لئے اس رسم کی ادائیگی تو خیر ناممکن ہی تھی۔ آپ تو یہ بھی گوارا نہیں کرتے تھے کہ بادشاہ وقت آپ کی خانقاہ میں داخل ہو۔ محبوب الٰہی کے اس طرز عمل کو دیکھ کر مخالفین کے ہاتھ ایک بہانہ آگیا اور خوشامدیوں نے یہ کہہ کر بادشاہ کو گمراہ کرنا شروع کردیا۔

''نظام الدین اولیاءؒ آپ کی بادشاہت کو تسلیم نہیں کرتے اگر وہ آپ کو فرماں روائے وقت مانتے تو دربار میں حاضری دے کر آپ کی حکومت کی سلامتی کے لئے دعا کرتے۔ وہ یقیناً درپردہ آپ کے اقتدار کے خلاف سازشیں کررہے ہیں۔''

قطب الدین چونکہ دنیا پرست اور شکی مزاج بادشا تھا۔ اس لئے ایک فقیر کے کردار کو نہیں سمجھ سکا اور خوشامدیوں کی گمراہ کن باتوں سے متاثر ہوکر محبوب الٰہی کی مخالفت پر اُتر آیا۔ اُس نے فوراً ہی اپنے ایک خاص وزیر کے ذریعے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو حکم دیا کہ وہ بھی دوسرے علماء کی طرح ہر مہینے کی چاند رات کو دربار میں حاضر ہوا کریں۔ محبوب الٰہی نے قطب الدین کا وہ حکم سن لیا اور خاموش رہے۔

جب پہلی چاند رات آئی تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ بادشاہ کے حکم کو اس طرح بھول گئے جیسے نہ تو دہلی میں قطب الدین کا وجود ہے اور نہ اُس کے حکم کی کوئی اہمیت۔ وقت گزر گیا مخالفین موقع کی تلاش میں تھے۔ انہوں نے بادشاہ کو محبوب الٰہی کی نافرمانی کی طرف توجہ دلائی۔ قطب الدین نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے حاضر نہ ہونے کو اپنی توہین سمجھا اور دوبارہ سختی سے حکم دیا۔

اگلے ماہ جب چاند رات آئی تو محبوب الٰہی نے اپنے خادم اقبال کو بھیج دیا۔ مخالفین نے اس صورت حال کو عجیب انداز میں رنگ کر پیش کیا۔ قطب الدین کم ظرف تھا اس لئے محبوب الٰہی کے قلندرانہ کردار کو برداشت نہ کرسکا اور عالم وحشت میں اُس نے چند سپاہیوں کو حکم دیا کہ نظام الدین اولیاءؒ اگر بخوشی آنے کو تیار نہ ہوں تو انہیں زبردستی دربار میں حاضر کیا جائے جس نے بھی بادشاہ کا یہ گستاخانہ حکم سنا دم بخود رہ گیا۔ ہر شخص محبوب الٰہی کے مرتبے سے واقف تھا۔ مگر موت کے خوف سے کسی میں بھی کچھ کہنے کی جرأت نہ تھی۔

جب سپاہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو یہ جابرانہ حکم سنانے پہنچے تو محبوب الٰہی اپنی خانقاہ کی چھت پر ٹہل رہے تھے۔ حضرت کے خادم اقبال نے سپاہیوں سے صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک محبوب الٰہی نیچے تشریف نہیں لے آتے اس وقت تک میں کوئی پیغام خدمت اقدس

میں نہیں پہنچا سکتا۔ سپاہیوں کو اپنی ملازمت اور جان خطرے میں نظر آرہی تھی اس لئے وہ جلد بازی کا مظاہرہ کرنے لگے۔ اقبال نے معذرت کی اور کہا کہ اگر انہیں ایسی ہی جلدی ہے تو وہ خود اوپر چلے جائیں سپاہی بادشاہ کے حکم سے مجبور تھے۔ اس لئے فوراً ہی خانقاہ کی چھت پر چلے گئے وہاں انہوں نے دیکھا کہ محبوب الٰہی انتہائی اضطراب کے عالم میں ٹہلتے ہوئے حضرت شیخ سعدیؒ کا یہ شعر بار بار پڑھ رہے تھے۔

اے روبہک چرانہ نشستی بجائے خویشتن.
باشیر پنجہ کردی ودیدی سزائے خویشتن

(اے لومڑی کے بچے! تو اپنی جگہ پر خاموش کیوں نہیں بیٹھتا۔ تو نے شیر کے پنجے میں پنجہ ڈال دیا اور اس کی سزا دیکھی)۔

سپاہیوں پر محبوب الٰہی ن عجیب سی ہیبت طاری تھی۔ پھر بھی انہوں نے آپ کو بادشاہ کا حکم سنایا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ چند لمحات کے لئے ٹھہرے پھر آپ نے سپاہیوں سے کہا۔

''تم کس بادشاہ کا حکم مجھے سناتے ہو؟''

''قطب الدین خلجی کا۔'' سپاہیوں نے ادب سے کہا۔

''جاؤ اپنے بادشاہ کی خبر لو اب وہ حکم دینے کے قابل نہیں رہا۔'' محبوب الٰہی نے غضبناک لہجے میں کہا۔

سپاہیوں پر آپ کے مختصر سے جملوں کی اس قدر دہشت طاری ہوئی کہ وہ اُلٹے پاؤں واپس چلے گئے اور جب دربار میں پہنچے تو انہوں نے بڑا عبرتناک منظر دیکھا...... قطب الدین کے بیٹے نے باپ کے خلاف بغاوت کردی تھی۔ تمام نظام درہم برہم ہوگیا تھا اور قطب الدین کی لاش خون میں نہائی ہوئی فرش پر پڑی تھی۔ سپاہیوں کے کانوں میں اچانک محبوب الٰہی کا وہ شعر گونجنے لگا اور وہ لرز کر رہ گئے۔

باشیر پنجہ کردی ودیدی سزائے خویشتن

ایک دوسرے بادشاہ کا عبرتناک انجام تحریر کرنے سے پہلے میں آپ کو حضرت امیر خسروؒ کے بارے میں چند حیرت انگیز باتیں بتانا چاہتا ہوں۔ وہ اس لئے کہ آئندہ صفحات میں جو واقعات تحریر کئے جانے والے ہیں' اُن کا تعلق کافی حد تک امیر خسروؒ کی ذات گرامی سے بھی ہے۔

امیر خسروؒ محبوب الٰہی کے انتہائی چہیتے مرید تھے۔ آپ اپنے پیر ومرشد کا یہاں تک ادب کرتے تھے کہ جب ایک مرتبہ حضرت محبوب الٰہیؒ نے ایک ضرورت مند کو اپنے جوتے دے دیئے تھے۔ تو امیر خسروؒ نے وہی جوتے ایک لاکھ روپے میں خرید لئے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو جب اس واقعے کی خبر ہوئی تھی تو آپ نے فرمایا تھا کہ

''خسروؒ بسیار ارزاں خریدی''

(خسرو! تم نے یہ جوتے بہت سستے داموں خریدے)

پیر ومرشد کی زبان سے کلمات سن کر امیر خسروؒ نے عرض کیا تھا۔

''اگر خسروؒ کے پاس اُس وقت تمام دنیا کی دولت ہوتی تو وہ پیر ومرشد کے جوتوں پر قربان کردیتا۔''

یہ صرف زبانی باتیں نہیں تھیں۔ امیر خسروؒ نے اپنی عقیدت کا اس حد تک عملی مظاہرہ کیا تھا کہ بنگال سے دہلی تک کے طویل سفر میں محبوب الٰہی کے جوتوں کو اپنے سر پر رکھ کر لائے تھے۔

امیر خسروؒ چونکہ فارسی زبان کے زبردست شاعر ہونے کے علاوہ جید عالم بھی تھے۔ اس لئے آپ نے حضرت شیخ سعدیؒ کی مشہور کتاب ''گلستان'' کے جواب میں ''چمنستان'' تحریر کی۔ تاریخی روایت ہے کہ حضرت شیخ سعدیؒ کی ''گلستان'' ہمیشہ محبوب الٰہی کے سرہانے رکھی رہتی تھی۔ امیر خسروؒ نے یہ سوچ کر اپنی کتاب ''گلستان'' کے اوپر رکھ دی کہ جب پیر ومرشد شیخ سعدیؒ کی کتاب اُٹھائیں گے تو آپ کی نظریں ''چمنستان'' پر بھی پڑ

جائیں گی۔ اس طرح میری تحریریں حضرت کے مطالعے میں آجائیں گی۔ دوسرے روز جب امیر خسروؒ نے دیکھا تو حیران رہ گئے "گلستان" حسبِ معمول اپنی جگہ تھی اور خسروؒ کی کتاب "چمنستان" نیچے رکھی تھی۔ امیر خسروؒ نے دوبارہ ترتیب بدل کر اپنی کتاب "گلستان" کے اوپر رکھ دی۔ تیسرے روز دیکھا تو "چمنستان" پھر "گلستان" کے نیچے تھی۔ جب یہ عمل کئی دن تک مسلسل دہرایا جاتا رہا تو امیر خسروؒ ایک روز محبوب الٰہی کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوگئے اور بڑے اُداس لہجے میں کہنے لگے۔

"پیرومرشد! آپ نے میری تحریروں کو ملاحظہ نہیں فرمایا۔ میں نے سعدیؒ سے اچھی کتاب لکھی ہے۔"

امیر خسروؒ کی زبان سے یہ بات سنتے ہی محبوب الٰہی کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور آپ نے فرمایا۔

"کیا تو سعدیؒ کو صرف شاعر سمجھتا ہے۔ میرے قریب آ۔" محبوب الٰہی کا بگڑا ہوا لہجہ دیکھ کر امیر خسروؒ سہم گئے اور لرزتے ہوئے دوزانو آپ کے قریب آکر بیٹھ گئے۔ یکایک محبوب الٰہی نے امیر خسروؒ کی آنکھوں پر اپنا ہاتھ رکھا اور فرمایا۔

"غور سے دیکھ۔"

امیر خسروؒ نے دیکھا کہ..... "ایک عجیب و غریب محفل آراستہ ہے۔ مسندِ نور پر رسالتمآب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ افروز ہیں۔ صحابہ کرامؓ اگلی صفوں میں اور اس کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے اولیاءِ کرام تشریف فرما ہیں۔ ایک شخص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مورچھل (ایک قسم کا پنکھا) جھل رہا ہے۔ رسالت مآب اُس شخص سے فرماتے ہیں۔ "ہاں سعدیؒ"

سعدیؒ فوراً ہی اپنی مشہور نعت

بلغ العلیٰ بکمالہ کشف الدجیٰ بجمالہ

پڑھنا شروع کردیتے ہیں...... اسی دوران محبوب الٰہی امیر خسروؒ سے فرماتے ہیں۔

"یہ ہے شیخ مصلح الدین سعدیؒ اب ذرا اپنے پیرو مرشد نظام الدینؒ کو اس محفل میں تلاش کر۔"

خسروؒ نے جب بہت تلاش کیا تو سب سے پچھلی صفوں میں انہیں اپنے پیرومرشد نظر آئے۔ اس کے بعد محبوب الٰہی نے امیر خسروؒ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور فرمایا۔

"خسروؒ! تو نے اس محفل میں اپنے پیرومرشد کی حیثیت اور سعدیؒ کا مقام دیکھا جو شخص رسالت مآبؐ کے اتنے قریب ہو تو اُس کی کتاب کے جواب میں "چمنستان" لکھتا ہے۔"

امیر خسروؒ یہ سن کر شرمندہ ہوگئے اور پھر کبھی شیخ سعدیؒ کی کسی کتاب کا جواب لکھنے کی کوشش نہیں کی۔

اب آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ محبوب الٰہی امیر خسروؒ سے محبت کے ساتھ دوسرے بزرگوں کا کس قدر احترام کرتے تھے۔ یہ آپ کے کردار کا نمایاں پہلو تھا کہ آپ نے اپنی تعریف پسند نہیں کی۔ جو شخص اپنی ذات کو دنیا کی ہر لالچ اور نمائش سے دور رکھے اُسے کیا ضرورت ہے کہ وہ بادشاہِ وقت کے دربار میں حاضری دے۔ جس نے زندگی بھر جو کی روٹی اور نمک کے پانی کو اپنی غذا کے طور پر استعمال کیا ہو اُسے دنیا کی دولت کس طرح خرید سکتی ہے؟ یہ نقطہ ہندوستان کے بادشاہوں کی سمجھ میں نہیں آیا اس لئے وہ محبوب الٰہی کو خریدنے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر جب انہیں اپنے مقصد میں ناکامی ہوگئی تو وہ اس مردِ قلندر کی دل آزاری پر اُتر آئے۔

قطب الدین خلجی کے بعد غیاث الدین تغلق کو اُس کے مشیروں نے بہکایا کہ نظام الدین اولیاءؒ دہلی کے تخت پر قبضہ کرلیں گے۔ غیاث الدین تغلق ایک کم ظرف اور عاقبت نااندیش بادشاہ تھا۔ اس لئے جلدی گمراہ ہوگیا۔ بنگال جاتے وقت اُس نے محبوب الٰہی کو ایک انتہائی ذلت آمیز خط لکھا۔

"نظام الدین! میرے بنگال سے لوٹنے سے پہلے تیری بہتری اسی میں ہے کہ دہلی چھوڑ دے۔ ورنہ تجھے ایسی عبرتناک سزا دوں گا کہ ہندوستان کے لوگ قیامت تک یاد رکھیں گے۔"

جب یہ خط محبوب الٰہی کے سامنے پڑھا گیا تو تمام مرید جو اُس وقت حاضر تھے بادشاہ کا خط سن کر لرز اُٹھے۔ امیر خسروؒ کے چہرے کا رنگ بدل گیا مگر کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ حضرتؒ کے سامنے لب کشائی کرسکے۔ محبوب الٰہی چند لمحے تک خاموش رہے اور پھر اپنے دستِ مبارک سے بادشاہ کے خط کی پشت پر لکھا۔

"ہنوز دلی دور است۔"

(ابھی دہلی دور ہے)۔

اُس وقت بادشاہ کے خط کی پشت پر جواب لکھنا بہت بڑا جرم سمجھا جاتا تھا اور پھر جبکہ خط میں آدابِ شاہی کا بھی لحاظ نہ رکھا گیا ہو۔ یہ دوسرا بڑا جرم تھا۔ غیاث الدین تغلق کا قاصد جو خط لے کر آیا تھا ایک قلندر کا یہ انداز دیکھ کر سناٹے میں آگیا۔ مگر اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے اُٹھا اور محبوب الٰہی کا جواب لے کر چلا گیا۔

قاصد کے جاتے ہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مریدوں کا اضطراب بڑھ گیا۔ امیر خسروؒ نے غیاث الدین تغلق کی کمینگی اور تشدد پسند طبیعت کے بارے میں تفصیل سے بتایا مگر آپ صرف مسکرا کر رہ گئے۔

بنگال کی بغاوت کو کچلنے کے بعد جب غیاث الدین تغلق واپس لوٹا تو دہلی میں فتح کا جشن منانے کے لئے اُس کے بیٹے نے جمنا کے کنارے ایک محل تعمیر کرایا جس میں کئی دن تک رقص و موسیقی کے ہنگامے برپا کرنے کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ جیسے جیسے غیاث الدین تغلق دہلی کی طرف بڑھ رہا تھا حضرت امیر خسروؒ کی بے چینی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا آپ بار بار محبوب الٰہی سے فرماتے تھے۔

"پیرومرشد! غیاث الدین تغلق بہت کمینہ ہے اُس کا علاج کیجئے۔"

امیر خسروؒ کے اضطراب کے جواب میں محبوب الٰہی مسکرا کر فرمادیتے تھے۔

"خسروؒ! اتنے بے چین کیوں ہوتے ہو؟ ابھی دہلی دور ہے۔" امیر خسروؒ پیرومرشد کا جواب سن کر احتراماً خاموش ہوجاتے تھے۔ مگر اُن کے چہرے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دلی طور پر مطمئن نہیں ہیں۔ امیر خسروؒ کی یہ بےقراری اپنے پیرومرشد کی بے انتہا محبت کے سبب تھی۔ ورنہ وہ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ غیاث الدین تغلق محبوب الٰہی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

آخر جب غیاث الدین تغلق دہلی کی حدود میں داخل ہوگیا تو امیر خسروؒ یہ کہتے ہوئے محبوب الٰہی کے سامنے رو پڑے۔

"حضرت وہ ذلیل انسان سر پر آپہنچا' اس کا کوئی بندوبست کیجئے۔"

محبوب الٰہی نے پھر فرمایا۔ خسروؒ! ابھی دہلی بہت دور ہے۔" جب خسروؒ نے محبوب الٰہی کی بے نیازی دیکھی تو بے اختیار قدموں سے لپٹ گئے اور روتے ہوئے فرمایا۔

"پیرومرشد آپ اپنی خاطر نہیں تو خسروؒ کے لئے غیاث الدین تغلق کا انتظام کیجئے۔"

حضرت نظام الدین اولیاءؒ، خسروؒ کی اس بے قراری سے بہت متاثر ہوئے اور پھر عجیب عالم میں فرمایا۔

"خسروؒ! تم بہت ضدی ہو مانو گے نہیں۔ اچھا اُٹھو اور ایک تربوز لے کر آؤ۔"

"خسروؒ فوراً ہی تربوز لے کر حاضرِ خدمت ہوئے۔ محبوب الٰہی نے تربوز کو ایک خوان میں رکھ کر اُس پر سرخ کپڑا ڈالتے ہوئے فرمایا۔

"یہ خوان حضرت سید احمد بہارؒ کے پاس لے جاؤ اور انہیں بہت ادب کے ساتھ میرا سلام پیش کرو۔"

خسروؒ بہت تیزی سے اُٹھے اور سید احمد بہارؒ کے مکان کی طرف روانہ ہوگئے۔ حضرت سید احمد بہارؒ دہلی میں ایک عجیب و غریب بزرگ گزرے ہیں۔ اُن کے

بارے میں زیادہ تفصیلات تو معلوم نہیں ہوسکیں پھر بھی اُن کے بارے میں یہ حیرت انگیز روایت مشہور ہے کہ سید احمد بہارؒ صبح سے شام تک ایک کچی دیوار بناتے تھے اور پھر شام کو اُسے ڈھا دیتے تھے۔ اس دیوار کے بنانے اور گرانے میں کیا راز تھا خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ حضرت امیر خسروؒ جب سید احمد بہارؒ کے پاس پہنچے تو حضرت حسب معمول دیوار بنا رہے تھے۔ آپ کے دونوں ہاتھ گیلی مٹی میں آلودہ تھے۔ امیر خسروؒ نے محبوب الٰہی کا سلام پیش کرتے ہوئے سرخ کپڑے میں لپٹا ہوا خوان آگے بڑھا دیا۔ اس سرخ پوش خوان کو دیکھ کر سید احمد بہارؒ کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور آپ نے بڑے عجیب سے انداز میں فرمایا۔

''تمہارا پیر و مرشد بھی خوب ہے۔ لوگوں کے سروں پر تاج خود رکھتا ہے اور کفن پہنانے کے لئے مجھ سے کہتا ہے۔ خیر اب تو اُس کی بات رکھنی ہی پڑے گی۔'' یہ کہہ کر سید احمد بہارؒ نے بڑی تیزی سے تربوز اُٹھایا۔ انتہائی بے قراری کے عالم میں آسمان کی طرف دیکھا اور تربوز کو دیوار پر مارتے ہوئے بلند آواز میں فرمایا:

''بر سر تغلق'' (تغلق کے سر پر)

اُس وقت غیاث الدین تغلق ہنگامہ جشن میں شریک ہونے کے لئے جمنا کے کنارے بنائے ہوئے محل میں داخل ہو رہا تھا۔ اچانک لوگوں نے دیکھا کہ پورا محل تغلق اور ساتھیوں کے سروں پر آ گیا اور جب ملبے کو ہٹایا گیا تو بادشاہ اور اس کے ساتھیوں میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچا تھا۔ جو لوگ صورت حال سے باخبر تھے وہ غیاث الدین تغلق کے عبرتناک انجام پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے محبوب الٰہی کا یہ جملہ دہراتے رہے۔

''ہنوز دلی دور است۔''

آج اس جملے کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ معمولی تعلیم یافتہ بھی اپنی گفتگو میں محبوب الٰہی کے اس قول کو کہیں نہ کہیں استعمال کر جاتا ہے۔

جس مرد قلندر سے قدم قدم پر بے شمار کرامتیں ظاہر ہوئیں اُس کی بزرگی پر عجیب عجیب انداز میں اعتراض کئے گئے ہیں۔ دہلی کے ایک بزرگ کو اس بات پر اعتراض تھا کہ عالم ہوتے ہوئے حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے حج کیوں نہیں کیا؟ محبوب الٰہی کے کانوں تک بھی یہ اعتراض پہنچا مگر آپ نے کوئی جواب نہ دیا۔ مخالف بزرگ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی اسی خاموشی کو پروپیگنڈے کے طور پر استعمال کرتے رہے اور جب وہ خود آئندہ سال حج کے لئے تشریف لئے گئے تو انہیں یہ دیکھ کر شدید حیرت ہوئی کہ خانہ کعبہ میں ادا کی جانے والی صبح کی نماز میں محبوب الٰہی بھی شریک تھے۔ جب انہوں نے اس واقع کا ذکر مکہ معظمہ کے ایک بزرگ سے کیا تو وہ فرمانے لگے۔

''نظام الدین اولیاءؒ تو تقریباً چالیس سال سے فجر کی نماز یہیں ادا کرتے ہیں۔'' مخالف بزرگ یہ سن کر بہت دیر تک سکتے کے عالم میں بیٹھے رہے اور جب دوسری صبح کو نماز میں انہوں نے محبوب الٰہی سے ملاقات کرنا چاہی تو وہ ناکام رہے کیونکہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نماز پڑھتے ہی رخصت ہو گئے تھے۔ اُن بزرگ کا جب تک مکہ معظمہ میں قیام رہا محبوب الٰہی روزانہ فجر کی نماز خانہ کعبہ میں ادا کرتے اور فوراً ہی رخصت ہو جاتے۔ آخر مخالف بزرگ نے یہ طے کیا کہ وہ دہلی جا کر نظام الدین اولیاءؒ سے اپنی غلط فہمی کی معافی مانگ لیں گے۔

مگر جب وہ بزرگ دہلی پہنچے تو چشتیہ سلسلہ کا یہ آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ ۱۸ ربیع الثانی ۷۲۵ ہجری کو آپ نے انتقال فرمایا۔ آپ غیاث پور ہی میں اپنی خانقاہ کے اندر دفن کئے گئے۔ اب اس جگہ بستی حضرت نظام الدین اولیاءؒ آباد ہے۔ یہ درگاہ نئی دہلی اور اوکھلے کے درمیان نئی سڑک پر مقبرہ ہمایوں کے قریب ہے۔

☆☆☆

●●●



شکار

نیلم خاتون

ایک شیطان صفت شخص کا قضیہ اس کے قبضہ میں شیطانی طاقتیں تھیں

شکار

ایک نوجوان کو پیش آنے والے عجیب و غریب واقعات کی روداد وہ مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کو پہلے ہی خواب میں دیکھ لیتا تھا. پرُ اسرار کہانیوں کے شائق قارئین کے لیے بطورِ خاص اُن لمحوں کا احوال جب موت سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے.

نیلم خاتون

ایک شیطان صفت شخص کا قضیہ اس کے قبضہ میں شیطانی طاقتیں تھیں

میں اپنے آفس میں بیٹھا تھا کہ میرے موبائل فون کی بیل بج اٹھی۔ میں نے میز پر سے فون اٹھا کر اُس کی اسکرین پر نمبر دیکھا جو میری گرل فرینڈ سونیا کا تھا۔ وہ کچھ دنوں سے مجھ سے روٹھی ہوئی تھی۔ میں نے بھی غصے میں آ کر فیصلہ کرلیا تھا کہ میں اُسے نہیں مناؤں گا۔

میں نے بٹن دبا کرفون کان سے لگالیا اور ''ہیلو؟'' بولا۔

''کیسے ہو تم؟'' سونیا کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں' تم کیسی ہو؟'' میں نے جواب دینے کے بعد سوال کیا۔

''میں تو سوچ رہی تھی کہ تم فون کرو گے؟'' قدرے شکایتی لہجے میں بولی۔

''وقت نہیں ملا۔'' میں نے بے نیازی سے کہا۔

''اچھا...... آئی ایم سوری!...... میں معافی مانگتی ہوں۔ اب موڈ ٹھیک کرلو۔'' وہ بولی۔

''میرا موڈ ٹھیک ہے۔'' میں نے اب بھی اپنے لہجے میں ذرا بے نیازی رکھی۔

''اچھا...... یہ بتاؤ کہ تم اس وقت کہاں ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''آفس میں۔'' میں نے جواب دیا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ میں وہیں آ رہی ہوں۔ اوکے؟'' وہ بولی۔

''ٹھیک ہے۔ آجاؤ۔'' میں نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

تقریباً دس منٹ بعد وہ میرے سامنے تھی۔ میں نے اپنے رویے میں بے نیازی ہی رکھی۔ وہ میرے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔

''اچھا بھئی!...... لو...... اب تو میں نے ہاتھ جوڑ دیے۔ اب تو غصہ تھوک دو۔''

میں سوچنے لگا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور میرے قریب آ گئی۔ اُس نے میری گردن کے گرد بازو حمائل کردیے اس کے ساتھ ہی ہاتھ بھٹکنے لگے۔ میں تو ویسے ہی بڑی مشکل سے اُس کی دوری برداشت کیے ہوئے تھا۔ چناں میں نے اسے جھٹکے سے سمیٹ لیا۔ چند ہی لمحوں میں اُس کے سانس اکھڑنے لگے اور آنکھوں میں نشہ سا تیرنے لگا۔ یہ میرے تجربے کی بات تھی کہ وہ خاصی جذباتی تھی اور



میرے قریب آتے ہی بے خود اور پُر جوش ہو جاتی تھی۔
اچانک انٹر کام کی بیل بجی تو ہم دونوں ہی اچھل سے گئے اور پھر ہم نے ایک دوسرے کی طرف شرمندہ نگاہوں سے دیکھا کیوں کہ ہم جانتے تھے کہ یہ آفس ہے اور ہمیں یہاں ایسی حرکتوں سے اجتناب کرنا چاہیے۔
سونیا مجھ سے علیحدہ ہوتے اور اپنے سانس بحال کرتے ہوئے بولی۔ ''آئی ایم سوری!...... شاید میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گئی تھی۔''
''نہیں...... قصور میرا ہے' مجھے احتیاط کرنا چاہیے تھا۔'' میں نے شرمندہ لہجے میں کہا اور ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا میری لیڈی سیکریٹری کی آواز میرے کان میں آئی۔
''سر!...... کوئی مسٹر شرما آئے ہیں' کہتے ہیں کہ آپ نے ہی انہیں بلایا تھا۔''
مسٹر شرما' انشورنس کمپنی کا ایک ایجنٹ تھا اور اُس نے مجھے فون کر کے پریشان کر دیا تھا۔ وہ مجھ سے ملنے کا خواہش مند تھا۔ میں نے اُس سے کہا تھا کہ کسی وقت میرے آفس آ جائے۔ میں نے سوچا تھا کہ میں اُس سے مل لوں گا لیکن ابھی میرا اُس سے ملنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس لیے میں نے سیکرٹری سے کہا۔ ''تم انہیں کل آنے کا کہہ دو' کہو کہ اس وقت اہم میٹنگ ہو رہی ہے۔''
''او کے سر!'' اُس نے کہا تو میں نے ریسیور رکھ دیا۔
''کون ہے؟'' سونیا نے مجھ سے پوچھا۔ اب وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔
''ایک انشورنس ایجنٹ ہے اصرار کر رہا تھا مجھ سے ملاقات کرنے کے لیے' میں نے بلا لیا تھا لیکن اس وقت تو بالکل موڈ نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔
''اچھا...... اب یہ بتاؤ کہ کیا پروگرام ہے؟'' وہ بولی۔
''کوئی خاص کام نہیں ہے' چلو کہیں باہر چل کر چائے پیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔
''ٹھیک ہے...... چلو۔''
کچھ ہی دیر بعد ہم دونوں گاڑی میں روانہ ہو گئے اور پھر ہم ایک ریسٹورنٹ میں آ کر بیٹھ گئے۔
کچھ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد سونیا نے مجھ سے کہا۔
''آج ممی اور ڈیڈی نئی پڈنی کے گھر جا رہے ہیں۔ رات وہیں رُکیں گے۔''
میں اُس کی بات کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں آج رات اُس کے گھر پر رہوں۔ میں اپنی کئی راتیں اس طرح اُس کے گھر پر رنگین بنا چکا تھا۔ ''تو اس کا مطلب ہے کہ میں آج رات تمہارے گھر پر رہ سکتا ہوں؟''
''ہاں بالکل...... کچھ یادیں تازہ کر لیں گے۔'' وہ بے باکی سے بولی۔
''میرا تو جی چاہ رہا ہے کہ ابھی رات ہو جائے۔'' میں بے صبری سے بولا۔
''صبر کرو صبر...... تمہارے چاہنے سے رات جلدی نہیں آ سکتی۔'' وہ دھیرے سے ہنس کر بولی۔
میں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ ''تم ٹھیک کہتی ہو۔ سوائے صبر کے کوئی چارہ نہیں ہے۔''
ہم لوگ سیر و تفریح اور ڈنر کرنے کے بعد سونیا کے گھر آ گئے۔ دروازہ بند کرتے ہی وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ میں اور ہم کچھ ہی دیر میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے۔ کمرہ ہماری تیز سانسوں اور سسکاریوں سے گونجنے لگا۔ کافی دیر بعد جب رقصِ شیطانی تھما جذبات کی شوریدہ سر لہروں نے دم توڑا تو میں بھی بے دم ہو کر بستر پر ڈھے گیا۔ سونیا آپ بھی میرے پہلو میں گہری آنکھیں موندھے لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔
''وجے!...... ایک بات کہوں تم سے؟'' وہ اپنی بے حال سانسوں پر قابو پاتے ہوئے خمار آلود لہجے میں بولی۔
''ہاں کہو؟'' میں نے کہا۔
''مجھے لگتا ہے کہ تم شاید مجھ سے سچی محبت نہیں کرتے؟'' اُس نے خدشہ ظاہر کیا۔
''یہ تم نے کیسے سوچ لیا؟'' میں نے فوراً کہا۔
''اس لیے کہ تم نے ناراض ہونے کے بعد مجھ سے رابطہ

ہی نہیں کیا۔'' وہ بولی۔
''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو خود تڑپ رہا تھا لیکن بس میں نے بھی فیصلہ کر لیا تھا اس مرتبہ تم مجھے مناؤ گی۔ ویسے اگر تم اور زیادہ وفادار رہتی تو یقیناً میں خود تمہارے پاس آ جاتا۔'' میں نے کہا تو اس کے چہرے پر خوشی نظر آنے لگی۔ وہ بولی۔
''سچ کہہ رہے ہو؟''
''بالکل سچ۔'' میں نے کہا۔
''اوہ ڈارلنگ۔'' کہہ کر وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ ہم کچھ دیر پیار بھری باتیں کرنے کے بعد نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

☆

صبح میں اپنی کار میں آفس کی طرف جا رہا تھا۔ اچانک ایک دس بارہ سالہ لڑکا دائیں طرف سے بھاگتا ہوا میری کار کے سامنے سے گزرتا چلا گیا جس کی وجہ سے مجھے فوراً بریک لگانا پڑے اور گاڑی ایک جھٹکا لے کر رُک گئی لیکن میں کچھ پریشان ہو گیا۔ کار کے سامنے سے لڑکے کا بھاگ کر جانا میری پریشانی کی وجہ نہیں تھی بلکہ میں اس لیے پریشان ہوا تھا کہ بالکل یہی منظر میں گزشتہ رات سپنے میں دیکھ چکا تھا۔ بات یہاں تک بھی ہوتی تو شاید میں کسی طرح ذہن سے نکال دیتا لیکن میں یہ سوچ رہا تھا کہ میں نے جو سپنا دیکھا تھا' ابھی تو اس کا اصل اور پریشان کن پہلو میرے سامنے نہیں آیا تھا' میں نے سپنے میں اسی طرح لڑکے کو اپنی کار کے سامنے سے بھاگتے دیکھا تھا اور پھر جب میں اپنے آفس پہنچا تھا تو مجھے فون آیا تھا کہ میرے دوست آنند کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ یہ فون مجھے آنند کے پتا جی نے کیا تھا۔
میں عجیب و غریب کیفیت کا شکار تھا۔ میں تو وہمات پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ میں نئے دور کا آدمی ہوں جہاں تو وہمات کی گنجائش بہت ہی کم ہے۔ اب تو سائنس اور ٹیکنالوجی نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ انسان کے پاس تو وہمات وغیرہ پر سوچنے کے لیے وقت ہی نہیں ہے لیکن اس وقت ایک حیرت انگیز اور ناقابلِ فہم بات میرے سامنے موجود تھی جو منظر میں ابھی ذرا دیر پہلے دیکھا تھا' وہی منظر میں سپنے میں دیکھ چکا تھا اور آنے والا وقت مجھے پریشان کیے دے رہا تھا۔
''کیا واقعی آنند کا ایکسیڈنٹ ہو چکا ہے۔ یا ہونے والا ہے؟'' میں نے سوچا پھر میں نے یہ سوچتے ہوئے خود کو تسلی دی۔ ''نہیں نہیں...... میں وہم کا شکار ہوں۔ میں نے جو کچھ سپنے میں دیکھا ہے' ضروری نہیں کہ وہ سب کچھ حقیقت میں بھی اس طرح پیش آئے۔ لڑکے کا میری کار کے سامنے سے بھاگ کر جانا ایک اتفاق بھی ہو سکتا ہے' اس کا سپنے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس طرح تو اکثر لڑکے دوڑ بھاگ کرتے رہتے ہیں۔ کسی کو پتنگ لوٹنا ہوتی ہے تو کوئی کسی ساتھی کے پیچھے دوڑ رہا ہوتا ہے۔ اس طرح بچے کھیلتے کودتے اور بھاگتے دوڑتے ہی رہتے ہیں۔''
میں نے اپنے آپ کو مزید تسلیاں دیں اور اس واقعہ کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے کار چلا دی۔
میں نے جو سپنا دیکھا تھا' اس کی تمام تر جزئیات میری یادداشت میں محفوظ نہیں تھیں' بس مجھے یہ یاد تھا کہ اسی طرح ایک لڑکا میری کار کے سامنے آ گیا تھا۔ میں نے کار روک لی تھی اور پھر جب میں اپنے آفس پہنچا تھا تو آنند کے پتا جی کا فون آ گیا تھا' اس لیے اب جو بھی مناظر میری آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے' انہیں شاید میں نے سپنے میں نہیں دیکھا تھا اور اگر دیکھا تھا تو میں انہیں بھول چکا تھا۔
بالآخر میں نے اس بلڈنگ کے پارکنگ لاٹ میں اپنی کار روک لی جس میں میرا آفس تھا۔
میں نے اپنے برابر والی نشست پر پڑا بریف کیس اٹھایا اور کار سے اترنے کے بعد اسے لاک کر کے عمارت کی طرف چل پڑا۔
ذرا ہی دیر بعد لفٹ کے ذریعے میں تیسرے فلور پر

آ گیا اور پھر میں کوریڈور میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے آفس کے دروازے پر پہنچ گیا۔ میں تیزی سے آفس میں داخل ہوتا چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ میرا چپراسی شیام حسب معمول صفائی ستھرائی میں مصروف ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ تیزی سے میرے قریب آ گیا اور ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ''نمستے سرکار!''

''نمستے!'' کہتا ہوا میں اپنے روم کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ میرے آفس کے ورکرز کی تمام سیٹیں خالی پڑی تھیں' ابھی تک کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے اسٹاف کے آنے کا وقت دس بجے رکھا تھا اور میں خود نو بجے آ جاتا تھا۔

میں نے اپنے روم میں داخل ہونے کے بعد بریف کیس میز پر رکھ دیا اور خود اپنی ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گیا۔

میں رات کے پریشان کن سپنے کو کوشش کے باوجود اب تک پوری طرح اپنے ذہن سے نہیں نکال سکا تھا اس لیے میری نگاہیں میز پر موجود ٹیلی فون سیٹ کی طرف چلی گئیں جسے دیکھتے ہی میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں کیوں کہ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بس اب کسی بھی لمحے اس کی بیل بجے گی اور پھر مجھے آنند کے پتاجی کی طرف سے یہ اطلاع ملے گی کہ آنند کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔

میں نے اپنی کیفیت کو قابو پانے کی خاطر اپنے سر کو جھٹکا اور ٹیلی فون سیٹ کی طرف سے نظریں ہٹا لیں پھر میں نے سوچا کہ مجھے ایسے خیالات میں اُلجھنے کے بجائے اپنا کام شروع کرنا چاہیے۔ چناں چہ میں نے بریف کیس اپنی طرف کھسکا لیا۔ اُسے کھول کر میں نے وہ کاغذات نکال لیے جن کا میں نے مطالعہ کرنا تھا۔

غیر ارادی طور پر ایک بار پھر میری نظریں ٹیلی فون سیٹ کی طرف چلی گئیں اور میں نے سر کو جھٹکا دیتے ہوئے نظر اس جانب سے ہٹا کر اپنے ہاتھوں میں موجود کاغذات کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ میں ان کاغذات پر لکھی تحریر پڑھنے لگا لیکن میں نے محسوس کیا کہ میں اپنی پوری توجہ اس جانب نہیں دے سکتا کیوں کہ میرا ذہن اب بھی ٹیلی فون سیٹ میں ہی الجھا ہوا تھا۔

میں خود کو عبارت پڑھنے پر آمادہ کرتے ہوئے تحریر پڑھنے لگا۔ ساتھ ہی میں کوشش کر رہا تھا کہ میری پوری توجہ اس جانب مبذول ہو جائے۔

ابھی میں نے چند سطریں ہی پڑھی تھیں کہ میں اچھل پڑا کیوں کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج گئی تھی۔ میں نے خوف زدہ ہو کر ٹیلی فون کی طرف دیکھا۔ دوسری اور پھر تیسری گھنٹی بھی بج چکی تھی لیکن میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ میں ریسیور اٹھاؤں۔

مزید کئی گھنٹیاں بج گئیں۔ میں نے خود کو تسلی دیتے ہوئے سوچا کہ میں خواہ مخواہ پریشان ہو رہا ہوں۔ ضروری نہیں ہے کہ فون آنند کے پتاجی کی طرف سے ہی آیا ہو' یہ میرے کسی دوست کلائنٹ یا پھر خود آنند کا بھی ہو سکتا ہے۔

میں نے اپنے دل کو مضبوط کر کے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔ میرے دل کی دھڑکنیں بہت زیادہ تیز ہو چکی تھیں۔ میں نے ماؤتھ پیس پر کہا۔ ''ہیلو؟''

''ہیلو!...... وجے بیٹا؟'' میرے کانوں میں آواز آئی جو آنند کے پتاجی کی ہی تھی اور اُسے سن کر میں جیسے سن ہو کر رہ گیا تھا۔ ''ہیلو!...... ہیلو!......'' میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر آنند کے پتاجی نے اضطرابی کیفیت سے کہا۔

''ج...... جی...... انکل...... م...... میں بول رہا ہوں۔'' میں نے بہ مشکل اپنے الفاظ ادا کیے۔

''وہ...... تم سٹی اسپتال پہنچ جاؤ' آنند کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔'' آنند کے پتاجی کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے حواس کام کرنا چھوڑ رہے ہیں۔ میرے ہاتھوں پیروں سے جان نکل رہی ہے۔ میں نے مضبوطی سے ریسیور پکڑ لیا کیوں کہ مجھے خدشہ تھا کہ وہ میرے ہاتھ سے چھوٹ جائے گا۔

''تم...... تم سن رہے ہو ناں بیٹا؟'' آنند کے پتاجی نے

میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر کہا۔

''جی جی ہاں...... جی ہاں' میں سن رہا ہوں اور...... بس میں پہنچ رہا ہوں۔'' میں نے جیسے ہوش میں آتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے بیٹا! ذرا جلدی آ جاؤ' دراصل وہ کراہتے ہوئے تمہیں ہی پکار رہا تھا اس لیے میں نے فوراً تمہیں فون کر لیا۔ وہ پریشان اور دکھ سے بھرپور آواز میں بولے۔

''آپ فکر نہ کریں انکل' بس میں پہنچ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔''

''ٹھیک ہے بیٹا!'' انہوں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میں نے ریسیور کان سے ہٹا لیا۔ میرے حواس اس قدر شل ہو چکے تھے کہ میں ریسیور کو کریڈل تک نہ لے جا پایا بلکہ میرا ہاتھ میری گود میں ہی گر گیا۔

میرے ذہن پر وسوسوں اور خیالات کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ یہ سوالات میرے دماغ میں ابھر رہے تھے کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ آخر وہ سب کچھ کیوں پیش آ رہا ہے جو میں نے سپنے میں دیکھا تھا؟

میں نے خود کو سنبھالا۔ ریسیور کریڈل پر رکھا۔ مجھے اپنا گلا خشک محسوس ہو رہا تھا جیسے میں بہت دور سے پیدل چل کر آ رہا ہوں۔

میں نے کال بیل کا بٹن پش کر دیا ذرا ہی دیر بعد شیام کمرے میں آ گیا۔ ''شیام بابو!...... ذرا جلدی سے پانی لے آؤ۔'' میں نے کہا۔

''ابھی لایا سرکار!'' کہتے ہوئے شیام تیزی سے کمرے سے باہر چلا گیا۔

میں نے دونوں کہنیاں میز پر ٹکا دیں اور اپنا سر ہاتھوں پر ٹکا دیا۔

ذرا دیر بعد شیام پانی لے آیا۔ ''کیا بات ہے سرکار!...... آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں؟'' اس نے گلاس مجھے تھماتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... دراصل...... آنند کے پتاجی کا فون آیا تھا۔ آنند کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''اوہ...... یہ تو بہت برا ہوا سرکار!'' اس نے افسوس کا اظہار کیا۔

میں نے پانی پینے کے بعد گلاس اُسے واپس کرتے ہوئے کہا۔ ''بس میں اس کی طرف جا رہا ہوں۔''

اب میں خود کو پوری طرح مستعد محسوس کر رہا تھا۔ سپنے والی بات کا اثر اب میرے ذہن پر کم ہو چکا تھا اور آنند کے ایکسیڈنٹ اور تکلیف کے بارے میں سوچ رہا تھا اور انہی خیالات نے مجھے متحرک کر دیا تھا۔ میں جلد از جلد سٹی اسپتال پہنچ جانا چاہتا تھا۔

میں نے کاغذات بریف کیس میں واپس نہیں رکھے اور نہ ہی بریف کیس کو بند کیا' صرف گاڑی کی چابیاں میز پر سے اٹھائیں اور اٹھ کر تیزی کے ساتھ کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

کچھ ہی دیر بعد میں اپنی کار میں روانہ ہو گیا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد میں سٹی اسپتال پہنچ گیا اور پھر مجھے آنند کے پتاجی تک پہنچنے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ ان کے ساتھ ہی ان کے گھر کے دیگر افراد بھی موجود تھے۔

''انکل!...... آنند کیسا ہے اب؟'' میں نے آنند کے پتاجی سے پوچھا۔

''اُسے آپریشن کے لیے لے گئے ہیں۔'' انہوں نے شکستہ لہجے میں جواب دیا اور ان کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

''فکر نہ کریں انکل!...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' میں نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔ پھر میں نے آنند کی ماتاجی اور بہنوں کی طرف دیکھا جو مجھ سے ذرا ہی فاصلے پر کھڑی رو رہی تھیں۔ میں نے آہستہ آواز میں آنند کے پتاجی سے کہا۔ ''دیکھیں انکل!...... آنٹی اور بچیاں رو رہی ہیں۔ آپ خود کو سنبھالیں آپ ہی حوصلہ ہار بیٹھیں گے تو انہیں کون تسلی دے گا؟''

انہوں نے اثبات میں سرہلایا اور آنکھوں میں آنے والے آنسو صاف کر لیے۔

"آنند کو زیادہ چوٹیں تو نہیں آئی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"زیادہ چوٹیں آئی ہیں۔" وہ بولے۔

"بہرحال...... آپ بے فکر رہیں' وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے تسلی دی۔ "میں ذرا آنٹی سے بات کرتا ہوں۔"

میں آنند کی ماتاجی کے پاس آ گیا۔ پھر انہیں اور آنند کی بہنوں کو تسلیاں دینے لگا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ڈاکٹروں کی طرف سے ہمیں اطلاع دی گئی کہ اب آنند کی حالت خطرے سے باہر ہے۔

"کیا ہم اس سے مل سکتے ہیں ڈاکٹر صاحب؟" آنند کے پتاجی نے ایک ڈاکٹر سے پوچھا۔

"فی الحال وہ ہوش میں نہیں ہے' اُسے ایک گھنٹے بعد ہوش آ جائے گا۔ آپ میں سے کوئی ایک جا کر اُسے دیکھ سکتا ہے۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

آنند کے پتاجی نے اپنی پتنی اور بچیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "بس اب بے فکر ہو کر جاؤ۔ اب کوئی نہیں روئے گا۔ میں ابھی دیکھ کر آتا ہوں۔"

"آپ میرے ساتھ آ جائیں۔" ایک نرس نے آنند کے پتاجی سے کہا۔ وہ ڈاکٹروں کے ساتھ ہی آئی تھی۔ ڈاکٹر تو اب جا چکے تھے لیکن وہ وہیں موجود تھی۔ آنند کے پتاجی اُس کے ساتھ چلے گئے۔

میں نے آنند کی ماتاجی اور بہنوں کو مزید تسلیاں دینا شروع کر دیں۔

کچھ دیر بعد آنند کے پتاجی واپس آ گئے۔ ان کے چہرے پر اطمینان تھا اور انہوں نے ہم سب کو اطمینان دلایا۔

ایک گھنٹے بعد آنند کو ہوش آ گیا۔ ڈاکٹر کی اجازت سے ہم سب اُس سے ملے وہ اس وقت بات چیت کرنے کے قابل نہیں تھا۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ وہ شام تک بولنے کے قابل ہو سکے گا۔

ڈاکٹر کی طرف سے اجازت نہیں تھی کہ کوئی بھی زیادہ دیر آنند کے پاس رُکے اس لیے ہم اُس کے روم سے باہر آ گئے۔ اب آنند کے ماتا پتا اور بہنوں کا چہروں پر کافی اطمینان نظر آ رہا تھا۔ میں بھی آنند کی طرف سے مطمئن تھا لیکن اب ایک بار پھر میرا ذہن رات والے سپنے کی طرف چلا گیا تھا اور اس حوالے سے پریشان کن خیالات مسلسل میرے ذہن میں سر ابھار رہے تھے۔ میں نے اکثر قصے کہانیوں میں تو یہ باتیں سنی تھیں کہ کسی کو آنے والے واقعات کے بارے میں پہلے سے علم ہو جاتا تھا لیکن میں اپنی تیس سالہ زندگی میں کبھی ایسے کسی انسان سے نہیں ملا تھا جو اس طرح کے حالات سے دوچار ہوا ہو۔

میں چونکہ حقیقت پسند انسان تھا اس لیے اس [illegible] میں کسی عامل وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا تھا لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر میں کس سے اس سلسلے میں رابطہ کروں؟ میرے ذہن میں سائیکاٹرسٹ کا خیال بھی آیا تھا لیکن میں سوچ رہا تھا کہ آخر سائیکاٹرسٹ اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہے؟ یہ کوئی نفسیاتی مسئلہ تو نہیں ہے تو مستقبل بینی ہے یہ اور پھر کافی دیر کی سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ میں اس واقعے کو بھول جاؤں گا تاکہ کسی بھی قسم کی پریشانی اور پیچیدگی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ میں نے ذہن بٹانے کے لیے سونیا سے فون پر رابطہ کیا لیکن پتہ چلا کہ وہ اپنے ممی ڈیڈی کے ساتھ کسی ایمرجنسی کی وجہ سے چھ ماہ کے لیے اپنے رشتہ داروں کے گھر فیض آباد جا رہی ہے۔

☆

دو روز گزر گئے اور آنند ٹھیک ہو گیا۔ اُسے اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا اور ہم لوگ اسے گھر لے آئے۔

میں ایک بار پھر اپنے معمولات زندگی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

شام کے پانچ بج رہے تھے۔ میں نے اپنا سامان سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیا اور پھر ذرا ہی دیر بعد میں دفتر سے نکل کر اپنی کار میں جم کی طرف روانہ ہو گیا جہاں میں ایکسر سائز کیا کرتا تھا۔ ایکسر سائز کے بعد میرا ارادہ تھا کہ میں آنند کے گھر جاؤں گا اور اُس کے ساتھ کچھ وقت گزاروں گا۔ آج اُسے اسپتال سے آئے ہوئے پانچ دن ہو گئے تھے اور اب اس کی حالت کافی بہتر تھی۔ میں روزانہ آفس سے پہلے جم جاتا اور اس کے بعد آنند کے پاس جاتا تھا اور اس کے ساتھ کچھ وقت گزارتا تھا۔

میں نے جم پہنچنے کے بعد ایکسر سائز شروع کر دی۔ آج میں نے اپنا پارٹنر ایمیفک کو بنایا تھا۔ اُس سے میری ملاقات آج سے چھ ماہ پہلے یہیں جم میں ہوئی تھی۔ اُس وقت یہاں آنند اور میں نے ایک ساتھ داخلہ لیا تھا۔ جب میں نہیں آتا تھا تو اکثر ایمیفک ہی آنند کا پارٹنر بنتا تھا اور جب آنند نہیں آتا تھا تو تب میں بھی اُسے پارٹنر بنا لیتا تھا۔ وہ کافی سینئر تھا اس لیے اُسے پارٹنر کی ضرورت کم ہی پڑتی تھی اس لیے جب کسی کو بھی پارٹنر کی ضرورت ہوتی تو وہ ایمیفک سے ہیلپ لے لیتا تھا۔

میں نے حسب معمول تقریباً آدھا گھنٹہ ایکسر سائز کی اور پھر ذراستانے کے لیے ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ اُسی وقت میری نظر سامنے ایکسر سائز کرتے ہوئے جیکسن پر پڑی۔ وہ بھی ہمارے جم کا سینئر رکن تھا اور پھر اچانک مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں جیکسن کو بالکل اسی انداز میں پہلے بھی ایکسر سائز کرتے ہوئے دیکھ چکا ہوں اور اُس کا ہاتھوں سے ویٹ چھوٹ کر گر پڑا تھا۔

ابھی میں اس بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اُس کے ہاتھوں سے ویٹ چھوٹ کر گر پڑا۔ یہ ایک معمولی واقعہ تھا اور ایسا ہوتا ہی رہتا تھا اسی لیے کسی کے لیے بھی اس حوالے سے پریشان ہونے والی کوئی بات نہیں تھی جب کہ میں بری طرح پریشان ہو چکا تھا۔ میری پریشانی کی وجہ یہ واقعہ نہیں بلکہ وہ سپنا تھا جو مجھے یاد آ گیا تھا اور میں نے اُسے گزشتہ رات ہی دیکھا تھا۔ یہ دوسرا سپنا تھا جو سچ ثابت ہو گیا تھا۔ اس سے قبل میں نے آنند کے ایکسیڈنٹ والا سپنا دیکھا تھا جو درست ثابت ہوا تھا۔

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ میں اُلجھ کر رہ گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آخر میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ مجھ میں ایسی کون سی تبدیلی آ گئی ہے کہ میں جو کچھ سپنوں میں دیکھ رہا تھا وہ حقیقت میں بھی میرے سامنے آتا جا رہا تھا؟

پہلے والے واقعے پر تو میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں اُسے بھول جاؤں گا اور اس حوالے سے نہ تو کسی عامل سے ملوں گا اور نہ ہی کسی سائیکاٹرسٹ سے لیکن اب میں سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ مجھے اس حوالے سے کسی نہ کسی سے ضرور رابطہ کرنا چاہیے۔ حقیقت پسند انسان ہونے کی وجہ سے میں نے پہلے کسی سائیکاٹرسٹ سے ملنے کا فیصلہ کیا۔

آنند کے پاس کچھ وقت گزارنے کے بعد میں ایک سائیکاٹرسٹ ڈاکٹر اجے شرما کے پاس اس کے کلینک میں پہنچ گیا۔ میں نے اُسے اپنے سپنوں اور ان کے حقیقت کا روپ دھار لینے کے بارے میں بتانے کے بعد کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! کیا آپ کے خیال میں یہ کوئی ذہنی مسئلہ ہے؟"

"ہاں بالکل!" اُس نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "اور یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے آپ ذرا مستقل مزاجی کے ساتھ ہفتہ دس دن علاج کروالیں' آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"اوہ!" میں نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا۔ "میں تو سمجھ رہا تھا کہ شاید اس کا علاج آپ کے پاس نہیں ہو گا۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "ہمارے پاس اس طرح کے تمام امراض کا علاج ہوتا ہے۔ یہ تو بڑی عام سی بیماری ہے' میرے پاس تو ایسے ایسے مریض آتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ لائے جاتے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ساتھ کوئی ماورائی معاملہ ہے۔ مثلاً ایک مریض میرے پاس لایا گیا' اُس نے مجھ سے بڑی بے رخی سے بات کی۔ اُس کا

خیال تھا کہ اُس کے مسئلے کا حل میرے پاس ہو ہی نہیں سکتا کیوں کہ اُسے اپنے سامنے بھوت وغیرہ نظر آتے تھے' اُس کا کہنا تھا کہ وہ ان سے بات چیت کرتا ہے' اُن کے ساتھ وقت گزرتا ہے اور جب بھوت کسی بات پر ناراض ہو کر یا کسی اور وجہ سے اُس کا گلا دبانے لگتے ہیں تو وہ چیخنے چلانے لگتا ہے اور بھوت بھاگ جاتے ہیں لیکن میں نے اُس کا علاج کیا اور جب وہ مکمل طور پر ٹھیک ہوگیا تو میں نے اُسے بتایا کہ اُس کے دماغ میں ہلکا سا خلل واقع ہوگیا تھا اور وہ اپنے خیالات کو حقیقت سمجھنے لگتا تھا اور ایسے میں وہ اپنے خیالی بھوتوں کو حقیقی بھوت سمجھتا تھا۔ اسی طرح ایک اور مریض میرے پاس لایا گیا' اُس کا کہنا تھا کہ رات میں سوتے ہوئے کوئی اُسے اٹھا دیتا ہے اور اُس کے کان میں سرگوشیاں کرتا ہے۔ وہ بھی علاج سے ٹھیک ہوگیا' اُس کو بھی ایک دماغی بیماری لاحق ہوگئی تھی ویسے تم ایک سمجھدار اور نڈر آدمی ہو کہ دہشت زدہ نہیں ہو ورنہ اکثر لوگ ایسی حالت میں سوچ سوچ کر خود کو ہلکان اور خوف زدہ کر لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی بتا دوں کہ تمہارا کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے' تم بس ہفتہ دس دن میں ٹھیک ہو جاؤ گے۔ بس شرط یہ ہے کہ مستقل مزاجی کے ساتھ علاج کروائیں اور میں جو ہدایات دوں ان پر پوری طرح عمل کرنا۔"

"میں ایسا ہی کروں گا ڈاکٹر صاحب!" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے' میں تمہیں دوائیں لکھ دیتا ہوں اور ساتھ ہی خصوصی ہدایات بھی دے دیتا ہوں۔" اس نے کہا اور اپنے سامنے موجود رائٹنگ پیڈ پر کچھ لکھنے لگا۔ پھر اُس نے اُس میں' اوپر والا کاغذ پھاڑ کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔ یہ دوائیں تو تم بازار سے لے لینا اور اب سنو کہ تمہیں کیا کچھ کرنا ہے۔" اس نے مجھے کچھ ہدایات دے دیں کہ مجھے کس طرح سونا ہے' کتنی دیر نیند لینی ہے۔ خوراک میں کن چیزوں سے پرہیز کرنا ہے اور کتنا آرام کرنا ہے وغیرہ وغیرہ۔

☆

ہفتہ' دس دن' بیس دن' ایک مہینہ' دو مہینے اور پھر تین مہینے گزر گئے۔ میں نہایت توجہ اور مستقل مزاجی کے ساتھ ڈاکٹر اے جے شرما سے علاج کرواتا رہا لیکن اس دوران میں نے ایسے کئی سپنے دیکھے جو دوسرے روز حقیقت کا روپ دھار گئے۔ میں ان سپنوں کے بارے میں ڈاکٹر اے جے کو بتاتا رہا لیکن وہ مجھے مسلسل کہتا رہا کہ یہ کیفیت جلدی ختم ہو جائے گی لیکن اب میں اس کی طرف سے مایوس ہونے لگا تھا کیوں کہ پہلے اس نے ہفتہ دس دن علاج کے لیے کہا تھا جو بڑھتے بڑھتے تین ماہ پر محیط ہوگیا تھا۔

ایک روز میں ایک میگزین میں ایک عامل دیواجی کی سوانح حیات پڑھ رہا تھا۔ اُس نے جہاں اور بہت سی باتوں کا ذکر کیا تھا' وہیں یہ بھی کہا تھا کہ وہ ایک عمل کے ذریعے مستقبل میں ہونے والے واقعات دیکھ سکتا تھا۔

اس بات نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا میرے مسئلے کا حل بھی کسی عامل کے پاس ہی ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی میں نے اپنی زندگی میں کئی بار لوگوں سے یہ سنا تھا کہ عامل اپنے کسی خاص عمل سے مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں جان لیتے ہیں لیکن میں نے یہ بھی سنا تھا کہ یہ سب قیاس ہوتا ہے۔ اب عامل دیواجی کا دعویٰ پڑھ کر میں سوچنے لگا تھا کہ کہیں واقعی ایسا ہوتا ہو گا جس کے ذریعے یہ لوگ مستقبل کے بارے میں جان سکتے ہیں۔

آنند میرا گہرا دوست تھا لیکن میں نے اُسے اب تک اُسے سپنوں والے معاملے کے بارے میں نہیں بتایا تھا' اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اپنے ساتھ ساتھ اُسے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر میں اُسے اپنے مسئلے کے بارے میں بتا دوں گا تو وہ مجھے سب سے پہلے یہی مشورہ دے گا کہ میں کسی عامل سے ملوں' دراصل وہ ماورائی باتوں پر بڑا یقین رکھتا تھا۔

اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور آنند اندر آ گیا۔ اُس نے میرے سامنے کرسی گھسیٹ کر اُس پر بیٹھتے ہوئے مجھ

سے کہا۔ ''کیا پڑھ رہے ہو بھئی؟''

''یار!..... وہی اسپورٹس کی سرگرمیاں دیکھ رہا تھا۔'' میں نے جواب دیا اور میگزین بند کر دیا۔

''لاؤ دکھاؤ' میں بھی تو دیکھوں۔'' اُس نے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے میگزین اُس کے حوالے کر دیا۔ پھر میں اپنے کام میں لگ گیا اور وہ میگزین کی ورق گردانی کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد اُس نے مجھ سے کہا۔ ''بھئی!..... تم نے عامل دیوانجی کا مضمون پڑھا؟''

میں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور سرسری لہجے میں بولا۔ ''ابھی نظر تو ڈالی تھی میں نے۔''

''بھئی!..... یہ ذرا غور سے پڑھنا' بڑا دلچسپ مضمون ہے۔'' وہ بولا۔

''ٹھیک ہے' میں دیکھ لوں گا۔'' میں نے کہا۔

''یار!..... میرا تو دل چاہتا ہے کہ میں اس سے ملاقات کروں۔'' اس نے بات جاری رکھی۔

''وہ کیوں؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''اس لیے کہ یہ مجھے کوئی بہت بڑا عامل لگتا ہے۔'' وہ بولا۔

''لیکن افسوس کہ تم اس سے نہیں مل سکتے کیوں کہ وہ لکھنؤ میں ہے اور تم یہاں ممبئی میں بیٹھے ہو۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں یار!'' اس نے افسردگی سے کہا۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو اور یہاں مصروفیات اتنی ہیں کہ میں انہیں چھوڑ کر جا بھی نہیں سکتا۔''

''چلو تو پھر انتظار کرو' شاید وہ یہاں بھی آ جائے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کبھی یہاں آ جائے اور ہمیں اس کی آمد کے بارے میں پتہ بھی چل جائے تو میں ضرور اس سے ملوں گا۔'' وہ بولا۔

میری اور آنند کی بات تو یہیں ختم ہو گئی لیکن میرا ذہن اب بھی عاملوں کے بارے میں سوچ رہا تھا اور میں کچھ کچھ ان کی طرف مائل ہو رہا تھا۔ اس کی وجہ صرف ڈاکٹر اسیجے شرما کی طرف سے مایوسی تھی۔ اگر وہ اب تک میرا علاج کر چکا ہوتا تو میں یقیناً عاملوں کے بارے میں نہیں سوچتا۔

اس طرح پندرہ دن اور گزر گئے لیکن ڈاکٹر کے علاج سے مجھے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔

ایک روز میں شاپنگ کرنے کی غرض سے بازار پہنچ گیا۔ میں نے گاڑی ایک جگہ پارک کر دی اور شاپنگ سینٹر کی طرف چل پڑا۔ اچانک فٹ پاتھ پر سامنے سے آتا ہوا ایک سادھو میرے سامنے آ کر رک گیا۔ اُس نے اپنا ہاتھ میری طرف پھیلا دیا۔ میں نے جیب سے کچھ سکے نکالے اور اُس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

''بہت چنے دیکھ رہے ہو آج کل؟'' اُس نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو میں چونک گیا اور حیرت سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر میں نے اس سے کہا۔

''یہ..... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''کیا میں نے غلط کہا؟'' وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے ایک بار پھر معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''لیکن..... یہ سب تم کیسے جانتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''اس لیے کہ یہ سب میری ہی وجہ سے ہو رہا ہے۔'' اُس نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے بھوئیں سکیڑ کر اُس کی طرف دیکھا۔

''ہاہاہا۔'' اُس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''مطلب یہ ہے کہ میں نے تمہیں پسند کیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ رہو۔''

''تمہارے ساتھ؟'' میں نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟..... آخر میں کیوں رہوں

تمہارے ساتھ؟''

''اس لیے کہ میں نے تمہیں پسند کیا ہے۔'' وہ پھر آنکھیں پھیلاتے ہوئے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''تم..... تم صاف صاف بات کرو' آخر تم کیا چاہتے ہو کون ہو تم؟'' میں نے اُلجھن کے ساتھ کہا۔

''تم جو علاج کروا رہے ہو' اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیوں کہ..... معاملہ کچھ اور ہے ناں.....'' وہ بولا۔

''آخر تم ہو کون؟'' میں نے بے چینی سے کہا۔

''میں آج رات تم سے ملوں گا اور ہم بیٹھ کر آرام سے بات چیت کریں گے۔ میرے بارے میں کسی کو نہ بتانا کیوں کہ جس کسی کو بھی تم بتاؤ گے' میں اُسے ختم کر ڈالوں گا۔'' اُس کا لہجہ سفاک ہو گیا تھا۔

''یہ..... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' میں نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

''ہاں..... اس نے اثبات میں سر ہلایا۔'' میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ بس اس بات کا خیال رکھنا۔ تم سے رات میں ملوں گا۔'' وہ بولا اور پھر اس نے ایک جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اوم' اوم' اوم.....'' اس کے بعد وہ نہایت ہلکی آواز میں کچھ بولنے لگا اور اس کے الفاظ مجھے سمجھ میں نہیں آئے۔ میں اُسے بت بنا دیکھتا رہا' وہ کچھ دور جانے کے بعد لوگوں کی بھیڑ میں غائب ہو گیا۔

اچانک مجھے کسی کا دھکا لگا اور مجھے جیسے ہوش آ گیا۔ دھکا عقب سے لگا تھا اور دھکا دینے والا شخص اب میرے دائیں طرف آ گیا تھا۔ وہ ایک موٹا آدمی تھا۔ جو مجھے ناگوار نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھ سے بولا۔ ''بھئی!..... آپ فٹ پاتھ کے درمیان میں کھڑے ہو گئے ہیں' کہیں ایک طرف ہو کر کھڑے ہو جائیں۔''

میں خجالت کے ساتھ بولا۔ ''اوہ..... شرمان جی!..... معاف کیجیے گا۔''

میرے معذرت خواہانہ الفاظ سن کر اس کے چہرے کے ناگوار تاثرات غائب ہو گئے اور وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ میں نے بھی قدم بڑھا دیئے۔ میں سادھو کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ مجھے اُلجھن میں ڈال گیا تھا۔ جب وہ مجھے ملا تھا اور اس نے میرے سامنے ہاتھ پھیلایا تھا تو میں یہی سمجھا تھا کہ وہ ان عام سادھوؤں میں سے ہے جو اکثر سڑکوں پر گھومتے رہتے ہیں اور لوگوں سے بھیک مانگتے رہتے ہیں۔ لیکن جاتے ہوئے وہ اپنا خوشاک اور پریشان کن تاثر مجھ پر چھوڑ گیا تھا۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ وہ کون تھا اور رات میں ملاقات کر کے مجھ سے کیا کہنا چاہتا ہے۔ اس نے مجھے دھمکی بھی دی تھی کہ میں اس کے بارے میں کسی کو نہ بتاؤں ورنہ وہ اس شخص کو مار ڈالے گا۔

شاپنگ کا موڈ تو اب ختم ہو چکا تھا اس لیے میں واپس پلٹا اور ذرا ہی دیر بعد میں اپنی کار میں واپس روانہ ہو گیا۔

اس وقت سہ پہر کے چار بج رہے تھے۔ میں واپس آ کر اپنے آفس میں بیٹھ گیا۔ میں جنرل آرڈر سپلائی کے کام کرتا تھا اور میرا کام بہت اچھا چل رہا تھا۔ آنند میرے ہی آفس میں کام کرتا تھا۔ میں نے اُسے اکاؤنٹ کی ذمہ داریاں دے رکھی تھیں۔ اس وقت وہ ایک فائل لے کر میرے پاس آ گیا اور بولا۔ ''یار!..... دیکھنا' اس فائل میں مجھے کچھ حساب کتاب غلط لگ رہا ہے' تم اسے دیکھ لو شاید تم جان سکو کہ کیا گڑبڑ ہے۔'' اس نے فائل میرے سامنے رکھ دی۔

''یار!..... اس کو بعد میں دیکھ لیں گے۔'' میں نے کہا۔

اُس نے ذرا غور سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''کیا بات ہے تم کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو؟..... خیریت تو ہے؟''

''میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا ہوا ہے؟'' اس نے فوراً میرا ماتھا چھوا۔ ''اوہ..... تمہیں تو ٹمپریچر ہے۔''

میں خود بھی محسوس کر رہا تھا کہ اس سادھو کے جانے کے بعد میرے ذہن پر جو دباؤ آیا تھا اس کی وجہ سے مجھے حرارت ہو رہی تھی۔ "ہاں یار!...... میں کچھ بخار محسوس کر رہا ہوں۔" میں نے آنند سے کہا۔

"یار!...... تو پھر پہلے ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔" وہ بولا۔

"نہیں...... اس کی ضرورت نہیں ہے' شاید میں نے ایک واقعے کو کچھ زیادہ ہی محسوس کیا ہے۔" میں نے جھوٹ بولنے کا فیصلہ کیا۔

"کیسا واقعہ؟" اس نے بلاتوقف کہا۔

"ابھی میں شاپنگ کے لیے گیا تھا' وہاں ایک آدمی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا' اس کی حالت بہت بری تھی' بس اُسے دیکھ کر میں ڈپریس ہو گیا ہوں۔"

"کیا وہ مر گیا تھا؟" آنند نے پوچھا۔

"مرا تو نہیں تھا لیکن اب شاید مر چکا ہو کیوں کہ اُسے کچھ لوگ اسپتال لے گئے تھے' اس کی حالت چوں کہ بہت بری تھی اس لیے میرا خیال ہے کہ وہ اب تک مر چکا ہوگا' اس نے اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ دیا ہوگا۔" میں نے کہا۔

اُس نے چند لمحے سوچا اور پھر مجھے دونوں شانے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولا۔ "اچھا چلو!...... تم فی الحال کوئی کام مت کرو بلکہ ابھی کچھ آرام کرلو...... کچھ دیر میں تمہاری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔"

اُس نے مجھے وہیں موجود صوفے پر لٹا دیا۔ پھر اس نے ایک کونے میں رکھے چھوٹے سے فریج میں سے پانی کی بوتل نکال لی۔ اس نے بوتل میں سے پانی ایک گلاس میں انڈیلا اور میرے پاس آ گیا۔ "لو...... یہ پانی پی لو...... ابھی سنبھل جائے گی تمہاری طبیعت!"

میں نے تھوڑا سا پانی پی لیا۔

میں نے تھوڑا سا پانی پی لیا۔

کچھ دیر کے آرام کے بعد مجھے تھوڑا سا سکون تو مل گیا لیکن بہر حال پریشانی اب بھی اپنی جگہ جوں کی توں موجود تھی۔ سادھو کا خیال رہ رہ کر میرے ذہن کو کچوکے لگا رہا تھا۔ اُس نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔ میں اپنی حالت کسی سے بیان بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے کسی کو اس کے بارے میں بتایا تو وہ اُسے مار ڈالے گا۔ آنند میرا سب سے اچھا دوست تھا۔ میں اُس سے ہی اپنی دل کی باتیں ڈسکس کیا کرتا تھا لیکن اس وقت میں بہت مجبور تھا۔ وہ میرے قریب ہی موجود تھا لیکن میں اُس سے اپنے دل کا حال بیان نہیں کر سکتا تھا۔

"اب کیسا محسوس کر رہے ہو تم؟" آنند نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اب میں بہتر ہوں۔" میں نے جواب دیا اور اٹھ کر بیٹھنے لگا۔ اُس نے میرے شانے پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

"فی الحال تم لیٹے رہو' ابھی تھوڑا آرام کرو۔"

"نہیں...... اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے کہا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"بس اب تم اس واقعے کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کرو۔" اس نے مشورہ دیا۔ "کیا خیال ہے' ہم لوگ کچھ دیر کے لیے کہیں باہر نہ چلیں؟" وہ جواب طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی بات مجھے کچھ مناسب محسوس ہوئی۔ میں نے سوچا کہ اس طرح شاید میرا ذہن کچھ پرسکون ہو جائے' میں نے اُس سے کہا۔

"ٹھیک ہے' کہیں چلتے ہیں۔"

"آؤ!...... شیلا سے مل کر آتے ہیں۔" وہ بولا۔ شیلا ہماری مشترکہ دوست تھی۔ حسین' اور نوجوان لڑکی تھی' اپنا ایک فلاحی ادارہ چلا رہی تھی۔ بہت ہنس مکھ تھی' بات بات پر چٹکلے چھوڑتی رہتی تھی۔ میں نے سوچا کہ شاید اُس سے مل کر میری ذہنی کیفیت کچھ بہتر ہو جائے۔ میں نے آنند سے کہا۔

"ٹھیک ہے' جلد اسی کی طرف چلتے ہیں۔"

تقریباً بیس منٹ بعد ہم دونوں شیلا کے سامنے موجود تھے۔

"اوہ...... تم لوگ!...... شکر ہے کہ تم لوگوں کی شکلیں تو نظر آئیں۔ کہاں ہو تم لوگ!" اس نے حسبِ عادت خوش گوار لہجے میں کہا۔

"ہم لوگ تو یہیں ہیں۔ تم تو دوسروں کی اتنی زیادہ فلاح بہبود کے کام کرنے لگی ہو کہ تمہیں اپنے دوست یاد ہی نہیں رہتے۔" آنند نے الٹا اس سے شکایت کر دی۔

"تم لوگ اس لیے یاد نہیں رہتے کیوں کہ تم لوگوں کو فلاح و بہبود کی ضرورت جو نہیں ہے۔" وہ ہنس کر بولی۔

"تو کیا ہم لوگ اپنی حالت ایسی بنالیں کہ تم ہمیں مستحق سمجھتے ہوئے ہماری طرف توجہ دے سکو؟" آنند بھی فوراً بولا۔

"ارے نہیں نہیں...... بھگوان نہ کرے کہ تم لوگوں پر کوئی ایسا وقت آئے۔" شیلا بولی۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ تم لوگ کیا پیو گے؟"

"چائے منگوا لو۔" آنند بولا۔

"کیا بات ہے مسٹر!...... تم نے کیا آج چپ کا برت رکھا ہے؟" شیلا نے شوخ نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔" آنند نے اُسے بتایا۔

"اوہ۔" وہ سنجیدہ ہو گئی۔ "کیوں کیا ہوا؟"

"یہ شاپنگ کے لیے گیا تھا' سڑک پر کسی آدمی کا ایکسیڈنٹ دیکھ لیا اور اُس واقعے کو کچھ زیادہ ہی فیل کر لیا' اسے ٹمپریچر ہو گیا تھا۔" اس نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اب تو ٹھیک ہے؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"ہاں' اب میں بہتر محسوس کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"ایکسیڈنٹ خطرناک تھا؟" شیلا نے میری طرف دیکھا۔

"ہاں...... بہت سیریس تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"اچھا چلو چھوڑو...... اس بات کو ذہن سے نکالو۔ روزانہ ہی نہ جانے کتنے ایسے ایکسیڈنٹ ہوتے رہتے ہیں' بس بھول جاؤ اس واقعے کو...... اچھا' میں پہلے چائے منگواتی ہوں۔" اس نے کال بیل کا بٹن پش کر دیا۔

ذرا دیر بعد بوڑھا چپراسی اندر آ گیا۔ شیلا نے اُسے چائے لانے کا کہا۔

"یار!...... آج میں نے ایک رسالے میں بڑا مزاحیہ اور دلچسپ مضمون پڑھا ہے۔" وہ اپنی میز کی دراز کھولنے لگی۔ پھر اس نے اس میں سے ایک میگزین نکال لیا اور اُسے کھولنے کے بعد ایک مضمون کی عبارت پڑھنے لگی۔ وہ واقعی دلچسپ اور مزاحیہ مضمون تھا لیکن اس وقت مجھ پر ایسی کوئی بات اثر انداز نہیں ہو رہی تھی۔ میرا ذہن اب بھی سادھو کے اثر میں تھا لیکن اب بہر حال میری حالت کچھ مزید بہتر ہو گئی تھی۔ اس لیے میں شیلا اور آنند پر یوں ظاہر کرنے لگا جیسے میں اب ٹھیک ہوں۔

کچھ دیر میں چائے آ گئی۔

چائے پینے کے بعد میں نے شیلا سے کہا۔ "اچھا اب ہم لوگ چلتے ہیں۔ اب میں بالکل ٹھیک محسوس کر رہا ہوں۔ آفس میں کچھ کام ہے' اُسے نمٹانا ہے۔"

"اگر ضروری کام نہ ہو تو لنچ میں کر لینا' فی الحال بیٹھو کچھ گپ شپ کرتے ہیں؟" وہ بولی۔

"نہیں...... کام ضروری ہے۔" میں نے کہا۔

"اوکے!...... ویسے اب تم بالکل ٹھیک ہو ناں؟" اُس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"ہاں' اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ میں اس لیے مسکرا دیا تھا تاکہ اُسے اور آنند کو یقین آ جائے کہ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔

میں اور آنند واپس اپنے آفس آ گئے۔ میں نے اُس

کے ساتھ اُس فائل پر بھی کچھ ڈسکس کی جس میں وہ گڑبڑ بتا رہا تھا۔ پھر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور میں ایک سگریٹ سلگا کر ٹہلنے لگا۔ میری سوچوں کا مرکز اب بھی سادھو ہی تھا۔

ویسے تو عموماً میں اور آنند آفس' چھٹی کے بعد ایکسر سائز کرنے کے لیے جاتے تھے' اس کے بعد کسی ریسٹورنٹ یا تفریحی جگہ پر کچھ وقت صرف کیا کرتے تھے لیکن آج میرا کہیں جانے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا' مجھے یہ سوچ سوچ کر بے چینی ہوتی جا رہی تھی کہ رات قریب آتی جا رہی ہے اور رات میں مجھے سادھو سے ملنا ہے۔ میں یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں ملے گا اور مجھ سے کیا بات چیت کرے گا۔

''آج ہم کہیں نہیں جا سکیں گے آنند!...... میں چاہتا ہوں کہ گھر جا کر ریسٹ کروں۔'' چھٹی کے وقت میں نے آنند سے کہا۔

''تو میں بھی چلتا ہوں ناں تمہارے ساتھ۔'' وہ بولا۔

''نہیں...... میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں جا کر سو جاؤں' ایسے میں تم بور ہو جاؤ گے۔'' میں نے کہا۔

اُس نے ذرا سوچ کر کہا۔ ''ٹھیک ہے' تم گھر جاؤ اور آرام کرو' اگر میری ضرورت پڑے تو مجھے فون کر کے بلا لینا۔''

''ہاں میں بلا لوں گا۔'' میں نے کہا۔

میں گھر آ گیا۔ گھر والوں سے کچھ تھوڑی بہت بات چیت کرنے کے بعد میں اپنے کمرے میں آ کر بیڈ پر لیٹ گیا۔ شام ہو چکی تھی اور ذرا ہی دیر بعد رات آنے والی تھی۔ اس وقت میری بے چینی مزید بڑھ چکی تھی اور میں جانتا تھا کہ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا' میری بے چینی بڑھتی ہی چلی جائے گی۔

بے چینی مجھے ذرا بھی سکون نہیں لینے دے رہی تھی اس لیے میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

بالآخر رات نے ہر طرف اپنا بسیرا کر لیا۔ میں بہت زیادہ بے چین تھا۔ ہر لمحہ یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ سادھو آ جائے گا اور اس کے بعد جانے کیا ہوگا۔

اچانک میرے موبائل فون کی بیل بج اٹھی۔ میں نے اُسے میز پر سے اٹھایا اور اسکرین پر نمبر دیکھا جو آنند کا تھا۔ میں نے بٹن پش کر کے اُسے کان سے لگایا اور بولا۔

''ہیلو؟''

''ہاں وجے آنند بول رہا ہوں۔ کیسی ہے طبیعت؟'' آنند کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''اب میں کافی ٹھیک ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں سوچ رہا تھا کہ فون نہ کروں' ایسا نہ ہو کہ تم سو چکے ہو لیکن بڑی بے چینی ہو رہی تھی اس لیے فون کر لیا' سو تو نہیں رہے تھے تم؟'' وہ بولا۔

''نہیں...... ابھی تو نہیں سویا تھا' لیٹا ہوا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے' تم بے فکر ہو کر سو جاؤ۔''

''اوکے اوکے اور تم بھی فکر نہ کرو۔'' میں نے اُسے تسلی دی۔

''ہاں...... ہاں' تم سے بات ہو گئی ہے۔ اب میں بے فکر ہوں۔'' وہ مطمئن لہجے میں بولا۔ ''اوکے...... ٹھیک ہے تم آرام کرو۔'' اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے موبائل فون واپس میز پر رکھ دیا۔

ذرا ہی دیر بعد ایک بار پھر اس فون کی بیل بج اٹھی۔ میں نے اُسے اٹھایا اور اس کے اسکرین پر نمبر دیکھا۔ وہ کوئی انجانا نمبر تھا۔ میں نے فون کان سے لگا کر ''ہیلو'' کہا۔

''اوہ...... یہ...... تم ہو؟'' میں نے کہا۔

''ہاں......'' وہ بولا۔ ''اب تم گمنشام ریسٹورنٹ میں آ جاؤ' میں وہیں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر اس نے کہا۔ ''کیا سوچ رہے ہو؟ یہ مت سوچنا کہ تم نہیں آؤ گے' کیوں کہ اگر تم نہیں آؤ گے تو میں وہاں آ جاؤں گا۔''

''نہیں نہیں...... میں...... میں آ رہا ہوں۔'' میں گھبرا

گیا۔'' میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ یہاں آئے اور میرے گھر والوں کو اس کے بارے میں کچھ معلوم ہوئے۔

''بس...... جلدی سے آ جاؤ۔'' وہ بولا اور اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میں نے موبائل فون جیب میں رکھا اور تیزی سے کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد میں گمنشام ریسٹورنٹ کے سامنے پہنچ گیا۔ میں نے ایک جگہ اپنی کار پارک کر دی تھی اور متلاشی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا لیکن سادھو کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

اچانک موبائل فون کی بیل بجی۔ میں نے اُسے جیب سے نکالا اور اُس کے اسکرین پر نمبر دیکھا۔ یہ سادھو کا نمبر تھا۔

''ہاں...... اب تم ریسٹورنٹ کے اندر آ جاؤ۔'' سادھو کی آواز میرے کان میں آئی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اتنے اعلیٰ ریسٹورنٹ میں آخر اس جیسے میلے کچیلے آدمی کو چھوڑ کیسے دیا گیا ہے۔ بہرحال اس وقت اس کا حکم تھا اور میرے پاس گنجائش نہیں تھی کہ اس کی حکم عدولی کر سکوں اس لیے میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے' میں آتا ہوں۔''

''ہاں جلدی سے آ جاؤ۔ وہ بولا اور اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔''

میں نے موبائل فون جیب میں رکھا اور کار سے اتر آیا اُسے لاک کرنے کے بعد میں ریسٹورنٹ کے مین گیٹ کی طرف چل پڑا۔ ذرا ہی دیر میں ریسٹورنٹ کے مین گیٹ پر پہنچ گیا اور پھر میں نے وہاں اِدھر اُدھر میزوں پر موجود لوگوں پر نظر ڈالنا شروع کر دی۔

اچانک کونے کی ایک میز پر موجود ایک آدمی نے ہاتھ ہلایا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ سادھو ہی تھا لیکن اس وقت وہ بہت معقول حلیے میں تھا۔ اُس نے تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا اور بہت صاف ستھرا تھا۔ اُس نے سلیقے سے سر کے بال جما رکھے تھے۔

میں اُس کے پاس پہنچ گیا۔ اُس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ وہ بولا۔ ''مجھے اس طرح دیکھ کر یقیناً تمہیں حیرت ہو رہی ہوگی؟''

''ہاں...... بالکل۔'' میں نے جواب دیا۔

''اچھا بیٹھ جاؤ' آرام سے بات چیت کرتے ہیں۔'' اس نے اپنے سامنے موجود کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا میں اس کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''کیا کھانا پینا پسند کرو گے؟''

''میں...... کچھ نہیں لوں گا۔'' میں نے جواب دیا۔

وہ دھیرے سے ہنس کر بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم اس وقت میری وجہ سے بہت پریشان ہو لیکن فی الحال اپنی پریشانی کو بھول جاؤ' مجھے اپنا ایک اچھا دوست سمجھو' ہم کچھ کھاتے پیتے ہیں' ساتھ ساتھ باتیں بھی چلتی رہیں گی۔''

''بس میرے لیے چائے منگوا لو۔'' میں نے اصرار پر کہا۔

''صرف چائے؟'' اُس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

''ہاں...... فی الحال یہی مناسب ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اوکے!'' وہ بولا۔ ''اس نے اپنے سامنے پڑا مینو اٹھایا۔ اُسے کھولا اور کچھ آئٹم نشان زد کرنے کے بعد ذرا دور کھڑے ویٹر کو اشارے سے بلا کر مینو اُس کے حوالے کر دیا۔ ویٹر چلا گیا۔ سادھو میری طرف متوجہ ہوا۔ ''میرا نام شیلندر ہے۔ میں تمہیں اپنا دوست بنانا چاہتا ہوں۔''

''لیکن...... دوست بنانے کے لیے تم نے بڑا عجیب و غریب طریقہ اختیار کیا ہے۔'' میں نے شکایتی انداز میں کہا۔

وہ دھیرے سے ہنس کر بولا۔ ''دراصل میں ضروری سمجھتا تھا کہ تمہیں اپنی شکتی کے بارے میں بھی کچھ بتا دوں اور اب یقیناً تم جان چکے ہو کہ میری پاس کتنی شکتی ہے۔''

''ہاں...... مجھے اندازہ ہو چکا ہے لیکن آخر تم مجھے اپنا دوست کیوں بنانا چاہتے ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''اس لیے کہ تم مجھے پسند آ گئے ہو۔'' وہ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''یہ میری بات کا کوئی معقول جواب نہیں ہے۔''

''لیکن حقیقت یہی ہے۔'' اس کے چہرے پر اب بھی مسکراہٹ تھی۔

''لیکن کیوں؟...... کیوں دوست بنانا چاہتے ہو یہ تو بتاؤ؟'' میں اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

''اس لیے کہ...... میں تم سے کچھ کام لینا چاہتا ہوں۔''

''کیسے کام؟'' میں نے فوراً کہا۔

''اس وقت میں تمہیں ان کے بارے میں نہیں بتا سکتا۔''

''یقیناً وہ خطرناک کام ہوں گے۔''

''ممکن ہے ایسا ہی ہو۔''

''تو پھر تم میری طرف سے انکار ہی سمجھو۔'' میں نے اُسے ٹٹولنے کے لیے کہا حالاں کہ مجھے اندازہ تھا کہ وہ زبردستی بھی مجھ سے اپنے کام کروا سکتا ہے۔

''تمہیں زندگی عزیز ہے؟'' اُس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''ہاں بالکل!'' میں نے جواب دیا۔

''اور اگر میں یہ کہوں کہ تم اس صورت میں زندہ رہ سکتے ہو کہ جب میری بات مانو تو کیا تم تب بھی میری بات نہیں مانو گے؟'' وہ گہری نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں زچ ہو کر بولا۔

''لیکن...... آخر تم میرے ہی پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟''

''اس لیے کہ میں نے تم پر بہت محنت کی ہے۔'' اب اس کا لہجہ کچھ تلخ تھا۔

''مجھ پر محنت کی ہے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟...... میرا خیال ہے کہ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوتی۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''میں نے تمہارے بچپن سے تم پر بہت محنت کی ہے۔''

''اوہ۔'' میں مزید حیرت زدہ ہو گیا۔ ''میری تمہاری ملاقات تو ابھی ہوئی ہے' پھر بھلا تم نے مجھ پر بچپن سے محنت کیسے کر لی؟ واقعی تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ یقیناً کوئی ایسا شخص ہے جس کی وجہ سے تم غلط فہمی میں میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔''

''یہ بات مت کرو کہ مجھے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے اور جب میں تمہیں حقائق بتاؤں گا تو تمہیں خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔'' وہ درشت لہجے میں بولا۔

''تو پھر بتاؤ ناں حقائق؟'' میں نے کہا۔

''سب بتا دوں گا۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے اور تمہیں بھی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔'' وہ بولا۔

اس وقت ویٹر ہمارا آرڈر لے کر آ گیا۔ اس نے کافی چیزیں منگوائی تھیں۔ ویٹر واپس چلا گیا تو شیلندر نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم اپنے کاروبار کو بہت وسعت دینا چاہتے ہو۔''

''تو پھر؟'' میں نے اس کی بات کا مطلب نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''میں تمہارا کاروبار اتنا وسیع کر دوں گا کہ تم خود حیرت زدہ رہ جاؤ گے۔ میں تمہیں اتنا پیسہ دے سکتا ہوں کہ تم دیگر کاروبار بھی کر سکتے ہو اور میں تمہارا وہ کاروبار دنیا کے کونے کونے تک بڑھا سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ میں تمہاری ہر طرح سے مدد کروں گا اور ہر قدم پر یہ ثابت کروں گا کہ میں تمہارا ایک بہترین دوست ہوں۔'' وہ بولا۔

''لیکن بہر حال میں سب سے پہلے یہ جاننا چاہوں گا کہ آخر تم مجھے ہی اپنا دوست کیوں بنانا چاہتے ہو اور تم نے بچپن سے مجھ پر کیا محنت کی ہے؟'' میں نے کہا۔

''وہ بھی پتہ چل جائے گا۔'' وہ بولا۔ ''آؤ...... فی الحال ہم کھانا کھاتے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ تم بھی کچھ کھاؤ

اور اگر نہیں تو پھر تم چائے پی سکتے ہو۔''

''میں چائے ہی پیوں گا۔'' میں نے کہا۔

''اوکے!'' اس نے ایک پلیٹ اپنے سامنے رکھ لی اور اس میں بڑی طشتری میں سے چاول ڈالنے لگا۔ میں چائے بنانے لگا۔

''میں فی الحال یہ بات ثابت کرنا چاہوں گا کہ میں تمہارے بچپن ہی سے تمہارے ساتھ ہوں۔'' وہ بولا۔

''وہ کس طرح؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم بچپن میں ایک کار ایکسیڈنٹ کا شکار ہوئے تھے؟'' اب اس کی سوالیہ نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں۔

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ واقعی ایسا ہو چکا تھا۔ ''لیکن یہ بات تو تم نے کسی سے بھی معلوم کر لی ہوگی۔''

''لیکن اس رات تمہیں خواب میں ایک سادھو بھی نظر آیا تھا؟'' یاد ہے تمہیں؟ اُسے خواب میں دیکھ کر تم چیخ مار کر اٹھ گئے تھے؟'' وہ بولا۔

''ہاں...... مجھے یاد ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''یاد کرو' اُس کا حلیہ آج دن میں تم نے میرا حلیہ دیکھا ہے' ویسا ہی نہیں تھا؟''

میں نے ذہن پر ذرا زور دیا اور مجھے یاد آ گیا کہ وہ درست کہہ رہا ہے۔ ''ہاں...... تم ٹھیک کہتے ہو۔'' میں نے کہا۔

''اور شکلوں کی مماثلت بھی یاد کرو۔'' وہ بولا۔

میں نے ایک بار پھر اپنے ماضی میں جھانک' ذہن پر زور دیا لیکن بچپن میں خواب میں دیکھے جانے والے سادھو کی شکل درست طور پر یاد نہ آ سکی۔ میں نے شیلندر سے کہا۔ ''مجھے اس کی شکل درست طور پر یاد نہیں آ رہی ہے۔''

''اچھا تو پھر تم ذرا آنکھیں بند کر لو۔'' وہ بولا۔

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور مجھے وہی کچھ نظر آنے لگا جو میں نے بچپن میں سپنے میں دیکھا تھا۔ جب وہ سپنا ختم ہو گیا تو میں نے آنکھیں کھول دیں اور شلیندر کی

طرف دیکھا۔ وہ بولا۔ ''ہاں دیکھ لیا وہ خواب؟''

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔

''اب تو تم یقین کر سکتے ہو کہ میں بچپن ہی سے تمہارے ساتھ ہوں؟'' اُس نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

''ٹھیک ہے۔ میں تمہاری بات پر یقین کر لیتا ہوں۔'' میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

''تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ تم اس ایکسیڈنٹ میں بالکل صاف طور پر بچ گئے تھے۔ گاڑی نے تمہیں اٹھا کر بہت دور پھینک دیا تھا۔ وہاں موجود دکانداروں کو تمہاری گاڑی سے ٹکرانے کی زوردار آواز آئی تھی۔ ان میں سے کئی ایک نے تو آنکھیں بھی بند کر لی تھیں تاکہ تمہارا انجام نہ دیکھ سکیں' لیکن جن لوگوں نے آنکھیں کھلی رکھیں' انہوں نے دیکھا کہ تم جا کر ایک چبوترے سے ٹکرا گئے تھے لیکن تمہیں چوٹ نہیں آئی تھی اور تم اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے اور کپڑے جھاڑنے لگے تھے۔''

''ہاں بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔''

''تم سوچو کہ اس طرح کا ایکسیڈنٹ ہو جائے تو کیا کوئی بچہ زندہ بچ سکتا ہے؟ اور اگر زندہ بچ بھی جائے تو کیا زخمی ہوئے بغیر رہ سکتا ہے؟'' وہ بولا اور پلیٹ میں سے چمچے سے چاول اٹھانے لگا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ کوئی بچہ کم سے کم زخمی ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔'' میں نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔

''لیکن تم بالکل محفوظ رہے۔ ہے نہ حیرت زدہ کرنے والی بات؟'' اُس نے منہ چلاتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

''ہاں بالکل۔'' میں نے مختصراً کہا۔

''اس حادثے میں' میں نے ہی تمہیں تحفظ دیا تھا۔''

''کیا؟'' میں اچھل پڑا۔ ''تم نے کس طرح میرا تحفظ کیا تھا؟''

''یہ چھوڑو...... یہ آئندہ کسی وقت میں تمہیں بتا دوں گا کہ میں نے کس طرح تمہارا تحفظ کیا تھا' فی الحال تو میں

تمہیں یہ یقین دلانا چاہتا تھا کہ میں واقعی تمہارے بچپن ہی سے تمہارے ساتھ ہوں۔"

میں اس کی باتوں پر زچ ہو کر سوچنے لگا۔ پھر میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اب یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"تم میرے لیے کام کرو گے۔" اُس نے رائتے کا برتن اپنے سامنے رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا کام؟" میں نے بلا توقف کہا۔

"یہ میں تمہیں ٹھکانے پر جا کر بتاؤں گا۔"

"ٹھکانہ؟...... کہاں ہے تمہارا ٹھکانہ؟"

"یہاں سے ہم وہیں چلیں گے۔"

"لیکن...... میں نہیں جا سکوں گا۔"

"اب بھول جاؤ اس بات کو کہ تم اپنی مرضی سے کچھ کر سکتے ہو، تمہیں میری مرضی سے چلنا ہوگا۔" اُس نے دھمکی آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"یہ سراسر زیادتی ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔ "تم اپنی شکتی کا ناجائز استعمال کر رہے ہو، تم خواہ مخواہ مجھے تنگ کر رہے ہو میں نے کبھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑا لیکن تم مجھے بغیر کسی مقصد کے سزا دینے پر تلے ہوئے ہو۔"

"اور کچھ کہنا چاہتے ہو تو وہ بھی کہہ لو لیکن یاد رکھو، مجھ پر ایسی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

"میں تمہارے خلاف پولیس میں رپورٹ کر دوں گا۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔

اُس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولا۔ "چلو ٹھیک ہے، یہ حسرت بھی پوری کر لینا لیکن یہ تمہیں بتا دوں کہ کوئی بھی پولیس والا میرے خلاف کچھ نہیں کر سکتا اور۔" اچانک اُس کے چہرے پر کرختگی آ گئی۔ "جو کوئی بھی میرے خلاف کچھ کرنے کی کوشش کرے گا۔ میں اسے اگلی دنیا میں پہنچا دوں گا۔"

اُس کے انداز سے میں کچھ خوف زدہ ہو گیا۔ مجھے یہ اندازہ تو ہو چکا تھا کہ وہ ایک طاقتور اور خطرناک آدمی ہے۔ کسی عام انسان کو موت کے گھاٹ اُتارنا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں سوچنے لگا کہ اس سے جان چھڑانے کے لیے کیا کروں؟ لیکن میری سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی۔

میں بار بار اُسے دیکھتا جا رہا تھا۔ وہ بے فکری سے کھانا کھا رہا تھا۔ پھر اُس نے کھانا ختم کر لیا۔ بیرے کو بلا کر اُس کا بل ادا کیا اور مجھ سے بولا۔ "چلو میرے دوست!...... اب ہم چلتے ہیں۔"

میرا جی تو چاہ رہا تھا کہ اُس سے کہہ دوں کہ میں اُس کے ساتھ نہیں جا رہا ہوں لیکن میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ یہ بات کہوں۔ میں اندر سے اس سے خوف زدہ تھا۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ بادل نخواستہ میں نے بھی کرسی چھوڑ دی ہم دونوں ریسٹورنٹ سے باہر آ گئے۔ "گاڑی کہاں ہے تمہاری؟" اس نے اِدھر اُدھر نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔

"وہ اس بڑی گاڑی کے پیچھے کھڑی ہے۔" میں نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی جب کہ وہ میرے برابر والی پیسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

میں نے انجن اسٹارٹ کر کے اُس سے کہا۔ "کس طرف چلنا ہے؟"

"اس طرف چلو۔" اس نے دائیں جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کی ہدایت کے مطابق گاڑی چلا دی۔

ہم پوش علاقے میں آ گئے۔ یہاں چھوٹے بڑے بنگلے اور کوٹھیاں تھیں۔ ایک چھوٹے بنگلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا۔ "بس اس بنگلے کے سامنے روک لینا گاڑی۔"

میں نے اس کی ہدایت کے مطابق گاڑی روک لی۔

"ٹھیک ہے، بس اب نیچے آ جاؤ، ہمیں اسی بنگلے میں جانا ہے۔" وہ بولا۔

ہم دونوں گاڑی سے اُتر آئے۔ میں نے گاڑی لاک کر دی اور ہم بنگلے کے گیٹ پر پہنچ گئے۔ اُس نے کال بیل کا بٹن پش کر دیا۔ اندر سے بیل کی گونج سنائی دی۔

کچھ ہی دیر بعد ذیلی گیٹ کھل گیا۔ گیٹ کھولنے والا ایک ادھیڑ عمر شخص تھا جو سرخ و سفید اور خاصا صحت مند تھا۔

میں اور شلیندر ذیلی گیٹ عبور کر کے بنگلے کے اندر داخل ہو گئے اور پھر ہم جلد ہی ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔

"یہ ہے میرا ٹھکانہ۔" شلیندر نے مجھ سے کہا۔

"اب بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہے؟" میں نے اُس کی بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر کہا۔

"دیکھو، جلدی نہیں کرو۔" وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔ "تمہیں کب کیا کرنا ہے، وہ میں خود بتا دوں گا، ویسے میں آج رات تمہاری ملاقات ایک بوڑھے شخص سے کروانا چاہتا ہوں۔"

"کس بوڑھے شخص سے؟" میں نے فوراً کہا۔

"یہ میں تمہیں بعد میں بتا دوں گا۔ فی الحال میں کافی کی طلب محسوس کر رہا ہوں، کیا تم پینا پسند کرو گے؟" وہ بولا۔

"نہیں۔" میں نے مختصراً جواب دیا۔

"اوکے...... میں کہہ کر آتا ہوں۔" وہ اٹھا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

میں اُس پُر اسرار اور طاقتور آدمی کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں ایکسرسائز کرتے ہوئے اکثر اپنے طاقتور جسم کو دیکھتے ہوئے سوچتا تھا کہ کوئی عام سے جسم کا آدمی آسانی سے مجھ پر قابو نہیں پا سکتا لیکن اب میں سوچ رہا تھا کہ شلیندر تو ایک عام سے جسم کا ہی آدمی ہے اور اُس نے مجھے بڑی بُری طرح جکڑ کر رکھ لیا ہے میرا سارا غرور خاک میں مل کر رہ گیا تھا۔

کچھ دیر بعد شلیندر واپس آ گیا اور میرے سامنے صوفے پر بیٹھنے کے بعد اُس نے جیب سے سگار نکال کر لائٹر سے سلگا لیا۔ کچھ کش لینے کے بعد اُس نے مجھ سے بڑے عام سے انداز میں کہا۔ "تم میرے ساتھ رہو گے تو تمہاری موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔"

"کیا؟" میں پریشان ہو کر اُچھل پڑا۔

اُس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ "موت سے بہت ڈرتے ہو۔"

"ہر انسان ڈرتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہوں...... ہوں۔" اُس نے مسکراتے ہوئے ہنکار ابھرا۔ سگار اُس کے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔ "تم نے ٹھیک کہا۔ لیکن اب تم اس خوف کو اپنے آپ سے دور کر دو کیوں کہ اب آنے والے دنوں میں شاید تمہارے لیے موت کی کوئی اہمیت نہ رہے زندگی اور موت تمہارے لیے یکساں ہو جائے۔"

"تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔" میں نے کہا۔

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو...... ابھی ایسا ہی ہوگا، بہت سی باتیں سمجھ نہیں آئیں گی لیکن آگے چل کر ساری باتیں تمہاری سمجھ میں آ جائیں گی۔"

اُسی وقت ایک بوڑھی ملازمہ ٹرے لے کر آ گئی۔ اُس میں دو مگ نظر آ رہے تھے۔ اُس نے ٹرے سینٹر ٹیبل پر رکھ دی اور خود واپس چلی گئی۔

"کافی پی لو۔" شلیندر نے ایک مگ اٹھا کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

میرا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "مجھے اس کی طلب نہیں ہے۔"

"ارے بھئی!...... پی لو...... کب تک اس طرح کھانے پینے کا بائیکاٹ رکھو گے؟" وہ خوش گوار انداز میں بولا۔

میں نے مزید بحث نہ کرنے کی وجہ سے اس کے ہاتھ سے مگ لے لیا۔

ہم کافی پی چکے تو وہ مجھ سے بولا۔ "چلو بھئی!...... اب میرے ساتھ آ جاؤ۔"

ہم دونوں ڈرائنگ روم سے نکل آئے۔ وہ مجھے کوریڈور میں دائیں جانب لے کر چل پڑا اور پھر ہم وہاں

موجود کمروں کی قطار میں سے سب سے آخری کمرے میں داخل ہوگئے۔ یہاں مجھے حیران اور پریشان کردینے والی کافی چیزیں موجود تھیں۔ کمرے کے وسط میں لکڑی کی ایک بڑی گول میز موجود تھی جس پر ایک انسانی کھوپڑی رکھی تھی۔ وہیں ایک چراغ بھی رکھا ہوا تھا۔ میز کے گرد کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔

کمرے کے ایک کونے میں ایک انسانی ڈھانچہ دیوار کے ساتھ اس طرح رکھا ہوا تھا جیسے کوئی انسان دونوں ٹانگیں پھیلا کر اور ٹیک لگا کر بیٹھا ہے۔ اُس کے قریب ہی کچھ چھوٹی بڑی ہڈیاں پڑی تھیں۔

ایک اور کونے میں ایک بڑی الماری استادہ تھی۔ اُس پر بھی ایک انسانی کھوپڑی رکھی ہوئی تھی۔

''تم بیٹھ جاؤ!'' ھلیندر نے کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

میں کرسی پر بیٹھ گیا جب کہ وہ انسانی ڈھانچے کے پاس چلا گیا۔ اُس نے کسی زبان میں ڈھانچے سے جیسے کچھ کہا۔ ڈھانچے کی کھوپڑی میں سے کسی درندے کی سی غراہٹ سنائی دی اور اُس کی ہڈیوں میں حرکت بھی پیدا ہوئی۔

ھلیندر میرے پاس آ گیا۔ اُس نے ایک کرسی گھسیٹی اور اُس پر بیٹھ گیا۔ وہ میرے مدمقابل ہی بیٹھ گیا تھا۔ اُس نے میز پر رکھی انسانی کھوپڑی اپنی طرف گھسیٹ لی اور پھر چراغ اٹھا کر اپنے قریب رکھ لیا اور جیب سے لائٹر نکال کر اُسے جلا دیا۔

اُس نے ایک کہنی میز پر ٹکا دی اور پھر اُسی ہاتھ پر انسانی کھوپڑی اٹھا کر رکھ لی۔ وہ زیرِلب کچھ بولنے لگا۔ پھر اُس نے چراغ اٹھا کر کھوپڑی پر رکھ دیا لیکن اُسے چھوڑا نہیں ورنہ وہ گر جاتا۔ وہ پھر زیرِلب کچھ بولنے لگا۔ پھر اس نے دونوں چیزیں واپس میز پر رکھ دیں۔

''اب تم میرے ساتھ چلو گے۔'' اُس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

میں ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ اُس نے مزید کہا۔

''تم جسمانی طور پر میرے ساتھ نہیں جاؤ گے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''تمہاری آتما میرے ساتھ جائے گی۔''

''کیا؟'' اس کے جواب پر میں مزید حیران ہوگیا۔

''ہاں۔ بس اب تم اس میز پر سیدھے لیٹ جاؤ۔'' اس نے میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے ہدایت جاری کی۔

میں پریشان ہوگیا کیوں کہ میرے لیے یہ سوچنا ہی پریشان کن تھا کہ وہ میری آتما کے ساتھ کوئی کھلواڑ کرنا چاہتا ہے۔ مجھے ہچکچاتے ہوئے دیکھ کر وہ بولا۔ ''تم گھبراؤ نہیں تمھیں کچھ نہیں ہوگا' کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

میں جانتا تھا کہ میرے پاس اس کی بات نہ ماننے کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے اس لیے میں میز پر چڑھنے کے بعد سیدھا لیٹ گیا۔

وہ اٹھ کر میرے قریب کھڑا ہو چکا تھا۔ اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب تم صرف چھت کی طرف دیکھتے رہو۔''

میں اُس کی ہدایت کے مطابق چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے زیرِلب کچھ بولنا شروع کردیا۔ پھر وہ بولا۔

''اب آنکھیں بند کرلو۔''

میں نے آنکھیں بند کرلیں اور پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے نیند آ رہی تھی۔ میرا دماغ اندھیرے میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا اور پھر مجھے جیسے کچھ ہوش نہ رہا۔

ذرا دیر بعد ایک بار پھر مجھے جیسے ہوش آ گیا اور میں پھر سے جاگ گیا۔

''اب تم میرے ساتھ آ جاؤ۔'' ھلیندر نے مجھ سے کہا۔

میں اٹھ کر بیٹھنے لگا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اب میرا وجود بےوزن ہو چکا ہے۔

''وہ بے!...... اب تم اپنے جسم سے آزاد ہو چکے ہو' اور میں نے بھی اپنا جسم چھوڑ دیا ہے' آؤ...... اب ہم چلتے

ہیں۔'' ھلیندر نے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ محسوسات ختم ہو چکے تھے لیکن عمل پورے طور پر ہو رہا تھا۔ میں میز سے نیچے آ گیا۔

ہم دونوں کمرے سے باہر آ گئے۔ ھلیندر نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ ہم لان میں آنے کے بعد آسمان کی طرف محوِ پرواز ہوگئے۔

رفتہ رفتہ ہم زمین سے دور ہوتے چلے جا رہے تھے۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ ہم نہایت تیز رفتار کے ساتھ پرواز کر رہے تھے۔ تب میں نے سوچا کہ لوگ جو روحوں کی باتیں کرتے رہے ہیں اور یہ کہتے رہے ہیں کہ ان کا کوئی وزن نہیں ہوتا۔ وہ کہیں بھی آ جا سکتی ہیں' میں آج خود اس تجربے سے گزر رہا تھا۔

ہم نے کچھ ہی دیر پرواز کی اور پھر ہم ایک گھنے تاریک جنگل میں اتر گئے۔

''یہ افریقہ کے جنگلات ہیں۔'' ھلیندر نے مجھے بتایا۔

''یہ سب کچھ میرے لیے بہت حیرت ناک ہے۔'' میں نے کہا۔

''یقیناً ہوگا۔'' وہ بولا۔ ''اس لیے کہ یہ سب کچھ تمہارے لیے بالکل نیا ہے اور تم پہلی مرتبہ اس تجربے سے گزر رہے ہو لیکن آگے چل کر تمہیں عادت سی پڑ جائے گی' پھر تم اس طرح سے بھی اپنی زندگی کا کافی حصہ گزار سکو گے۔ یہ تو ابتداء ہے' جب تم کچھ وقت میرے ساتھ گزار لو گے تو تمہیں پتہ چل جائے گا کہ کس طرح دوسروں کے خوابوں میں آتے ہیں یا اس طرح کے دیگر عمل کس طرح کیے جاتے ہیں۔''

بالآخر ہم ایک جھونپڑی کے پاس پہنچ گئے۔ یہ گھاس اور پھونس سے بنی ہوئی تھی۔ جب سے میں ھلیندر کے گھر سے روانہ ہوا تھا' ایک حیرت انگیز بات یہ بھی رونما ہو رہی تھی کہ میں اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا تھا۔ یعنی یہ ثابت ہوتا تھا کہ روحیں اندھیرے میں بھی دیکھ سکتی ہیں۔

ہم لوگ جھونپڑی کے دروازے پر کھڑے ہوگئے۔ ھلیندر نے جھونپڑی کے دروازے پر دستک دینے والے انداز میں ہاتھ مارا۔

''تم اندر آ سکتے ہو۔'' ایک بلغمی آواز آئی۔

''آؤ اندر آ جاؤ۔'' ھلیندر نے دروازے کو دھکیلتے ہوئے مجھ سے کہا۔

ہم دونوں جھونپڑی کے اندر داخل ہوگئے۔ سامنے ہی دیوار کے ساتھ ایک شخص دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اُس نے گھٹنے پیٹ سے لگا رکھے تھے دونوں ٹانگوں پر بازو لپیٹے ہوئے تھے اور اس کا سر گھٹنوں پر ٹکا ہوا تھا۔ اُس نے ہمیں دیکھنے کے لیے سر اٹھانے کی زحمت نہیں کی بلکہ صرف آنکھیں اوپر کرکے ہمیں دیکھا۔

''نمستے!'' ھلیندر نے دونوں ہاتھ جوڑ کر جسم کو تھوڑا سا خم دیتے ہوئے اس سے کہا۔

''ہوں۔'' اُس نے جواباً ہنکارہ بھرا اور دھیرے سے سر ہلایا۔

''ججیت جی!...... کیا ہم بیٹھ جائیں؟'' ھلیندر نے نہایت مودبانہ انداز میں اُس سے کہا۔

''ہوں۔'' ججیت نے پھر ہنکارہ بھرا۔

''آؤ بیٹھ جاؤ۔' ھلیندر نے مجھ سے کہا اور ہم دونوں ججیت کے سامنے اُس سے ذرا ہی دور بیٹھ گئے۔

''ججیت جی!...... میں نے اسے پسند کیا ہے۔'' ھلیندر نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے ججیت سے کہا۔

''ہوں۔'' ججیت نے جواباً ہنکارہ بھرا۔

''اب آپ اپنا کام کردیئے!'' ھلیندر بولا۔

''اسے واپس چھوڑ آؤ۔'' ججیت سر اٹھا کر ھلیندر سے بولا۔

''کیا مطلب؟'' ھلیندر حیرت سے بولا۔

''پہلے اسے چھوڑ آؤ' پھر میں تم سے بات کرتا ہوں۔'' ججیت نے کچھ بتانے سے گریز کیا۔

''ٹھیک ہے ججیت جی!'' ھلیندر قدرے مایوس لہجہ

میں بولا۔ پھر اُس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔
''چلو بھئی......واپس چلنا ہے۔''
ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہلیندر نے ہاتھ جوڑ کر جگجیت کو نستے کہا اور ہم لوگ جھونپڑی سے باہر آ گئے۔
ہم جس طرح گئے تھے اسی طرح واپس ہلیندر کے گھر آئے اور ایک بار پھر میرا دماغ سو گیا۔ پھر میں جگا تو میرا جسم بھی متحرک تھا۔ ہلیندر میرے قریب ہی کھڑا تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا۔
''چلو اب تم میز سے نیچے آ جاؤ۔''
میں اٹھا اور فرش پر آ گیا۔
''آؤ میں تمہیں کمرے تک چھوڑ آتا ہوں' تم وہاں آرام سے رہنا' مجھے واپس جگجیت جی کے پاس جانا ہے اور پتہ نہیں کب واپس آتا ہوں۔'' وہ بولا۔
وہ مجھے ایک اور کمرے میں لے آیا۔ یہاں کونے میں ایک شاندار بیڈ لگا ہوا تھا۔ ایک جانب صوفہ سیٹ رکھا تھا جس کے سامنے سینٹر ٹیبل موجود تھا۔ زمین پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک کونے میں ٹرالی پر ٹی وی سیٹ رکھا ہوا تھا۔ ٹرالی میں کچھ کتابیں اور رسالے وغیرہ بھی نظر آ رہے تھے۔ اس کے علاوہ دیگر آرائشی اشیاء بھی کمرے میں موجود تھیں۔
''تم اس کمرے میں آرام کرو۔'' ہلیندر نے مجھ سے کہا۔
''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔
''اس کمرے سے نکلنے کی کوشش مت کرنا کیوں کہ تم یہاں سے نکل نہیں سکتے ہو۔ اگر ایسی کوشش کرو گے تو تمہارے جاؤ گے اور میرا خیال ہے کہ تم ابھی زندہ رہنا پسند کرو گے۔'' اُس نے دھمکی دی۔
''تم نے درست اندازہ لگایا' واقعی میں زندہ رہنا چاہوں گا۔'' میں نے اُس سے کہا۔
''ٹھیک ہے۔ میں چلتا ہوں۔'' وہ بولا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔
میں بیڈ پر بیٹھ گیا۔ مجھے اندازہ ہی نہیں ہو پا رہا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔
میں بہت دیر تک حالات پر غور کرتا رہا لیکن جب کچھ حالات کے بارے میں کچھ سمجھ نہ سکا تو میں بیڈ پر لیٹ گیا۔ میں نے اپنے دماغ کو پُرسکون کرنے کے لیے اس سے تمام سوچوں کو نکالنے کی کوشش شروع کر دی اور جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔
تقریباً ایک گھنٹے بعد ہلیندر واپس آ گیا۔ اُس نے مجھ سے کہا۔ ''بھئی...... میں تم سے بہت بہت معذرت چاہتا ہوں۔ جگجیت جی نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ میں نے تمہیں پسند کر کے بہت غلط کیا ہے کیوں کہ تم تو چاند کی ایسی تاریخ کو پیدا ہوئے ہو کہ تم پر تو کوئی عمل کیا ہی نہیں جا سکتا اور اگر ایسا کیا جائے گا تو عامل پر اس کے خطرناک اثرات مرتب ہوں گے۔ بھئی مجھے شما کر دو۔ اب تم میرے معزز مہمان ہو۔''
''اوہ...... یہ تو میرے لیے بڑی خوش خبری ہے۔'' میں نے کہا۔ مجھے اس کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حالات اچانک اس طرح میرے حق میں آ جائیں گے۔
''بس اب کل تم یہاں سے جا سکو گے۔'' وہ بولا۔
''ویسے تو میں تمہیں ابھی جانے دیتا لیکن میں نے تم پر ایک عمل کر دیا تھا' اب اس کے توڑ کا سمے کل ہی آئے گا۔ بس میں وہ عمل کر لوں اس کے بعد تم یہاں سے جا سکو گے۔''
''یہ تو واقعی میرے لیے بڑی خوشی کی بات ہے۔ مجھے تو یقین نہیں آ رہا ہے کہ اچانک حالات اس طرح پلٹ جائیں گے۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ شاید مجھے زندگی بھر تمہاری قید میں رہنا پڑے گا۔'' میں نے کہا۔
''ہاں......ایسا ہی ہوتا اگر تم میری موافق تاریخوں میں پیدا ہوئے ہوتے۔'' وہ بولا۔
''ویسے آخر یہ سب چکر کیا ہے۔ تم میرے ساتھ کیا کرنا چاہتے تھے یا اب میری جگہ جو شخص آئے گا اس کے ساتھ

کیا کرو گے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔
وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''بس اب ان باتوں کو چھوڑو۔ اب تم میرے مہمان ہو' مجھے بتاؤ کہ میں تمہاری کیا تواضع کر سکتا ہوں؟''
''کچھ بھی نہیں......بس اب میں آرام کرنا چاہوں گا۔'' میں نے جواب دیا۔
''تم نے تو کھانا بھی نہیں کھایا تھا' میرا خیال ہے کہ تم کچھ کھا لو؟'' وہ بولا۔
میں واقعی کچھ بھوک محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ اگر تمہیں زحمت نہ ہو تو تم مجھے کچھ کھانے کے لیے دے دو۔''
''زحمت کی کوئی بات نہیں ہے' میں ابھی لے کر آتا ہوں کھانا۔'' وہ بولا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔
میں بہت خوش تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھے نئی زندگی مل گئی ہے۔
کچھ دیر بعد ہلیندر واپس آ گیا۔ اس کے ساتھ اُس کا ملازم بھی تھا جس کے ہاتھوں میں ایک ٹرے تھی جس پر برتن رکھے ہوئے تھے۔
''آؤ بھئی!......کھانا کھا لو۔'' ہلیندر نے مجھ سے کہا۔
ملازم نے ٹرے سینٹر ٹیبل پر رکھ دی۔
میں اٹھ کر صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ ہلیندر بھی میرے قریب ہی بیٹھا تھا۔ ملازم واپس جا چکا تھا۔
''تم بھی کھاؤ ناں؟'' میں نے ہلیندر کی طرف دیکھ کر کہا۔
''نہیں' مجھے تو بھوک نہیں ہے۔ تم نے تو دیکھا ہی تھا کہ میں نے ہوٹل میں خوب لوٹ کر کھانا کھایا تھا۔'' وہ بولا۔ ''تم کھاؤ خوب پیٹ بھر کر۔ تم نے کچھ نہیں کھایا تھا۔'' اس نے کہا۔
میں نے کھانا شروع کر دیا۔ کھانا کھانی لذیذ تھا۔ میں نے ہلیندر کی طرف دیکھ کہا۔ ''کھانا تو بہت ذائقہ دار ہے۔''
''یہ میرے خانساماں کشن کمار نے بنایا ہے۔ اُس کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔ ویسے کل میں تمہیں اس کے ہاتھ کا پکا ہوا ہرن کا گوشت کھلاؤں گا' وہ گوشت تو وہ بہت ہی لذیذ بناتا ہے۔ تم انگلیاں چاٹتے رہ جاؤ گے۔'' اُس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
''اچھا......اگر ایسی بات تو میں ضرور اس کے ہاتھ کا پکا ہوا وہ گوشت کھاؤں گا۔''
میں کھانے سے فارغ ہوا تو اُس نے مجھ سے کہا۔ ''اب تو تم میرے ساتھ کافی پینا پسند کرو گے ناں؟''
''ہاں بالکل!'' میں نے خوش دلی سے کہا۔
ذرا ہی دیر بعد ملازم آ گیا۔ ہلیندر نے اُسے کافی لانے کے لیے کہہ دیا۔ وہ برتن لے کر چلا گیا۔
میں نے ہلیندر سے کہا۔ ''مجھے تمہارے بارے میں تجسس پیدا ہو گیا ہے کہ تم کیا کرتے ہو' یہ عملیات تم نے کس سے سیکھے ہیں اور تمہارے پاس کون کون سی شکتیاں ہیں۔ اگر تم مناسب سمجھو تو مجھے کچھ بتاؤ؟''
اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی اور وہ کچھ سوچنے لگا پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''میں چاہتا ہو کہ اب اس موضوع پر بات نہ کروں' بس اب تم مجھے اپنا ایک ایسا دوست سمجھو جس کے پاس تم ایک دن کے لیے قیام پذیر ہو۔ ہمیں ہنس کھیل کر اور خوش گپیاں کرتے ہوئے وقت گزار لینا چاہیے۔''
''ٹھیک ہے' اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو یونہی سہی۔'' میں نے بھی مسکرا کر کہا۔
ذرا دیر بعد ملازم ہمیں کافی دے کر چلا گیا اور کافی پینے کے بعد ہلیندر مجھ سے بولا۔ ''اچھا میرے دوست!...... اب میں آرام کرنا چاہتا ہوں اس لیے اپنے کمرے میں جا رہا ہوں' تم بھی اب آرام کرو' صبح تم سے ملاقات ہوگی۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا اور پھر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں نے اندر سے دروازے کا لاک لگایا اور آ کر بیڈ پر لیٹ گیا۔

پیٹ میں کھانا پہنچ چکا تھا اور ھلینڈر کی طرف سے اپنی آزادی کے بارے میں سننے کے بعد میرا ذہن بھی پُرسکون ہو چکا تھا اس لیے میں جلدی ہی نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

صبح میری آنکھ کھلی تو میں نے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا۔ آٹھ بج رہے تھے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر میں نے باتھ روم میں غسل کیا اور اس کے بعد کمرے سے باہر آ گیا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ گھر میں کوئی جاگ گیا یا نہیں؟ اور میں جیسے ہی کمرے سے باہر آیا' میری نظر ملازم پر پڑ گئی جو کوریڈور میں جا رہا تھا۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا اور میرے قریب آ گیا اور بولا۔ ''سرکار! ھلینڈر جی تو سویرے ہی ایک ضروری کام سے چلے گئے ہیں۔ گیارہ بارہ بجے تک آئیں گے' کہہ کر گئے تھے کہ آپ اٹھ جائیں تو آپ کو ناشتہ کروا دیا جائے۔ کہیں تو ناشتہ لے آؤں؟''

''ہاں لے آؤ۔'' میں نے جواب دیا۔

''آپ کمرے میں بیٹھیں' میں ابھی لے کر آ رہا ہوں۔'' اس نے کہا اور واپس جانے کے لیے مڑ گیا۔

میں پھر کمرے میں آ گیا۔ میری نظر ٹی وی سیٹ پر پڑی جس پر ریموٹ بھی رکھا ہوا تھا۔ میں نے اُسے اٹھا لیا اور ٹی وی آن کر لیا۔ کوئی ایسا چینل لگا تھا۔ جس سے فٹ بال کا میچ دکھایا جا رہا تھا۔ اس میں میری دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو خبریں سننا چاہتا تھا اس لیے چینل بدلنے لگا اور پھر میں نے خبروں کا چینل لگا دیا۔ ایک خوب صورت نوجوان نیوز کاسٹر خبریں سنا رہی تھی۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد ملازم ناشتہ رکھ کر چلا گیا اور ناشتہ کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن ساتھ ساتھ ٹی وی پر بھی نظریں ڈالتا جا رہا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد میں کچھ دیر ٹی وی دیکھتا رہا اور پھر کمرے سے باہر آ کر لان میں بیٹھ گیا۔ مجھے ھلینڈر کا انتظار تھا۔ بارہ بجے کے قریب وہ آ گیا۔ میرے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''ارے یار معاف کرنا...... دراصل مجھے ایک ضروری کام پڑ گیا تھا اس لیے میں چلا گیا تھا ورنہ میرا ارادہ تھا کہ ہم ناشتہ ساتھ ہی کریں گے۔''

''مجھے بھی اکیلے ناشتہ کرتے ہوئے مزا نہیں آیا۔'' میں نے اُس کا دل رکھنے کی خاطر کہا جب کہ میں نے خوب مزے لے لے کر اور ڈٹ کر ناشتہ کیا تھا۔

''فکر نہ کرو' اب ہم مل کر دوپہر کا کھانا کھائیں گے۔ شام پانچ بجے کے قریب میں تم پر اپنا عمل کروں گا' اس کے بعد تم یہاں سے جا سکو گے۔'' وہ بولا۔

''میں یہاں سے جانے کے لیے کتنا بے چین ہوں تم اس کا اندازہ شاید کر سکتے ہو۔'' میں نے کہا۔

''ہاں بالکل۔'' وہ بولا۔ ''اگر کسی کو یہ پتہ ہو کہ ساری عمر قید میں رہے گا اور پھر اچانک یہ پتہ چل جائے کہ اسے آزادی ملنے والی ہے تو ایسا انسان خوش ہونے کی انتہا تک پہنچ سکتا ہے۔''

''واقعی!'' میں نے کہا۔ ''میں ایسی ہی انتہا پر ہوں۔''

''اچھا تم بیٹھو' میں خانساماں کو کھانے کے متعلق ہدایات دے کر آتا ہوں۔'' اس نے کہا اور اٹھ کر تیز تیز قدموں سے برآمدے کی طرف چلا گیا۔

کچھ دیر بعد خانساماں نے آ کر ہمیں کھانا تیار ہونے کی اطلاع دی تو ھلینڈر نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''آؤ...... اب ہم ڈائننگ ٹیبل کی طرف چلتے ہیں۔''

ذرا سی دیر بعد ہم دونوں کھانا کھا رہے تھے۔

''کیوں بھئی!...... یہ ہرن کا گوشت کیسا لگا تمہیں؟'' ھلینڈر نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے پوچھا۔

''بہت لذیذ!'' میں نے جواب دیا۔ ''یہ مجھے تمہاری کی ہوئی تعریف سے زیادہ لذیذ محسوس ہوا ہے۔''

وہ میری بات پر دھیرے سے ہنس دیا اور بولا۔ ''یہ گوشت میں صرف اپنے خاص مہمانوں ہی کو کھلاتا ہوں۔''

''مجھے خوشی ہے کہ تم مجھے اپنے خاص مہمانوں میں سمجھ

رہے ہو۔'' میں تشکرانہ انداز میں کہا۔

''ہاں...... تم میرے خاص مہمان ہی ہو۔'' اُس نے بڑی معنی خیز انداز میں کہا۔ جس کی وجہ سے میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے؟

جب ہم کھانا کھا چکے تو وہ میری طرف دیکھ کر نہایت سنجیدہ اور قدرے بیگانے انداز میں بولا۔ ''میں نے اپنا مقصد حاصل کر لیا ہے۔''

''کون سا مقصد؟'' میں نے پوچھا۔

''جگجیت جی نے مجھ سے کہا تھا کہ میں کسی بھی طرح تمہارے پیٹ میں انسانی گوشت اتار دوں اور ایسا میں کر لیا ہے۔''

''کیا؟'' میں نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔'' اس نے اس پلیٹ کی طرف اشارہ کیا جو میں بقول اس کے ہرن کا گوشت تھا۔ ''یہ ہرن کا نہیں بلکہ انسان کا گوشت ہے۔''

''اوہ......'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

''اب تم پوری طرح میرے قابو میں آ چکے ہو۔''

''تو اس کا مطلب ہے کہ تم نے پھر مجھے دھوکا دیا؟'' میں نے تلخ لہجے میں اس سے کہا۔

''یہ ضروری تھا۔ کہ اگر میں یہ ڈرامہ نہ رچاتا تو شاید تم اتنی آسانی سے یہ گوشت نہ کھاتے۔'' وہ بولا۔

میرا جی تو چاہا کہ کوئی طشتری اٹھا کر اس کے منہ پر دے ماروں لیکن میں جانتا تھا کہ ایسا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا اس لیے میں صرف بے بسی سے ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

وہ اٹھا اور بغیر کوئی بات چیت کیے کمرے سے باہر چلا گیا۔

میرے لیے یہ احساس بڑا ناگوار تھا کہ میں نے انسانی گوشت کھا لیا ہے۔ مجھے کچھ متلی سی بھی محسوس ہونے لگی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اب میں شدید طور پر مایوس تھا۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا دروازے کی طرف چل پڑا۔

کمرے سے باہر آنے کے بعد میں نے ادھر اُدھر نظریں ڈالیں لیکن وہاں مجھے کوئی بھی نظر نہ آیا۔

میں نے سوچا کہ اس گھر سے نکلنے کی کوشش تو کر کے دیکھنا چاہیے۔ شاید کوئی بہتر صورت نکل آئے۔ لیکن مجھے ھلینڈر کی دھمکی بھی یاد تھی کہ اگر میں نے یہاں سے نکلنے کی کوشش کی تو میری موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔

میں نے باہر نکلنے کی کوشش کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور ایک گہرا سانس لے کر بوجھل قدموں سے چل پڑا۔

کچھ ہی دیر بعد میں لان میں پڑی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرے سارے خواب چکنا چور ہو گئے تھے اور ساری خوشی ملیامیٹ ہو گئی تھی' ایک بار پھر میں تفکرات اور خوف کی زد پر آ گیا تھا۔

مجھے خانساماں برآمدے میں جاتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ بھی میری طرف دیکھ رہا تھا۔ بے اختیار میں نے اُسے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ اُس نے رُخ بدلا اور میری طرف آنے لگا اور پھر ذرا ہی دیر بعد وہ میرے پاس آ گیا۔ ''جی سرکار؟'' اُس نے مجھ سے کہا۔ اُس کا لہجہ مودبانہ تھا۔

''ھلینڈر کہاں گیا؟'' میں نے اپنی تلخی کو چھپاتے ہوئے اس سے کہا۔

''وہ تو باہر چلے گئے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''کب تک آئے گا؟''

''یہ تو ہمیں پتہ نہیں سرکار!''

''کچھ کہہ کر نہیں گیا؟''

''نہیں سرکار!''

''کیا تم میری کچھ مدد کر سکتے ہو؟''

''کیسی مدد سرکار؟''

میں جانتا تھا کہ خانساماں' ھلینڈر کا خیر خواہ ہی ہوگا لیکن پھر بھی میں نے اُسے ٹٹولنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے اُس سے کہا۔ ''میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں' ھلینڈر نے مجھے یہاں زبردستی قید کر رکھا ہے' کیا تم میری کچھ مدد کر سکتے

ہو؟“

”نہیں سرکار!“ اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہم آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔“

”بھگوان کے لیے میری مدد کرو۔ کسی پریشان انسان کی مدد کرنے سے بھگوان خوش ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ایسی باتیں نہ کریں سرکار!...... ہم تو ھلیندر جی کے داس ہیں‘ ہم ان کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے اور پھر ہمارے پاس تو کوئی شکتی بھی نہیں ہے کہ ہم کسی کی مدد کر سکیں۔“ وہ بولا۔

”کیا تم مجھے کوئی ایسا راستہ بتا سکتے ہو کہ میں یہاں سے آزادی حاصل کر سکوں؟“ میں نے اس کی طرف ملتجیانہ نظروں سے دیکھا۔ اُس نے پھر نفی میں سر ہلا کر کہا۔

”نہیں سرکار!...... ہمیں تو ایسا کوئی راستہ نہیں معلوم ہم تو بس عام سے انسان ہیں اور ایک داس سے زیادہ ہماری کوئی حیثیت اور طاقت نہیں ہے۔ بس ہم آپ کی یہی سیوا کر سکتے ہیں کہ آپ کو اچھے کھانے پینے کی اشیا دے سکیں‘ اگر ایسی کسی چیز کی ضرورت ہے تو حکم کریں؟“ وہ بولا۔

”نہیں ایسی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم جا سکتے ہو۔“ میں نے کہا۔

”بہتر سرکار!“ اس نے ذرا سر جھکاتے ہوئے کہا اور پلٹ کر تیز تیز قدموں سے واپس جانے لگا۔

شام ہوگئی۔ ھلیندر واپس آ گیا۔ میں لان ہی میں بیٹھا تھا۔ وہ میرے پاس آ گیا۔ میں نے اس سے کوئی بات نہ کی۔ وہ میرے سامنے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”وجے!...... میں نے تمہارے بارے میں بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔“

”اچھا فیصلہ؟“ میں نے اُس کی طرف دیکھ کر طنزیہ انداز میں کہا۔ ”تم کب سے میرے اتنے بڑے خیر خواہ ہو گئے کہ میرے بارے میں اچھا سوچنے لگے؟“

”دیکھو! تمہیں یقیناً یہ محسوس ہو رہا ہوگا کہ میں نے تم پر دباؤ رکھا ہوا ہے اور یہ درست بھی ہے لیکن...... درحقیقت میں تمہاری اچھائی ہی چاہتا ہوں۔ میں تمہیں صاف طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے تمہارے بارے میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں ایک خوش و خرم اور بھرپور زندگی دوں‘ ایک ایسی زندگی جس میں تم ہر لمحہ خوشیاں حاصل کر سکو لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ تم میرے ساتھ تعاون کرو۔“

اور یہ جو میں تم پر تھوڑی بہت سختی کر رہا ہوں‘ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں تمہیں اپنے پاس رکھ سکوں۔ دیکھو!...... تم اگر میرے دوست بن جاؤ‘ مجھ سے تعاون کی ہامی بھر لو تو میں تمہارے ساتھ ایک دوستانہ رویہ اختیار کر سکتا ہوں۔“ وہ نرم لہجے میں بولا۔

”مجھے نہ تو تمہاری بکواس سننی ہے اور نہ ہی مجھے تمہارے کسی بات پر اعتبار ہے۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

اُس کے چہرے پر ناگواری اور غصے کے تاثرات آئے لیکن اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور ملائم لہجے میں بولا۔ ”دیکھو! دراصل میرے نزدیک اس وقت تمہاری حیثیت ایک ایسے بچے کی ہے جس کا کوئی بڑا اُسے اچھے مستقبل کے بارے میں بتاتا ہے لیکن اُس بچے کو اس وقت اپنے مستقبل سے زیادہ اپنا کھیل کود یا دوسری مصروفیات عزیز ہوتی ہیں جب کہ اُس کا بڑا اُس کی اچھائی چاہ رہا ہوتا ہے‘ اسی طرح میں بھی تمہاری بہتری چاہتا ہوں لیکن اس وقت تم میری باتوں کا اندازہ نہیں لگا سکتے ہو۔“

”مجھے کوئی اندازہ نہیں لگانا۔“ میں نے تلخی سے کہا۔

”میں اس وقت تمہارے ہاتھوں میں پھنسا ہوا ہوں‘ میں تمہارے خلاف کچھ نہیں کر سکتا‘ سارے اختیارات تمہارے پاس ہیں اس لیے تم نے جو کرنا ہے کرو‘ مجھے بہلانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

اُس نے ایک گہرا سانس لیا اور بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ اگر تم میرے ساتھ تعاون نہیں کرنا چاہتے تو کوئی بات نہیں۔ ویسے مجھے جو کرنا ہے وہ تو میں کر ہی لوں گا۔“

میں نے مزید کچھ نہ کہا اور وہ اٹھ کر برآمدے کی طرف چلا گیا۔

میں ذہنی طور پر شدید دباؤ کا شکار تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں ھلیندر کے ہاتھوں میں پوری طرح پھنسا ہوا ہوں‘ میں نے اُس سے نہایت خشک انداز میں بات کی تھی۔

اندھیرا پھیل گیا تو لان میں مچھروں نے بھنبھنانا اور مجھے کاٹنا شروع کر دیا۔ میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

کچھ دیر بعد خانساماں میرے پاس آ گیا اور بولا۔

”سرکار!... کیا آپ کھانا پسند کریں گے؟“

”نہیں۔“ میں نے تلخی سے جواب دیا۔

”ھلیندر جی کہہ رہے تھے کہ اگر آپ کھانا کھا لیں تو بہتر ہے۔“ میری تلخی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے اپنے سابقہ ملائم لہجے میں کہا۔

”اس سے کہہ دو کہ مجھے نہیں کھانا ہے کھانا۔“ میرا تلخ انداز بھی برقرار رہا۔

”بہتر ہے سرکار!...... ویسے جب بھی آپ کو بھوک محسوس ہو آپ ہمیں بتا دیجیے گا۔“ وہ بولا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ھلیندر میرے پاس آ گیا۔ میں صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گیا۔ اس نے جیب سے سگار نکالا اور اُسے لائٹر سے سلگانے کے بعد کچھ کش لے کر مجھ سے بولا۔ ”ابھی ہمیں پھر پہلے کی طرح جگجیت کے پاس جانا ہوگا۔ اگر تم گڑبڑ کرو گے تو میں تم پر سختی کرنے پر مجبور ہوں گا۔“

میں خاموش رہا۔ ذرا دیر بعد وہ بولا۔ ”تم کھانا کیوں نہیں کھا رہے ہو؟“

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”دیکھو!...... میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا ہوں بلکہ جو کچھ بھی کروں گا وہ تمہارے لیے اچھا ہی ہوگا۔ بہتر ہے تم میرے ساتھ تعاون کرو۔“ وہ بولا۔

”تم نے جو کرنا ہے وہ کرو‘ مجھ سے کسی قسم کے تعاون کی اُمید مت رکھو۔“ میں نے تلخی سے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ تم اگر مجھے سختی پر مجبور کر رہے ہو تو یونہی سہی‘ میں تو چاہتا تھا کہ تم خود اٹھ کر میرے ساتھ چلو لیکن اگر تم تعاون نہیں کرنا چاہتے تو نہ سہی۔“ اس نے کہا اور پھر اُس نے فضا میں دیکھتے ہوئے یوں اشارہ کیا جیسے کسی کو میری طرف آنے کا اشارہ کر رہا ہو۔

چند ہی لمحوں بعد کسی ان دیکھے وجود نے مجھے جکڑ لیا۔ میں نے خود کو اس سے چھڑانے کی کوشش کی لیکن گرفت بہت سخت تھی۔ مجھے اٹھا لیا گیا اور پھر وہ نادیدہ مخلوق مجھے لے کر چل پڑی۔ اس دوران ھلیندر بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

ہم اس کمرے میں گئے جہاں ھلیندر نے مجھے میز پر لٹایا تھا اور ایک بار پھر مجھے ان دیکھی مخلوق نے اسی میز پر لٹا دیا۔ میں اتنا جکڑا ہوا تھا کہ ہلنے جلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ھلیندر اسی کرسی پر بیٹھ گیا جس پر وہ پہلے بیٹھا تھا۔ اُس نے چراغ روشن کر لیا۔ انسانی کھوپڑی اُٹھا کر اپنی ہتھیلی پر رکھ لی اور پہلے والا عمل کر ڈالا۔ پھر وہ اٹھ کر میرے پاس آن کھڑا ہوا۔ اُس نے سختی سے مجھ سے کہا۔ ”اب تم چھت کی طرف دیکھو۔“

میں نے اس کی ہدایت پر عمل نہیں کیا۔

”میں کہتا ہوں چھت کی طرف دیکھو!“ اُس نے مزید سختی سے کہا۔

”نہیں دیکھوں گا۔“ میں نے طیش میں آ کر کہا۔

”اچھا۔“ اُس نے جیسے خون کا گھونٹ پیا۔ پھر اُس نے اپنی دائیں ہتھیلی میرے جسم سے ذرا اُوپر چلانا شروع کر دی۔ اُس کی ہتھیلی میرے سر سے پیروں تک گئی اور پھر میرے سر تک آ گئی۔ اُسی وقت مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا اختیار اپنے اوپر نہیں رہا ہے‘ میری آنکھیں خود بخود چھت کو دیکھنے لگیں اور پھر ھلیندر نے کچھ بڑبڑا کر مجھ پر پھونک ماری‘ میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ پھر میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ میں ہوش و حواس سے بیگانہ

ہوگیا اور پھر جیسے مجھے ہوش آ گیا۔

شلیندر نے میرا ہاتھ پکڑا اور ہم دونوں فضاء میں تیرتے ہوئے کمرے کے دروازے سے باہر آ گئے۔ اب میری آتما شلیندر کی آتما کے ساتھ تھی۔

ہم دونوں باہر آ گئے اور لان میں آنے کے بعد ہم نے آسمان کی جانب پرواز شروع کر دی اور ہم ایک بار پھر جگجیت کی جھونپڑی کے سامنے اتر گئے۔

شلیندر نے جھونپڑی کے دروازے پر دستک دی۔

"اندر آ جاؤ۔" اندر سے جگجیت کی آواز آئی۔

ہم دونوں جھونپڑی کے اندر داخل ہو گئے۔ جگجیت وہیں بیٹھا تھا جہاں میں نے اُسے پہلے دیکھا تھا' اُس کا انداز و نشست بھی پہلے ہی جیسا تھا۔ شلیندر نے اُسے نمستے کہا اور بیٹھنے کی اجازت چاہی' جگجیت نے اجازت دے دی تو ہم دونوں اس کے سامنے بیٹھ گئے۔

جگجیت کچھ دیر تو مجھے گھورتا رہا' پھر اُس نے انداز نشست بدل دیا۔ اُس نے اپنا دایاں ہاتھ میری طرف پھیلا دیا اور کچھ بڑبڑانے لگا۔

اچانک زوردار دھما کا سا ہوا جو کہ ہمارے عقب سے ہوا تھا۔ میں نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔ جھونپڑی کا دروازہ گر چکا تھا اور ایک آدمی اندر داخل ہو رہا تھا' اس کے چہرے پر پھیلے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ سخت طیش میں ہے۔

"کیا کرنے آئے ہو یہاں اور...... یہ تم نے کیا انداز اختیار کر رکھا ہے؟" شلیندر نے کھڑے ہو کر اُس آدمی سے چیختے ہوئے کہا۔

"میرا حصہ مجھے دے دیا جائے ورنہ میں اعلانِ بغاوت کرتا ہوں۔" وہ آدمی سختی سے بولا۔

"جتیندر!...... یہ تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو۔" شلیندر نے بھی اسی لہجے میں کہا۔

"میں بہتر جانتا ہوں کہ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ یا غلط...... بس میں نے جو کہہ دیا ہے وہ کر دیا جائے ورنہ میں اپنا حصہ وصول کرنے کے لیے جو کچھ مجھ سے ہو سکتا ہے' وہ میں کروں گا۔" جتیندر پھر سابقہ سختی کے ساتھ بولا۔

"جگجیت جی!...... آپ ہی اسے سمجھائیں۔" شلیندر نے جگجیت سے کہا۔

"تم جاؤ!...... یہ سب مت کرو۔" جگجیت نے ذرا سخت لہجے میں جتیندر سے کہا۔

"بکواس بند کرو۔" جتیندر نے اُسے نظر انداز کرتے ہوئے اُسے جھڑک دیا۔ "یہ سب تمہاری ناانصافی کی وجہ سے ہے۔ پہلے بھی تم اسے نوازتے رہے ہو۔" اس نے شلیندر کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ تمہارا بہت چہیتا ہے کیا؟ یا اس نے مجھ سے بڑھ کر تمہاری سیوا کی ہے؟"

"جا چلا جا یہاں سے۔" جگجیت اُس پر غرایا۔

"نہیں جاؤں گا۔" جب تک تم میرا حصہ نہیں دو گے میں نہیں جاؤں گا۔" جتیندر نے ڈھٹائی کے ساتھ کہا۔

"کچھ نہیں ملے گا تجھے' میں جسے جو چاہوں گا' دوں گا۔" جگجیت بولا۔

"بس تو پھر تیار ہو جاؤ' میری بغاوت تم سب کو مہنگی پڑے گی' سب سے پہلے تو میں شلیندر کا یہ کام بھی خراب کروا دوں گا۔" اُس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم نے اگر کچھ کیا تو میں تمہارا بہت بُرا حشر کروں گا۔" جگجیت غرایا۔

"مجھے اپنی پروا نہیں ہے لیکن میں سب کا کھیل بگاڑ دوں گا' بس تم مجھے یہ بتاؤ کہ میری بات مان رہے ہو یا نہیں؟" جتیندر نے اپنے دونوں ہاتھ اطراف میں لٹکا کر کہا۔

"تجھے جو کرنا ہے کر لے' میں تیری کوئی بات نہیں مانوں گا۔" جگجیت نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"ٹھیک ہے...... تو پھر یونہی سہی۔" جتیندر آگ بگولہ ہو کر بولا۔ پھر اُس نے اپنی مٹھی کھولی اور اس پر پھونک ماری' اس میں سے کئی رنگ کا سفوف اڑ کر فضاء میں پھیل گیا۔ اب اس سفوف کی وجہ سے مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر کسی نے مجھے پکڑ کر اٹھا لیا' وہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ مجھے لے کر چل پڑا۔

کچھ دیر بعد مجھے جھونپڑی سے باہر لایا گیا۔ اب بھی مجھے کسی نادیدہ مخلوق نے اٹھا رکھا تھا۔

میں فضاء میں تیرنے لگا۔ یہ تو مجھے پتہ تھا کہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ جتیندر کی ایما پر ہو رہا ہے لیکن مجھے یہ بالکل اندازہ نہیں تھا کہ مجھے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔

بہت دیر تک میں فضاء میں تیرتا رہا' آخر مجھے دور ایک عمارت نظر آئی جو چراغوں سے روشن تھی۔ وہ بہت شاندار عمارت تھی' اُسے دیکھ کر کسی محل کا گمان ہوتا تھا۔ میں اُس عمارت کے اندر پہنچ گیا۔ یہاں ایک وسیع باغ تھا۔ جس کے وسط میں ایک خوبصورت تالاب تھا اس کے وسط میں فوارہ جاری تھا۔ باغ کے اطراف میں کیاریاں بنی ہوئی تھیں جن میں رنگ برنگے پھول نظر آ رہے تھے۔

باغ سے آگے سنگ مرمر کا بنا ہوا صحن تھا' اس کے بعد ایک لمبا برآمدہ نظر آ رہا تھا اور وہیں کئی کھڑکیاں اور دروازے نظر آ رہے تھے

"بس اب تم یہیں بیٹھ جاؤ' جب تک جتیندر جی نہ آ جائیں۔ تم یہاں سے کہیں نہیں جانا۔" ایک خوب صورت مترنم نسوانی آواز میری سماعت سے ٹکرائی اور مجھے گرفت سے آزاد کر دیا گیا۔

میں وہیں گھاس پر بیٹھ گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے میں سوچنے لگا کہ آخر یہ کون سی جگہ ہے؟

تقریباً دس منٹ بعد عمارت کے صدر دروازے سے جتیندر اندر داخل ہوا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا میرے پاس آ گیا۔ "تمہارا بہت شکریہ کہ تم نے مجھے ان لوگوں کے ہاتھوں سے بچا لیا۔ کیا تم میری مزید کچھ مدد کر سکو گے؟ کیا مجھے ان لوگوں کی قید سے مجھے مکمل طور پر آزادی دلا سکو گے؟" میں نے اُس سے کہا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں؟" وہ بولا۔ "میں ضرور تمہاری مدد کروں گا اور تمہیں آزادی دلا دوں گا۔"

"میں زندگی بھر تمہارا شکرگزار رہوں گا۔" میں نے کہا۔

"نہیں...... اس میں شکریے کی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے تمہاری مدد کر کے خوشی ہو گی۔ آؤ میرے ساتھ...... ہم آرام سے بیٹھ کر بات چیت کریں گے۔" وہ بولا۔

میں اس کے ساتھ چل دیا۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لے آیا۔ یہاں زمین پر قالین بچھا تھا۔ دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیے رکھے تھے۔ کمرے کے وسط میں چھت سے ایک فانوس لٹک رہا تھا جس میں چراغ روشن تھے۔ کھڑکیوں پر سرخ مخملی پردے پڑے ہوئے تھے۔

"آؤ...... یہاں بیٹھ جاؤ۔" جتیندر نے ایک گاؤ تکیے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ میں بیٹھ گیا اور وہ بھی مجھ سے ذرا فاصلے پر ایک گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "تم جانتے ہو کہ وہ لوگ تمہارے ساتھ کیا کرنا چاہتے تھے؟"

"نہیں' مجھے بالکل اندازہ نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ تمہیں زندہ حالت میں قبر میں دفن کرنا چاہتے تھے۔" اس نے بتایا تو میں پریشان ہو گیا اور بولا۔

"اس کا مطلب ہے کہ شلیندر میرے ساتھ بڑا دھوکا کر رہا تھا۔"

"کیسا دھوکا؟" اس نے بھوئیں سکیڑ کر کہا۔

"وہ کہہ رہا تھا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے' اس میں میرا فائدہ ہے اور وہ مجھے ایک خوشیوں بھری زندگی دینا چاہتا ہے۔" میں نے بتایا۔

وہ ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولا۔ "بڑے سہانے سپنے دکھائے تھے اس نے تمہیں۔"

"وہ تو تم عین وقت پر آ گئے اور مجھے بچا لیا ورنہ میں تو موت کے منہ میں چلا جاتا۔" میں نے کہا۔

"میں اس انتظار میں تھا کہ شلیندر تمہیں لے کر وہاں پہنچے اور میں اس کام خراب کر دوں۔" وہ بولا۔

"تم کس حصے کی بات کر رہے تھے؟" وہ بولا۔

"وہ دولت کا معاملہ ہے۔ اس دولت پر میرا اور شلیندر کا برابر کا حق تھا لیکن جگجیت نے اُسے زیادہ دولت دے دی اور مجھے میرا حق نہیں دیا۔ میں نے کئی مرتبہ ان لوگوں سے اس معاملے پر بات کی اور اپنے حق کا مطالبہ کیا لیکن انہوں نے میری بات کو اہمیت نہیں دی اور پھر مجھے مجبور ہو کر ان کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنا پڑا۔" اُس نے جواب دیا۔

"مجھے اگر تم واپس پہنچا دو تو تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔" میں نے درخواست کرنے والے انداز میں کہا۔

"میں یقیناً ابھی تمہیں واپس پہنچا دیتا لیکن فی الحال میرے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں ہے کیوں کہ ابھی شلیندر والا معاملہ ختم نہیں ہوا ہے۔ میں نے ایک تو ان کے نرغے سے تمہیں نکال لیا ہے اس کے علاوہ میں نے دیگر کئی طریقوں سے بھی انہیں نقصان پہنچا دیا ہے۔ ابھی تو میری طرف سے ان پر حملہ ہوا ہے اور مجھے توقع ہے کہ وہ لوگ جلد ہی مجھ سے بدلہ لینے کے لیے کوئی نہ کوئی کارروائی کریں گے اس لیے جب تک میں ان لوگوں کی طرف سے پوری طرح مطمئن نہیں ہو جاتا' کہیں جا نہیں سکتا ہوں' ویسے تم بے فکر ہو کر یہاں رہو' اس وقت تم ایک آتما کی صورت میں ہو اس لیے تمہیں ویسے بھی زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے' کھانے پینے' چلنے پھرنا' تھکنے یا سونے وغیرہ جیسے معاملوت سے تو تم آزاد ہو۔ بس جیسے ہی میں اپنے معاملات سے فارغ ہوں گا ہم یہاں سے چلیں گے' میں بھی مستقل طور پر یہاں نہیں رہتا' میں بھی ممبئی ہی میں رہتا ہوں اس لیے مجھے بھی واپس جانا ہے۔" اُس نے تفصیل سے بات کی۔

"ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی...... ویسے اگر تمہیں کسی معاملے میں میری ضرورت ہے تو میں حاضر ہوں؟" میں نے پیش کش کی۔

"تمہارا بہت بہت شکریہ!...... مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہے' بس تم بے فکر ہو کر یہاں رہو۔" وہ بولا۔

"بہرحال...... اگر تمہیں کسی بھی مرحلے پر میری کوئی بھی ضرورت پڑے تو مجھے بتا دینا' تمہاری مدد کر کے مجھے خوشی ہوگی۔ ویسے تو تم نے میری جان بچا کر مجھ پر احسان کا جو قرض چڑھا دیا ہے۔ اُسے میں زندگی بھر نہیں اُتار سکتا لیکن اگر میں تمہارے کسی بھی کام آسکوں تو میرے لیے خوشی کی بات ہوگی۔" میں نے کہا۔

"تمہارے خلوص کا بہت بہت شکریہ۔ اچھا اب میں اپنے ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ تم بے فکر ہو کر رہو۔ ہو سکتا ہے کہ میں جب واپس آؤں تو شلیندر والا معاملہ ختم ہو چکا ہو اور ہم واپس جا سکیں۔" وہ بولا۔

"بھگوان کرے ایسا ہی ہو۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"اچھا اب میں چلتا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

☆

آج جتیندر کو گئے ہوئے تین دن گزر چکے تھے۔ مجھے شدت سے اس کا انتظار تھا۔ یہاں تو مجھے کوئی تکلیف نہیں تھی ہاں البتہ یہ فکر دامن گیر تھی کہ نہ جانے شلیندر کے گھر میں میرے جسم کے ساتھ کیا ہو رہا ہوگا؟ مجھے خطرہ تھا کہ کہیں اُسے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔

اس وقت شام ہو رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ آج بھی جتیندر واپس نہیں آیا اور نہ جانے اُسے مزید کتنے دن لگیں گے۔ ابھی میں انہیں سوچوں میں گم تھا کہ جتیندر آ گیا۔ وہ کچھ مضطرب تھا۔ اُس نے پریشان لہجے میں مجھ سے کہا۔

"وجے!...... ہم لوگوں کو فوراً یہاں سے چلنا ہے۔"

"خیریت تو ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں...... حالات کچھ گڑبڑ ہو گئے ہیں اور ہمیں فوراً یہاں سے جانا ہے۔ آؤ چلو میرے ساتھ۔"

وہ مجھے لے کر چل پڑا۔ پھر ہم تیز رفتاری کے ساتھ فضاء میں پرواز کرنے لگے۔

کچھ دیر ہم ایک جگہ زمین پر اُتر گئے۔ یہاں ایک جانب درختوں کے جھنڈ تھے۔ ہم اُس جھنڈ کے اندر گھستے چلے

گئے۔

"بس اب یہاں بیٹھ جاؤ۔" جتیندر نے مجھ سے کہا۔

ہم دونوں درختوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

کچھ دیر بعد ایک بھاری بھرکم مردانہ آواز آئی۔

"جتیندر!...... اگر تم اپنی خیریت چاہتے ہو تو باہر آ جاؤ۔" میں اس آواز کو نہیں پہچانتا تھا۔ میں نے جتیندر کی طرف دیکھ کر کہا۔

"یہ کس کی آواز ہے؟"

"یہ جگجیت کا ساتھی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"اچھا اچھا۔" میں نے کہا۔

"جتیندر!...... میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ تم اگر اپنی خیریت چاہتے ہو تو باہر آ جاؤ...... اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو' میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم میری بات مان لو میں تمہارے ساتھ رعایت کروں گا۔" جگجیت کے ساتھی کی آواز ایک مرتبہ پھر آئی۔

جتیندر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ تو پھر تیسری مرتبہ اس آدمی کی آواز آئی۔ "جتیندر!...... میں آخری مرتبہ تم سے کہہ رہا ہوں کہ تم میرے پاس آ جاؤ ورنہ تمہیں بہت پچھتانا پڑے گا...... میں بس یہ تمہیں آخری مرتبہ کہہ رہا ہو۔ اگر تم پانچ منٹ کے اندر مجھ تک نہ آئے تو پھر ہر طرح کے نقصان کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔"

"تم یہاں سے چلے جاؤ۔ میری اور تمہاری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تم کیوں خواہ مخواہ میرے پیچھے پڑ گئے ہو؟" اب جتیندر نے بھی چیخ کر کہا۔ مجھے اس کی بات پر حیرت بھی ہوئی کیوں کہ وہ کہہ رہا تھا کہ جگجیت کے ساتھی اور اس کی کوئی دشمنی نہیں ہے جب کہ ان لوگوں کی تو آپس میں سخت دشمنی چل رہی تھی اور جتیندر ان لوگوں کو کچھ نقصان بھی پہنچا کر آیا تھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم باہر نہیں آؤ گے؟" جگجیت کے ساتھی کی آواز آئی۔

"میں نے تم سے کہا ناں کہ میری اور تمہاری کوئی دشمنی نہیں ہے اس لیے بہتر ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔" جتیندر نے بلند آواز میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اب ہر طرح کے نقصان کی ذمہ داری تمہارے اپنے اوپر ہوگی۔" جگجیت کا ساتھی بولا۔

اسی وقت جتیندر بڑبڑانے لگا۔ اس نے سامنے موجود درختوں کی طرف ہاتھ پھیلا دیا۔ ایک درخت جڑ سے اکھڑ گیا اور فضاء میں تیرتا ہوا ایک جانب چلا گیا۔

کچھ دیر بعد ایک اور درخت بھی اس طرح چلا گیا اور پھر اسی طرح کئی درخت اکھڑ کر چلے گئے۔

تقریباً پانچ منٹ بعد درختوں کے درمیان سے نکل کر ایک لمبا تڑنگا اور صحت مند آدمی ہمارے سامنے آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کوڑا تھا جسے اُس نے جھٹکا تو اُس کے زمین پر لگنے کی وجہ سے زوردار آواز آئی۔ وہ غضب ناک لہجے میں جتیندر سے بولا۔ "میں نے تم سے کہا تھا کہ تم میری بات مان لو...... تم جانتے ہو کہ میرے پاس کتنی شکتی ہے۔ کیا تم یہ سمجھ رہے تھے کہ میں تم تک نہیں پہنچ سکوں گا یا تمہارے وہ پھینکے ہوئے درخت میرا کچھ بگاڑ لیں گے؟"

"لیکن میں بھی تو تم سے کہہ رہا ہوں کہ میری اور تمہاری کوئی دشمنی نہیں ہے' تو پھر تم کیوں خواہ مخواہ میرے پیچھے پڑے ہو؟" جتیندر نے قدرے تلخ لہجے میں اُس سے کہا۔

"میری دشمنی تو تم سے اور تم جیسے تمام لوگوں کے ساتھ ہے۔ جو کوئی بھی شردھان جی کی پوجا نہیں کرے گے۔ وہ میرا دشمن ہی ہوگا۔" اس آدمی نے کہا۔

"دیکھو موتی رام!...... تم بلاوجہ ہم سب کو شردھان جی کا پجاری بنانا چاہتے ہو اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس کے پیچھے تمہارا ایک خاص مقصد کارفرما ہے اور وہ یہ ہے کہ تم کسی طرح سب کو شردھان جی کا پجاری بنا کر سب لوگوں کے سردار بن جاؤ کیوں کہ تم ہی دھان جی کے سب سے بڑے پجاری ہو۔ اگر تم یہ وعدہ کرو کہ تم سرداری مجھے دو گے تو میں تمہاری بات ماننے کے لیے تیار ہوں؟" اُس

نے موتی رام کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔
"سرداری تو میں ہی کروں گا۔" موتی رام حتمی انداز میں بولا۔
"بس..... یہی تو وجہ اختلاف ہے۔ بھلا میں کیوں تمہاری سرداری قبول کرلوں؟" جتیندر بولا۔
"میں اپنا مقصد زبردستی بھی حاصل کرسکتا ہوں۔ ویسے تم نے یہ غلط کہا کہ میں سرداری کرنے کا خواہش مند ہوں۔ مجھے ایسی کوئی خواہش نہیں ہے لیکن حالات کے پیش نظر سرداری مجھے ہی کرنی چاہیے کیوں کہ کوئی اور اس کا اہل نہیں ہوسکتا۔ شردھان جی کی پوجا میں نے ہی کی ہے اور میں ہی ان کے بارے میں زیادہ بہتر جانتا ہوں۔ ان کی تعلیمات کو کس طرح پھیلانا ہے۔ ان کی تعلیمات کے اسرار و رموز تو صرف میں ہی جانتا ہوں اس لیے مجبوراً سرداری مجھے ہی کرنی پڑے گی۔" موتی رام نے کہا۔
"یہ تم بہانہ کررہے ہو۔ دراصل تمہیں سرداری ہی چاہیے۔" جتیندر نے اس کی باتوں کو رد کرتے ہوئے کہا۔
"ٹھیک ہے۔" موتی رام کو غصہ آگیا۔ "اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو پھر یونہی سہی..... میں تو چاہتا ہوں کہ تمہارے ساتھ رعایت کروں لیکن تمہارا رویہ بتا رہا ہے کہ مجھے تمہارے ساتھ سختی کرنی پڑے گی۔"
"اس میں تمہارا بھی نقصان ہوسکتا ہے، تمہاری موت بھی واقع ہوسکتی کیوں کہ میں بھی اتنا کمزور نہیں ہوں کہ تم آسانی سے مجھ پر قابو پالو گے۔ بہتر ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ اور اپنے کام سے کام رکھو۔" جتیندر ناگوار لہجے میں بولا۔
"دیکھو!..... تمہیں میری شکتی کا اندازہ نہیں ہے، میں تمہیں چیونٹی کی طرح مسل دوں گا۔ میرے نرم رویے کو میری کمزوری مت سمجھو اس لیے بہتر ہے کہ میری بات مان لو شردھان جی کی تعلیمات میں ایک بات یہ بھی ہے کہ لوگوں کی جان لینے سے جس حد تک ہوسکے گریز کرو، میں ان ہی کی تعلیمات پر عمل کررہا ہوں اور صبر و ضبط کا مظاہرہ کررہا ہوں لیکن شردھان جی کی یہ تعلیمات بھی ہیں کہ اگر کوئی بہت زیادہ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرے اور بات نہ مانے تو اس کو طاقت کے ذریعے اپنا غلام بنالو اور اگر بہت زیادہ مزاحمت کرے تو اُسے مار ڈالو۔ بس یہی وجہ ہے کہ میں ابھی تمہارے ساتھ کوئی سخت رویہ اختیار کرکے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا لیکن اگر تم نے میری بات نہ مانی تو میں سختی کرنے پر مجبور ہوں گا۔ بولو..... کیا تم میری بات ماننے کے لیے تیار ہو؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے جتیندر کی طرف دیکھا۔
"نہیں..... میں تمہاری کوئی بات نہیں مانوں گا۔ بلکہ تمہارا سارا غرور خاک میں ملا دوں گا۔" جتیندر نے چراغ پا ہوتے ہوئے کہا۔
موتی رام نے غضب ناک ہوکر کوڑا لہرایا اور اس کوڑے کے زمین پر لگنے کی وجہ سے ایک بار پھر زوردار آواز پیدا ہوئی۔ وہ مشتعل آواز میں بولا۔ "ٹھیک ہے..... تو پھر تم جو کرسکتے ہو کرلو..... میں بھی دیکھتا ہوں کہ تمہارے پاس کتنی شکتی ہے۔"
جتیندر بڑبڑانے لگا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ موتی رام کی طرف پھیلا دیئے۔ پھر اُس نے ہاتھوں کو دائیں بائیں پھیلا دیا اور پھر انہیں جھٹکے سے بلند کیا۔ اُسی وقت دونوں جانب کے کئی درخت جڑوں سے اکھڑ کر فضاء میں بلند ہوئے اور تیزی سے موتی رام کی طرف بڑھے موتی رام نے اپنا کوڑا زمین پر مارا آواز پیدا ہوئی اور جو درخت اس کی طرف جارہے تھے، وہ اسی رفتار سے واپس پلٹ کر تیرتے ہوئے اپنی جگہوں پر پہنچے اور واپس اپنی جگہوں میں پیوست ہوگئے۔
جتیندر نے اپنے لباس میں سے ایک چمکتا ہوا خنجر نکالا لیا اور اُسے موتی رام کی طرف کھینچ مارا۔ موتی رام نے ایک بار پھر اپنا کوڑا زمین پر مارا اور اپنی طرف آنے والے خنجر کو پکڑ لیا۔
جتیندر اب بھی بڑبڑا رہا تھا۔ اُس نے چیخنے جیسے انداز میں آواز نکالی اور فضاء میں اڑتا ہوا ایک جانب جانے لگا۔ ادھر موتی رام نے اپنا کوڑا زمین پر مارا اور وہ بھی جتیندر کی طرف فضاء میں تیرتا ہوا اس کے تعاقب میں جانے لگا۔
کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں میری نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ میں حیران پریشان تھا کہ آخر یہ موتی رام کون ہے۔ جتیندر اور اس کی باتوں سے تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے موتی رام کا تعلق جگجیت سے نہیں ہے یا پھر اگر اس کا ایسا کوئی تعلق تھا تو میں اُسے سمجھ نہیں سکا تھا۔ میں اب اس سے پریشان تھا کہ نہ جانے موتی رام اور جتیندر کی چپقلش کا کیا نتیجہ نکلے گا اور اگر وہ دونوں واپس نہ آئے تو میرا کیا بنے گا۔ کیا میں ساری عمر انہی جنگلات میں بھٹکتا رہوں گا؟
تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا۔ اب میری بے چینی کافی بڑھ گئی تھی۔ جتیندر اور موتی رام میں سے اب تک کوئی واپس نہیں آیا تھا اور پھر موتی رام آگیا۔ میں نے اُس سے فوراً کہا۔ "جتیندر کہاں ہے؟"
اُس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ آگئی۔ وہ بولا۔ "آؤ میرے ساتھ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ وہ کہاں ہے۔"
میں اُس کے ساتھ چل پڑا۔ اس نے میرا بازو پکڑ لیا۔ ہم دونوں فضاء میں تیرنے لگے۔
تقریباً پانچ منٹ بعد ہم ایک میدان میں اُتر گئے۔ یہاں ایک جھونپڑی تھی۔ موتی رام نے اُس کا دروازہ دھکیلا اور ہم دونوں اندر داخل ہوگئے۔ باہر سے تو جھونپڑی چھوٹی سی دکھائی دے رہی تھی لیکن اندر سے کسی عالی شان محل جیسی تھی۔
ہم راہداری پر چلنے لگے جس کے دونوں جانب باغ تھا۔ راہداری عبور کرنے کے بعد ہم لوگ برآمدے میں آگئے۔ سامنے ہی کئی دروازے نظر آرہے تھے۔ موتی رام نے ان میں سے ایک دروازہ کھولا اور ہم اندر داخل ہوگئے۔ یہاں چھت کے عین وسط میں ایک فانوس روشن تھا۔ زمین پر قالین بچھا ہوا تھا جس پر صوفہ سیٹ رکھا تھا۔
موتی رام نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "تم بیٹھو میں ابھی کچھ دیر میں واپس آتا ہوں۔"
میں صوفے پر بیٹھ گیا جب کہ وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔
تقریباً پانچ منٹ بعد وہ واپس آیا اور مجھ سے بولا۔ "تم میرے ساتھ آجاؤ۔"
میں اُس کے ساتھ کمرے سے باہر آگیا۔ ہم برآمدے میں چلنے لگے اور پھر ہم برآمدے کے اختتام پر موجود کمرے میں داخل ہوگئے۔ یہاں جتیندر دو ٹکڑوں میں منقسم قالین پر پڑا ہوا تھا۔
"یہ..... یہ تم نے اس کا کیا حشر کیا ہے؟" میں نے پریشان ہوتے ہوئے موتی رام سے کہا۔
اُس کے چہرے پر بڑی خوفناک مسکراہٹ آگئی۔ وہ تلخ لہجے میں بولا۔ "اس خبیث کا یہی حشر ہونا تھا۔ اب اس کا جسم جو کہ یہیں اور پڑا ہے، سڑ کر ختم ہوجائے گا۔"
"لیکن..... آخر یہ سب کیا چکر ہے؟ کیا میں واپس جاسکوں گا؟" جتیندر کا حشر دیکھ کر مجھے اپنی فکر پڑ گئی۔
"بے فکر رہو..... میں تمہارے واپس جانے کا بندوبست کروادوں گا لیکن تم نے چوں کہ پوچھا ہے کہ یہ سب کیا چکر ہے تو میں تمہیں ضرور بتاؤں گا کہ یہ کیا چکر ہے۔ جتیندر تمہارا بہت بڑا دشمن تھا۔ اُس نے تمہاری زندگی سے کھلواڑ کیا تھا۔ دراصل وہ اپنی ہتکیاں تمہیں دے کر اگلی منزل پر جانا چاہتا تھا۔"
"اگلی منزل؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔
"ہاں....." وہ پُرخیال انداز میں بولا۔ "یہ لوگ اس طرح اپنے سب سے آخری مقام تک پہنچتے ہیں۔ میں تمہیں ذرا وضاحت کے ساتھ بتاتا ہوں کہ آخر یہ سب ہوتا کیا ہے۔ تم نے جگجیت کو دیکھا تھا ناں؟" اُس نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔
"ہاں۔" میں نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔

”دراصل...... وہ ان کے شعبے کی آخری منزل ہے۔ یہ عاملوں کا ملوں کا ایک بہت بڑا گروہ ہے جس میں دنیا بھر کے عامل کامل شامل ہیں۔ ان میں ہر کوئی ترقی کر کے اگلی منزل تک جانا چاہتا ہے۔ لوگ جس بھی منزل پر پہنچتے ہیں اس کے لیے کافی محنت کرنا پڑتی ہے۔ اس میں ایسی ایسی خطرناک ریاضتیں ہیں کہ کئی عامل اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں لیکن آخری منزل پر جانے کا خواب ہر عامل دیکھتا ہے۔ آخری منزل پر تم نے جگجیت کو دیکھا۔ وہ بظاہر تو ایک معمولی اور بے ضرر سا انسان دکھائی دیتا ہے لیکن یہ وہ منزل ہے کہ جب انسان کے پاس بہت زیادہ شکتیاں آجاتی ہیں اور وہ صرف اپنی آتما پر ہی قابو نہیں پالیتا بلکہ اپنے جسم کو بھی دنیا میں کہیں بھی لے جاسکتا ہے اور اسے یہ شکتی بھی حاصل ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی شکل میں خود کو ڈھالی لے۔ اس کے علاوہ دولت اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہتی کیوں کہ وہ جب بھی چاہتا ہے کہیں سے بھی دولت حاصل کر لیتا ہے اور تم جان سکتے ہو کہ دولت اس دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ جس کے پاس دولت ہوتی ہے وہ ایک پرتعیش زندگی گزار سکتا ہے۔ لہٰذا یہ لوگ دنیا میں ہر طرح کی آسائش حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ دنیا کی خوب صورت ترین عورتوں کو بھی حاصل کر سکتے ہیں اور جب ان کا دل کسی پر آتا ہے تو اسے کسی نہ کسی طرح حاصل کر لیتے ہیں ورنہ کم سے کم اُس کے جسم کے اندر گھس کر اپنے مقاصد حاصل کر لیتے ہیں۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ اکثر نوجوان لڑکیوں اور عورتوں کی حالت خراب ہوتی ہے۔ ان کے حلق سے مردوں جیسی آواز میں آنے لگتی ہیں تو ایسی عورتوں پر اکثر یہ عامل ہی قابض ہوتے ہیں۔ یہ ان کے جسموں سے تسکین حاصل کر رہے ہوتے ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ لوگ دنیا کی ہر طرح کی آسائش حاصل کر لیتے ہیں اور انسانی فطرت ہے کہ وہ دنیا کی ہر آسائش حاصل کر لینا چاہتا ہے۔ ان عاملوں میں سے ہر کوئی چاہتا ہے کہ وہ جگجیت کے مقام تک پہنچ جائے لیکن اس مقام تک پہنچنے کے لیے کئی مراحل طے کرنے پڑتے ہیں۔ سب سے پہلے تو جو بھی اس گروہ میں شامل ہوتا ہے اُسے ہلکی پھلکی ریاضت کرنی پڑتی ہیں لیکن بتدریج ان کے عملیات اور ریاضتوں میں تبدیلی ہوتی چلی جاتی ہے اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے ہیں ان کی ریاضتیں سخت سے سخت ہوتی چلی جاتی ہیں۔ انہیں کئی دنوں تک بھوکے رہنا پڑتا ہے۔ جانوروں کا کچا گوشت کھانا پڑتا ہے اس کے بعد انسانوں کا بھی گوشت کھانا پڑتا ہے اور ساتھ ہی مختلف اوقات میں انسانوں کا خون بھی پینا پڑتا ہے۔ انہیں اپنے قبضے میں کئی آوارہ آتماؤں کو کرنا پڑتا ہے اور یہ وہ خطرناک مرحلہ ہوتا ہے کہ جب عامل کی جان کو خطرہ ہوتا ہے۔ بہت سے عامل اس مرحلے پر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔“

اس نے چند لمحے توقف کیا اور پھر اپنی بات بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”دیگر بہت سے مراحل اور ریاضتیں ہیں جنہیں میں تمہیں بتانا ضروری نہیں سمجھتا کیوں کہ میں نے تمہیں جس قدر بتا دیا ہے تم اس سے اندازہ کر سکتے ہو کہ یہ عامل کیا کچھ کرتے ہوں گے لیکن جس ریاضت اور مرحلے کا تم سے تعلق ہے اس کے بارے میں میں تمہیں ضرور بتاؤں گا۔ ان عاملوں کا ایک مرحلہ یہ ہے کہ کچھ خاص منزلیں طے کرنے کے بعد جب انہیں اپنی اگلی منزل تک جانا ہوتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنی تمام شکتیاں کسی اور عام سے انسان میں کچھ عرصہ کے لیے منتقل کر دیں۔ یہ مرحلہ تقریباً پانچ سال کے لیے ہوتا ہے۔ یعنی پانچ سالوں کے لیے وہ عامل کسی عام انسان کو اپنی شکتیاں منتقل کرتا ہے اور اگلی منزل کے لیے ریاضت وغیرہ کرتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ جس بھی انسان کو وہ ریاضتیں منتقل کی جائیں وہ اپنے اندر اتنی روحانی طاقت رکھتا ہو کہ ان تمام شکتیوں کا بوجھ سنبھال سکے۔ کسی عام آدمی پر اگر اچانک ان شکتیوں کا بوجھ ڈال دیا جائے تو وہ اس کے لیے ناقابل برداشت ہوں گی اور وہ آدمی مر جائے گا اس لیے عامل اپنے لیے پہلے کسی بچے کا

انتخاب کرتا ہے اور آہستہ آہستہ اُس کے اندر روحانی شکتیاں برداشت کرنے کی طاقت پیدا کرتا ہے اور شلیندر نے تمہارے ساتھ بھی یہی کیا تھا۔ جب تم چھوٹے سے تھے تو اس نے تمہارا انتخاب کر لیا تھا اور تم پر کام شروع کر دیا تھا۔“

”ہاں...... اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ بچپن سے ہی میرے ساتھ ہے۔“ میں نے موتی رام کی بات کی تصدیق کی۔

”ہوں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلا کر ہنکارہ بھرا۔ ”جب یہ عامل اپنی مخصوص منزل پر جانے لگتے ہیں تو تم جیسے کسی منتخب کیے ہوئے آدمی کو اپنی شکتیاں منتقل کر دیتے ہیں اور پھر تقریباً پانچ سال تک یہ اپنی ریاضت کرتے رہتے ہیں اور جب یہ اپنی ریاضت ختم کر لیتے ہیں تو اپنی شکتیاں واپس لے لیتے ہیں۔ ایسے میں اس شخص کے لیے زندہ رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کا جسم اتنی شکتیوں کے بوجھ سے اتنا کمزور اور لاغر ہو چکا ہوتا ہے کہ جونہی یہ شکتیاں اس سے واپس لی جاتی ہیں اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔“

”اوہ...... اس کا مطلب ہے کہ شلیندر نے میری موت کا بندوبست کر دیا تھا؟“ میں نے پریشان ہو کر کہا۔

”ہاں...... لیکن اب اس کا کھیل بگڑ چکا ہے۔“ وہ بولا۔

”یہ تو تم نے مجھ پر بہت بڑی مہربانی کی کہ اُس سے میری جان بچالی۔“ میں نے متشکرانہ انداز میں اس سے کہا۔

”یہ مہربانی کی بات نہیں ہے بلکہ...... یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ حالات ایسے ہو گئے کہ تم بچ گئے۔“ وہ بولا۔

”لیکن بہرحال میں تمہاری ہی وجہ سے اس سے بچ گیا ہوں۔ اس لیے میں زندگی بھر تمہارا شکر گزار رہوں گا۔“ میں نے سابقہ انداز میں کہا۔ ”ویسے شلیندر کس حال میں ہے؟“

”میں نے اُس کا بھی وہی حشر کیا ہے جو جتیندر کا کیا تھا۔ اب تمہیں شلیندر کی طرف سے بھی فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ بولا۔

”تم نے ان دونوں کو یقیناً کسی وجہ سے مارا ہوگا۔ میرا مطلب ہے کہ تمہاری کوئی نہ کوئی دشمنی ضرور ہوگی ان سے؟“ میں نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”ہاں۔“ اُس کے لہجے میں تلخی گھلی ہوئی تھی۔ ”میری ان سے ایک خاص دشمنی تھی۔ یہ بھی تمہیں بتا دوں کہ جتیندر اور شلیندر دونوں آپس میں بھائی تھے۔ یہ دہلی میں رہتے تھے۔ جب یہ جوان تھے تو انہیں عامل کامل بننے کا شوق ہوا۔ دونوں ہی نہایت خبیث فطرت کے مالک تھے۔ میری ایک بڑی بہن تھی اس کا نام سادھنا تھا۔ وہ بڑی خوب صورت تھی۔ ان دنوں اس کی شادی کی بات چل رہی تھی۔ شلیندر نے اُسے کہیں دیکھ لیا اور پھر اُس نے جتیندر کے ساتھ مل کر سادھنا کو اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا۔ میں ان دنوں اپنی چوڑیوں وغیرہ کی دکان چلاتا تھا۔ ان دونوں بھائیوں نے مل کر سادھنا کو اغوا کر لیا اور اس کی عزت تار تار کر دی۔ وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکی اور اس نے آتما ہتھیا کر لی۔ اس کے غم میں میری ماتا جی پاگل ہو گئیں۔ میرا پورا گھرانہ ہی تباہ و برباد ہو کر رہ گیا۔ شلیندر اور جتیندر منظر عام سے غائب ہو چکے تھے۔ میں نے انہیں بہت تلاش کیا لیکن وہ نہیں ملے۔ پھر ایک روز میری ملاقات ایک سادھو سے ہوئی۔ اُس نے میری خراب حالت اور پریشان ذہنی کیفیت دیکھ کر مجھ سے حالت پوچھے۔ میں نے اُسے حالات بتائے کہ اور یہ بھی بتایا کہ میں شلیندر اور جتیندر کی تلاش میں ہوں۔ اگر وہ میرے ہاتھ آجائیں تو میں انہیں ختم کر دوں گا۔ اس پر اس سادھو نے بتایا کہ میں ان دونوں کو آسانی سے نہیں مار سکتا۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ وہ دونوں بڑے عامل ہیں ان کے پاس بڑی شکتیاں ہیں اور میرے لیے ان کو مارنا آسان نہیں ہوتا۔ تب میں نے اس سے کہا کہ وہ مجھے ان سے انتقام لینے کا کوئی طریقہ بتائے۔ اُس نے کہا

کہ ہی راستہ ہے کہ میں ان سے بڑا عامل بن جاؤں۔ میں نے اس سے کہا کہ اس سلسلے میں کیا وہ میری کوئی مدد کر سکتا ہے؟ اس نے کہا کہ وہ مجھے اپنا شاگرد بنا سکتا ہے لیکن مجھے دنیا چھوڑنی پڑے گی۔ دنیا تو میری ویسے ہی اجڑ چکی تھی۔ اس وقت میرا اس دنیا میں کوئی رہا ہی نہیں تھا۔ ماتا جی اور سادھنا ہی میرے کنبے کے افراد تھے۔ سادھنا مر چکی تھی اور ماتا جی کو پاگل خانے میں داخل کروا دیا گیا تھا اس لیے میں نے سادھو کی بات مان لی۔ اس نے مجھ پر محنت کرنا شروع کر دی۔ اس سلسلے میں کئی مرتبہ اس کے ساتھ دوسرے شہروں میں بھی جانا ہونے لگے اور پھر ماتا جی کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد تو میں مکمل طور پر سادھو کے ساتھ ہی رہنے لگا۔

وقت گزرتا رہا اور میرے پاس شکتیاں آتی چلی گئیں۔ میرا گرو مجھ پر بڑی محنت کر رہا تھا اور میں بھی کوئی کوتاہی نہیں کر رہا تھا۔ میں نے ایسی ایسی ریاضتیں بھی کیں جن میں کئی بار میری جان جاتے جاتے بچی لیکن بہرحال میں نے اتنی شکتیاں حاصل کر لیں کہ شلیندر اور جتیندر سے انتقام لے سکوں اور تم نے دیکھا کہ میں نے ان سے اپنا انتقام لے ہی لیا۔" وہ اپنی بات ختم کر کے کچھ سوچنے لگا۔

"کیا اب تمہیں جگجیت کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہے؟" میں نے اس سے سوال کیا۔

"نہیں......" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ شلیندر اور جتیندر کا گرو تو ہے لیکن اُسے کسی چیلے کے ذاتی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ان دونوں کی طرح اس کے اور بھی بہت سے شاگرد ہیں اس کا اصول ہے کہ وہ شاگردوں کے ذاتی معاملات میں دلچسپی نہیں لیتا۔ وہ کہتا ہے کہ اس کا کام شاگردوں کو عملیات وغیرہ سکھانا ہے ان کے دیگر معاملات سے انہیں کوئی سروکار نہیں ہے۔"

"اب تم مجھے کب واپس بھجواؤ گے؟" میں نے سوال کیا۔

"فی الحال تو میں اپنے کچھ ضروری کاموں سے جا رہا ہوں کل واپس آ جاؤں گا۔ اگر میرا سارا کام نمٹ گیا تو میں خود ہی تمہیں لے جاؤں گا ورنہ کسی کے ساتھ بھجوا دوں گا اور پھر ابھی شلیندر اور جتیندر کے کچھ دوستوں کو بھی ٹھکانے لگانا ہے۔ وہ مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ بس اب تم یہاں بے فکر رہو۔ کل تم جا سکو گے۔" اس نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں اب بے فکر ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ چلا گیا اور میں عمارت میں اِدھر اُدھر گھوم پھر کر وقت گزارنے لگا۔

اگلے روز موتی رام واپس آ گیا اور مجھ سے بولا۔

"میری قسمت آج کل مجھ پر مہربان ہے۔ میں نے اپنے سارے دشمنوں کو ٹھکانے لگا دیا ہے اور دیگر کام بھی نمٹا دیے ہیں اس لیے اب میں خود ہی تمہیں واپس پہنچا سکتا ہوں۔"

"یہ تو میری بھی بڑی خوش قسمتی ہے۔ ویسے میں بھگوان سے پرارتھنا کر رہا تھا کہ وہ تمہیں کامیابی دے۔" میں نے کہا۔

"پرارتھنا کرنے کا شکریہ۔" وہ بولا۔ "آؤ اب ہم لوگ چلتے ہیں۔"

ہم لوگ کمرے سے باہر آ گئے اور برآمدہ عبور کرنے کے بعد ہم نے آسمان کی طرف پرواز شروع کر دی۔

کچھ دیر کے سفر کے بعد ہم شلیندر کے اس مکان میں پہنچ گئے جہاں میز پر میرا جسم رکھا ہوا تھا۔ میں نے اپنے جسم کو دیکھا اور موتی رام سے بولا۔ "اب اس میں منتقل ہونے میرے لیے کافی مشکل ہوگا کیوں کہ پہلے تو شلیندر کوئی عمل پڑھتا تھا جس کی وجہ سے میں اپنے وجود میں جاتا تھا۔"

"تم فکر نہ کرو......اب وہ منتر میں پڑھوں گا۔" اس نے تسلی بخش لہجے میں کہا۔ "میرا طریقہ کار ذرا مختلف ہے اس لیے تم صرف اپنے جسم کو چھو لو۔" اس نے ہدایت کی۔

میں نے اپنے جسم کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

موتی رام نے کچھ بڑبڑانا شروع کر دیا اور پھر ذرا ہی دیر بعد میری آتما میرے جسم میں منتقل ہو گئی۔ اب میں اپنی سابقہ حالت میں آ چکا تھا۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا لیکن اب مجھے موتی رام نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اُسے آواز دی۔

"میں یہیں ہوں۔ تم پر سے شلیندر کے عملیات کے اثرات ختم ہو چکے ہیں اور تم اپنی اصلی حالت میں آ چکے ہو اس لیے اب میں تمہیں نظر نہیں آ رہا ہوں لیکن تم فکر نہ کرو، میں ابھی تمہیں نظر آ جاتا ہوں۔" اور پھر چند ہی لمحوں بعد وہ مجھے پھر نظر آنے لگا۔ اُس نے مسکرا کر مجھ سے کہا۔

"اچھا میرے دوست!......اب مجھے اجازت دو......میرا جسم بنگلہ دیش میں اپنے گرو کے پاس رکھا ہوا ہے۔ مجھے وہیں واپس جانا ہے۔ ہاں اگر زندگی رہی تو پھر تم سے ضرور ملاقات ہوگی۔"

"میں اپنے محسن سے بار بار ملاقات کرنا چاہوں گا۔" میں نے اُس سے کہا۔

"بس اب تم بے فکر ہو کر جاؤ اور اپنی عام زندگی گزارو۔ شلیندر اب تمہاری زندگی سے جا چکا ہے اور اب تمہارے اُوپر اس کے کوئی اثرات نہیں ہیں۔ تم عام لوگوں کی طرح زندگی گزار سکتے ہو۔" وہ بولا۔ "اچھا اب میں چلتا ہوں۔"

"تم کوشش کرنا کہ مجھ سے ملاقات کرتے رہو۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے......میں کوشش کروں گا۔" وہ بولا اور پھر وہ فضاء میں تیرتا ہوا دروازے سے باہر چلا گیا۔

میں نے اپنے آس پاس نظر ڈالی۔ تمام چیزیں ویسی ہی رکھی تھیں جیسی میں چھوڑ کر گیا تھا البتہ ان پر خاصی گرد جمی ہوئی تھی۔ گرد تو میرے جسم پر بھی تھی۔

میں میز سے نیچے اتر آیا اور میں نے اپنے جسم کی گرد جھاڑی اور پھر میں کمرے سے باہر نکل آیا۔

کچھ ہی دیر بعد میں گھر سے نکلنے کے بعد ایک ٹیکسی کے ذریعے اپنے گھر پہنچ گیا۔

غسل وغیرہ کر کے فریش ہونے کے بعد میں نے سب سے پہلے آنند سے ملنے کا فیصلہ کیا اور پھر میں نے سب سے پہلی ملاقات اس سے کی۔ اُس نے شکوہ کیا کہ میں تین ماہ کہاں غائب رہا۔ تب مجھے پتہ چلا کہ میں تقریباً تین ماہ تک شلیندر کے چکر میں پھنسا رہا تھا۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اُس پراسرار روحانی دنیا کے اور ہماری عام دنیا کے وقت میں کیا فرق ہے کیوں کہ میرا خیال تھا کہ میں وہاں کچھ دن رہا ہوں لیکن اب پتہ چل رہا تھا کہ میں نے تین ماہ وہاں گزارے ہیں۔ میں نے اپنے تمام حالات آنند کو بتا دیے۔ وہ نہ صرف حیران پریشان ہوا بلکہ اُس نے میرے زندہ بچ جانے پر بھگوان کا شکر بھی ادا کیا۔

اُسی وقت میرے موبائل فون کی بیل بجی۔ میں نے اُس کے اسکرین پر نمبر دیکھا جو سونیا کا تھا۔ اُس کا خیال آتے ہی میرے اندر مستی کی لہریں دوڑنے لگیں۔ میں نے فون کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو؟"

"ہیلو......جے کیسے ہو؟" سونیا کی آواز آئی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"میں واپس آ گئی ہوں، تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ اس وقت تم کہاں ہو؟" وہ بولی۔

"اس وقت میں آفس میں ہی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، میں آ رہی ہوں۔"

"او کے۔" میں نے رابطہ منقطع کر دیا اور پھر آنند کو اُس کے کمرے میں بھیج دیا جب کہ خود کرسی کی پشت گاہ سے سر لگا کر سونیا کے حسین خیالوں میں کھو گیا۔ ساتھ ہی میں نے فیصلہ کیا کہ میں آج کی رات اُس کے ساتھ گزار دوں گا۔

☆......☆......☆

●......●......●



دل کا رشتہ

میری ماں مرچکی ہے. وہ پیاری ہستی جسے دیکھے بنا مجھے چین نہیں آتا تھا. میں نے خود ہی اسے موت کی نیند سلا دیا. اگر میں ایسا نہ کرتا تو پاپا..... وہ آپ کو موت کی نیند سلا دیتی..... میں یہ برداشت نہیں کرسکتا تھا..... کیوں کہ میں خون کے رشتے کے بغیر تو زندہ رہ سکتا ہوں..... لیکن پاپا آپ کی محبت کے رشتے کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا...

اشتیاق فاطمہ عظمی

ماں کی بے وفائی کو دیکھ کر اسے موت کی نیند سلا دینے والے ایک بیٹے کی کہانی......ایک پراثر داستاں

موسم سرما کی ٹھٹھرتی ہوئی دھوپ منڈیروں سے نیچے اتر رہی تھی۔ سہمی ہوئی سہ پہر حیران و پریشان شام کی طرف بڑھ رہی تھی۔

شنکر کو اسکول سے آئے کتنی ہی دیر ہو گئی تھی۔ پر اس نے یونی فارم بھی تبدیل نہیں کیا تھا۔ موزے اور جوتے بھی نہیں اتارے تھے۔ اسکول سے آنے کے بعد سے اب تک وہ اسی طرح سہما ہوا سا کونے میں دبکا بیٹھا تھا۔

آج صبح وہ ناشتہ کر کے نہیں گیا تھا۔ روز شیکھر ہی اس کے لیے ناشتہ بناتا تھا اور ساتھ ہی لنچ بکس بھی تیار کر دیتا تھا۔ پر آج صبح اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی تیز بخار کے باعث وہ بستر سے اٹھ ہی نہیں سکا تھا۔ اس لیے شنکر ناشتے اور لنچ بکس کے بغیر ہی اسکول چلا گیا تھا اور اب اسکول سے واپس لوٹے اسے کافی وقت گزر گیا تھا۔ مگر اس کے منہ میں ایک نوالہ بھی اڑ کر نہ گیا تھا۔ اس کے باوجود اسے اس وقت بالکل بھی بھوک نہیں لگ رہی تھی۔ وہ سہما ہوا سا کونے میں دبکا، اندرونی کمرے میں ہوتی، ماں اور باپ کی لڑائی کی آوازیں سن رہا تھا۔

دیکھا جاتا تو گھر میں ہونے والی اس طرح کی لڑائیاں عموماً یک طرفہ ہوتی تھیں۔ اس کی ماں سونیا ہی زیادہ تر بولتی چیختی اور شور مچاتی رہتی تھی جبکہ اس کا باپ شیکھر عموماً خاموش رہتا یا نہایت دھیمی آواز میں کوئی معقول سا جواب دیتا۔ جواباً سونیا اور بھڑک اٹھتی تھی۔

سونیا روز اول سے ہی شیکھر کے ساتھ خوش نہیں تھی اس کی مجبوری نہ ہوتی تو شاید وہ کبھی شیکھر جیسے سیدھے سادھے شریف انسان سے شادی نہ کرتی۔ شیکھر اسے دل کی گہرائیوں سے چاہتا تھا اور اسے خوش رکھنے کی حتی الامکان کوششوں میں لگا رہتا تھا۔ مگر وہ کبھی بھی اس کی کسی بھی کوشش کو کامیاب نہ ہونے دیتی تھی اور بات بے بات کوئی نہ کوئی جھگڑے کی بات نکال ہی لیتی تھی۔

اور آج کل ان دونوں کے درمیان جھگڑے کی وجہ، شیکھر کا یہ قدیمی گھر ''اوبرائے ہاؤس'' بنا ہوا تھا......سونیا کی خواہش تھی کہ شیکھر یہ پرانا بوسیدہ گھر فروخت کر کے شہر میں کسی اچھی سوسائٹی میں کوئی چھوٹا صاف ستھرا اپارٹمنٹ لے لے مگر شیکھر کسی بھی قیمت پر گھر فروخت کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ شاید سونیا اس کے مسلسل انکار کے سامنے آخر کار خاموش ہو بیٹھتی اگر اس کا پرانا عاشق اور بوائے فرینڈ، ونود

اسے مسلسل ستا کستا تا۔ دراصل مکان بیچنے کا یہ اسی کا آئیڈیا تھا۔ جو ہو پر واقع یہ شاندار کوٹھی دیکھتے ہی اس کے ذہن میں ایک زبردست منصوبہ آ گیا تھا۔ سونیا نے پہلے اس کے منصوبے سے تھوڑا اختلاف کیا تھا۔ لیکن آخرکار ونود نے اسے اپنا ہم خیال بنا لیا تھا۔

سونیا کا خیال تھا کہ وہ نہایت آسانی سے شیکھر کو اپنی بات ماننے پر مجبور کر دے گی۔ مگر اس وقت اسے شدید حیرت ہوئی تھی جب شیکھر نے اس کے آئیڈیے کو یکسر مسترد کر دیا تھا۔ تب سے سونیا کے ہاتھ لڑنے کے لیے ایک نیا موضوع آ گیا تھا۔ اب آئے دن ان دونوں کے درمیان اسی مسئلے پر بحث مباحثہ اور لڑائی جھگڑا چلتا رہتا تھا۔

شیکھر کی طرح 10 سالہ شنکر کو بھی یہ ہر وقت کے جھگڑے اور تو تکار سخت ناپسند تھی۔ شیکھر کی طرح شنکر بھی سونیا کو بے پناہ اور بے حد و حساب چاہتا تھا۔ وہ اپنی ماں کو ہر وقت پھول کی طرح کھلا ہوا اور کلی کی طرح مسکراتا ہوا دیکھنے کا متمنی تھا۔ اس کی چیخم دھاڑ اور شور شرابے سے وہ سہم جاتا تھا۔

''میں کہتا ہوں سونیا...... اس وقت میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے...... بس اس موضوع کو اب ختم کر دو۔'' شیکھر کی آواز میں نقاہت کے ساتھ شکست خوردگی بھی تھی۔

''تمہاری کوئی طبیعت وبیعت خراب نہیں ہے۔'' سونیا نے خونخوار لہجے میں کہا۔ ''جب تم سے گھر کی بات کی جائے تمہاری طبیعت خراب ہو جاتی ہے...... مگر آج میں نے سوچ لیا ہے...... کہ آج اس بات کا آخری فیصلہ لے کر ہی رہوں گی......''

''آخر تم چاہتی کیا ہو؟'' شیکھر نے تھکے تھکے لہجے میں پوچھا تھا۔

''ہر بار تم انجان بن جاتے ہو۔'' سونیا چیخ کر بولی تھی۔ ''تم نہیں جانتے میں کیا چاہتی ہوں۔''

''اس سلسلے میں، میں بارہا جواب دے چکا ہوں۔'' شیکھر نے حسب عادت رسان بھرے لہجے میں کہا تھا۔ ''اس کے باوجود تم روز روز یہ موضوع لے کر بیٹھ جاتی ہو۔''

''میں پوچھتی ہوں، آخر تمہیں اس کھنڈر نما بھوت بنگلے سے اتنی انسیت کیوں ہے؟'' سونیا نے دل جلے لہجے میں سوال کیا۔ جھلاہٹ اس کے لہجے سے صاف جھلک رہی تھی۔

''یہ سوال بھی تم کتنی ہی بار کر چکی ہو اور میں کتنی ہی بار اس کا جواب دے چکا ہوں۔'' شیکھر نے اذیت بھرے انداز میں گہری سانس لی۔ ''اس کے باوجود تم چاہو تو میں پھر سے تم کو وہی سب کچھ بتا سکتا ہوں......''

سونیا نے ناراض نظروں سے اس کی طرف دیکھا مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔

''تم جانتی ہو...... یہ ہمارا آبائی گھر ہے...... دادا جی نے اسے بہت پیار اور چاہت سے تعمیر کروایا تھا...... پتا جی کو اس گھر سے عشق تھا...... میری ماتا جی اسی گھر میں دلہن بن کر آئی تھیں...... میں اور شانتی دیدی اسی گھر میں پیدا ہوئے...... شانتی دیدی اسی گھر سے وداع ہو کر پردیس سدھاریں...... اور تم نے بھی تو دلہن بن کر اسی گھر میں قدم رکھا تھا۔ ہمارا شنکر بھی تو اسی گھر میں پیدا ہوا ہے......''

سونیا کے چہرے کی بےزاری کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

''دادا جی، پتا اور ماتا جی کی کتنی ہی یادیں اس گھر سے جڑی ہیں۔ اس گھر کے در و دیوار کس قدر مانوس اور جانے پہچانے سے لگتے ہیں۔ اپنے پن کا احساس ہوتا ہے...... گھر کے خاموش کمروں میں مجھے دادا جی اور دادی جی کی سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں۔ آنگن کے ساکت فرش پر ماتا جی کے مانوس قدموں کی آہٹیں دھڑکتی ہیں۔ پتا جی کی پریم بھری آواز کی گونج سنائی دیتی ہے مجھے یہاں...... اور تم کہتی ہو کہ میں اس گھر کو بیچ دوں۔''

تم ہی سوچو...... میں اس طرح کیوں کر، کر سکتا ہوں۔ بھلا یہ کس طرح ممکن ہے؟''

''کیوں؟'' شیکھر کے رکتے ہی سونیا چیخ کر بولی۔

''بھلا کیوں ممکن نہیں ہے بنگلہ تمہارے نام ہے...... تمہاری بہن برسوں سے لندن میں رہ رہی ہے...... وہ اپنے میاں اور بچوں کے ساتھ خوش ہے...... اسے اس گھر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس نے نہ صرف تمہیں اس گھر کو بیچنے کی اجازت دے دی ہے بلکہ وہ تم سے کوئی حصہ بھی نہیں لینا چاہتی...... پھر بھلا...... اس گھر کو بیچنے میں کیا قباحت ہے؟'' اس نے رک کر ناراض نظروں سے شیکھر کی طرف دیکھا۔ ''اور جہاں تک یادوں کا تعلق ہے...... تو یہ بیمار لوگوں کی علامت ہے...... زندہ لوگ یادوں سے نہیں چمٹے رہتے...... بلکہ گزرے ہوئے کل کو بھول کر آنے والے کل کا سواگت کرتے ہیں۔''

شیکھر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ بس خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ اسے متاثر ہوتا دیکھ کر سونیا نے پرتاثیر آواز میں مزید کہا۔

''دیکھو شیکھر! ونود کہہ رہا ہے...... وہ اس کھنڈر کی بہت اچھی قیمت دلا دے گا۔''

''بس اصل بات یہی ہے۔'' ونود کے نام پر شیکھر چیخ کر بولا۔ ''کیوں نہیں کہتیں کہ تم اپنے اس نکمے اور ناکارہ عاشق کے کہنے کی ہی وجہ سے یہ گھر بیچنے پر مصر ہو۔''

''تم میرے کردار پر شبہ کرتے ہو؟'' ونود کو اس کا عاشق کہنے پر سونیا کو ایک دم سے غصہ آ گیا تھا۔ ''تمہارے خیال میں، میں ونود سے عشق کر رہی ہوں؟''

''تم جیسی عورتیں کسی سے محبت اور عشق کرنا جانتی ہی نہیں۔'' شیکھر کے لہجے میں مایوسی سمٹ آئی۔ ''تم اسے بھی اپنے مفاد کے لیے محض استعمال کر رہی ہو۔''

''تم میرے بارے میں ایسا سوچتے ہو؟'' سونیا غضب ناک لہجے میں بولی۔ ''اگر میں تم سے محبت نہ کرتی تو اپنا کیریئر اپنا لیو چر داؤ پر لگا کر بھلا تم سے شادی کیوں کرتی؟''

''محبت ہونہہ۔'' شیکھر نے طنزیہ لہجے میں ہنکارہ بھرا۔ ''تم جانتی ہو کہ تم نے مجھ سے شادی کیوں کی تھی...... اور اب تو میں بھی جان گیا ہوں......'' شیکھر نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

ان دنوں شیکھر نے نئی نئی نوکری شروع کی تھی۔ اس کی اکلوتی بہن شانتی بیاہ کے بعد پردیس سدھار گئی تھی اور وہ گھر میں بالکل اکیلا رہ گیا تھا۔

کبھی یہ گھر کتنا بھرا پرا تھا۔ دادا دادی پتا ماتا جی اور وہ دونوں بہن بھائی، گھر کیسا آباد اور شاداب لگتا تھا۔

پھر دھیرے دھیرے گھر کی رونقیں دم توڑتی گئیں۔ پہلے دادا جی پھر ماتا جی رخصت ہو گئیں...... شاید ماتا جی کا غم پتا جی برداشت نہ کر سکے اور ان کے دیہانت کے سال بھر بعد ہی وہ بھی رخصت ہو گئے...... اب صرف دادی ہی رہ گئی تھیں اور وہ دونوں بھائی بہن۔ پتا جی نے اپنی زندگی میں ہی انگلینڈ میں مقیم اپنے ایک دوست کے بیٹے انیل ورما سے شانتی کا رشتہ طے کر دیا تھا۔ سو دادی جی نے لپک جھپک شانتی کی ودائی کروادی تھی اور پھیروں کے اگلے ہی دن شانتی اپنے پتی کے ساتھ لندن روانہ ہو گئی تھی۔

ایسا لگتا تھا کہ جیسے دادی صرف شانتی کے بیاہ کے لیے ہی زندہ تھی۔ شانتی کی رخصتی کے کچھ ہی دنوں بعد وہ بھی اس عالم فانی سے رخصت ہو گئی تھیں۔

اب اس وسیع دنیا اور بڑے گھر میں شیکھر بالکل اکیلا رہ گیا تھا۔

چند سال پہلے اس نے زندگی کے اس روپ کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ یہ آج تنہائی کی بےرحم پرچھائیوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ روح میں سناٹے سے اتر آئے تھے۔ ان دنوں زندگی کتنی اکیلی کتنی بےرنگ اور کتنی بےمعنی ہو کر رہ گئی تھی۔

اور یونہی کرب و اذیت کے کسی لمحے میں تنہائی کے احساس کے بوجھ تلے دبے محض اپنے اطراف افراد کی موجودگی کا احساس تلاش کرتے وہ اس شام، قریبی تھیٹر میں جا بیٹھا تھا۔

اور اس پل اسٹیج کا پردہ اٹھتے ہی جیسے اس کی زندگی میں ایک نیا پن سا آ گیا تھا۔ پہلی بار سونیا پر نظر پڑتے ہی وہ دیر

تک اس پر نظریں جمائے اسی کو تکتا رہا تھا۔ وہ ایک متناسب خدوخال کی حسین لڑکی تھی۔ تیز میک اپ زرتار لباس اور جھلملاتی روشنیوں نے اس کے حسن کو مزید نکھار دیا تھا۔

ششیکھر اس کا بے مثال حسن دیکھ کر پہلی ہی نگاہ میں اس پر اپنا دل نثار کر بیٹھا تھا۔ تھیٹر سے گھر آنے کے بعد بھی وہ تمام وقت اسی کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ سونیا کا تصور ہی بہار کے معطر جھونکے کی طرح اس کے دل کے ویرانے میں آداخل ہوا تھا۔ ایک نئی امنگ جاگ اٹھی تھی۔ آرزو کے ایک نئے پرتو نے اس کے دل کے زنگ آلود دروازے پر دستک دی تھی۔ گو کہ اس نے خود کو بہت سمجھانا چاہا تھا۔ کیوں کہ وہ جانتا تھا۔ اسٹیج ٹی وی اور فلموں میں کام کرنے والی عورتیں، عام عورتوں سے مختلف ہوتی ہیں...... ان کے شوق، خواہشیں اور امنگیں جداگانہ ہوتی ہیں۔ ایسی عورتیں عموماً صرف اپنی ذات سے ہی محبت کرتی ہیں۔

مگر وہ اپنے دل کا کیا کرتا؟

اس کا دل تھا کہ بنا ڈور کے سونیا کی طرف کھنچا جاتا تھا۔

اس کی ہر سوچ کا سفر آخر کار سونیا کے در پر ہی جا کر اختتام پذیر ہوتا تھا۔ چند ہی دنوں میں وہ سونیا کو دیوانگی کی حد تک چاہنے لگا تھا۔

وہ ہر شام تھیٹر کی پہلی رو میں بالکل درمیان کی سیٹ پر تمام تر دلچسپی انسیت اور انہماک لیے، سونیا پر نظریں جما کر بیٹھ جاتا تھا۔ جلد ہی سونیا نے بھی یہ بات محسوس کر لی تھی۔

شروع شروع میں تو اس نے اس بات پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ اس جیسی اسٹیج فنکارہ پر اکثر لوگ اسی طرح آنکھیں گاڑھ کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ مگر جلد ہی اسے احساس ہو گیا تھا کہ یہ سنجیدہ اور معصوم سا نوجوان دیگر تماش بینوں سے یکسر مختلف ہے۔ نہ وہ سیٹیاں بجاتا تھا نہ آوازیں کستا تھا۔ بس آنکھوں میں ایک پیاس لیے ٹکٹکی باندھے خاموشی سے اسے تکا کرتا تھا اور جو کبھی بالکل اچانک اس کی ساحر نظریں اسے انجانے دیوانے سے ٹکرا جاتیں تو وہ بے ساختہ گھبرا کر نظریں جھکا لیتا تھا۔ جیسے کہ چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو۔

یہ سلسلہ کئی ہفتوں تک چلتا رہا۔ نہ ششیکھر نے آنکھوں کی حد سے آگے بڑھنے کی کوشش کی نہ ہی سونیا نے زیادہ لفٹ کروائی...... شاید یہ سلسلہ ابھی کچھ عرصے اور چلتا کہ بالکل اچانک ایک رات تھیٹر پر پولیس نے چھاپا مارا۔ آدھی رات کے بعد اس تھیٹر میں ایک خصوصی شو ہوا کرتا تھا۔ پولیس نے تمام رقاصاؤں اور تماش بینوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ کر، حوالات اور تھیٹر کو سیل کر دیا تھا۔

سونیا ایک دم سے پریشان ہو گئی تھی۔

یہ تھیٹر ہی اس کی آمدنی کا واحد ذریعہ تھا۔ اسی تھیٹر کی آمدنی سے وہ کھولی کا کرایہ اور اپنے اور ونود کے خرچ پوری کرتی تھی۔

یو پی کے ایک انتہائی دور افتادہ چھوٹے سے دیہات سے ممبئی وہ فلم ایکٹریس بننے آئی تھی۔ ادھر اس کا گاؤں میں تھا ہی کون؟ ایک بوڑھا دادا تھا۔ جس نے اس کے باپ کے مرنے اور ماں کے بھاگ جانے کے بعد اسے پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ دادا کے دیہانت کے بعد وہ اپنے گھر میں نہیں پوری دنیا میں اکیلی رہ گئی تھی۔ اس نے جس طرح تنگی ترشی اور کسم پرسی سے زندگی بتائی تھی۔ اس زندگی نے اس پر دولت کی اہمیت اور ضرورت کا احساس پوری طرح اجاگر کر دیا تھا۔ سو گاؤں میں رہ کر چھوٹا موٹا کام کرنے کی بجائے اس نے ممبئی جا کر کوئی بڑا کام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اس نے سنا تھا کہ دولت کمانے کا سب سے آسان اور زود اثر نسخہ فلموں میں کام کرنا تھا۔ سو اسی لیے اس نے فلم نگری ممبئی کا رخ کیا تھا۔ اسے اپنی بے پناہ خوب صورتی اور بھرپور جوانی پر بڑا مان تھا۔ سو بے شمار امیدیں اور ان گنت خواب آنکھوں میں لیے وہ اس فلم نگری میں وارد ہوئی تھی۔

مگر جلد ہی اسے احساس ہو گیا تھا کہ فلموں میں کام کرنا تو دور کی بات فلم سازوں تک رسائی بھی ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ ہر روز بج سنور کر مختلف اسٹوڈیوز

کے سامنے لگی لمبی قطاروں میں جا کر کھڑی ہو جاتی تھی اور ایک صبح ایسی قطار میں لگے ہوئے اس کی ملاقات ونود سے ہو گئی تھی۔

ونود کسی غیر معروف سے فلمی پرچے میں فری لانسر تھا اور برسوں سے مختلف اسٹوڈیوز کے چکر لگا تا رہا تھا اور اسی چکر میں گھر سے بھاگی ہوئی ہیروئن بننے کی شوقین کئی لڑکیوں سے اس کے چکر چل چکے تھے۔ سیدھی سادی حسین و جمیل سونیا کو دیکھ کر اس کا دل بے اختیار دھڑک اٹھا تھا۔

سونیا ان دنوں بے شمار مسائل میں گھری ہوئی تھی۔ سب سے بڑا مسئلہ اس کی رہائش کا تھا۔ سو ونود اسے اپنی کھولی میں لے آیا تھا۔ اسی نے اسے فلموں کے چکر میں وقت خراب کرنے کی بجائے اسٹیج پر کام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ بلکہ وہ خود ہی اسے ایک تھیٹر کے مالک سے ملوانے بھی لے گیا تھا۔ اس طرح سونیا کا کچھ تو شوق بھی پورا ہوا تھا اور آمدنی کا ایک راستہ بھی کھل گیا تھا اور دھیرے دھیرے غیر محسوس طور پر کھولی کے کرائے سے لے کر ونود کے تمام تر اخراجات بھی اس کے کاندھوں پر آ گئے تھے۔

مگر اسے اس بات کی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہ ونود کو اپنا محسن اور ہمدرد سمجھتی تھی ونود نے اس شہر بے مہر میں اس کو سہارا دیا تھا۔ اس کے ہر دکھ سکھ میں وہ شریک رہا تھا۔ غیر محسوس طور پر وہ اس سے متاثر ہوتی چلی گئی تھی اور دھیرے دھیرے ونود اس کی سوچوں کی پگڈنڈی پر چلتا اس کے شہر دل میں جا داخل ہوا تھا۔

یہ حقیقت تھی کہ سونیا ایک شاندار اور دولت مند زندگی کا خواب لے کر اس شہر میں آئی تھی۔ اس کے بلند و بالا خوابوں میں ونود جیسے بے روزگار اور کنگال صحافی کی کوئی گنجائش نہ تھی وہ ایک وسیع بنگلہ، چم چماتی کار اور دولت کی ریل پیل والی زندگی کی خواہاں تھی۔ مگر ونود کے پاس تو کچھ بھی نہ تھا بنیادی طور پر وہ ایک بے عمل مگر چرب زبان انسان تھا لچھے دار باتوں سے سیدھی سادی لڑکیوں کو بے وقوف بنانے کے ہنر سے خوب واقف تھا۔ سو اس کا جادو سونیا پر بھی چل گیا تھا اور سونیا نے بنا کچھ سوچے سمجھے اپنا سب کچھ اس کے قدموں میں رکھ دیا تھا۔

اور جلد ہی اسے پتہ چل گیا تھا کہ وہ ونود کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔

اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں ونود سے کہا تھا۔ ”ونود اب ہمیں جلد ہی شادی کر لینی چاہیے۔“

”یہ بیٹھے بٹھائے تمہیں شادی کا خیال کیسے آ گیا؟“ ونود حیران ہوا۔ ”سکھ اور شانتی سے زندگی بسر تو ہو رہی ہے......“

تب اس نے اس کے کاندھے پر سر رکھ کر آنے والے مہمان کے بارے میں بتایا تھا اور ونود سناٹے میں آ گیا تھا۔

وہ ایک خوبرو اور وجیہہ جوان تھا اور اپنی وجاہت اور چرب زبانی کے باعث بہت سی لڑکیوں کے دل جیت چکا تھا۔ آج کل وہ کسی دولت مند باپ کی اکلوتی بیٹی یا کسی کروڑ پتی ودھوا کی تلاش میں تھا تا کہ اسے اپنے حسن و جوانی کے زور پر عشق کے جال میں پھنسا کر شادی کے بعد زندگی بھر اس کی دولت پر عیش کرے......

سونیا تو پتہ نہیں کیسے اس کی زندگی میں شامل ہو گئی تھی۔ وہ سونیا کو پسند کرتا تھا اس کے لیے دل میں ہمدردی بھی رکھتا تھا۔ مگر اس کنگال معمولی اسٹیج آرٹسٹ سے شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور بچے وغیرہ کا جھنجٹ تو اس کی سوچ کی حدوں سے بھی باہر تھا۔

”تم فوری طور پر اس بچے سے نجات حاصل کر لو۔“ اس نے سرد اور روکھے لہجے میں سونیا کو مشورہ دیا تھا۔

”میں اور یقیناً تم بھی ابھی کسی بھی بچے کو افورڈ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔“

خود سونیا بھی اتنی جلدی ماں بن کر اپنے خوابوں سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھی سو ونود کا مشورہ اسے پسند آیا تھا۔ مگر بدنصیبی سے اس فیصلے کے لیے اب خاصی دیر ہو چکی تھی۔ یکے بعد دیگرے اس نے کئی

گائنا کالوجسٹ کو دکھایا۔ لیڈی ہیلتھ ورکرز سے لے کر گھریلو دائیوں تک سے رابطہ کر دیکھا۔ مگر سب کا ایک ہی جواب تھا بہت دیر ہو چکی ہے..... اب ابارشن کی کوشش خود اسی کی جان کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتی ہے۔

تھک ہار کر وہ خاموش ہو بیٹھی تھی۔ اب ایک ہی راستہ تھا ونود سے شادی، لیکن ونود اس شادی کے لیے ہرگز تیار نہ تھا جب سونیا کا اصرار بڑھا تو ایک رات وہ اپنا مختصر سا سامان لے کر کھولی ہی سے نہیں اس کی زندگی سے بھی چلا گیا۔

ایک بار پھر سونیا اکیلی ہو گئی تھی۔

اتنے عرصے میں، ونود کے ساتھ رہ کر اس نے اس کی فطرت کے بارے میں بہت کچھ جان لیا تھا۔ اس لیے وہ یہ بات اچھی طرح سمجھ چکی تھی کہ اسے تلاش کرنا محض وقت کا زیاں ہوگا۔ اب اپنے مسائل سے اسے خود ہی نمٹنا ہوگا..... اور اس پل صراط سے اسے اپنے بل بوتے پر ہی گزرنا ہوگا......

زندگی ایک دم سے بوجھل اور ویران ہو گئی تھی۔ بچپن سے اب تک اس نے دکھ محرومیاں اور پریشانیاں ہی دیکھی تھیں اس کے باوجود وہ ان سب سے مانوس نہ ہو سکی تھی اور اب تو صورت حال اور بھی بدتر ہو گئی تھی۔ کئی مہینوں سے کھولی کا کرایہ ادا نہیں کیا تھا۔ کھولی کا مالک روز دروازے پر آ کے غل غپاڑہ مچاتا اور اس کا سامان نکال پھینکنے کی دھمکیاں دیتا تھا۔ تھیٹر کے بند ہو جانے سے آمدنی کا راستہ تو پہلے ہی بند ہو چکا تھا۔ وہ شدید مالی اور ذہنی پریشانیوں کا شکار تھی۔ ابھی اس کا فگر متاثر نہیں ہوا تھا اب بھی وہ پہلے کی طرح نازک اندام اور دلکش دکھائی دیتی تھی۔ چاہتی تو کسی ڈرامہ کمپنی یا تھیٹر میں اسے حسب معمول اب بھی چھوٹا موٹا کام مل سکتا تھا۔ مگر آج کل وہ شدید ذہنی انتشار کا شکار تھی۔

ونود کے رویے نے اسے شدید جذباتی صدمہ پہنچایا تھا۔ اس نے ونود کو اپنا سب کچھ مان کر اپنا سب کچھ اس کے قدموں میں رکھ دیا تھا۔ مگر وہ سنگ دل اسے اس ابتلا میں مبتلا کر کے تنہا چھوڑ کے جانے کس نگر میں جا بسا تھا۔ دل ٹوٹنے کے اس پہلے پہلے حادثے نے اسے بے حد افسردہ اور دل گرفتہ کر دیا تھا۔

جب بھی زخمی دل میں شدید ٹیسیں اٹھنے لگتی تھیں۔ وہ ساحل سمندر پر چلی جایا کرتی تھی اور ساحل پر سر پٹختی لہروں کو دیکھ کر وہ اپنے سینے میں اٹھتے طلاطم کے بارے میں سوچا کرتی تھی۔ لہروں کو ساحل سے ٹکرا کر بے نیل و مرام واپس پلٹتے دیکھ کر اسے ایک سکون کا احساس ہوتا تھا کہ دنیا میں ایک وہی ناکام و مایوس نہیں ہے اور بھی بہت ہیں جو سر پٹخ رہے اور تڑپ رہے ہیں۔

اس شام بھی وہ ساحل کی ٹھنڈی ہواؤں سے اپنے اندر کی جلن بجھاتی گیلی ریت پر ننگے پاؤں چلتی بہت دور نکل گئی تھی۔ تب ہی اس پر شیکھر کی نظر پڑی تھی۔

''سونیا۔'' اس نے متحیر لہجے میں زیر لب اس کا نام دوہرایا تھا۔ گو کہ اس وقت سونیا تیز میک اپ اور زرق برق لباس میں نہیں تھی۔ اس کے باوجود اس نے اسے پہلی نگاہ میں پہچان لیا تھا۔ وہ تو اس کے روم روم میں بسی ہوئی تھی۔ وہ بے اختیارانہ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا تھا اور یہ جانے بغیر کہ اس کا ردعمل کیا ہوگا وہ بے ساختہ اسے پکار بیٹھا تھا۔

''مس سونیا۔'' سونیا نے اس کی آواز سنی اور نہ ہی اس کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ یہ نرم شائستہ متحیر اور محبت پاش آواز اسے اپنی سماعت کا دھوکا لگی تھی۔ بھلا اس دور افتادہ اور ویران ساحل پر اسے پکارنے والا کون ہو سکتا ہے؟ اور وہ بھی اس قدر تہذیب اپنائیت اور محبت سے۔ وہ تو اس شہر میں ہی نہیں اس پوری دنیا میں اکیلی تھی۔ محروم راندہ روزگار اور بے شناخت تھی کوئی اپنا کوئی شناسا، کوئی رازدار کوئی غم خوار کوئی بھی تو نہ تھا..... آج کل تو آئینے میں اس کا عکس بھی اسے اجنبی نظروں سے دیکھا کرتا تھا..... سو وہ شیکھر کی آواز سنی ان سنی کرتی آگے بڑھتی چلی گئی۔

اس کی بے نیازی اور بے توجہی نے شیکھر کے دل کو کچھ نراش تو کیا پر وہ پوری طرح مایوس نہ [illegible] ..... اور تیز قدموں سے چلتا بالکل اس کے قریب جا پہنچا۔ [illegible] اس کے خوابوں

کی ملکہ خود سے چل کر اس کے دروازے پر آ گئی تھی تو وہ اسے قریب سے دیکھنے اور اس سے باتیں کرنے کی آرزو کو دبا نہ سکا تھا۔

''مس سونیا۔'' بالکل قریب پہنچ کر اس نے دوبارہ اسے پکارا تھا۔

سونیا چلتے چلتے ایک دم سے رک گئی تھی اور پلٹ کر شیکھر کی طرف دیکھا تھا۔ پہلی نظر میں وہ اسے پہچان نہیں سکی تھی تب ہی اس نے تیوریوں پر بل ڈال کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''یوں سر راہے آپ کو مخاطب کرنے..... اور آپ کی تنہائی میں مخل ہونے پر میں شرمندہ ہوں۔'' اس کی تیوریوں کے بل اور نظروں کی اجنبیت نے اس کے حوصلے پست کر دیے تھے۔ اسی لیے گڑبڑائی ہوئی آواز میں وہ جلدی سے بولا تھا۔ ''آپ مجھے نہیں جانتیں مگر..... میں آپ کو جانتا ہوں ..... بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا میں آپ کا فین ہوں،..... ایکس تھیٹر میں، میں روز آپ کا شو دیکھنے آتا تھا......''

''اوہ۔'' سونیا نے گہرا اطمینان بھرا سانس لیا اور بالکل اچانک ہی اسے پہلی رو میں خود پر نظریں جما کر بیٹھنے والا وہ خوش شکل مہذب اور شرمیلا سا نوجوان یاد آ گیا تھا۔

تو وہ آپ تھے؟ وہ نرم مگر نخریلی آواز میں اور چہکتے لہجے میں بولی اور شیکھر نے محجوب سے انداز میں نظریں جھکا لیں۔

''خیر چھوڑیے۔'' اسے شرمندہ ہوتا دیکھ کر سونیا نے بات بدلی۔ ''آپ اس وقت یہاں کہاں؟''

''میں تو یہیں رہتا ہوں۔'' شیکھر جلدی سے بولا۔ ''وہ سامنے کی جانب..... پہلا بنگلہ.....'' اوبرائے ہاؤس۔'' شیکھر نے ساحل سے دائیں جانب ذرا فاصلے سے بنے پرانی طرز کے شاندار بنگلوں میں سے ایک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

''اوہ۔'' سونیا کے ہونٹ سیٹی بجانے والے انداز میں سکڑ گئے۔ اس نے پلٹ کر شیکھر کو سر سے پاؤں تک دیکھا تھا۔ لباس اور انداز سے وہ کوئی بہت دولت مند انسان دکھائی نہیں دیتا تھا مگر اس نے جس گھر کی طرف اشارہ کیا تھا وہ قیمتی اور عالیشان تھا۔

''اچھا۔'' سونیا اب کے بولی تو اس کا لہجہ بدلا ہوا سا تھا۔ ایک ہلکی سی لگاوٹ پیدا ہو گئی تھی۔ ''آپ کرتے کیا ہیں؟''

''ایک ملٹی نیشنل فارماسوٹیکل فرم میں سیلز آفیسر ہوں۔'' شیکھر نے سر جھکا کر دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ ''اور آپ آج کل کیا کر رہی ہیں تھیٹر تو......''

''ہاں تھیٹر تو بند ہو گیا۔'' سونیا نے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔ ''آج کل بے روزگار اور پریشان حال ہوں۔''

''جی۔'' شیکھر نے حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میں تو آپ کو بہت مال دار اور خوشحال سمجھتا تھا۔''

''ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔'' سونیا نے دکھ بھرے لہجے میں جواب دیا اور واپسی کے لیے مڑ گئی۔

''اوکے..... اب میں چلتی ہوں۔''

''ایک منٹ۔'' شیکھر نے لپکتے ہوئے لہجے میں اسے مخاطب کیا تھا۔ ''اگر آپ برا نہ مانیں تو کیا، میں آپ کو ایک کپ چائے کی دعوت دے سکتا ہوں۔''

''چائے؟'' سونیا نے پلکوں کی چلمن اٹھائی۔

''جی! وہ سامنے ہی تو میرا گھر ہے۔'' شیکھر جلدی سے بولا۔ ''اور میں چائے بہت اچھی بناتا ہوں۔''

''اوہ اچھا۔'' سونیا کے دلکش لبوں پر دلنشین مسکراہٹ بکھر گئی۔ ''میں آپ کے ہاتھ کی چائے ضرور پیتی مگر..... اس وقت ممکن نہیں ہے......''

کیوں؟'' شیکھر نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

''کیوں کہ پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔'' سونیا نے کلائی پر بندھی نازک سی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بتایا۔ ''مزید تاخیر ہوئی تو آخری بس بھی نکل جائے گی۔''

''یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔'' شیکھر چہکتے لہجے میں بولا۔ ''میں آپ کو اپنی کار میں چھوڑ آؤں گا۔''

شیکھر کی آفرسن کر سونیا کے کان کھڑے ہو گئے۔ ایک مہنگے علاقے میں شاندار ولانما گھر ایک اچھے مشاہرے کی باعزت نوکری خوش شکل سیدھا سادا اور صاحب کار بھی۔ ان حالات میں سونیا اس سے زیادہ اور کیا توقع کر سکتی تھی اور شیکھر کو دیکھتے ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ایسے بے وقوف نوجوان کو شیشے میں اتارنے میں کچھ زیادہ تگ و دو نہیں کرنی پڑے گی اور ہوا بھی یہی۔

بات شادی تک پہنچی تو شیکھر تو خوشی سے دیوانہ ہی ہو گیا تھا۔ وہ تو گھڑی کی چوتھائی میں شادی کا خواہش مند تھا اور سونیا حالات کے جس دوراہے سے گزر رہی تھی ان حالات کے پیش نظر وہ بھی شادی میں تاخیر کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ سو پہلی ملاقات کے ہفتے بھر بعد ہی وہ دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے تھے۔

اس شادی سے دونوں اپنی اپنی جگہ بے حد خوش تھے۔ سونیا کے سارے مسائل یک جنبش قلم دور ہو گئے تھے اور شیکھر کو اپنے خوابوں کی ملکہ کو حاصل کر کے اپنی تقدیر پر رشک آ رہا تھا۔

شادی کے ہفتے بھر بعد ہی سونیا نے اسے باپ بننے کی خوش خبری سنادی تھی۔ اس وقت اس کی خوشی دیدنی تھی۔ ماں باپ کے انتقال اور بہن کی شادی کے بعد وہ ایک عرصے تک گھر کے سناٹوں میں اکیلا رہا تھا۔ اب بچے کی آس نے اس کی روح میں خوشیوں کی جھنکار جگادی تھی اسے ہمیشہ سے ہی بچے بے حد پسند تھے اور وہ ڈھیر سارے بچوں کا باپ بننا چاہتا تھا۔ سونیا نے اسے یہ خبر سنا کر نہال کر دیا تھا۔ اب وہ رات دن سونیا کی ناز برداری میں لگا رہتا۔ دن گن گن کے اس نے بقیہ دن گزارے تھے۔ شاید یہ اس کے انتظار اور چاہت کا ہی کرشمہ تھا کہ بچہ چھٹے مہینے ہی دنیا میں آ گیا تھا۔

دبلا پتلا زرد رو کمزور سا بچہ جس کی شکل و شباہت میں شیکھر کا ہلکا سا پرتو تک نہ تھا پر وہ اسے اپنے دل کا ٹکڑا لگ رہا تھا۔ اس نے بے ساختہ اسے سینے سے لگا لیا تھا۔ سونیا اس کی آنکھوں سے چھلکتے اور چہرے پر بکھرے محبت کے رنگ دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔

"تم نے بچے کا کوئی نام سوچا ہے؟" شیکھر نے خوشی سے تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ پر اشتیاق لہجے میں پوچھا تھا۔

"نہیں۔" سونیا نے بے پروائی سے کندھے اچکا کر جواب دیا تھا اسے بچے سے کوئی دلچسپی نہ تھی اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ اس بچے کو دنیا میں آنے ہی نہ دیتی۔ یہ بچہ اس کی بلند و بالا خواہشوں کی راہ میں رکاوٹ بن گیا تھا۔ دبلا پتلا مریل سا بچہ اس کے لیے کسی بھی کشش کا باعث نہیں تھا۔ "تمہارا ہے...... تم ہی کوئی نام سوچ لو۔" شیکھر کو جواب کا منتظر پا کر اس نے قدرے بے زاری سے جواب دیا۔

"میں نے تو بہت پہلے سے سوچا ہوا ہے۔" شیکھر نے پر جوش لہجے میں جواب دیا۔ "شنکر۔" اس نے تائید طلب نظروں سے سونیا کی طرف دیکھا۔ "شنکر اوبرائے، سن آف شیکھر اوبرائے...... کیسا؟"

"اچھا ہے۔" سونیا نے سرسری سے لہجے میں کہا۔ بچے کی خبر سننے کے بعد سے بچے کی ولادت تک شیکھر کی حالت اور کیفیت دیکھتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے شیکھر کو بے وقوف سمجھا تھا مگر یہ تو بالکل ہی گدھا نکلا دوسرے کے بوجھ کو کس قدر خوشی اور دیوانگی کے ساتھ اٹھانے کے لیے اتاؤلہ ہو رہا ہے۔

توقع کے عین مطابق سونیا نے شنکر کی پرورش اور تربیت کے سلسلے میں کسی بھی دلچسپی اور گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا اور غیر محسوس طریقے سے شروع سے ہی شیکھر نے بچے کی تمام تر ذمے داری اپنے کاندھوں پر لے لی تھی اور وہ یہ سب کر کے بے حد اطمینان اور خوشی محسوس کرتا تھا۔ گو کہ اسے سونیا سے بہت زیادہ توقعات نہیں تھیں پھر بھی کچھ اور نہیں کم از کم بچے کو تو ماں کی ممتا اور چاہت کی ضرورت تو ہوتی ہے۔ مگر سونیا اس سلسلے میں بھی بے حد کٹھور اور سنگ

دل ثابت ہوئی تھی۔ اسے شیکھر سے تو کبھی کوئی لگاؤ تھا ہی نہیں۔ مگر اپنی کوکھ سے پیدا کیے بچے سے بھی اسے کوئی رغبت نہ تھی۔ پہلے تو اس نے یہی سوچ رکھا تھا کہ بچے کی پیدائش کے فوراً بعد اسے اناث آشرم میں دے دے گی۔ مگر یہ بچے کی خوش نصیبی تھی کہ وہ شیکھر کے گھر میں اس کے نام کے ساتھ پیدا ہوا تھا اور اپنے اس نام نہاد باپ کی بے پناہ توجہ اور محبت سے سرشار ہو رہا تھا۔

سونیا پھر سے اپنی سابقہ دلچسپیوں کی طرف راغب ہو گئی تھی۔ اس نے پھر سے اسٹیج اور ٹی وی کے ڈراموں میں کام کرنے کے لیے ہاتھ پیر مارنے شروع کر دیے تھے۔ شیکھر کا تعلق ایک شریف اور باعزت گھرانے سے تھا۔ اس لئے اب وہ نہیں چاہتا تھا کہ سونیا دوبارہ سے شوبز کی طرف واپس جائے اور ویسے بھی شنکر ابھی بہت چھوٹا تھا اسے ماں کے قرب اور توجہ کی ضرورت تھی۔ مگر سونیا کو نہ شنکر کی ضرورت کا خیال تھا اور نہ ہی شیکھر کی خاندانی ساکھ کا...... وہ ان لوگوں میں سے تھی جو اپنی ذات سے نکل کر کسی اور کے بارے میں سوچتے ہی نہیں۔ اسے صرف اپنی ذات سے پیار تھا۔

مجبوری ختم ہوتے ہی وہ پھر سے پہلے انداز میں سوچنے لگی تھی۔ اب اسے شیکھر کا یہ پرانی طرز کا گھر کھنڈر اس کی پرانے ماڈل کی گاڑی کھٹارا اور خود اس کے خیالات فرسودہ لگنے لگے تھے۔ اب وہ ہر چیز سے بے زار ہو چلی تھی۔

وہ شوبز میں ایک بار پھر اپنی قسمت آزمانا چاہتی تھی۔ اسی لیے اس نے اب پارٹیز اٹینڈ کرنی شروع کر دی تھیں۔ شیکھر اس کی ان تمام مصروفیات سے زیادہ خوش نہیں تھا۔ وہ اسے، ایک باوفا بیوی اور اچھی ماں کے روپ میں دیکھنا چاہتا تھا۔ شروع شروع میں اس نے اسے پیار محبت سے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ کبھی تلخ لہجے اور غصے کا بھی مظاہرہ کیا...... مگر سونیا تو کوئی بات سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔ بات بات پر بھڑک اٹھتی چیخنے چلانے لگتی...... چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکتی اور خوب ہنگامہ کرتی۔ ننھا شنکر یہ سب دیکھ کر خوفزدہ ہو کر رونے لگتا اور شیکھر سب کچھ بھول کر شنکر کو چپ کرانے میں لگ جاتا۔ شنکر کے آنسو اس کا غصہ بہا کر لے جاتے تھے وہ شنکر کو روتا ہوا دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اسی طرح وقت گزرتا رہا...... دیکھتے ہی دیکھتے 10 سال بیت گئے۔

اب شنکر دس برس کا ہو چکا تھا۔

ان دس سالوں میں شنکر اور شیکھر سونیا کی توجہ اور محبت کو ترستے رہے تھے۔

شروع شروع شنکر ماں کو دیکھ کر ہمکتا تھا...... اس کی گود میں جانے کے لیے لپکتا تھا مگر ماں کی طرف سے ڈانٹ جھڑکی اور نفرت بھری نخوت پا کر دوبارہ سے شیکھر کی طرف لوٹ آتا تھا۔ ماں کی بے توجہی اور نفرت نے اسے بے حد حساس بنا دیا تھا۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اندر سمٹتا جا رہا تھا۔ ممتا کی محرومی نے اس کے اندر ایک احساس کمتری اور سہمی ہوئی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ شیکھر کی بے پناہ محبت بھی اس کی زندگی کے گوشوارے میں ممتا کے خسارے کو کم نہ کر سکی تھی۔ وہ ایک تشنہ مایوس اور محروم شخصیت کا مالک بن کر رہ گیا تھا۔

شیکھر کی طرح شنکر بھی سونیا کو بے پناہ چاہتا تھا۔ جب تک وہ گھر میں رہتی وہ پروانے کی طرح اسی کے گرد چکر لگائے جاتا وہ ڈانٹ کر بھگا دیتی تو وہ کونوں کھدروں سے چھپ چھپ کر اسے تکے جاتا۔

برسوں کی تگ و دو اور کوششوں کے باوجود سونیا شوبز میں اپنا کوئی نام اور مقام نہ بنا سکی تھی۔ اس کی ناکامیاں اس کے چڑچڑے پن میں اضافے کا باعث بنتی جا رہی تھیں۔ اب تو وہ بات بے بات شیکھر سے جھگڑتی رہتی تھی۔ شادی کے کچھ ہی عرصے بعد شیکھر کو اندازہ ہو گیا تھا کہ سونیا ان لڑکیوں میں سے نہیں ہے جو گھر بساتی ہیں اور عزت و آبرو کے ساتھ شوہر اور بچوں کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہیں۔ اسے اپنی ذات کی نمائش اور تشفی کے لیے دولت اور شہرت کی ضرورت تھی اور ان کی خاطر وہ گھر شیکھر اور شنکر کو لات

مار کر جانے سے بھی گریز نہ کرے گی...... وہ یہ جانتا تھا...... پر شنکر کی خاطر، سب کچھ سہہ رہا تھا۔ وہ اپنے چہیتے بیٹے کو اس کی ماں سے جدا نہیں کرسکتا تھا۔ لاکھ تعلق سہی پر وہ شنکر کی نظروں کے سامنے تو تھی اور جہاں تک خود اس کا تعلق تھا تو لاکھ اختلافات کے باوجود اس کے دل میں اب بھی سونیا کی چاہت موجود تھی اور وہ اس سے علیحدگی یا جدائی برداشت نہ کرسکتا تھا۔ سو اس نے صبر اور خاموشی کا وطیرہ اختیار کرلیا تھا اور جوں توں زندگی گھسٹ گھسٹ کر آگے بڑھتی جارہی تھی۔

اور ایسے میں بالکل اچانک سونیا کی ولود سے ملاقات ہوگئی اور ابتدائی شکوے شکایتوں کے بعد کچھ ہی دیر میں وہ پھر سے پہلے کی طرح دوستانہ ماحول میں باتیں کرنے لگے تھے۔ سونیا کے دل میں آج بھی ولود کے لیے محبت کی دبی ہوئی چنگاری موجود تھی۔ جبکہ خود اسے آج بھی سونیا سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ ہمیشہ کی طرح آج کل بھی اس کی مالی حالت بے حد خراب تھی اور وہ ایک کروڑ پتی بیوہ کو رجھانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔

سونیا اصرار کرکے اسے اپنے ساتھ گھر لے آئی تھی۔ شیکھر ہمیشہ ہی دیر سے گھر لوٹتا تھا البتہ شنکر گھر پر موجود تھا۔

شیکھر نے شاندار گھر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ ''تم اس گھر میں رہتی ہو؟'' اس سارے عرصے میں پہلی بار اسے سونیا میں دلچسپی محسوس ہوئی۔ ''یہ تمہارا گھر ہے؟''

''میرے شوہر کا گھر ہے...... اسے ترکے میں ملا ہے۔''

سونیا کے سوکھے لہجے سے ولود کو اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ اپنے پتی سے زیادہ خوش نہیں ہے۔ اس نے پہلی بار پیار بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''جانتی ہو سونیا تمہیں کھو کر میں کس کس طرح پچھتایا ہوں، لمحہ لمحہ میں نے خود کو لعن طعن کی ہے...... کوئی پل نہیں گزرا جب میں نے تمہیں یاد نہیں کیا...... میں کتنا برا تھا جو اس مشکل گھڑی میں تمہیں چھوڑ کر چلا گیا تھا اور تم کتنی اچھی ہو کہ آج بھی تمہارے دل میں میرے لیے جگہ ہے۔''

اس نے ہاتھ بڑھا کر سونیا کو اپنی طرف کھینچ لیا اور سونیا اس کی بانہوں میں آتے ہی موم کی طرح پگھل گئی۔ آج برسوں کے بعد پھر سے وہ پہلے کی طرح مل رہے تھے۔ ایک دوسرے میں گم ہوکر وہ ہر بات بھول گئے تھے۔

تب ہی بالکل اچانک دھڑ سے دروازہ کھولتے ہوئے شنکر کمرے میں داخل ہوا تھا ماں کو کسی غیر مرد کی آغوش میں سمٹے دیکھ کر پہلے اس کی آنکھوں میں حیرت اتری پھر یہ حیرت کراہیت اور نفرت میں بدلتی چلی گئی تھی۔

''یہ......؟'' ولود ایک دم سے سیدھا ہوتے ہوئے بولا تھا۔

''تم یہاں کیا کررہے ہو؟'' سونیا نے ولود کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے غصیلی آواز میں شنکر سے سوال کیا تھا۔

''اور...... آپ کیا کررہی ہیں؟'' زندگی میں شاید پہلی بار اس نے غصے بھرے لہجے میں ماں سے سوال کیا تھا۔ سونیا کو حیرت ہوئی مگر اگلے ہی لمحے اس نے مزید غصے سے اسے کمرے سے نکل جانے کا حکم دیا تھا اور وہ تحقیر آمیز نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے باہر نکل گیا تھا۔

''ولود تم بھی نا......'' شنکر کے جانے کے بعد وہ ولود کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''اتنے بے تاب ہوجاتے ہو کہ دروازہ بند کرنا بھی بھول جاتے ہو...... ہمیشہ کی طرح آج بھی تم اتنے ہی دیوانے ہو۔''

''اور یہ بچہ......؟'' ولود نے سوچتی ہوئی آواز میں سوال کیا...... ''کیا یہ وہی بچہ ہے؟''

''ہوں۔'' سونیا نے انگڑائی لیتے ہوئے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''یہ وہی ہے۔''

اور ٹھیک اسی لمحے شیکھر کی پرانی خستہ حال گاڑی بنگلے کے کشادہ پورچ میں آکر رکی تھی۔ شیکھر اپنا بیگ سنبھالتا برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتا جوں ہی اوپر آیا تھا وہیں اس نے برآمدے کے مرمریں ستون سے لپٹے سہمے ہوئے شنکر

کو کھڑے پایا تھا۔

''پاپا! آپ آگئے؟'' وہ ستون کی آڑ سے نکل کر اس کے قریب آتا ہوا بولا تھا۔

''اس طرح یہاں کیوں کھڑے ہو؟'' شیکھر نے حیرت سے پوچھا تھا۔

''اندر کوئی انجان شخص ممی سے ملنے آیا ہے......'' شنکر نے نفرت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ ''وہ بہت گندا ہے آپ فوراً اسے گھر سے نکال دیں۔''

10 سالہ بیٹے کی بات سن کر وہ حیران ہوا تھا آج پہلی بار اس نے شنکر کو اتنے غصے میں دیکھا تھا۔ گو کہ وہ صرف دس برس کا تھا مگر شعور اور آگاہی کے لحاظ سے وہ ایک میچور اور سمجھ دار بچہ تھا۔ حالات کی تلخیوں نے اسے بہت کچھ سمجھا اور سکھا دیا تھا۔ وہ شیکھر کا ہاتھ تھامے اسے سونیا کے بیڈ روم کی طرف لے آیا تھا۔ اس سے پہلے کہ شیکھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتا اندر سے آتی آوازوں نے اس کے قدم جہاں کے تہاں روک دیے تھے۔

''شنکر اس کا نام ہے۔'' سونیا ولود کو بتارہی تھی۔ ''شیکھر نے اپنے نام کے قافیے سے قافیہ ملا کر اس کا نام رکھا تھا۔''

''نام بے شک اس نے رکھا ہو۔'' ولود کی ہنستی آواز سنائی دی تھی۔ ''مگر وہ بیٹا تو میرا ہے نا؟''

''ہاں وہ تمہارا ہی بیٹا ہے جسے تم پیدا ہونے سے پہلے ہی چھوڑ بھاگے تھے۔'' سونیا قدرے نیروٹھے لہجے میں جواب دیا۔ ''کس مشکل سے میں نے شیکھر کو شیشے میں اتارا تمہیں کیا معلوم...... اور وہ بے وقوف آج تک نہ سمجھ سکا کہ یہ بچہ اس کا نہیں ہے......''

پہلے تو شیکھر کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا تھا۔ وہ الفاظ نہیں کھولتا ہوا سیسہ تھا جو اس کے کانوں میں انڈیلتا چلا گیا تھا۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سونیا اس کے ساتھ ایسا دھوکا بھی کرسکتی تھی...... وہ بچہ جسے وہ اپنے جگر کا ٹکڑا اور دل کی دھڑکن سمجھ کر پال رہا تھا۔ سرے سے اس سے اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔

وہ لڑکھڑاتے قدموں سے واپسی کے لیے مڑ گیا۔

شنکر اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔ سونیا کی کہی ہوئی سب باتیں اس نے بھی سنی تھیں اور بہت آسانی سے سمجھ لی تھیں۔ یہ حقیقت اس کے لیے بھی بہت اذیت ناک تھی کہ جان سے زیادہ چاہنے والے اس شخص سے اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ وہ اپنی ماں کے گناہ کا نتیجہ تھا...... جسے اس نے نہایت چالاکی سے شیکھر جیسے معصوم شخص کے سر منڈھ دیا تھا اور وہ کمینہ خصلت انسان کہ جس کا نام ولود تھا...... دراصل اس کا باپ تھا۔

ولود کے ساتھ سونیا کے لیے بھی اس کے دل میں شدید نفرت کا احساس اٹھا تھا اور وہ پاؤں پٹختا اپنے کمرے کی طرف چل دیا تھا۔

وہ کیا کچھ جان چکا ہے شیکھر نے یہ راز سونیا پر کھلنے نہ دیا تھا اور نہ ہی شنکر کے ساتھ اس کے رویے میں کوئی فرق پڑا تھا۔

''آپ اب بھی مجھ سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں؟'' اس صبح جب وہ ہمیشہ کی طرح اس کے لیے ناشتہ تیار کررہا تھا۔ تو اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا تھا۔

''اب کیا فرق پڑ گیا؟'' شیکھر نے سوال کیا تھا۔

''آپ سمجھ رہے ہیں جو میں کہہ رہا ہوں۔'' شنکر نے اذیت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ ''اب جبکہ یہ راز کھل چکا ہے کہ میرا اور آپ کا کوئی رشتہ نہیں ہے...... تب بھی آپ......''

''محبت بذات خود ایک رشتہ ہوتا ہے۔'' شیکھر نے اس کے رنجیدہ چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لیتے ہوئے، پیار بھرے لہجے میں کہا تھا۔ ''اور میرا اور تمہارا دل کا رشتہ ہے......''

شنکر نے بے اختیار اپنا سر شیکھر کے سینے پر رکھ دیا تھا۔ شیکھر کے سینے میں تڑپتا ہوا دل دھڑک دھڑک کر اس کی بات کی تصدیق کررہا تھا۔

اندر کمرے میں شیکھر اور سونیا کے درمیان حسب معمول

بحث وتکرار ہورہی تھی اور کمرے سے باہر دروازے سے لگا سہا ہوا شنکر اس لڑائی کے ختم ہونے کا انتظار کررہا تھا۔ اسے شیکھر پر رحم آرہا تھا۔ آج اس کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ مگر اس کی ماں اس سے مسلسل لڑے جارہی تھی۔ آخر تھک کر شیکھر کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔

اگلے دن شنکر اسکول سے لوٹا تو شیکھر گھر پر نہیں تھا۔ البتہ سونیا کے کمرے میں ونود موجود تھا۔

"میں مایوس ہوچکی ہوں ونود؟" سونیا کی شکست خوردہ آواز سنائی دی شنکر نے آگے بڑھ کر دروازے میں موجود کی ہول پر آنکھ لگادی تھی۔

کمرے کے وسط میں دھرے بیڈ پر ونود نیم دراز تھا اور سونیا اس کے پہلو میں لیٹی ہوئی تھی۔ "مجھے اب یقین ہوچلا ہے شیکھر کسی بھی طرح یہ گھر نہیں بیچے گا......"

"اگر وہ نہیں بیچے گا تو کیا ہوا؟" ونود نے سوچے سمجھے لہجے میں کہا۔ "تم تو بیچ سکتی ہو؟"

"میں؟" سونیا حیران ہوئی۔ "گھر شیکھر کے نام ہے؟"

"اس کے مرنے کے بعد یہ گھر اس کی بیوہ کے نام ہوجائے گا۔" ونود نے اطمینان بھرے لہجے میں جواب دیا۔ "اور وہ آرام سے گھر فروخت کرسکے گی......"

"کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک۔" سونیا نے مایوسی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اب اس کے مرنے کا انتظار کرنا پڑے گا؟"

"نہیں۔" ونود نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی سی شیشی نکالی شنکر نے کی ہول سے لگی آنکھ سے حیرت سے اس شیشی کی طرف دیکھا۔ ایسی کئی شیشیاں اس گھر میں موجود تھیں۔ ہومیوپیتھک کی ادویات عموماً اسی طرح کی شیشیوں میں دستیاب ہوتی تھیں اور شنکر ہومیوپیتھک طرز علاج کو پسند کرتا تھا۔

"کیا ہے اس شیشی میں؟" غالباً سونیا بھی اس میں کوئی اسی قسم کی دوا سمجھی تھی۔

"اس میں تیر بہدف زہر ہے؟" ونود نے سنسنی خیز لہجے میں کہا تھا۔

"زہر؟" سونیا دہل کر ذرا سا پیچھے ہٹ گئی تھی۔

"درست یہ ایسا انوکھا زہر ہے کہ دنیا کا کوئی ڈاکٹر اسے ثابت نہیں کرسکتا۔" ونود نے مطمئن لہجے میں بتایا۔ "کھانے کے چند منٹ بعد ہی دل کی حرکت رک جائے گی تو یہی پتہ چلے گا کہ جیسے ہارٹ فیل ہوا ہے...... اور بس......"

"مگ...... مگر......" سونیا اب بھی خائف نظروں سے شیشی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ "اس طرح تو......"

"اسی طرح کرنا پڑے گا۔" ونود نے وہ شیشی ہاتھ بڑھا کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ کام تم آج رات ہی کو کرلو...... ہم زیادہ انتظار نہیں کرسکتے...... اور تمہیں ڈرنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے...... یہ کھانے والے کے لیے جس قدر خطرناک ہے، کھلانے والے کے لیے اسی قدر بے ضرر ہے۔" وہ سفاکی سے مسکرایا۔ "کسی کو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ شیکھر کی موت زہر خورانی سے ہوئی ہے یا ہارٹ اٹیک سے......"

"اچھا...... اگر تم کہہ رہے ہو تو......" سونیا نے گردن کو ذرا سا خم دے کر شیشی کی طرف دیکھا۔

"اب اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی تو نہیں ہے۔" ونود نے سونیا کو اپنی آغوش میں سمیٹتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں سرگوشی کی۔ "اب میں تم سے ایک دن بھی دور نہیں رہنا چاہتا۔"

شنکر نے کی ہول سے آنکھ ہٹالی۔

اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

اندر موجود مرد اور عورت کہ جن سے اس کا خون کا رشتہ تھا اس شخص کو صفحہ ہستی سے مٹانے کا پروگرام بنارہے تھے۔ جس سے اس کا دل کا رشتہ تھا محبت کا رشتہ۔

"محبت کا رشتہ ہر رشتے سے بالاتر ہوتا ہے۔ اس کے کانوں میں شیکھر کے کہے ہوئے الفاظ گونجے اور اس نے گھبرا کر ایک بار پھر کی ہول سے آنکھ لگادی۔ اب اس کی دید کا مرکز وہ چھوٹی سی شیشی تھی۔ جس میں زہر کی صورت شیکھر کی موت بند تھی۔

ونود کے جانے کے بعد بھی شنکر کافی دیر تک سونیا کے بیڈ روم کے اردگرد ہی منڈلاتا رہا تھا۔ سونیا اس کی عادت سے واقف تھی۔ وہ جانتی تھی شنکر اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر اسے کونوں کھدروں سے چھپ چھپ کر دیکھا کرتا تھا اور اس کی اس دیوانہ وار محبت پر کبھی وہ بے اختیار مسکرادیتی تھی اور کبھی جھنجلا اٹھتی تھی۔

شام ڈھل گئی مگر سونیا اپنے کمرے سے باہر نہیں آئی۔

آفس سے آنے کے بعد حسب معمول شیکھر نے رات کا کھانا تیار کیا تھا اور کھانا میز پر لگا کر شنکر کو آواز دی تھی۔

"شنکر! آؤ بیٹا کھانا کھالو۔"

شنکر آہستگی سے چلتا کھانے کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اس کی اداس آنکھوں میں ایک عجب سی حسرت تھی۔ وہ مایوس نگاہوں سے شیکھر کو دیکھ رہا تھا۔ یہ شخص، یہ محبت کرنے والا انسان، دل و جان سے چاہنے والا باپ......

آج رات کو ہی...... یا آنے والے ایک آدھ دن میں موت کی نیند سلا دیا جانے والا تھا...... شنکر کا دل بے تحاشہ دھڑکنے لگا۔ وہ اپنی ماں سونیا سے بے پناہ محبت کرتا تھا...... مگر آج اسے احساس ہورہا تھا کہ وہ شیکھر سے بھی محبت کرتا تھا...... کیوں کہ شیکھر سے تو اس کا رشتہ ہی محبت کا تھا......

"کیا بات ہے؟" شیکھر نے اسے دور گم صم کھڑے اور اپنی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے دیکھ کر حیرانی سے پوچھا تھا۔ "تم اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں۔" شنکر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے قدم میز کی طرف بڑھا دیے تھے۔ شیکھر نے اس کے سامنے پلیٹ لگائی تھی اور پلیٹ میں سالن نکالا تھا۔ شنکر خاموشی سے سر جھکا کر کھانے میں مصروف ہوگیا تھا۔

شیکھر ہاتھوں میں سر تھامے خاموش بیٹھا تھا۔

"آپ کیوں نہیں کھا رہے؟" شنکر نے اچانک ہی چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ "کیا آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟" اس نے ہاتھ سے نوالہ پلیٹ میں واپس رکھتے ہوئے فکرمند لہجے میں پوچھا۔ "نہیں ایسی کوئی خاص طبیعت خراب نہیں ہے......" شیکھر نے تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "بس یونہی معمولی سا سر میں درد ہے۔"

"آپ کے سر میں درد تھا، اس کے باوجود آپ نے میرے لیے کھانا تیار کیا؟" شنکر نے پوچھا۔

"اگر میں مر بھی رہا ہوں گا تب بھی تمہارے لیے کھانا تیار کروں گا۔" شیکھر مسکرایا۔

"پاپا! شاید آپ کو اندازہ نہیں...... آپ واقعی بہت جلد مرنے والے ہیں۔" شنکر نے کرب بھرے انداز میں سوچا اور نگاہیں جھکالیں۔

"تم نے ہاتھ کیوں روک دیا تم کھانا کھاؤ۔" شیکھر نے اسے ہاتھ روکتے دیکھ کر جلدی سے کہا۔

"بس پیٹ بھر گیا۔" شنکر نے افسردہ لہجے میں جواب دیا اور کرسی سے اٹھ کر برتن سمیٹنے لگا۔ برتن لے کر وہ کچن میں گیا تو اس نے دیکھا کہ سونیا کچن میں موجود تھی وہ جھوٹے برتن سنک میں ڈال کر خاموشی سے کچن سے باہر نکل گیا۔

"شنکر! میرے لیے ایک گلاس پانی لادو پلیز۔" شیکھر نے کمرے سے آواز دے کر کہا تھا۔ سر میں شدید درد ہے میں ٹیبلیٹ کھانا چاہتا ہوں۔"

سونیا نے پلٹ کر کمرے کے کھلے دروازے سے اندر کی طرف دیکھا۔ شیکھر کرسی کی پشت گاہ پر سر ٹکائے آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ تکلیف کا احساس اس کے چہرے سے جھلک رہا تھا۔ وہ چند لمحے سوچتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ وہ آہستگی سے کچن کے بیرونی دروازے سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔ برآمدے کے پلر کے پیچھے کھڑا شنکر اسے اپنے کمرے میں جاتا ہوا دیکھتا رہا تھا۔ چند ہی لمحوں بعد وہ واپس کچن میں چلی آئی تھی۔

"شنکر۔" آہٹ سن کر شیکھر نے دوبارہ آواز دی تھی۔

"شنکر یہاں نہیں ہے۔" اس نے روکھے لہجے میں جواب دیا۔ "میں چائے بنا رہی ہوں تمہیں بھی ایک کپ دے دوں گی اسی کے ساتھ ٹیبلیٹ لے لینا۔" گو کہ اس کا لہجہ کھردرا تھا پر آواز میں ایک نرمی تھی۔ اس نے چائے کا پانی چولہے پر رکھ کر، اسٹینڈ سے چائے کے دو مگ اٹھا کر ٹرے میں رکھے۔ غالباً چائے تیار ہو گئی تھی۔ اس نے دونوں مگوں میں چائے انڈیلی پھر محتاط نظروں سے کھڑکی اور دروازے کی طرف دیکھا۔ شنکر غالباً اپنے کمرے میں تھا اور شیکھر حسب سابق آنکھیں بند کیے ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھا تھا۔ سونیا نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر وہی چھوٹی شیشی جو آج دوپہر ہی ونود نے اسے دی تھی نکالی اور اس میں موجود سفوف چائے کے ایک مگ میں انڈیل دیا۔ پھر چمچے سے چائے میں موجود سفوف کو مکس کرتی دو مگ اٹھا کر اندر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"چائے۔" اس نے چائے کا مگ شیکھر کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں اسے اطلاع دی۔ "تمہارے پاس ٹیبلیٹ ہے یا میں اپنے کمرے سے لادوں!" اس نے نرم لہجے میں مزید پوچھا۔

"نہیں ٹیبلیٹ میرے پاس ہے۔" اس نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ "اینی دے چائے کے لیے تھینکس۔"

اس کے کچن سے نکلتے ہی شنکر دبے پاؤں کچن میں داخل ہو گیا تھا۔ سامنے ہی کاؤنٹر پر ٹرے میں بھاپ اڑاتی چائے کا مگ دھرا تھا۔ شنکر تیزی سے اس کی جانب بڑھا تھا۔ اس سے پہلے کہ سونیا کچن میں آتی شنکر اسی انداز میں کچن سے باہر نکل گیا تھا۔

سونیا نے کچن میں آ کر چائے کا مگ اٹھایا اور آہستگی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ کمرے میں آ کر اس نے دروازہ بند کیا تھا اور بستر پر بیٹھ کر چائے پینے لگی تھی۔ دروازے کی کی ہول سے آنکھ لگائے شنکر یک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔

چائے پی کر آنکھیں بند کر کے وہ بستر پر لیٹ گئی تب شنکر دروازے کے پاس سے ہٹ گیا تھا اور آہستگی سے چلتا کھانے کے کمرے کی طرف چلا آیا تھا۔

شیکھر بھی چائے پی چکا تھا اور اس وقت میز پر سر دھرے آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں بند اور لب ساکت تھے اور ستے ہوئے زرد چہرے پر موت کا سا سکوت تھا۔

شنکر کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ مگر اس نے اپنی حلق سے ابلتی چیخوں اور سسکیوں کو وہیں روک لیا تھا۔ وہ سختی سے ہونٹ بھینچے تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بھاگ گیا تھا۔

"شنکر...... شنکر میرے بچے اٹھو......" صبح اس کی آنکھ شیکھر کی گھبرائی ہوئی وحشت زدہ آواز سے کھل گئی تھی...... "شنکر...... تم...... تمہاری ماں......"

"میں جانتا ہوں پاپا۔" شنکر نے دوبارہ آنکھیں بند کیے ہوئے کرب بھرے لہجے میں سوچا تھا۔ "میری ماں مر چکی ہے۔ وہ پیاری ہستی جسے دیکھے بنا مجھے چین نہیں آتا تھا۔ میں نے خود ہی اسے موت کی نیند سلا دیا۔ ونود کا لایا ہوا زہر اس نے آپ کی چائے میں ملایا تھا میں نے اس کے مگ کو آپ کے مگ سے بدل دیا تھا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو...... اس زہر سے وہ آپ کو موت کی نیند سلا دیتی...... میں یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا...... کیوں کہ شاید میں خون کے رشتے کے بغیر تو زندہ رہ سکتا ہوں...... لیکن پاپا آپ کی محبت کے رشتے کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔" شنکر نے سختی سے آنکھیں بھینچ لیں اور آنسوؤں کے دو قطرے اس کی پلکوں سے ٹوٹ کر اس کے زرد رخساروں پر بہتے چلے گئے۔

☆ ☆ ☆



خون گشتہ

سمندر پار سے۔ تازہ ترین درآمد کرائم کی یادگار کہانیوں میں ایک۔ ایک ماسٹر پیس تحریر' معیار کا اعتبار مانے ہوئے لکھاری۔ کلارک هوورڈ کے قلم سے

احمد صغیر صدیقی

ایلری کوئن' مسٹری میگزین کے تازہ شمارے سے انتخاب

لوریتا رڈ نے یہ فیصلہ۔ جو بالآخر اس کی جان لے لینے والا تھا' اس وقت کیا تھا جب اس کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی' اس وقت وہ اس چھوٹے سے ہائی اسکول سے تعلیم مکمل کر کے نکلی تھی جو نو ورس کاؤنٹی کی میٹ سے باہر ایک دیہی کاؤنٹی میں واقع تھا' جسے فودھیرز کاؤنٹی کہا جاتا تھا اور گریجویشن کے لئے تیار تھی۔

اور لوریتا نے جو فیصلہ کیا تھا وہ یہ تھا' وہ اس لڑکے کو جس سے وہ محبت کرتی تھی اور جو اس سے محبت کرتا تھا' بتا دے گی کہ اس نے کسی اور سے شادی کرنے کا ارادہ کر لیا ہے' وہ لڑکا جو اس سے پیار کرتا تھا' خود بھی ایک سینئر تھا' مگر کسی دوسرے اسکول کا جو قریبی کاؤنٹی میں واقع تھا' وہ لوریتا سے کوئی تین سال پہلے جبکہ دونوں کی عمریں پندرہ سال تھیں' بلیک فرائی ڈے نائٹ فٹ بال گیم کے دوران ملا تھا' جو ان دونوں اسکولوں کے درمیان کھیلا جا رہا تھا' تب

سے ان دونوں کی دوستی مضبوطی کے ساتھ قائم تھی' جب لورینا نے اپنے ارادے کا تذکرہ اس سے کیا تو لمحہ بھر کے لیے ششدر رہ گیا۔

"تم مذاق کر رہی ہو۔" اس نے گھبراہٹ کے ساتھ کہا۔

"رینا اس طرح کی باتیں مت کرو۔" وہ واحد آدمی تھا اس کی زندگی میں جو اسے رینا کہہ کر پکارتا تھا۔

"نہیں...... میں بے حد سنجیدہ ہوں۔" لورینا نے کہا۔ میں ادھر کچھ دنوں سے کارٹر گراہم سے ملتی رہی ہوں' اس نے مجھ سے شادی کے لیے کہا ہے۔

کارٹر گراہم' اس وقت ایک اونچے کلاس کی پرائیویٹ یونیورسٹی میں اپنا تھرڈ ائیر مکمل کر رہا تھا اور موسم بہار کی تعطیلات میں گھر آیا ہوا تھا' وہ ایک مقامی مال دار لڑکا تھا' وہ اس گھرانے کا واحد لڑکا تھا' جس کے پاس نوورز کاؤنٹی کے آدھے سے زیادہ کھیت تھے' جن میں سویابین اُگتے تھے۔

"مجھے بہت افسوس ہے۔" لورینا نے کہا وہ واقعی افسردہ لگ رہی تھی۔ "مگر میں اس چھوٹے سے علاقے میں غربت کی زندگی گزارتے ہوئے تنگ آ چکی ہوں' میرے سامنے کوئی مستقبل نہیں' کارٹر ایک سال بعد تعلیم سے فارغ ہو جائے گا' پھر وہی اپنے باپ کا بزنس سنبھالے گا' ہم لوگ "دی ہل" پر ایک بڑے سے مکان میں رہیں گے' میرے پاس اس قدر دولت ہوگی' جس سے میں جو کچھ چاہے خرید سکوں گی۔"

"دی ہل" وہ جگہ تھی جہاں اس کاؤنٹی کے صرف چھ عدد متمول لوگوں کے مکانات تھے۔

"مگر ہم نے طے کیا تھا کہ ہم گریجویشن کے بعد معلفس یا اٹلانٹا یا کسی اور جگہ منتقل ہو جائیں گے۔" اس کے نوجوان عاشق نے اُسے سمجھانے کی سعی کی۔ "ہم نے تو سوچا تھا کہ ہمیں وہیں کہیں رہنے کی جگہ مل جائے گی' ہمیں جاب بھی......"

"کس قسم کی جگہ ملتی؟" لورینا نے للکارتے ہوئے کہا...... "کوئی چھوٹا سا گندہ سا اپارٹمنٹ اور جاب؟ میں کسی ہوٹل میں ویٹرس اور تم...... تم کو ڈیلیوری مین یا اسی طرح کے کچھ اور؟ نہیں مجھے معاف کرو۔" اس نے اپنا ہاتھ اس کے ننگے سینے پر رکھ دیا۔ آخری بار وہ اسے اپنائیت سے چھو رہی تھی۔ "آئی ایم سوری۔"

"مگر...... رینا۔ یہ تو صرف ہمارا آغاز ہوگا۔" اس نے التجائی لہجے میں کہا۔ "ہم کوئی نائٹ اسکول وغیرہ جوائن کر لیں گے' کوئی پیشہ ورانہ ڈگری حاصل کر لیں گے......"

"کب؟ کتنے عرصے میں؟ چھ سال' سات سال یا دس سال میں؟"

"رینا ڈیئر......"

"نہیں۔ میں نے ذہن بنا لیا ہے' میں اب زیادہ عرصہ غربت میں نہیں رہنا چاہتی۔" اس نے اپنا ہاتھ اس کے سینے سے ہٹا لیا۔ ایک چیونٹی اس کے بازو پر رینگ رہی تھی' لڑکے نے اسے مارنے کیلئے ہاتھ اٹھایا مگر لورینا نے اسے روک دیا' پھر اس نے اپنی ایک انگلی کی جنبش سے اُسے بازو سے اُڑا دیا۔ "مجھے بہت افسوس ہے' میں تمہارے ساتھ یہ کچھ کر رہی ہوں' مگر میں مجبور ہوں۔" اس نے لڑکے کے ہونٹوں کا ایک مختصر سا بوسہ لیا' اس کی آنکھیں بہہ نکلی تھیں' لڑکے کی آنکھیں بھی نمناک تھیں۔ "تم جلد مجھے بھول جاؤ گے۔ تھوڑا سا وقت گزر جانے دو......"

☆

رابرٹ میکویڈ اسسٹنٹ ڈائریکٹر جیل خانہ جات' اپنا ناشتہ کر رہا تھا' جب فون کی گھنٹی بجی اور ذرا سی دیر بعد اس کی ہاؤس کیپر ڈیلیا ایک پورٹ ایبل ہینڈ سیٹ لیے آتی دکھائی دی۔

"مسٹر بولی...... گورنر کا فون ہے۔" اس نے کہا۔

میکویڈ نے کافی کا گھونٹ حلق سے اُتارا۔ فون لے لیا اور بولا۔ "گڈ مارننگ سر۔"

"دیکھو...... میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں' تم مجھے گرانٹ کہہ کر مخاطب کرو گے۔" دوسری طرف سے گورنر گرانٹ مارلو کی آواز سنائی دی۔ "یہ سر وَر بند کرو۔"

"صرف اس وقت جب ہم پی پلا رہے ہوں اور تنہا ہوں۔" میکویڈ نے کہا۔

"کتنے برسوں سے ہم ایک دوسرے کے دوست رہے تھے' کالج میں تمہارے Notes کی بدولت ہی مجھے کامیابی ملی تھی' کیا تم پسند کرو گے کہ میں تمہیں "مسٹر ڈائریکٹر" کہہ کر پکارنا شروع کر دوں۔"

"تم گورنر ہو' جس طرح چاہے مجھے مخاطب کر سکتے ہو۔"

"بولی میک اینڈ تم جلد مانتے نہیں ہو۔" گورنر نے کہا۔ "اچھا سنو جلدی سے میرے آفس پہنچ جاؤ۔ فریڈ ویلس اور آرٹ میڈوز بھی آ رہے ہیں' ہمیں ابھی ابھی ایک فیڈرل کورٹ کا آرڈر ملا ہے' کارٹر گراہم کی پھانسی کو فی الحال روک دیا گیا ہے۔"

میک اینڈ نے تیوری چڑھائی۔ فریڈ ویلس اسٹیٹ اٹارنی جنرل تھا اور آرٹ میڈوز ریاستی سرجن جنرل۔ "کس بنیاد پر یہ التوائی حکم جاری ہوا ہے؟"

"یہاں آؤ گے تب بتاؤں گا۔" ماریو نے کہا۔ "جلدی پہنچو۔"

اس نے فون بند کیا۔ مگر اس کے چہرے پر الجھن کے تاثرات بدستور موجود رہے۔" وہ سوچ رہا تھا اس STAY کے لیے کون سی ممکنہ وجوہات ہو سکتی ہیں' کارٹر گراہم وہ شخص تھا' جس نے اپنی بیوی لورینا رڈ گراہم کو سر پر ہتھوڑی مار کر بیہوش کر دیا تھا' پھر اس نے اس کے ایک پیر میں ایک اسپیئر ٹائر باندھ کر لسکی دریا میں پھینک دیا تھا' اسے پکڑا گیا تھا اور اسے موت کی سزا دی گئی تھی' پچھلے تین برسوں میں اس کے کیس میں کئی اپیلیں ہوئی تھیں' مگر ہر بار یہ مسترد کر دی گئی تھیں' ریاستی سپریم کورٹ' فیڈرل ڈسٹرکٹ کورٹ' فیڈرل کورٹ آف اپیلز اور یو ایس سپریم کورٹ ہر جگہ سے اپیل کی تمام جگہوں کو کھنگالا گیا تھا' اور ہر جگہ سے انکار ہوا تھا' خود گورنر گرانٹ مارلو نے بھی اس متمول زمیندار مجرم کی سزائے موت کو عمر قید کی سزا میں بدلنے سے انکار کر دیا تھا' کیونکہ یہ قتل انتہائی درجہ سفاکانہ تھا' لاش کے پوسٹ مارٹم سے معلوم ہوا تھا کہ لورینا رڈ پانی میں ڈوبنے سے مری تھی' یعنی جب اُسے مجرم نے دریا میں پھینکا تھا وہ زندہ تھی۔

اس وقت یہ کارٹر گراہم پار مالی ریاستی جیل میں اُس کال کوٹھری میں تھا' جو موت کے سزا یافتہ لوگوں کے لئے بنائی گئی تھی' اسے ایک مہلک انجکشن کے ذریعے آنے والے تین دنوں میں موت کے گھاٹ اُتارا جانا تھا۔

مگر یہ کام فی الوقت ملتوی کر دیا گیا تھا۔

☆

گرانٹ مارلو کی عمر چھیالیس سال تھی' وہ مضبوط نقوش کا مالک تھا' اس کے سر پر گھنے بال تھے' جن میں جا بجا سفیدی پھیل رہی تھی' اس کی مسکراہٹ الجھا لینے کی صلاحیت رکھتی تھی' اس کا حافظہ نہایت اچھا تھا' نام' چہرے اسے خوب یاد رہتے تھے' اپنی شخصیت اور صلاحیتوں کے پیش نظر وہ صحیح معنوں میں ایک گورنر نظر آتا تھا' اس بات کے امکانات بھی تھے کہ آگے جا کر وہ سینٹر بن جائے' وہ مملکت کا صدر بھی بن سکتا تھا۔

"آ جاؤ بھئی' آ جاؤ۔" اس نے اپنے ڈائریکٹر جیل خانہ جات اٹارنی جنرل اور سرجن جنرل کو دیکھ کر کہا۔ میک ویڈ فریڈ ویلس اور آرٹ میڈوز دروازے سے اندر داخل ہوئے' ویلس کے چہرے پر تلخی پھیلی ہوئی تھی' وہ تین سال سے کارٹر گراہم کے چالاک وکلاء سے لڑ تا رہا تھا' اور اس کی کامیابی پھر دھندلا رہی تھی' وہ صورت حال سے خاصا ناخوش تھا۔

جب تینوں آدمی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ گورنر نے کہا۔ "اوکے' فریڈی تم ذرا یہ خونچکاں تفصیل بتاؤ۔"

ویلس نے اپنا بریف کیس نکالا اور اس میں سے چار

شیٹوں پر مشتمل ایک آرڈر نکالا' جس پر امریکا کے ڈسٹرکٹ کورٹ کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔

''ایک بے رحمانہ اور غیر معمولی سزا کے خلاف یہ اپیل ایک نئی رسائی جیسی ہے۔'' اس نے کہا۔

میک ڈیڈ نے ہنکاری بھری۔ ''یہ درجنوں ریاستوں کی درجنوں عدالتوں میں ٹھوکریں کھاتی رہی ہے' میں تو سمجھا تھا کہ قانون اس پر مستحکم رہے گا۔''

''اصلیت تو یہی ہے۔'' ولیس نے کہا۔ ''مگر اس میں اب نیا پھندنا ٹانکا گیا ہے۔ اپیل اس کے خلاف نہیں ہے کہ مہلک انجکشن کے ذریعے موت دینا کوئی بے رحمانہ یا غیر معمولی طریقہ ہے' بلکہ اس میں کہا گیا ہے کہ کسی شخص کو مارنے کے لئے مہلک انجکشن لگانے کا جو طریقہ رائج ہے' وہ بے رحمانہ اور غیر معمولی ہے۔''

گورنر اور میک ویڈ دونوں نے ہی کنفیوژن کے ساتھ سر جھٹکا' سرجن جنرل میڈوز نے صرف بھنویں اٹھا کر اپنے تجسس کا اظہار کیا۔

''میں سمجھا نہیں۔'' گورنر نے کہا۔

''میں بھی نہیں سمجھ سکا۔'' میک ویڈ نے تائید کی۔

''دونوں میں کیا فرق ہے؟''

''ولیس نے کہا۔ ''میں خود بھی دونوں باتوں میں کوئی فرق نہیں پاتا۔'' اس نے تسلیم کیا۔

''مگر ڈسٹرکٹ کورٹ نے فرق کی وضاحت کی ہے۔ بنیادی طور پر گرا ہم کے وکلاء نے جو کہا ہے اور جسے کورٹ نے تسلیم کیا ہے وہ یوں ہے کہ جب کسی شخص کو مہلک انجکشن کے ذریعے موت کے گھاٹ اُتارا جا رہا ہوتا ہے تو کیا وہ ان اوقات کے مابین' جب اُسے پہلا ڈرگ دیا جاتا ہے جو اُسے سلا دیتا ہے' پھر جب اُسے دوسرا ڈرگ دیا جاتا ہے جو اُسے مفلوج کر دیتا ہے اور پھر جب اُسے تیسرا ڈرگ دیا جاتا ہے جو اس کے دل کی حرکت روک دیتا ہے.....کیا اُسے درد کا احساس ہوتا ہے؟ اس کے وکلاء کا کہنا ہے کہ ان انجکشنوں کے لگانے کے موجودہ طریقے میں اس بات کا امکان موجود ہے کہ سزا یافتہ شخص ہوسکتا ہے بیہوش نہ ہوتا ہو' اسے پتا چلتا رہتا ہو کہ کیا ہو رہا ہے اور اس طرح وہ خوف ناک قسم کے درد و کرب میں مبتلا ہونے کے بعد مرتا ہو۔ وہ اس موت کو بے رحمانہ اور غیر معمولی کہتے ہیں' اس امکان کے جواز میں ان کا کہنا ہے کہ اگر آدمی مضبوط جسم کا ہو تو وہ لاشعوری طور پر بیہوشی کے خلاف کامیاب مزاحمت کر سکتا ہے۔''

''یہ ایک مضحکہ خیز بات ہے۔'' میک ویڈ نے کہا۔ اس نے آرتھر میڈوز کی سمت دیکھا۔ ''تم کیا کہتے ہو؟''

سرجن نے شانے اُچھالے..... ''بہ طور تھیوری۔'' اس نے تسلیم کیا۔

''یہ بات درست ہو سکتی ہے' مگر عملاً میں سمجھتا ہوں ایسا ممکن نہیں' اپنی جگہ سے اٹھ کر ڈاکٹر کمرے میں ٹہلنے لگا' پھر وہ اس طرح گھوما جیسے میڈیکل کے طلبہ سے مخاطب ہو۔

''پہلی دوا جو انجکٹ کی جاتی ہے' وہ ہے سوڈیم تھیوپنٹال' جسے عام طور پر سوڈیم پاتھوتھل کہتے ہیں' اگر اسے انٹروینس انجکٹ کیا جائے تو یہ بیہوش کر دیتی ہے' یہ بہت زود رفتار ڈرگ ہے' صرف تیس سیکنڈ میں یہ دماغ پر اثر انداز ہو جاتی ہے۔''

''اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟'' گورنر نے پوچھا۔

''اس کا مطلب ہوتا ہے کہ آدمی بیہوش ہو جاتا ہے' آدمی کو کچھ پتا نہیں چلتا کیا ہو رہا ہے' کوئی درد نہیں ہوتا' وہ بے حرکت ہو جاتا ہے اور اُسے ہوش آنے تک کی کوئی بات نہیں یاد رہتی۔''

''اور'' گورنر مارلو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''سرجری کے ضمن میں مریضوں کو سو یا ڈیڑھ سو ملی گرام کا ڈوز دیا جاتا ہے' تاہم ہماری ریاست میں مجرموں کو موت دینے کے لئے دو گرام کا ڈوز دیا جاتا ہے' یہ گویا دو ہزار ملی گرام کا ڈوز ہوتا ہے' یہ ڈوز بذات خود مارنے والا کہا جا سکتا ہے' مگر اس کا انحصار آدمی کے برین سیل

(BRAIN CELL) کے ردعمل پر ہوتا ہے۔

''کیا ایسا کوئی طریقہ نہیں جس کے ذریعے کسی شخص پر اس کے اثرات کو ماپا جا سکتا ہو؟'' میکویڈ نے پوچھا۔

''ایسا کہا جا سکتا ہے مگر کسی حد تک مگر یہ کام Anesthesiologists کا ہوتا ہے۔ مگر یہ بھی جان لیں کہ یہ انتھیولوجسٹوں اور تمام ڈاکٹروں پر طبی اخلاقیات نے پابندی عائد کر رکھی ہے کہ وہ کسی قانونی Execution میں بالکل حصہ نہ لیں۔ بے شک وہاں ہمارا ایک ریاستی ڈاکٹر ہوتا ہے' مگر وہ صرف اس لئے ہوتا ہے کہ مجرم کی موت کی تصدیق کرے۔ اسے کسی بھی طرح مجرم کو مارنے کے عمل میں حصہ لینے کا عمل نہیں کہا جا سکتا ہے۔''

''کیا پہلے ڈرگ کے اثرات کو ماپنے کا کوئی اور طریقہ نہیں؟'' گورنر نے پوچھا۔

آرتھر میڈوز نے لمبی سانس بھری۔ ''میں اس کا جواب دیتا ہوں' دماغ ہی تمام حیوانات کا سب سے زیادہ حیرت انگیز عضو ہوتا ہے' چڑیاں' حشرات الارض' مچھلیاں' ممال سارے جاندار دماغ رکھتے ہیں اور ان سب میں انسانی دماغ سب سے حیران کن ہوتا ہے' یہی ہمیں بولنے سمجھنے' سوچنے' سننے کی طاقت بخشتا ہے' یہی ہمارے جسم کے درجۂ حرارت' خون کی رفتار' دل کی دھڑکنوں اور سانسوں کی آمد و شد کو کنٹرول کرتا ہے' یہی ہماری آنکھوں' کانوں' ناکوں' لمس وغیرہ کی اطلاعات کے سیلاب کو تھامتا ہے' اسی کی بدولت ہم کھڑے ہو سکتے ہیں' لیٹ سکتے ہیں' بیٹھ سکتے ہیں' جواب استدلال تجربات' جذبات' سب اسی کی پیداوار ہوتے ہیں۔ اور یہ وہ عضو ہوتا ہے' جو گوبھی کے ایک چھوٹے پھول سے زیادہ نہیں ہوتا۔'' اس نے اپنا سر جھٹکا' ہمارے پاس کوئی ایسا طریقہ نہیں' جس سے ہم یہ جان سکیں کہ کسی خاص حالات میں کسی کا دماغ کس طرح محسوس کرتا ہے۔

آفس میں خاصی لمبی خاموشی رہی' پھر گورنر نے اسے توڑا۔

''ٹھیک ہے.....اب ہم کیا کریں؟'' اس کی نظریں اٹارنی جنرل پر جار رکیں۔ ''فرڈ تم بتاؤ۔''

''فرڈ ولیس نے پرخیال لہجے میں کہا۔

''ہم ہائر فیڈرل کورٹ میں اپیل کر سکتے ہیں اور بس۔''

''اور اگر ہم وہاں ناکام ہو گئے؟''

اٹارنی نے شانے اچھالے۔ ''ہم آخری عدالت میں جا سکتے ہیں' امریکا سپریم کورٹ میں' ہم وہاں نہیں ہاریں گے' اس کی میں گارنٹی دے سکتا ہوں۔''

گورنر مارلو نے ہنکارہ بھرا۔ ''اگر یہ معاملہ اتنی دور تک گیا تو فیصلے میں کئی سال لگ جائیں گے۔''

''فرڈ... سوچو کوئی ایسا طریقہ ہے۔'' میک ویڈ نے دریافت کیا۔ ''جس سے ہم نچلی عدالت کو اس پہلے انجکشن کے بارے میں مطمئن کر سکیں؟ کوئی ایسا طریقہ جس سے عدالت کو یقین ہو سکے کہ مجرم موت تک گہری غشی میں ہوتا ہے اور اس دوران اسے نہ کوئی درد ہوتا ہے' نہ تکلیف۔''

''مجھے اس کا علم نہیں۔'' اٹارنی جنرل نے کہا۔ ''تاہم میرے ذہن میں ایک خیال.....''

''ہاں..... ہاں..... ضرور بتاؤ۔'' گورنر نے جلدی سے کہا۔

''ہمارے موجودہ طریقے میں ایک الیکٹرو کارڈ لوگراف مشین کو سزا یافتہ شخص کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے اور ایک فلیٹ لائن مونیٹر مطلع کرتا ہے کہ اب دل بند ہو چکا ہے اور موت واقع ہو چکی ہے' اس کے بعد ہمارا ریاستی ڈاکٹر لاش کا معائنہ کر کے موت کی تصدیق کا خط جاری کرتا ہے' میں سمجھتا ہوں اگر فیڈرل کورٹ کو یہ بات سمجھائی جائے اور ساتھ میں ہم اس کے اگر ایک ایسا برین ویو (BRAIN WAVE) مانیٹر بھی منسلک کر دیں جو تینوں انجکشنوں کے دوران کے وقفوں میں برین

کی سرگرمی کو ظاہر کرنے والا ہو تو عدالت کو بتایا جا سکتا ہے کہ کارروائی کے دوران مجرم کو کوئی درد یا تکلیف نہیں ہوتی۔"

"کیا اس طرح ہو سکتا ہے؟" گورنر سرجن نے جنرل کی سمت دیکھا۔

"میں سمجھتا ہوں' ایک الیکٹرو انسفالو گراف مشین استعمال کی جا سکتی ہے۔" سرجن جنرل نے رائے دی...... "یہ مشین برین نیورون کی سرگرمی کو ماپتی ہے' ہمارا دماغ تقریباً بلین NERVE ہزار CELLS سے بنا ہوا ہے' انہیں NEURONS کہتے ہیں' یہی ساری اطلاعات جمع کرتے ہیں اور جسم میں الیکٹرو کیمیکل سگنلز کو TRNNSMIT کرتے ہیں۔ جب سوڈیم پنٹو تھل انجکٹ کیا جاتا ہے' یہ نیورون سو جاتے ہیں اور برین ولو مانیٹر پر نتیجتاً ان کی ختم ہوتی سرگرمی ظاہر ہونے لگتی ہے۔"

"کیا یہ بھروسے کے قابل ہے؟" گورنر نے پوچھا۔

"بالکل...... مگر دماغ کے بارے میں ابھی سینکڑوں اسرار نامعلوم ہیں۔"

"کیا تم سمجھتے ہو' عدالت مان لے گی؟" میک ویڈ نے اٹارنی جنرل سے پوچھا۔

"میں آرٹ کے ساتھ اسے ڈس کس کر چکا ہوں' ہمارا خیال ہے کہ اگر ججوں میں کوئی نیورولوجسٹ نہ ہوا تو ہمارے جیتنے کے تمام امکانات ہیں' ویسے بھی اگر تین ججوں میں سے دو رائے دے دیں تو فیصلہ ہو جاتا ہے' یہ حکم التواء ختم کر دیا جائے گا۔"

گرانٹ مارلو اپنی لمبی چوڑی میز کے پیچھے سے اُٹھا اور اس بڑی سی کھڑکی کی طرف چل دیا۔ جس سے اس کی حویلی کے شاندار گراؤنڈ کو دیکھا جا سکتا تھا' کچھ دیر ادھر دیکھنے کے بعد وہ اپنے مشیروں کی سمت گھوما۔

"جیت کا چانس کیسا بھی ہو' ہمیں لینا ہوگا۔" اس نے اٹارنی جنرل سے کہا۔ "کیا یہ کام جمعہ تک ہو سکے گا؟"

"ہاں...... ہو سکتا ہے۔"

"پھر لگ جاؤ اسی پر۔" گورنر نے حکم دیا۔

☆

میٹنگ کے بعد گرانٹ مارلو نے میک ویڈ کو رکنے کے لئے کہا۔

"لوسی نے آج رات کے کھانے پر تمہیں مدعو کیا ہے بوبی۔"

میک ویڈ مسکرایا۔ "لگتا ہے تمہاری خوب صورت بیگم میری شادی پر تل گئی ہے' کیا معاملہ یہی نہیں؟"

"اب تم پوچھ رہے ہو تو بتاتا ہوں۔ ہاں روز فلر بھی موجود ہوگی۔"

روز فلر گورنر کی پرائیویٹ سیکریٹری تھی' یہ ایک مطلقہ عورت تھی' جس کا شوہر نہایت واہیات ثابت ہوا تھا' یہ بوبی میک ویڈ سے عمر میں قدرے کم تھی' مگر تھی بہت ذہین اور دلکش' گورنر کی بیگم وہی سے اس کی پرانی دوستی تھی اور گورنر کی بیوی چاہتی تھی کہ روز کی شادی بوبی سے کرا دے۔ بوبی نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔

"گرانٹ۔" میک ویڈ نے کہا۔ "دیکھو روز اور میں دونوں میں خاصی دوستی ہے' مگر میں نہیں سمجھتا کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہوگی' خود میں نے بھی اس طرح نہیں سوچا۔"

"لوسی اس طرح نہیں سوچ رہی ہے' اس کا خیال ہے روز تیار ہے' خواہش مند ہے' دیکھو میں خود بھی سمجھتا ہوں' تم دونوں کا جوڑا اچھا رہے گا۔"

"اچھا بھئی...... لوسی کو کہہ دینا میں آ رہا ہوں۔"

جب میک ویڈ جانے لگا تو گورنر نے پوچھا۔

"یاد آیا...... تم نے ڈویل کی جگہ پُر کرنے کے لئے کسی کو چن لیا ہے یا نہیں؟"

"ابھی تک تو نہیں۔" راس ڈویل پارملی کے ریاستی جیل خانے کا وارڈن تھا' جہاں ان لوگوں کی کال کوٹھریاں

تھیں' جنہیں سزائے موت دی گئی ہوتی تھی' موت کا چیمبر بھی اسی کے چارج میں تھا۔

"کیا اس بات کا کوئی امکان ہے کہ وہ اپنا استعفیٰ واپس لے لے؟"

"مجھے امید نہیں' یہ معاملہ اس کے لئے اخلاقی مسئلہ ہے' وہ سزائے موت کے خلاف ذہن رکھتا ہے اور چونکہ اس کے فرائض میں بٹن دبانا بھی شامل ہے' اس نے چار افراد کے ضمن میں یہ کام کیا تھا اور کہتا ہے اب وہ اس طرح کا کام قطعی نہیں کریگا۔"

"مجھے دکھ ہو رہا ہے' وہ ایک لائق آدمی ہے۔" مارلو نے اپنی میز پر دھرے چند کاغذات کی سمت دیکھا اور بولا۔ "اچھا بوبی۔ اب شام کو تم سے ملاقات ہوگی' او کے۔"

گورنر آفس کے استقبالیہ کمرے میں روز فلر ایک خاصی بڑی سی میز کے پیچھے موجود تھی۔ اس کے سامنے بڑی کرسی پر بوبی میک ویڈ نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کیوں نہ ہم دونوں چپکے سے کہیں فرار ہو جائیں؟ باس اور باس کی بیوی ہماری شادی کرانے پر تلی ہوئی ہے۔"

"لوسی مارلو مجھے کبھی نہیں معاف کرے گی۔" روز نے اپنی کھنکتی آواز میں کہا جو سیدھی دل پر اثر کرتی تھی۔

"اس نے حکم دیا ہے کہ وہی میرے لئے شوہر تلاش کرے گی اور وہ سمجھتی ہے کہ تم خاصے موزوں آدمی ہو' وہ اسی حویلی میں شادی کی تقریب بپا کرنے کے لئے سخت بے چین ہے' اگر وہ ناکام ہوئی تو ہم دونوں کو جان سے مار ڈالے گی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آج رات میں مجھے یہاں کھانے پر آنا ہی پڑے گا۔ کتنے لوگ ہیں؟"

"بس صرف ہم چار۔"

"خوب۔" میک ویڈ نے اس کے دودھ جیسے سفید ہاتھ پر تھپکی دی۔ "رات میں ملاقات ہوگی۔"

"او کے۔"

میک ویڈ اٹھا اور چل دیا۔ راستے میں وہ سوچتا رہا کہ یہ عورت آہستہ آہستہ واقعی مجھے اچھی لگنے لگی ہے' اُسے یقین ہو رہا تھا کہ اس کی اور روز کی جوڑی واقعی اچھی لگے گی اور یہ ایک ایسا جوڑا ہوگا جو مستقبل میں جب گرانٹ ایک امریکی سینیٹر بن جائے گا اس کے ساتھ ہوگا' البتہ روز خاصی شرمیلی ہو گئی تھی' جب سے اُسے اس کے سابقہ شوہر نے پچنگ بیگ بنا لیا تھا۔ وہ شراب پی کر اُسے مارتا رہتا تھا' روز بہرحال خوش تھی کہ اُس آدمی سے اس کے گھر کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی' دونوں یعنی بوبی اور روز' ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لیکن کسی نے بھی ابھی تک شادی کی بات کہنے کی ہمت نہیں کی تھی۔

میک ویڈ کا آفس اسی سے متصل ایڈمنسٹریشن بلڈنگ میں تھا۔ وہ ادھر جاتے جاتے ایک دم سے رک گیا' پھر اس نے اپنا رخ تبدیل کیا' اپنی ویٹر پکڑا اور پارکنگ گیراج میں جا پہنچا' دس منٹ کے بعد وہ ایک دوسری ریاست کے اس راستے پر کار دوڑا رہا تھا' جس کے دونوں طرف سویابین کے کھیت تھے...... اس کی منزل تھی وہ ریاستی جیل' جہاں سب سے زیادہ سیکورٹی کے انتظامات تھے۔

☆

پارمالی اسٹیٹ پریزن (ریاستی جیل) نوے سال پہلے تعمیر کی گئی تھی' اسے قیدیوں سے تعمیر کرایا گیا تھا' اس میں پتھروں کا استعمال کیا گیا تھا' جو پتھر کی ایک ریاستی کان سے نکالے جاتے تھے' جس وقت یہ بن گئی تھی' اسے امریکہ کی بہترین جیل سمجھا گیا تھا' اب تو دہائیوں بعد اس کی صورت خراب ہو گئی تھی' یہ پرانی لگتی تھی اور OUT-MODED بھی۔ گورنر گرانٹ مارلو ان دنوں ایک نئی جیل کی تعمیر کروا رہا تھا' جو قریب ہی ایک جگہ تھی اور یہ عمارت اعلیٰ درجے کے نقشے کے ساتھ پرائیویٹ ٹھیکے داروں کے ذریعے بنوائی جا رہی تھی' جس میں پاورفل الیکو پمنٹ اور کنسٹرکشن میٹر' ستعمل ہو

رہا تھا' یہ سال کے آخر تک مکمل ہونے والی تھی۔ مگر فی الحال پارمالی جیل ہی تھی۔

جیل کی انتظامیہ کی عمارت' بڑی سی دیوار کے آدھی اندر تھی اور آدھی باہر۔ میک ویڈ استقبالیہ میں داخل ہوا' جہاں وارڈن راس ڈویل کا آفس تھا۔

''گڈ مارننگ لیون۔'' اس نے وارڈن کے سیکریٹری سے کہا۔ لیون ایک سابق کالج پروفیسر تھا' وہ اکیس سال کی عمر سے یہاں عمر قید کی سزا بھگت رہا تھا۔ اس نے اپنی ایک شاگرد لڑکی کو قتل کر دیا تھا کیوں کہ وہ اس کے ساتھ زیادہ دیر تک تعلقات رکھنے پر تیار نہ تھی۔

''وارڈن مصروف ہے؟'' میک ویڈ نے پوچھا۔

''نہیں سر۔'' لیون نے جواباً کہا۔'' اندر چلے جائیں۔''

راس ڈویل نے اپنے باس کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تو اٹھا اور مسکرایا۔ وہ میک ویڈ کا بہت پرانا دوست تھا' دونوں ایک زمانے میں ایک ہی شعبے میں کام کرتے رہے تھے اور یہ میک ہی تھا' جس نے ڈویل کو یہاں پارمالتی کا وارڈن بنوایا تھا۔

''ہوبلی۔'' وارڈن نے کہا۔'' میرے ساتھ کھانا کھاؤ گے یا یہ کوئی سرکاری ملاقات ہے؟''

''یہ سرکاری اور غیر سرکاری دونوں ہے' مگر لنچ تو کھاؤں گا۔ میرا خیال ہے تمہاری جیل چھ ریاستوں میں شاید سب سے شگفتہ کہی جا سکتی ہے' مگر یہ بات کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہاں کے قیدیوں کو پوری طرح کھانا نہیں ملتا۔''

''یہ ان کا حق بنتا ہے' یہاں ان کے چھ عدد فارم ہیں' یہاں ہر وہ چیز اُگائی جاتی ہے جو ہم کھاتے ہیں' میں اگر یہ کہوں کہ ہمارے جیسا ڈیری فارم کسی ریاست میں نہیں تو غلط نہ ہوگا۔''

''راس نے لیون کو اپنے ہونے کی جگہ سے مطلع کیا پھر وہ اور میک ویڈ اس راستے پر چلے جو ایک ڈبل' ڈیڈ لاک راہداری تھی' پھر وہ جیل کے حصے میں داخل ہو گئے' انہوں نے ایک بہت عمدہ ترشے ترشائے لان کو عبور کیا' جس کے ادھر جیل کا ڈائننگ ہال تھا' یہ دو بڑے بڑے CELL بلاکس کے درمیان بنا ہوا تھا۔

''ایک فیڈرل کورٹ نے گراہم کے EXCUTION کو رکوا دیا ہے۔'' میک ویڈ نے چلتے ہوئے ڈویل کو مطلع کیا۔

''تم مذاق تو نہیں کر رہے ہو؟'' ڈویل نے کہا۔'' اور کن بنیادوں پر؟''

''اس طریقے پر جس طرح مہلک انجکشن لگائے جاتے ہیں' ان کا کہنا ہے کہ یہ نہیں ثابت کیا جا سکتا کہ انجکشن سے واقعی قیدی بیہوش ہو جاتا ہے' اور اسے کوئی اذیت نہیں محسوس ہوتی۔''

''کیا مضحکہ خیز بات ہے۔'' ڈویل نے کہا۔'' اسے بیہوشی کا جو انجکشن دیا جاتا ہے وہ خود ہی نہایت مہلک ہوتا ہے' اُسے مارنے کیلئے کافی ہوتا ہے۔''

''ہوگا۔'' میک ویڈ نے بتایا۔'' اپیل کورٹ Positive ثبوت چاہتا ہے۔''

ڈویل خاموش ہو گیا' وہ موت کی سزا کا ہی مخالف تھا اور سزا پر عمل درآمد کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا تھا' تاہم اس کا یہ خیال ضرور تھا کہ پھانسی کی سزا میں سب سے اچھی سزا اگر کوئی تھی تو وہ انجکشن والی ہی تھی' کم از کم یہ ''انسانی'' ضرور تھی۔

''دیکھو راس۔'' میک ویڈ نے کہا۔'' اس سے تمہارے استعفے پر بہرحال کوئی اثر نہیں پڑے گا.....''

''پڑے گا۔'' ڈویل نے بات کاٹی۔'' میں نے کہہ رکھا ہے کہ میں کارٹر گراہم کے EXCECUTION تک رکوں گا۔''

''ہاں.....لیکن یہ تو اس جمعے تک کا معاملہ تھا' جس میں اسے موت دی جانے والی تھی اور تمہارے لئے ایک اور منصب منتظر ہے اور یہ کون سا ادارہ ہے؟''

''یہ اس قومی تحریک کا ادارہ ہے جو قیدیوں کو موت کی سزا دیئے جانے کے خلاف چلائی جا رہی ہے' اس کا مرکزی دفتر نیویارک میں ہے۔''

''میں نہیں چاہوں گا کہ تم اس جگہ سے محروم ہو جاؤ۔'' میک اس عمارت کے سامنے رک گیا۔ جہاں وہ بڑا سا ڈائننگ روم واقع تھا۔

''دیکھو' مجھے معلوم ہے کہ تمہارے اندر موت کی سزا کے خلاف کس قسم کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم بہت دنوں سے صرف اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی کے لئے خود اپنے جذبات سے برسر پیکار ہو' مجھے معلوم ہے اگر تمہاری دوستی مجھ سے نہیں ہوتی تو تم کئی برس پہلے اس نوکری کو چھوڑ کر رخصت ہو گئے ہوتے۔ مگر تم نے آ کر مجھ سے اس سلسلے میں بات کی تھی اور ہمیں موقع دیا تھا کہ ہم [illegible] پریس میں آنے سے پہلے ہی طے کر سکیں' مجھے خوشی ہے کہ تم نے اور گورنر دونوں نے عمدگی سے مسئلے کو ڈیل کیا تھا' میں چاہتا ہوں کہ تم بھی پیر تک اپنے استعفے کو روکے رکھو' کارٹر گراہم کا کام تمام ہو یا نہ ہو۔'' میک ویڈ نے اپنے دوست کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔'' تم نیویارک جا کر نئی جاب سنبھال لو' ہم اس کارٹر گراہم کے کیس کو تمہارے بٹن دبائے بغیر ہی ہینڈل کر لیں گے۔''

راس ڈویل نے جذباتی آواز میں کہا۔'' دراصل میں اپنی ذمہ داری کسی اور کے اوپر ڈالتا نہیں.........''

''تم بے فکر ہو جاؤ' سب ٹھیک ہو جائے گا۔ چلو......''

پھر وہ دونوں اُس وسیع و عریض ڈائننگ ہال میں داخل ہوئے جہاں کوئی دو ہزار قیدی دن میں دو وقت کھانا کھاتے تھے' ناشتا اور رات کا کھانا دوپہر کا کھانا' براؤن رنگ کی تھیلیوں میں دیا جاتا تھا' کیونکہ قیدی اس وقت کھیتوں میں کام کر رہے ہوتے تھے' یا ان دکانوں پر جہاں انہیں رکھا گیا ہوتا تھا' اس وقت وہاں چند سو کلرک اور کچھ دوسرے عملے کے لوگ کھانے کے لئے قطار لگا رہے تھے' پھر میک ویڈ اور ڈویل بھی اسی قطار میں شامل ہو گئے' انہوں نے پلیٹوں میں اپنا کھانا وصولا اور اپنی پلاسٹک ٹرے کو ایک ایسے علاقے کی طرف لے کر چل دیئے' جسے گھیر کر رکھا گیا تھا' اس پر صرف STAF F کے لئے کی تختی لگی تھی' جب وہ کھانے بیٹھ گئے تو ڈویل نے اچانک کہا۔'' میں تو بالکل بھول گیا تھا.....آج صبح ایک لڑکی میرے پاس آئی تھی' اس کا دعویٰ تھا کہ وہ لوریٹا گراہم کی بیٹی ہے' وہ کارٹر کو موت دیئے جانے کی کارروائی دیکھنا چاہتی تھی اور اجازت نامہ لینے آئی تھی' مگر اب تو یہ معاملہ ہی غیر یقینی ہو گیا ہے۔''

میک ویڈ نے تیوری چڑھائی۔'' میں نہیں سمجھتا کہ گراہم اور اس کی بیوی کے ہاں کوئی اولاد تھی۔''

''ریکارڈ پر تو واقعی نہیں ہے۔'' ڈویل نے کہا۔

''مگر لڑکی کا کہنا ہے کہ وہ مقتولہ کی بیٹی ہے اور اس کے پاس ثبوت میں سرٹیفکیٹ بھی ہے' اس کا نام رابرٹا رڈ ہے' میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ اس کی اجازت اُسے تم ہی سے مل سکے گی۔ وہ کل صبح تمہارے آفس میں آئے گی۔''

میک ویڈ کی الجھن ویسے ہی قائم رہی۔

☆

اُس رات گورنر کی حویلی کے رہائشی حصے میں گرانٹ اور لوسی اپنے گہرے دوستوں بوبلی میک ویڈ اور روز فلر کی دعوت میں لگے ہوئے تھے' کھانے کے دوران گورنر نے اپنی اور میک ویڈ کے کالج کے دنوں کی متعدد باتیں سنائیں۔

''بوبلی کے بغیر میں شاید کامیاب نہ ہو پاتا۔'' اس نے کہا......'' میں نے ابتداء ہی میں سمجھ لیا تھا کہ ہماری کلاس کا سب سے ذہین لڑکا یہی ہے اور تبھی سے میں نے اس سے دوستی گانٹھ لی تھی۔''

''تم باتوں میں غلو کر رہے ہو۔'' ویڈ نے کہا... پھر اس نے اس کی بیوی کو آنکھ ماری اور بولا۔'' یہ ایک سیاست داں ہے۔''

"نہیں...... لوسی مارلو نے شوہر کی سمت سے کہا۔" "میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں' یہ کوئی بہت ذہین آدمی ہرگز نہیں۔"

پھر سب ہنسنے لگے اور یہ قہقہے دوستوں کے تھے' ان میں گرم جوشی تھی' خلوص تھا اور محبت تھی۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں' اگر بوبی نے کالج فلش کرلیا ہوتا تو آج اسی کرسی پر ہوتا جس پر میں ہوں' یہ اتنا ہی تیز تھا۔"

"تیز مگر غریب۔" میک ویڈ نے اضافہ کیا۔

"اس وقت جو گورنر تھا اول درجے کا چور اور بدمعاش تھا۔" لوسی مارلو نے کہا۔ "اس نے تعلیم کے فنڈ میں بڑی کٹوتی کی تھی اور اسی وجہ سے بوبی جیسے ذہین طالب علموں کو اسکالرشپ نہیں مل سکا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔" روز فلر نے کہا۔ "بوبی نے پھر بھی بہت کچھ کرلیا ہے حالاں کہ کالج مکمل نہیں ہوسکا تھا' ڈائرکٹر جیل خانہ جات کوئی چھوٹی موٹی نوکری نہیں ہے۔"

"ہاں مگر اس میں میرے بہت اچھے دوست کا بھی ہاتھ ہے۔" میک ویڈ نے اپنا گلاس گرانٹ مارلو کو دیکھتے ہوئے اونچا کیا۔

"غلط۔" گورنر نے کہا۔ "تم میرے بغیر بھی بہت کچھ کرنے کی صلاحیت سے مالا مال تھے' شاید تھوڑی تاخیر ہو جاتی مگر بس...... یہ مت بھولو کہ تم مجھ سے پہلے ہی لیفٹیننٹ گارڈ کے عہدے پر پہنچ چکے تھے' تم جیل کے محکمے میں موگی سے ترقیوں کے زینے چڑھ رہے تھے' میرے گورنر بننے سے کافی پہلے۔" رک کر وہ ہنسا۔ "یاد ہے تمہیں گورنر بننے کے بعد میں نے پہلی مرتبہ جب جیلوں کا معائنہ کیا تھا اور تمہیں دوبارہ دیکھا تھا' میرا خیال ہے حیرت سے میرا منہ کھلا رہ گیا تھا' میں بے حد متحیر ہوا تھا۔"

"یہ قسمتوں کی بات تھی۔" لوسی مارلو نے پرزور انداز میں کہا۔ "بالکل اسی طرح میں اور روز بھی ملی تھیں' اس روز ایک ائیرپورٹ پر کوئی دس سال بعد...... اور اب ذرا دیکھو ہم سب اکٹھے ہیں' سارے بہترین دوست یکجا ہیں اور سب خدا کے فضل سے خوشحال ہیں۔"

کچھ بھی ہو اس کی خوش حالی تو گرانٹ مارلو ہی کی وجہ سے تھی' یہ بات میک ویڈ اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے قصبے سے ہائی اسکول کر کے نکلا تھا' پھر اس غریب نوجوان بوبی میک ویڈ نے ایک نئی اسٹیٹ ہارڈشپ پروگرام کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یونیورسٹی ٹیوشن فری حیثیت میں داخلہ لے لیا تھا' جس میں شرط تھی کہ اس کے گریڈ اچھے ہونے چاہئیں' یہاں اُسے گرانٹ مارلو ملا تھا جو ایک مشہور ریاستی پولیٹیکل فیملی کا فرد تھا۔

مگر میک کی ساری محنت پر اس وقت پانی پھر گیا تھا جب اس وقت کے گورنر نے کالج ٹیوشن پروگرام کو ختم کر دیا تھا۔ اسے اسٹوڈنٹ بینک لون بھی نہیں مل سکا تھا' کیونکہ اس کے پاس رہن رکھنے کے لئے کوئی قیمتی شے نہ تھی' پھر میک ویڈ یونیورسٹی سے نکل گیا تھا۔ اس نے ایک معمولی سی مزدوری کرنی شروع کردی تھی' جس میں کوئی مستقبل نہ تھا' پھر اس نے خود کو میرین کورپ میں بھرتی کرلیا' اس کا ارادہ تھا کہ اب وہ ملٹری میں اپنا کیریئر بنائے گا۔

کلف وار میں اس نے کچھ کام نمایاں قسم کے انجام دیئے تو ترقی دے کر ملٹری پولیس مین بنا دیا گیا۔ انہی دنوں اس کی وطنی ریاست کے گورنر کے نمائندوں نے اُسے اس پروگرام کے حصے کے طور پر بھرتی کرایا جو اعلیٰ اور ذہین پولیس آفیسروں کی تربیت پر مبنی تھا' ان نئے آفیسروں کو پرانے ریٹائر کئے جانے والے افسروں کی جگہیں پر کرنی تھیں جو جیلوں کو ڈنڈے کے زور پر چلاتے تھے' دماغ کے زور پر نہیں۔

ویڈ ملٹری لائف سے بھی اُکتا رہا تھا' اسے سول سروس میں جگہ ملتی نظر آئی اور اس طرح اپنے وطن میں بسنے کی اُمید بھی بندھی تو اس نے Diocharge لے لیا اور پارمارلی اسٹیٹ پریزن کے اس تربیتی پروگرام میں چلا

گیا' جو آفیسروں کے لئے تھا' تربیت کی تکمیل کے بعد وہ کوئی دس سال تک اسی جگہ رہا' یہاں وہ جونیئر آفیسر سے سینئر آفیسر بنا' پھر سرجنٹ اور سرجنٹ سے میجر سرجنٹ اور پھر اسے گارڈ لیفٹیننٹ بنا دیا گیا' اس کا نام اس فہرست میں سب سے اوپر تھا' جنہیں کیپٹن کے عہدے پر ترقی دی جانے والی تھی کہ ریاست کا نیا گورنر جیل کے معائنے پر آیا تھا۔

میک ویڈ کو گرانٹ مارلو کالج کے زمانے سے یاد تھا۔ وہ بھی اپنے سیاسی کیریئر میں کامیابی سے آگے بڑھا تھا' پہلے کاؤنٹی پروسیکیوٹر' پھر ڈسٹرکٹ اٹارنی' پھر اسٹیٹ اٹارنی جنرل' پھر لیفٹیننٹ گورنر اور بالآخر گورنر بنا تھا' لیفٹیننٹ میک ویڈ کو مگر شک تھا کہ گرانٹ مارلو نے اُسے یاد رکھا ہوگا' یہاں اس سے اندازے کی ایک بڑی غلطی ہوئی تھی' جیل کے افسروں کو دیکھتے ہوئے مارلو نے میک ویڈ کو دیکھا تھا' پھر نظریں ہٹالی تھیں' پھر کچھ سوچا تھا اور اس کی طرف پھر دیکھا تھا' اس کے بعد اس کے سینے پر لگے نام کے ٹیگ پر نگاہ ڈالی تھی...... جس پر لکھا تھا لیفٹیننٹ آر میک ویڈ...... اور تب اس کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔

"بوبی؟"

سیلوٹ کرتے ہوئے میک ویڈ نے کہا۔ "ہیلو گورنر الیکشن میں کامیابی مبارک ہو سر۔"

"بوبی میک ویڈ؟" گرانٹ مارلو مسکرایا تھا۔ ایک چوڑی مسکراہٹ۔ "کمال ہوگیا بوبی۔"

اسی روز ڈائریکٹر جیل خانہ جات اور پارمارلی جیل کے وارڈن کے ساتھ لنچ کے بعد گرانٹ مارلو نے میک ویڈ کو ایک پرائیویٹ آفس میں طلب کیا تھا۔

"دوست کیسے ہو؟"

"ٹھیک ہوں سر۔" میک ویڈ نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"سر اور تکلف ختم۔" تب گرانٹ مارلو نے کہا۔ "سیدھی طرح بات کرو' میرا نام گرانٹ مارلو ہے۔"

اس طرح وہ پھر ایک بار دوست بن چکے تھے۔ تب سے میک گورنر کی انتظامیہ کا ایک اہم آدمی تھا' دو سال کے اندر اندر میک ویڈ ڈائریکٹر جیل خانہ جات بن چکا تھا' انہی دنوں کی بات ہے کہ کارٹر گراہم اپنی بیوی کے قتل کے سلسلے میں گرفتار ہوا تھا' اس نے بیہوش لورینارڈ کو دریا میں پھینک دیا تھا اس کے ایک پیر میں ایک پرانا ٹائر باندھ کر۔"

☆

گورنر کے ساتھ دعوت کھانے کی دوسری صبح کو میک ویڈ کے سیکریٹری نے بتایا کہ ایک لڑکی' جس کا نام رابرٹا رڈ ہے' اس سے ملنا چاہتی ہے' میک ویڈ نے اسے بلوالیا' اس سے قبل وہ گراہم کی فائل دیکھ رہا تھا' جس میں بہت سی تصویریں مقتولہ کی بھی تھیں' یہ لڑکی جو اس کے آفس میں داخل ہوئی تھی' مقتولہ سے غضب کی مشابہت رکھتی تھی' مشابہت اس قدر زیادہ تھی کہ لمحہ بھر کے لئے میڈ ویڈ کے اعصاب ہل گئے تھے' وہ بالکل ایسی تھی گویا مردہ عورت جوان ہوکر اس کے سامنے آگئی ہو۔

"بیٹھو۔" میک ویڈ نے کہا۔

"شکریہ سر۔ پارمارلی کے وارڈن نے مجھ سے کہا تھا کہ گراہم کے Execution کی کارروائی دیکھنے کیلئے اجازت نامہ مجھے آپ کے پاس سے ملے گا۔"

"شاید تمہیں علم ہوگا کہ فی الحال کارٹر گراہم کا معاملہ التوا میں ڈال دیا گیا ہے۔"

"ہاں۔ مگر بہرحال اُسے موت ضرور ملے گی یا نہیں؟"

"امید تو یہی ہے۔" میک ویڈ نے کہا۔ پھر پوچھا۔ "وارڈن نے بتایا تھا کہ تم لورینارڈ کی بیٹی ہو...... کیا یہ سچ ہے؟"

"ہاں...... وہ میری ماں تھی۔"

"مگر کارٹر گراہم کی تو کوئی اولاد نہیں۔"

"ہاں" رابرٹا روڈ نے کہا۔ "میری ماں نے جب کارٹر گراہم سے شادی کی تھی وہ پہلے ہی سے اُمید سے تھیں' میں سات مہینے بعد پیدا ہوئی تھی اور کارٹر کو شبہ ہوگیا تھا'

اس نے بلڈ ٹیسٹ کرایا تھا اور اس سے ثابت ہو گیا' میں اس کی بیٹی نہیں تھی' اس نے میری ماں سے کہا کہ وہ منہ بند رکھے اور اس سے چھٹکارا حاصل کرے۔ ماں نے مجھے میری نانی کے پاس بھیج دیا' ملبلی رڈ کے پاس' جو ٹاؤن کے نچلے علاقے میں رہتی تھیں' پھر ماں نے میرے اور نانی کے لئے نیا مکان مہیا کر دیا اور جب تک وہ زندہ رہیں' انہوں نے ہمارے لئے رقم بھی بھجوائی' ان کی ہلاکت کے بعد میری نانی اپنی بیٹی کے غم میں مر گئیں۔"

"میں سمجھا۔" میک ویڈ نے کہا۔ "تمہیں اپنی ماں کو جاننے کا موقع ملا تھا؟"

"ہاں۔" لوجوان لڑکی نے کہا۔ "ماں میرے پاس ہر ہفتے آتی تھیں' بے شک ہم ساتھ ساتھ ٹاؤن میں نہیں رہتے تھے' تاہم جب میں ذرا بڑی ہو گئی تھی تو وہ مجھے کسی قریب ٹاؤن میں اپنی کار میں لے جایا کرتی تھیں' وہاں ہم گھومتے تھے' خریداری وغیرہ کرتے تھے۔" اُس کی آواز بھرانے لگی۔ "مجھے اپنی ماں سے بہت محبت تھی' بہت زیادہ......"

میک ویڈ نے سر ہلایا۔ "یقیناً ہو گی۔ کیا اسی لئے تم اس کے قاتل کو مرتا ہوا دیکھنا چاہتی ہو؟"

"ہاں...... اسی لئے۔" رابرٹارڈ نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"کیا تم سمجھتی ہو یہ تمہارے لئے کوئی اچھی بات ہو گی؟ یہ کوئی خوشگوار منظر نہیں ہو گا۔ تمہیں اس کا خیال بعد میں پریشان کر سکتا ہے' کیوں کہ تم بس اپنی والدہ کی خوب صورت یادوں ہی کے ساتھ رہو اور اس کے قاتل کے خیال کے ساتھ آمیزش نہ کرو۔"

"نہیں...... میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔" لڑکی نے ضدی انداز سے کہا۔ "اس شخص نے میری ماں کا جینا دوبھر کر رکھا تھا' میں اسے مرتا دیکھنا چاہتی ہوں...... اور یہ بھی چاہتی ہوں کہ یہ بڑی اذیت کی موت مرے۔"

"مگر مس رڈ' شاید مرتے وقت اُسے ذرا بھی تکلیف نہیں ہو گی' وہ بس نیند کی سی حالت میں ہو گا اور گزر جائے گا' کچھ محسوس کئے بغیر۔"

"مگر میں نے تو آج کے اخبار میں خبر دیکھی ہے کہ عدالت کو یقین نہیں کہ اس کی موت بلا اذیت ہو گی۔ ان کا کہنا ہے کہ ممکن ہے اُسے معلوم ہوتا رہے گا کہ اسے مارا جا رہا ہے' اس کی آنکھیں ویڈ پر رکی ہوئی تھیں' اس نے کہا۔ "میں چاہتی ہوں وہ سخت اذیت کے ساتھ مرے کتے کی موت' میرے دل کو تبھی قرار آ سکے گا۔"

"کیا تمہاری ماں تمہاری اس خواہش کو پسند کرتی؟" ویڈ نے پوچھا۔

رابرٹارڈ کا تاثر بدل گیا۔ "مجھے نہیں معلوم۔" اس نے کہا۔ "شاید نہیں...... میری ماں بہت رقیق القلب عورت تھی' بہت نفیس' یہ ٹھیک ہے کہ سب یہی کہتے ہیں' انہوں نے کارٹر گراہم کے ساتھ صرف دولت کے لئے شادی کی تھی' وہ غربت سے تنگ تھیں اور ان کے سامنے کوئی اچھا مستقبل نہیں تھا' احساس کمتری کے تحت انہوں نے اس کا رڈ کو اپنایا تھا' بے شک رقم کے لئے شادی کرنے کا ان کا یہ عمل غیر اخلاقی تھا' مگر اسی کے سبب وہ ماری بھی گئی تھیں۔" رابرٹارڈ کی آواز میں گرم جوشی پیدا ہونے لگی۔ "جب میں چھوٹی تھی' میں ان کا نام نہیں لے پاتی تھی' لورینا کے بجائے رینا کہتی تھی' جب کبھی میں ان کا نام "رینا" کہہ کر لیتی تھی وہ بہت خوش ہوتی تھیں' بے حد خوش' نہ جانے کیوں ان کے چہرے کا سارا تاثر بدل جایا کرتا تھا' وہ کچھ کھوسی جاتی تھی اور پھر مجھے اس طرح دیکھتی تھیں' جیسے میں ان کیلئے کوئی خزانہ ہوں۔"

تھوڑی دیر تک دونوں چپ رہے' پھر میک ویڈ اور لڑکی نے ایک دوسرے کو دیکھا' دونوں کی نظروں میں ایک دوسرے کے لئے ایک نامعلوم سا جذبہ موجود تھا' جسے دونوں ہی سمجھ نہیں پا رہے تھے۔

پھر میک ویڈ نے میز کا ایک بٹن دبایا' اس کی سیکریٹری نمودار ہوئی تو میک ویڈ نے اُس سے کہا۔

"ایڈنا...... مس رڈ سے ایک Coitness Request کا فارم پُر کراؤ اور اسے کارٹر گراہم کی موت کے منظر کو دیکھنے کا اجازت نامہ جاری کر دو۔"

"ٹھیک ہے سر۔"

رابرٹارڈ اٹھی اس نے کہا۔ "بہت شکریہ مسٹر میک ویڈ۔"

میک ویڈ نے اُس سے مصافحہ کیا اور ضرورت سے زیادہ دیر تک اُس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیے رہا۔

جب دروازہ بند ہو گیا' میک ویڈ نے میز پر رکھی فائل کھولی' اس نے لورینارڈ گراہم کی تصویر پر نظریں مرکوز کر دیں۔

رینا... اُس نے سوچا۔

☆

جمعے کا دن آیا اور چلا گیا۔ فیڈرل کورٹ سے کوئی جواب نہیں آیا تھا' کہ گراہم کی سزا کا التواء ہٹا دیا گیا ہے۔

ہفتے کے روز بوبی میک ویڈ نے کار اٹھائی اور پار بارلی جیل کی طرف چل دیا' وہاں اس نے راس ڈویل کو اپنی میز کی درازیں صاف کرتے پایا۔ وہ اپنی ذاتی چیزیں آفس سے نکال کر باندھ رہا تھا' پچھلی رات اس کے اعزاز میں ایک رخصتی پارٹی ہوئی تھی اور اس میں میک ویڈ کے علاوہ جیل کا سارا عملہ شریک ہوا تھا' سوائے ان کے جو ڈیوٹی پر تھے' بہت مجمع تھا' راس ڈویل جیل کے لوگوں میں اپنے سے پہلے وارڈن سے بھی زیادہ مقبول تھا' یعنی بوبی میک ویڈ سے بھی زیادہ۔ لطف کی بات یہ تھی کہ وہاں کے قیدی جنہیں موت کی سزائیں ملی ہوئی تھیں' انہوں نے بھی اپنی اپنی جگہوں پر چھوٹی چھوٹی رخصتی پارٹیاں کی تھیں' اسی وقت کارٹر گراہم کو بھی موت کے کمرے سے نکال کر دوبارہ کال کوٹھری میں پہنچایا گیا تھا۔

"بوبی؟" راس ڈویل نے اسے تعجب سے دیکھا۔ "آج ہفتے کو یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"میں نے سوچا جاتے جاتے تمہیں ایک اچھی سی چیز پلاؤں۔" میک ویڈ نے جیب سے ایک بوتل نکالی' جیک ڈینئل کی۔"

ڈویل کے ابرو اوپر چڑھ گئے۔

"سر یہ غلط بات ہے۔" اس نے کہا۔ "جیل میں شراب کی بوتل لانا ممنوع ہے' میں آپ کو گرفتار کرانے جا رہا ہوں۔"

"ضرور گرفتار کراؤ۔" میک ویڈ نے کہا۔ "مجھے کچھ آرام کی ضرورت ہے۔"

ڈویل نے آگے بڑھ کر کیبنٹ سے دو کافی مگ نکالے میک ویڈ نے اس میں بوتل انڈیل دی۔ پھر دونوں دوست ملاقاتی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"راس تم چلے جاؤ گے تو میں تمہاری کمی بہت محسوس کروں گا۔" میک ویڈ نے کہا۔

"مجھے بھی یہ کمی محسوس ہوتی رہے گی۔" ڈویل نے گرد سے لہجے میں کہا۔

"یہ نیویارک میں تمہاری جاب کیا ہے؟"

"زیادہ تر ایڈمنسٹریٹو ورک ہے' پھانسیوں کے اعداد و شمار وغیرہ یا پھر تقریریں' روٹری کلبوں میں' کالجوں میں' لیگل کمیٹیوں میں' بس یہی اور فنڈ جمع کرنے کا کام۔"

"مجھے بھی سالانہ چندہ دینے والوں میں شامل کر لینا۔" میک ویڈ نے کہا۔

راس ڈویل نے دیکھا اور بولا۔ "مگر میں تو سمجھتا تھا کہ تم موت کی سزا کے حق میں ہو۔"

"میں ہوں۔ لیکن جب تمہارے جیسا کوئی دیانت دار آدمی جس کی میں عزت کرتا ہوں' دوسری بات کہے تو مجھے سوچنا پڑتا ہے۔" رک کر وہ مسکرایا۔ "بس کسی اور کو نہ بتانا کہ میں تمہارا Contributarl ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" راس ڈویل نے لمبی سانس لی۔ "مگر خیال کی یہ تبدیلی کیسے ہوئی؟" اس نے پوچھا۔

"وہ لوجوان لڑکی جسے تم نے میرے پاس بھیجا تھا' میں

نے محسوس کیا تھا کہ وہ اپنی ماں کے قاتل کو کو مرتا دیکھنے کا پختہ عزم کیے ہوئے ہے پتا نہیں یہ بات میرے لئے بے چینی کا باعث بنی ہے۔" میک ویڈ نے ٹنگ کو منہ سے لگا کر گھونٹ بھرا "مجھے غلط نہ سمجھنا' میں اب بھی موت کی سزا کے حق میں ہوں' مگر صرف چند لوگوں کے لئے' ان لوگوں کے لئے جو اغواء کرتے ہیں' ریپ کرتے ہیں اور بچوں کو مارتے ہیں۔ مثلاً وہ...... جس نے ایک چھ برس کی بچی کو...... کیا نام تھا اس کا؟"

"ڈکلن۔"

"ہاں ڈکلن...... میرے نزدیک ایسے لوگ اسی لائق ہوتے ہیں کہ انہیں ہلاک کر دیا جائے۔ میں تو اس قسم کے جرائم کرنے والوں کو اذیت ناک موت مرتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ انہیں گردن میں پھندا ڈال کر مارنا چاہیے' ایک قانون خصوصی طور پر ایسا بنانا چاہیے......"

"میں تمہاری بات سمجھ گیا۔" راس ڈویل نے کہا۔ "لیکن یہ بتاؤ خط اختراق کس طرح کھینچا جا سکتا ہے؟ ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں' اسے مارو اور اسے نہ مارو؟ اور ایسے بھی ہوتے ہیں جو بے قصور ہوتے ہیں...... انہیں بھی مار دیا جاتا ہے۔"

میک ویڈ نے سر ہلایا۔

"تم اس کارٹر گراہم کے بارے میں کیا کہو گے؟ ہو سکتا ہے اس نے جب اپنی بیوی کو دریا میں پھینکا تھا تو اُسے معلوم نہ رہا ہو کہ وہ زندہ تھی' دریا میں ڈالے جانے سے پہلے تو شاید سزا کچھ اور ہوتی۔"

میک ویڈ نے کوئی جواب نہیں دیا' اس ٹنگ سے چند گھونٹ لئے۔

"ہاں۔ لاس بہت سے سوالا ہیں اور دونوں طرف معقول جوازات بھی ہیں' بہر حال موت کی سزا کو اس طرح ختم بھی نہیں کیا جا سکتا' ہمیں صحیح غلط کا پتا نہیں' ہمیں قانون کی پابندی کرنی ہے اور بس۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ آج کل امریکہ میں تین ہزار سے زیادہ افراد ایسے ہیں جنہیں موت کی سزا دی گئی ہے؟" ڈویل نے کہا۔ "ان میں سے چھ عورتیں بھی ہیں۔"

"میں مانتا ہوں کہ تعداد خاصی ہے۔" میک ویڈ نے تسلیم کیا۔ "مگر ہمارے پاس اڑتیس ریاستوں میں یہ قانون رائج ہے' صرف 12 ریاستیں رہتی ہیں۔"

"اور...... مغرب کو چھوڑو۔ مشرقی ملکوں میں بھی Capital Punkument رائج ہے۔"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے' تم کو تمہاری تحریک مبارک۔ بھائی' میں تو یہاں تمہارے ساتھ الوداعی وقت گزارنے آیا تھا۔ DEBATE کے لئے۔"

پھر ان دونوں نے موضوع بدل دیا۔ ذرا دیر بعد میک ویڈ نے الوداعی مصافحہ کیا۔

جس وقت میک ویڈ جیل سے نکل رہا تھا' اسے رابرٹا رڈ کا خیال آیا اور یہ بات بھی یاد آئی کہ وہ لڑکی اپنے باپ کے قاتل کو اذیت ناک انداز سے مرتے دیکھنے کی خواہاں تھی' پھر اسے اس لڑکی کی ماں کا خیال آیا' جس کے پیر میں ٹائر باندھ کر دریا کے سپرد کر دیا گیا تھا' وہ اس وقت زندہ تھی' لیکن کیا اس سے کوئی فرق پڑتا تھا؟ راس ڈویل نے اس سے پوچھا تھا کہ کارٹر گراہم کے بارے میں وہ کیا کہتا ہے اور میک ویڈ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

اب ڈرائیونگ کرتے ہوئے ایک نام بار بار اس کی سماعت میں گونج پیدا کر رہا تھا' کسی گولی کی طرح دھماکے پیدا کر رہا تھا۔

ریٹا...... ریٹا...... ریٹا

☆

پیر کی صبح کو میک ویڈ کو اٹارنی جنرل کے پاس سے ایک کال موصول ہوئی' فریڈ ویلس کہہ رہا تھا...... "پہلو کورٹ نے اپنا التوائی آرڈر منسوخ کر دیا ہے بوبی...... اب اس کو موت دی جا سکتی ہے مگر Execution میں ایک شرط رکھ دی گئی ہے کہ ہمیں اس میں Brain Wave مانیٹر کا استعمال کرنا ہوگا۔ اس بات کی یقین دہانی کے لئے کہ وہ موت سے پہلے مکمل طور سے بیہوش تھا' میں نے سرجن جنرل آرٹ سے بات کر لی ہے' آج سہ پہر میں وہ پار مارلی جیل میں الیکٹرو انسیفالوگراف مشین بھجوا رہا ہے' ساتھ میں ایک ٹیکنیشن بھی ہوگا جو تمہارے آدمیوں کو مشین آپریٹ کرنا سکھائے گا۔"

"او کے۔" میک ویڈ نے کہا۔ "میں کیپٹن آف دی یارڈ کو مطلع کر دوں گا کہ وہ ہدایات سمجھنے کے لئے Execution ٹیم کو تیار رکھے۔ کیا گرانٹ نے اس کے لئے کوئی تاریخ طے کی ہے؟"

"ہاں...... کل۔" ویلس نے کہا۔ "وہ دستخط کے لئے ایک نیا ڈیتھ وارنٹ بنوا رہا ہے۔"

اسی وقت گورنر کی ڈائرکٹ لائن روشن ہوئی۔

"میں گرانٹ بول رہا ہوں۔" میک ویڈ نے فرڈ ویلس سے بتایا اور کہا...... "میں تم سے بعد میں بات کروں گا۔" اس نے ایک بٹن دبایا اور بولا۔ "گڈ مارننگ گورنر۔"

"بوبی...... فرڈ سے بات ہوئی؟"

"ہاں...... ابھی ابھی' ہم کل بالکل تیار ہوں گے۔"

"ٹھیک...... تم تک نیا Death Warrant پہنچ جائے گا' میں جلد سے جلد اس قاتل کا خاتمہ کر کے اپنی پلیٹ صاف کرنا چاہتا ہوں' تاکہ سینٹ تک پہنچنے میں میری راہ میں کوئی رکاوٹ نہ رہے' ڈویل تو چلا گیا' اب اس کی جگہ پار مارلی میں کون سب کچھ کرے گا؟ بس ذرا سے توقف سے میک ویڈ نے کہا......

"اس کی جگہ یہ شو میں RUN کروں گا اتنی جلدی کسی نئے وارڈن کا تقرر مناسب نہیں۔"

"بوبی...... تم پہلے بھی کوئی Execution کر چکے ہو؟"

"ہاں...... میں وارڈن تھا جب۔ پانچ بار۔"

"او کے...... پھر ٹھیک ہے' پریس والے اسے پسند کریں گے...... انصاف کی تکمیل کے لئے اسٹیٹ ڈائریکٹر جیل خانہ جات کا انفرادی اقدام...... میں یہ بات اس پریس کانفرنس میں بھی کہوں گا جو میں کل کرنے والا ہوں۔ مجھ سے رابطہ رکھنا۔"

کلک کے ساتھ لائن ڈیڈ ہو گئی۔ میک ویڈ نے ایک اور بٹن دبایا۔ یہ پار مارلی جیل کی ڈائرکٹ لائن تھی۔ "میں میک ویڈ بول رہا ہوں۔" اس نے کہا...... "کیپٹن آف دی یارڈ (COY) سے بات کراؤ۔" ذرا سی دیر بعد رائے ڈیل کی آواز اُبھری جو کیپٹن آف دی یارڈ تھا اور وارڈن کے بعد اسی کا منصب تھا۔

"COY رائے ڈیل......"

"ڈیل میں بوبی میک ویڈ بول رہا ہوں' تم نے گراہم کے بارے میں سنا؟"

"خبروں میں دیکھا ہے' صرف چند منٹ پہلے' اس کا کام کب ہونا ہے؟"

"کل رات...... بٹن میں دباؤں گا' تب تک سارا انتظام تمہیں دیکھنا ہے' اسے دوبارہ ڈیتھ واچ CELL میں پہنچاؤ' فوراً تاکہ دوسرے قیدی شور نہ مچا سکیں۔"

"میں سنبھال لوں گا' فکر مت کریں' میرے لئے یہ کام نیا نہیں' گیارہ آدمیوں کا مسئلہ حل کر چکا ہوں' پانچ تو آپ کے ہی ماتحتی میں ہوئے تھے۔"

"ٹھیک ہے' سنو۔ رائے۔ سرجن جنرل تمہارے پاس ایک برین مانیٹر بھجوا رہا ہے' تم خود اور کسی آدمی کو اس پر لگاؤ' وہ اس کا آپریشن سمجھے۔"

"ٹھیک ہے ہماری ٹیم تیار ملے گی۔"

"میں کسی وقت خود آؤں گا' تاکہ سپروائزر کو اچھی طرح سمجھ لوں۔ کافی دن ہو گئے ہیں بے عملی کے۔"

ابھی اس نے فون بند ہی کیا تھا کہ ایک بار پھر گورنر کی لائن جاگ اٹھی' ادھر سے روز فلر کی آواز آئی۔

"گڈ مارننگ۔"

"روز؟ کیا مسئلہ ہے؟"

"کوئی نہیں' میں نے سنا ہے اس بار بٹن تمہیں دباؤ گے' سوچا پوچھ لوں تم ٹھیک تو ہو۔"

"میں ٹھیک ہوں۔" اس نے رک کر کہا۔ "ہاں میں ٹھیک ہوں۔ ویسے روز......"

"میرے پاس رات کا کھانا کھاؤ' میں تمہیں کچھ مشورے دوں گی' بھلا ہوگا۔"

"خوب۔"

"اطالوی کھانے کیسے رہیں گے؟"

"مجھے پسند ہیں۔"

"جیمس اینڈ رچمنڈ کے کارنر پر ایک جگہ ہے۔"

"نیکولینی کیفے۔ یہ میرے گھر سے بہت قریب ہے۔ میں وہیں تم سے ملوں گی' آٹھ بجے ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک...... کیا میں گرانٹ اور لوسی کو بھی مدعو کرلوں؟"

"نہیں......انہیں بتایا تو میں تمہیں جان سے مار دوں گی۔"

"ہاں......"

ادھر سے فون بند کردیا گیا۔

☆

اس روز بعد میں میک ویڈ ایک بار پار مارلی جیل گیا' وہاں وہ رائے ڈیل سے ملا' یہ پچاس سالہ ایک سیاہ فام آدمی تھا۔

"گڈ آفٹرنون سر۔"

"سر کا لاحقہ ہٹاؤ۔ رائے تم نے میری تربیت کی ہے یاد ہے؟"

رائے ڈیل مسکرایا۔ "اور آپ نے سیکھا بھی خوب۔" اس نے کہا۔ وہ ایک سیاہ فام تھا' مگر جب وہ مسکرایا تو کمرہ جیسے روشن ہوگیا۔

"جمعے کی پارٹی زبردست تھی۔" اس نے کہا۔ "میں اپنے پاس راسن کو بہت مس کروں گا۔"

"میں بھی۔" میک نے کہا۔ "خاص طور سے کل' تم مجھے ذرا ایک ری فریشر کورس کرادو۔ مہلک انجکشن 101 کے سلسلے میں۔"

"آپ کو بس ساتھ والے کمرے میں جانا ہوگا' چیمبر اور دوسری چیزوں کا مسئلہ میری X-TEAM کرلے گی۔" یہ X دراصل Execution کا مخفف تھا۔

میک ویڈ رائے ڈیل کے ساتھ ایک چھوٹی سی بلڈنگ میں گیا جو سب سے الگ تھی اور جیل کی Death Row سے متصل تھی' اسے اس سے ایک چھوٹے بغیر کھڑکی والے کاریڈور سے ملایا گیا تھا' یہ عمارت پانچ کمروں میں تقسیم تھی۔ ایک ڈ-تھ CELL جس میں تین طرف سلاخیں تھیں' اسی میں سزا یافتہ کو اپنے آخری 24 گھنٹے گزارنے ہوتے تھے' ایک چھوٹا سا ملحق کمرہ جس میں آخری ملاقاتیں کرائی جاتی تھیں' آخری کھانا بھی کھلایا جاتا تھا' ایک بڑا کمرہ جس میں باہر سے آیا جاسکتا تھا' ان تماشائیوں کے لئے تھا جو موت کا منظر دیکھنے آتے تھے' اس کے علاوہ وہ موت کا کمرہ تھا' جسے Death Chmber کہا جاتا تھا' اس میں ایک ربر پیڈ والی Execution ٹیبل تھی' جس میں بازو' کلائی' سینہ' ہپ' پیر اور ٹخنوں کو باندھنے کا بندوبست تھا اور پھر وہ بغلی کمرہ تھا یعنی Ante- Room جہاں ایک سوئی کے ذریعے ایک انٹروینس لائن' سزا یافتہ کے بازو میں' دیوار کے ایک چھوٹے میٹل پینل کے ذریعے دوڑائی جاتی تھی' اس اینٹی روم سائڈ پر یہ لائن تقسیم ہوجاتی تھی اور تین ایسی ہائپوڈرمک سرنجوں سے منسلک ہوجاتی تھی' جو وہاں ایک شیلف پر رکھی ہوتی تھیں' تین اوپن سکھوں میں' زرد' سبز اور سرخ والے۔ میٹل پلیٹ اور شیلف کے بیچ' ان تینوں لائنوں میں ایک ضمنی کنکشن سیلائن سلوشین کے کنٹینرز تک جاتا تھا' تاکہ انجکشنوں کے درمیانی حصوں میں مین کنال کو Flush کیا جاسکے' اس شیلف تلے چند ڈرائرز تھیں' یہ بھی زرد' سبز اور رنگوں سے رنگی ہوئی تھیں' ان میں ایکسٹرا ہائپوڈرمک سوئیاں رکھی جاتی تھیں' ان کی

کلر کوڈ لائنوں کیلئے شیلف کے اوپر ایک مستطیل جیسی ون وے ونڈو تھی' جس کے ذریعے موت دینے والا (Executioner) چیمبر کی میز پر لیٹے قیدی کو دیکھ سکتا تھا' اسی طرح تین انچ کا ایک (Color Coded) کلر کوڈیڈ ELLIFTICAL بٹن بھی' اندر آنے والی لائنوں کے بیچ موجود تھا اور شیلف کے ذریعے Executioner ترتیب سے تینوں لائنوں کو Activate کرسکتا تھا' شیف کے اوپر ایک بڑی سی کلاک تھی جو بتاتی تھی کہ اسے کس وقت کرنا ہے' ایک اور ونڈو بھی دائیں سمت تھی' تھی بھی ون وے' یہ اس کمرے میں کھلتی تھی' جس میں تماشائی بیٹھے ہوئے تھے۔

"سب چیزیں مانوس ہیں؟" رائے ڈیل نے میک ویڈ کو کمرا دکھاتے ہوئے پوچھا۔

"سب کچھ کسی برے خواب کا سا ہے۔" میک ویڈ نے کہا۔ بلاشبہ بٹن دبانے کا کام وہ پانچ بار کرچکا تھا' مگر یہ کام کرتے ہوئے اسے ہمیشہ وحشت ہوتی تھی۔

"سب کچھ اسی طرح ہے' جیسے پہلے تھا' رائے ڈیل نے کہا۔ "یہ زرد بٹن۔

SALINE سے لائن کو FLUSH کرتا ہے' پھر سزا یافتہ کو سلانے کیلئے تھیوپنٹال کا انجکشن لگاتا ہے۔ سبز بٹن لائن کو پھر فلشن کرتا ہے اور قیدی کو مکمل طور سے مفلوج کرنے کے لئے اسے وینکورونیم بروماءیڈ کا انجکشن دیتا ہے اور سرخ بٹن لائن کو تیسری بار فلش کرتا ہے' قیدی کے دل کی دھڑکن کو روکنے کے لئے وہ اسے پوٹاشیم کلورائڈ کا انجکشن لگاتا ہے' یہ تینوں کام سادے سے ہیں' بالکل ABC کی طرح۔"

"کیا ہم آج بھی اُسی کیمیکل فرم اور اس کے ٹکنیشنوں ہی کو استعمال کر رہے ہیں؟" میک وڈ نے پوچھا۔

"ہاں۔ وہی کمپنی۔" رائے نے بتایا۔ "کیمیکلز اور ٹکنیشن اسٹیٹ سرجن جنرل سے منظور شدہ ہوتے ہیں' ہم نے اس برین مانیٹر کو بھی چیک کرلیا ہے' اب کوئی مسئلہ نہیں۔"

"او کے۔" میک ویڈ نے کہا اور اس ون وے ونڈو سے سفید پیڈ والی ٹیبل کو دیکھا' لمحہ بھر تک وہ جیسے منجمد رہا' سحرزدہ سا' اس ڈیتھ ٹیبل کو دیکھتا رہا' معاً رابرٹ ارڈ کا ایک خالی پیکر چیمبر میں نظر آیا۔ اس کے اور میز کے درمیان اس کی آواز اس کے ذہن میں اُبھری۔

"میں اُسے مرتے دیکھنا چاہتی ہوں' میں چاہتی ہوں وہ سخت اذیت کے ساتھ مرے۔"

"کیا ہوا؟" رائے ڈیل نے اسے غائب دماغی میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میک ویڈ ساکت کھڑا دیکھے جا رہا تھا۔

"ریٹا۔"

رائے ڈیل نے بھنویں سکیڑ کر اسے دیکھا اور بولا۔

"بولو......"

جس قدر عجلت سے اس پر یہ سحر طاری ہوا تھا اسی تیزی سے ختم بھی ہوگیا' جاگتے ہوئے میک ویڈ نے پوچھا۔ "کیا؟" اس نے رائے کی سمت دیکھا۔

"ہاں...... میں ٹھیک ہوں۔" پھر وہ زبردستی مسکرایا۔

"کام سے پہلے کچھ شراب ضرور پی لینا' مرحلہ آسان ہوجائے گا۔"

"ٹھیک۔" میک ویڈ اپنے آپے میں آچکا تھا۔ اس نے کہا۔ "رائے...... اس چیمبر میں جاؤ اور نمبر فور فلنر لائٹ کو بائیں طرف کوئی انچ بھر اور سرکا دو۔ مجھے اس میں سے شعاعیں پھوٹتی محسوس ہوتی ہیں۔"

"او کے۔"

اس نے رائے ڈیل کو ونڈو سے اندر جاتے دیکھے۔ اس پر وہ سحر پھر سے طاری ہوگیا۔

ریٹا۔

اس بار نام کے ساتھ اس کا فوٹو ذہن میں اُبھرا جو اس نے فائل میں دیکھا تھا' یہ فوٹو اس کی نوجوانی کا تھا' خوب صورت' جاندار' پرکشش' یہ فوٹو لوریٹا رڈ گراہم کا تھا۔

دیتا..........

میک وڈ نے زرد دراز کھولی جو شیلف تلے تھی اور پھر اس نے ان میں سے ایک پائیوڈرمک نیڈل نکال لی جو خواب آور انجکشن کے لئے تھی' جس سے سزا یافتہ کو بے ہوش کیا جاتا تھا' تا کہ اس کی موت اذیت کے تعبیر واقع ہو۔

احتیاط سے اس نے وہ پیکیج شدہ سوئی (Needle) اپنی جیب میں ڈال لی۔

☆

نیکولیتی کے کیفے میں وہ اس رات روز فلر کے ساتھ عقبی کارنر کی میز پر بیٹھا ہوا تھا۔

''اچھی جگہ ہے روز۔'' اس نے تعریف کی۔

''وہ مسکرائی۔ یہ بہت دلکش مسکراہٹ تھی۔

''یہ اہتمام میں نے اس لئے کیا ہے کہ کل کے کام کے لئے تمہاری تھوڑی ہمت افزائی ہو جائے۔ مجھے یاد ہے جب تم وارڈن تھے' ایسے کاموں پر جاتے ہوئے تم کس قدر تناؤ میں ہوتے تھے۔

''اچھا؟'' میک ویڈ نے پوچھا۔ ''تمہیں یہ باتیں کیسے یاد آ گئیں؟''

''بوبی۔'' اس نے نگاہ نیچی کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ہمیشہ سے تمہارا خاصہ خیال رہا ہے۔''

''اور میں بتادوں...... مجھے بھی تم......'' وہ چپ ہو گیا۔

چوں کہ دعوت روز کی طرف سے تھی' اس نے روز سے کہا کہ آرڈر وہی دے۔

کھانے کے آنے تک انہوں نے باتیں شروع کر دیں جو ایک دوسرے کے پیشے سے متعلق تھیں' انہوں نے ایک دوسرے سے پوچھا کیا وہ گرانٹ کے ساتھ ہی چلے جائیں گے' اگر وہ سینیٹر بن گیا۔

''میں واشنگٹن جانے کے بجائے یہیں رہنا پسند کروں گی۔'' روز نے کہا۔

''میں بھی تمہاری کشتی میں ہوں۔'' میک ویڈ نے کہا۔ ''ایک گھر خرید لیا ہے یہاں ایک ہاؤس کیپر رکھ لیا ہے' اس میں ایک باغیچہ بھی ہے۔''

''تمہارا باغیچہ؟''

''ہاں......'' اس نے مسکرا کر کہا...... ''میں ٹماٹر اُگاتا ہوں۔ تم دیکھ کر حیرت کرو گی۔''

''خوب۔'' اس نے اپنا ہاتھ میک کے ہاتھ پر رکھ کر آہستہ سے دبایا۔

کھانے کے دوران وہ مزید بے تکلف ہو کر بول رہے تھے۔ اس دوران میک ویڈ نے ایک آدھ بار جیب میں ہاتھ ڈالکر اس پیکٹ کو چھوا' جس میں وہ نیڈل کو رکھے ہوئے تھا' اُسے تعجب تھا آخر اس نے یہ حرکت کیوں کی تھی؟ کوئی معقول وجہ ابھی اس کے ذہن میں صاف نہ تھی' مگر کسی سبب سے اُسے اپنی حرکت ضروری لگ رہی تھی۔

''میرا سابقہ شوہر ایک کتا تھا۔'' روز نے کہا...... ''میں تو سوچ کر حیرت کرتی ہوں' میں نے آخر اس سے شادی کیسے کر لی تھی۔'' رُک کر اس نے پوچھا...... ''بوبی...... تم نے کبھی شادی نہیں کی؟''

''نہیں۔''

''کوئی معقول عورت نہیں ملی؟''

''ملی تھی ایک' بہت زمانہ پہلے' مگر بات بنی نہ تھی۔'' اس نے سر ایک طرف جھکا لیا۔

''روز...... کبھی تمہیں خیال آیا کہ تمہارے ہاں کوئی اولاد ہوتی؟''

''نہیں...... اس حرام زادے کے ساتھ اچھا ہی ہوا۔'' رک کر وہ بولی۔ ''مگر اولاد کی خواہش تو رہتی ہی ہے۔''

''اگر تمہارے گھر کوئی لڑکی ہوتی' تو وہ اب تک جوان ہو چکی ہوتی' میک ویڈ نے رابرٹا رڈ کا تصور کرتے ہوئے کہا۔

'میرا خیال ہے تم بہت اچھی ماں ہوتیں' اپنی بچی کی بہترین دوست۔''

''شکریہ بوبی۔'' روز مسکرائی۔

''کھانے کے بعد وہ پیدل ہی چل دیئے۔ وہ روز کے اپارٹمنٹ کی طرف چل رہے تھے۔

''روز...... آج کی رات کی دعوت کا شکریہ۔'' چلتے ہوئے میک ویڈ نے کہا۔ ''میں کل کے خیال سے تھوڑا ٹینشن پا رہا تھا۔ تم نے اچھی کمک پہنچائی ہے۔''

''بلڈنگ کے دروازے پر۔'' روز نے کہا۔

''گھر میں چلو گے؟''

''کیا واقعی میں اندر چلوں؟'' اس نے اس کے ہاتھ کو تھام لیا۔

''بالکل میں چاہتی ہوں۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔''

☆

دوسرے روز' صبح کو بوبی میک ویڈ نے وہ سیلفون والا پیکٹ کھولا' جو وہ ڈیتھ چیمبر کے اینٹی روم سے لے کر آیا تھا' اس نے اُس میں وہ ہپوڈرمک نیڈل نکال لی۔ اپنی دواؤں کے کیبنٹ سے اس نے ایک شیشی آئی سوپروپل (Rubbing) ربنگ الکوحل کی نکالی اور بہت احتیاط سے اس نے اس کی تھوڑی سی مقدار' نیڈل کی سرنج میں بھری۔

مجھے پتا نہیں اس سے کیا ہو گا۔ رابرٹا! مگر مجھے یقین ہے جو کچھ ہو گا اچھا نہیں ہو گا۔

اپنے آفس میں جب وہ پہنچا تو یہ نیڈل پھر سے ڈھیر میں پہنچ چکی تھی' اسے اس نے رومال میں رول کر اپنی کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا تھا۔ ویڈ منتظر رہا' جب اس کی سیکریٹری لنچ کھانے چلی گئی' اسنے آفس کی ایک فائلنگ کیبنٹ کھولی' وہاں سے وہ فولڈر نکالا' جس پر...... ''گراہم کارٹر...... ایگزی کیوشن ڈنٹس کا لیبل لگا ہوا تھا' اس نے اس کی مدد سے وہ انفارمیشن فارم نکالا' جس پر رابرٹا رڈ کے کوائف تھے' اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہ لڑکی یہیں اسی شہر میں رہ رہی تھی...... وہ لووڈر کاؤنٹی سے اِدھر آ گئی تھی' شاید نانی کی موت کے بعد اس نے گھر بیچ دیا ہو گا...... میک ڈیڈ نے سوچا۔

اس نے رابرٹا کی درخواست کی ایک کاپی نکالی اور اصل کو دوبارہ فولڈر میں لگا دیا' کاپی اس نے باہر رکھ لی' اس نے فائل کو کیبنٹ میں بند کر دیا اور اپنی میز پر آ بیٹھا۔ اس نے گراہم کارٹر کی سزا سے متعلق عدالت عالیہ کا فائل کھولا۔ اس نے لورینا رڈ گراہم کی وہ تصویریں نکال لیں جو اس کی زندگی میں لی گئی تھیں' ان میں سے ایک کا انتخاب کر کے اس نے اسے اپنی جیب میں رکھ لیا' پھر اس نے گرانٹ مارلو سے ڈائرکٹ لائن پر بات شروع کی۔

''ہیلو بوبی۔'' اسے روز فلر کی آواز سنائی دی۔

''ہیلو روز۔'' ان میں باتیں ذرا تاخیر سے شروع ہوئیں' روز نے کہا۔

''کیا آج رات تم اس سے فارغ ہو کر آ سکتے ہو؟''

''میں کہہ نہیں سکتا۔'' میک ویڈ نے سرسری انداز میں کہا۔

''کیا آنا نہیں چاہتے؟''

''کیوں نہیں......'' اس نے کہا مگر اس کی آواز میں خلوص نہ تھا۔

''بوبی...... کیا کوئی الجھن ہے؟''

''نہیں...... بس......'' احتیاطاً...... احتیاطاً اس نے خود سے کہا۔ پھر بولا...... ''نہ جانے مجھے خدشہ سا ہو رہا ہے شاید یہ کام...... ہموار انداز میں نہیں ہو سکے گا۔''

''بوبی۔'' روز نے تشویش سے کہا۔

''مجھے بتاؤ...... شاید میں کچھ کر سکوں۔'' اسے یہ موضوع بدلنا ضروری تھا۔

اس نے کہا...... ''میں Execution کی تکمیل کے بعد جلد سے جلد آنے کی کوشش کروں گا۔''

''وعدہ؟''

''وعدہ۔''

''اوکے...... میں انتظار کروں گی۔''

''کیا گرانٹ ہے؟''

''ہاں...... ہولڈ کرو......''

سیکنڈ بعد گرانٹ کی آواز اُبھری...... ''یوبی؟ سب ٹھیک ہے ناں؟''

''بالکل......''

''گڈ...... میں پانچ بجے ایک پریس کانفرنس کر رہا ہوں' رات میں نشر ہونے کے بعد گراہم کے وکیلوں نے پھر درخواست دی ہے' موت کی سزا معاف کرانے کے لئے مگر میں نے انکار کر دیا ہے۔''

''میں اپنا دفتر ذرا دیر بعد بند کر رہا ہوں۔'' میخ نے کہا...... ''تمام کالز اب پبلک انفارمیشن آفس ٹرانسفر کر دی جائیں گی۔''

''گڈ۔'' ذرا دیر وقفہ رہا۔ شاید گرانٹ اُس کا ذہن پڑھنے کی سعی کر رہا تھا۔ ''تم کیسے ہو؟''

''فائن۔'' میک ویڈ نے نیڈل کو چھوتے ہوئے کہا۔ ''گرانٹ فکر کی ضرورت نہیں۔''

''ٹھیک ہے...... رات کو تمہارے ساتھ بیٹھک ہو گی۔''

جب اس کی سیکریٹری آ گئی تو اس نے کہا...... ''ایڈنا تمام فون بند کر دو اور ساری کالز کو PIO کی RELAY کر دو' اس کے بعد آفس بند کر کے تم آرام کر سکتی ہو' میں پارمارلی کی جیل کی طرف جا رہا ہوں۔''

''یس سر۔'' ایڈنا نے کہا۔ ''گڈ لک مسٹر ویڈ۔''

☆

موسم سرما میں شام جلد ہو جاتی ہے' جب میک ویڈ رائے ڈیل کے آفس میں داخل ہوا' کچھ اندھیرا ہو چلا تھا' ٹی وی چل رہا تھا' میک ویڈ نے COY کے نجی برتن سے ایک کپ کافی نکالی اور کرسی لے کر بیٹھ گیا۔

''سب ٹھیک ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''بالکل۔'' رائے ڈیل نے کہا۔ اس نے میک ویڈ کو ایک چھوٹا سا Two Way ہینڈ ریڈیو پکڑا دیا۔ ''چھ بجے چلنا ہے۔''

''سارے تماشائی آ چکے ہیں؟''

''زیادہ تر آ گئے ہیں اور پریس روم میں چائے وغیرہ پی رہے ہیں' بس تیار کھڑی ہے' انہیں ادھر لے جانے کے لئے۔''

اسی وقت ٹی وی پر نیوز کا اعلان ہوا اور ناظرین کو گورنر مارلو کے آفس میں پہنچا دیا گیا۔

''مائی فیلو سٹیزنز۔'' گورنر نے خطاب کا آغاز کیا۔ کارٹر گراہم کے لئے' جس نے اپنی بیوی کو بہت بے رحمی سے ہلاک کیا تھا' مجھ سے دوسری بار درخواست کی گئی تھی۔ کہ اس کی سزائے موت معاف کر دی جائے' مگر میں نے انکار کر دیا ہے۔ آج شام اُسے مہلک انجکشن کے ذریعے پارمارلی اسٹیٹ پریزن میں Execute کیا جا رہا ہے......''

''اوکے۔'' میکویڈ نے کہا۔ ''ہمیں اب چلنا چاہیے۔''

''پھر دونوں آدمی Coy کے آفس سے اٹھے اور جیل کی ایڈمنسٹریشن بلڈنگ سے نکلے وہ اسی راستے پر چلے جس پر کل چل کر وہ ڈیتھ روم سے ملحق چھوٹے سے ڈیتھ چیمبر میں گئے تھے۔

بلڈنگ میں پہنچنے کے بعد انہوں نے ایک لمبی بینچ پر Exececution ٹیم کو بیٹھے دیکھا' یہ چار رضا کار جیل آفیسر تھے' جنہیں Exececution میں مدد دینے کیلئے خصوصی معاوضہ دیا گیا تھا۔

''چلو۔'' ڈیل نے بلاتمہید کہا۔

وہ چاروں معمول کے مطابق مصروف ہو گئے۔ ایک نے ایگزی کیوشن چیمبر کا دروازہ کھولا۔ اندر گیا' اس نے پانچوں کھڑکیوں کے بلائنڈ اٹھا دیئے تا کہ ان سے تماشائی اندر دیکھ سکیں' دوسرے نے ایک چھوٹی سی کیبنیٹ سے جو چیمبر کے فوراً باہر تھی' دو سرخ رنگ کے ٹیلیفون نکالے اور انہیں کیبنٹ کے اوپر موجود JACK کے ساتھ پلگ کر دیا۔ دوسرے کو اس نے اس جیک کے ساتھ پلگ کیا جو اینٹی روم کے اندر تھا' جہاں سے میک ویڈ کو ایگزی کیوشن بٹن کنٹرول کرنے تھے۔

بقیہ دونوں آفیسر ڈیتھ واچ سیل میں داخل ہوئے' جہاں ایک آفیسر ایک چھوٹی سی میز پر بیٹھا کارٹر گراہم کی نگرانی کر رہا تھا' جو اپنی حوالات کی سلاخوں میں سے اپنے دو وکیلوں سے باتیں کر رہا تھا۔

''بس۔'' X ٹیم آفیسروں میں سے ایک نے ڈیتھ واچ گارڈ سے کہا۔ اس نے فوراً کارٹر کے وکیلوں سے کہا۔ ''جناب صرف پانچ منٹ رہ گئے ہیں۔''

چیمبر ڈور کے نزدیک ڈیل نے اپنے سام براونی یونیفارم بیلٹ سے وہ ٹو وے ریڈیو ہک سے نکالا' جس سے ریڈیو لٹکا ہوا تھا اور اس میں بولا۔ ''COY پریس روم آفیسر سے مخاطب ہے۔'' جب جواب مل گیا' تو اس نے کہا چھ بجے...... انہیں ادھر لے آؤ۔'' اس کے بعد اس نے سرخ فون کا ریسیور اُٹھایا' اس نے جیل کے سوئچ بورڈ آفیسر سے بات کی۔''

''میں چیمبر فون سے ڈیل بول رہا ہوں' پلیز ایک لائن لیفٹیننٹ گورنر کے آفس کے لئے کھول دیں۔'' ڈیل کو معلوم تھا یہ پروٹوکول کا معائنہ ہے کہ ایگزی کیوشن کی رات میں' معافی کی درخواست مسترد کرنے کے بعد گورنر نہیں مل سکتا تھا' اب اگر کوئی معافی' بفرض محال دی جاتی تو وہ انہیں صرف لیفٹیننٹ گورنر کے توسط سے ہی آ سکتی تھی۔

ایک بار چیمبر لائن کے کھولے جانے کے بعد ڈیل اینٹی روم میں داخل ہوا اور ایک بار اس نے دوسرے سرخ رنگ کے ٹیلیفون کے ساتھ پرانا طریقہ اختیار کیا۔ قوانین کے مطابق وارڈن ہی جو اس کیس میں میکویڈ تھا' کی ذمہ داری ہوتی تھی کہ ابتدائی کارروائیوں کے ہر ہر قدم کا مشاہدہ کرے' وہ ،ور تصدیق کرے کہ کسی شخص کو قانوناً موت دینے کا عمل درست خطوط پر آگے بڑھ رہا ہے' میکویڈ اس وقت بھی دیکھ رہا تھا کہ اس کے ایک ہاتھ نے جیب میں جا کر اس ہیوڈرمک سرنج نیڈل کو محسوس کیا جو وہ ساتھ لایا تھا۔

بالکل آخر میں کیا ہو گا؟ وہ سوچ رہا تھا' کسی پر الزام عائد کیا جائے گا؟ کم از کم اس پر ہرگز نہیں' اس نے تو صرف بٹن دبائے تھے' بھلا کون سوچ سکے گا کہ سزا یافتہ کے بدل میں الکوحل انجکٹ کرنے کے لئے نیڈل تبدیل کرنے والا خود ڈائریکٹر جیل خانہ جات ہے اور پھر اس حرکت کے پیچھے کوئی جواز بھی نہیں پا سکتے۔ نہیں...... اس نے سوچا۔ سارا الزام کیمیکل کمپنی اور اس کے ٹیکنیشنز پر آئے گا جنہوں نے اینٹی روم میں چیزیں تیار کی تھیں' اس کے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں کیا جا سکے گا۔

معاً ایک اور بات ہوئی۔ اس نے سوچا اس کے اس ایک تیر سے دو شکار ہونے والے تھے' جو کچھ وہ کر رہا تھا تو اس سے ایک طرف تو رابرٹا رڈ اپنی ماں کے قاتل کو اذیت ناک موت مرتے دیکھ سکتی تھی جو اس کی دلی تمنا تھی اور دوسری طرف اس کا فائدہ راس ڈ ڈیل کو بھی پہنچ سکتا تھا' جو ملک سے موت کی سزا ختم کرانا چاہتا تھا کیوں کہ جب برین مانیٹر قیدی کے تخلی اذیت کو ریکارڈ کر کے دکھاتا تو پھر ان انجکشنوں کے ساتھ وابستہ یہ یقین ٹوٹ جاتا کہ اس طرح دی جانے والی موت بلا تکلیف ہوتی ہے اور پھر موت کی سزا کے ختم کیے جانے کے امکانات پیدا ہو سکتے تھے۔

میکویڈ کے اندر یہ خیالات پیدا ہو رہے تھے اور سوچ رہا تھا...... کیا میں جو کچھ کرنے جا رہا ہوں اس کو حق بہ جانب قرار دینا چاہتا ہوں؟ اور اس کے لیے رابرٹا اور راس ڈیل کو استعمال کر رہا ہوں؟

نہیں...... یہ بات نہیں اس نے پرزور طریقے سے خود سے کہا۔

اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ کیا کر رہا تھا۔

''ملاقاتیوں کی بس آ گئی ہے'' ڈیل نے کہا اور میکویڈ کے خیالات میں مداخلت کی۔

''اچھا۔'' میکویڈ نے دیوار کے کلاک کو دیکھا جو چیمبر کے ٹیلیفون کے اوپر لگی ہوئی تھی' ڈیل کے آفس سے انہیں نکلے چالیس منٹ ہو چکے تھے۔

''آدمی لطف اندوز ہو رہا ہو تو وقت کو پر لگ جاتے ہیں۔'' ڈیل نے کہا۔ وہ سیاہ چہرہ پر سکون تھا' اسے بھی یہ کام میکویڈ کی طرح کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔''

''مسٹر میکویڈ آپ میرے ساتھ ڈیتھ واچ روم میں چلیں گے؟''

''نہیں۔ رائے۔ تم خود ہینڈل کرو' میں اینٹی روم میں انتظار کروں گا۔''

''او کے۔ ہم اسے پانچ بج کر پچپن منٹ پر لائیں گے۔''

پھر رائل ڈیل ڈیتھ واچ روم میں چلا گیا' جہاں کارٹر گراہم ایک صاف ستھری سفید نیکر میں کھڑا ہوا تھا۔

☆

Ante-Room میں پہنچ کر میکویڈ نے وہ ہینڈ ریڈیو ایک طرف رکھ دیا' جو اسے رائے ڈیل نے دیا تھا' ایک گہری نروس سانس کے ساتھ اس نے اپنی جیب سے عجلت کے ساتھ وہ الکوحل بھری ہائپوڈرمک نیڈل نکالی' اسے کھولا۔ وہیں شیلف پر پہلے ہی سے کیمیکل کمپنی نے ایک زرد سرنج رکھ چھوڑی تھی' بہت تیزی سے وہ تھوڑا سا گھوما اور اس نے وہ سرنج اٹھائی' جس میں سوڈیم تھیو نیڈال بھرا ہوا تھا اور اس کی جگہ اس نے وہ زرد سرنج اور نیڈل رکھ دی' جو وہ ساتھ لایا تھا' اسی تیزی سے اس نے نکالی ہوئی نیڈل کو اسے رومال میں لپیٹا اور اسے کوٹ پاکٹ میں رکھ لیا' ایک اور رومال اس نے پتلون کی جیب سے نکالا' اس سے اس نے احتیاط کے ساتھ نیڈل کی اس پلاسٹک سرنج سے جس سے اُس نے پلائی نیڈل فٹ کی تھی' اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کر دیئے۔

پھر میکویڈ عقبی کھڑکی کی طرف بڑھا' اس نے وہاں سے موت کا منظر دیکھنے والے افراد کو VIEWING روم میں داخل ہوتے دیکھا' ذرا دیر آفیسروں میں سے ایک نے باہر والا دروازہ بند کر دیا اور اسے مقفل بھی کر دیا۔

بھنویں سکیڑے میک ویڈ نے تماشائیوں کے چہرے پر نظریں ڈالنی شروع کیں۔ وہ شروع سے آخر تک دیکھتا گیا' اس نے ایک بار پھر ابتدا کی' مگر اسے رابرٹا نظر نہ آ سکی۔

مذکورہ شیلف پر گیا اس نے ریڈیو آن کیا اور رائے ڈیل سے بولا۔

''رائے۔ کیا سارے تماشائی آ چکے ہیں؟''

''لسٹ کے مطابق سب آ چکے ہیں' ماسوائے ایک کے۔ کوئی رابرٹا رڈ نہیں پہنچی ہے۔''

''تم نے اِدھر اُدھر دیکھ لیا ہے اُسے؟''

''وہ باہر کہیں نہیں ہے' وہ مین گیٹ ہی سے اندر نہیں پہنچی ہے۔'' ڈیل نے کہا۔

''قانونی تعداد کے مطابق تماشائی موجود ہیں۔''

اب میکویڈ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ''ٹھیک ہے' کام آگے بڑھاؤ۔''

وہ یہاں نہیں آئی...... آخر کیوں؟ اس نے میکویڈ کے آفس جس ضد اور عزم کا اظہار کیا تھا' اس کے پیش نظر اسے آنا چاہئے تھا' مگر وہ نہیں آئی تھی۔

میکویڈ کو اپنے ماتھے اور ہونٹوں پر پسینہ اُبلتا محسوس ہوا' اس نے رومال نکال کر چہرہ اور پیشانی صاف کی۔

آخر رابرٹا کیوں نہیں آئی؟

اینٹی روم میں ٹہلتے ہوئے اس نے شیلف پر لگی کلاک پر نگاہ ڈالی اور سوچا اگر رابرٹا نہیں آئی ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟' کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ یہ کام اُس کے لئے نہیں کر رہا تھا' اگر وہ اس کا حصہ نہ تھی تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔

شیلف کے پاس سے میکویڈ نے چیمبر کی ونڈو سے دیکھا رائے ڈیل اور ایکس فیم کارٹر گراہم کو اندر لا رہے تھے' انہوں نے اسے ایگزیکیوشن ٹیبل پر بٹھا دیا' ایک آفیسر نے اُس کے جوتے اُتار دیئے' جو وہ ڈیتھ واچ سیل سے پہن کر یہاں تک آیا تھا۔

میکویڈ نے اپنا بٹوہ نکالا' اس میں سے اس نے لورینا رڈ گراہم کی وہ تصویر نکالی' جسے اس نے آفس فائل سے حاصل کیا تھا' اس نے تصویر کو دیکھنا شروع کیا' پسینہ اُبل کر اس کے بالوں سے اس کی گدی سے نیچے گردن تک بہنے لگا تھا' اس نے اپنی ٹائی ڈھیلی کی اور کالر کھول دیئے۔

چیمبر میں اب کارٹر گراہم کی ایگزیکیوشن ٹیبل پر لٹا دیا گیا تھا' اسٹرپ ٹیم اب اُسے میز سے جڑے تسموں کے ساتھ باندھ رہی تھی' ماتھا' سینہ' بازو' کلائی' کمر' رانیں' ٹخنے سب دو سپید کوٹ والے مرد نرس جو کہ دونوں ہی جیل اسپتال سے تعلق رکھتے تھے اور خود بھی سزا یافتہ لوگ تھے' اب ہارٹ اور برین مانیٹر مشینوں کو کارٹر کے گھٹے ہوئے سر اور سینے کے ساتھ منسلک کر رہے تھے اور ان مشینوں کو فعال بنا رہے تھے جو ان کے ساتھ منسلک تھیں۔

میکویڈ نے ہاتھ ڈال کر اپنے بٹوے کی گہرائی سے ایک بہت ہی پرانی تصویر نکالی جو اس کے ہائی اسکول کے زمانے کی تھی' اسے اس نے شیلف پر پہلی والی تصویر کے پاس رکھ دی۔

رینا...... اس نے سوچا۔ خوب..... تو تم نے اس بچی کا نام بھی میرے ہی نام پر رکھا تھا' یعنی رابرٹ سے رابرٹا۔

کیا فرق پڑتا ہے اگر وہ یہاں نہیں آئی؟ رینا! کیا تم چاہتیں کہ وہ یہاں آئے؟

مرد نرسوں میں سے ایک نے جو ایک تربیت یافتہ Phelebotomist تھا' اب سزا یافتہ آدمی کے بازو کو مناسب رگ کی تلاش کے لئے چھیڑنا شروع کر دیا تھا۔

رینا...... کیا تم بھی اسی کی خواہش کرتیں؟ میکویڈ نے سوچا۔ مگر تم تو اس چھوٹی سی چیونٹی تک کو مارا جانا نہیں دیکھ سکتی تھیں...... ہماری آخری ملاقات کے وقت میرے ہاتھ پر رینگتی...... نظر آ گئی تھی؟

میکویڈ نے نظریں اٹھا کر گھڑی کی سمت دیکھا' ٹھیک چھ بج رہے تھے۔

عجلت سے کپکپائے ہاتھوں سے اس نے وہ پہلے والی اصل سرنج کو بھی اپنی جگہ رکھ دیا اور اسے جسے وہ ساتھ لایا تھا' دوبارہ جیب میں ڈال لیا۔

☆

جب یہ کام ختم ہو گیا تو میکویڈ باہر کی روشن پارکنگ لاٹ میں گیا اور اس نے حیرت سے دیکھا کہ روز فلر وہاں موجود تھی' وہ اس کی کار کے پاس ہی کھڑی تھی' اس کی منتظر۔

''بوبی...... مجھے آنا ہی تھا...... میں...... مجھے احساس ہو رہا تھا کہ کچھ نہ کچھ غلط ہو رہا ہے' میں یہی دیکھنے آئی تھی کہ......''

میکویڈ نے اس کا بازو تھام لیا۔

''بے شک کچھ غلط ہونے جا رہا تھا روز...... مگر اب سب ٹھیک ہو چکا ہے۔'' اس نے ٹھٹکتے ہوئے کہا...... ''میرے پاس تمہیں سنانے کے لئے ایک لمبی رنجیدہ کہانی ہے اور کوئی اور ہے جس سے میں تمہیں ملانا چاہوں گا۔''

اس نے کوٹ کی جیب سے رابرٹا رڈ کی وہ درخواست نکالی جس کی کاپی اس نے آفس فائل سے بنائی تھی۔ اسے کھولا اور اسے روز کو دیتے ہوئے اس نے کہا...... ''یہ پتا پڑھو۔ کیا تم اس جگہ سے واقف ہو؟''

روز نے پتا پڑھا اور بولی...... ''ہاں' میرا خیال ہے یہ جگہ باآسانی مل جائے گی۔''

''ٹھیک...... تم کار چلاؤ' میں باتیں کروں گا۔''

اس نے کار کا دروازہ روز کے لئے کھولا۔ جب وہ بیٹھ گئی تو وہ چکر کاٹ کر پسنجر ڈور کی سمت آیا۔

''روز اور رابرٹا''...... اس نے سوچا...... ''ماں اور بیٹی کے روپ میں یہ دونوں بہت اچھی لگیں گی۔''

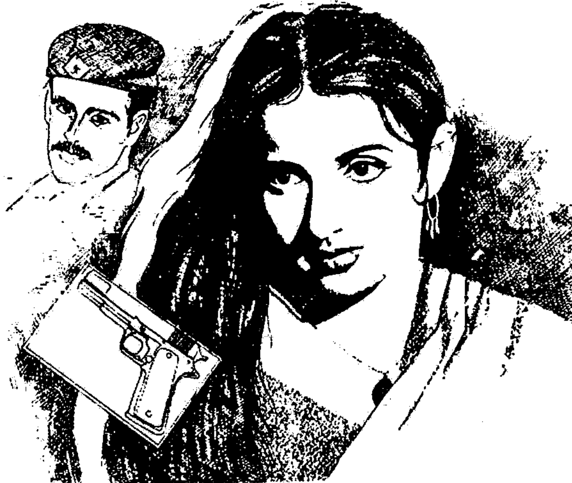
☆☆☆

قلمدان کی چوری

آئیے ایک طویل عرصہ بعد اپنے پسندیدہ کردار اور دنیا کے انوکھے چور نک ویلوٹ سے ملیے' اس مرتبہ اس نے امریکہ میں ایک پاکستانی قلمدان چوری کرنے کی ذمہ داری قبول کی تھی۔

اقبال کاظمی

اس چور کا احوال' جس کا ضمیر ہمہ وقت بیدار رہتا تھا' نک ویلوٹ کا انوکھا کارنامہ



ماربل کا بنا ہوا وہ قلمدان واقعی بہت خوب صورت تھا۔ جس کی رنگین تصویر اس بڑھیا نے نک ویلوٹ کو دکھائی تھی۔ تصویر کھینچنے میں فوٹوگرافر کی مہارت کو بھی بڑا دخل تھا۔ تصویر کے پیچھے لکھی ہوئی تحریر کے مطابق ماربل کا تراشہ ہوا یہ قلمدان بارہ انچ لمبا آٹھ انچ چوڑا اور موٹائی میں ایک انچ تھا۔ ماربل کے اُوپر کی سطح پر میرون رنگ کی دو دھاریاں ایک دوسرے کے متوازی اس طرح بنی ہوئی تھیں کہ انہیں میرون رنگ کی چھوٹی چھوٹی لکیریں کراس کرتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ ان لکیروں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے خاردار تاریں بچھا دی گئی ہوں۔ دودھیا رنگ کے ماربل پر میرون رنگ کی یہ قدرتی لکیریں بڑی اچھی لگ رہی تھیں ماربل کے اس ٹکڑے کے قلمدان میں تبدیل کرنے میں بھی بڑی مہارت کا ثبوت دیا گیا تھا۔ سامنے والے کنارے کے قریب دو پین ہولڈر تھے۔ ایک ہولڈر میں سرخ اور ایک میں سیاہ رنگ کا قلم بھی نظر آرہا تھا۔ یہ دونوں ہولڈر پیتل کی چھوٹی چھوٹی نالیوں کے ذریعے ماربل میں لگے ہوئے تھے ان نالیوں پر پیتل کے رنگ چڑھے ہوئے تھے۔ یہ چوڑی دار رنگ گھما کر ان ہولڈروں کو اس سے الگ بھی کیا جا سکتا تھا۔ آگے کی سائیڈ پر ہلکی سی گہرائی نالی بنی ہوئی تھی' جس میں مختلف رنگوں کی تین چار پنسلیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس کے دائیں بائیں دو چھوٹے خانے بھی بنے ہوئے تھے۔ ایک خانے میں ربر اور دوسرے میں پنسل تراش رکھا ہوا تھا۔ ہولڈروں کے قریب دائیں طرف ایک خانے میں گم کی چھوٹی بوتل اور اس کے ساتھ والے خانے میں روشنائی کی دو چھوٹی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک سیاہ اور دوسری سرخ ہولڈروں کے بائیں طرف ایک خانہ وزیٹنگ کارڈز کے لیے مخصوص تھا اور دوسرے ایک خانے میں سادے کاغذ کی سلپس رکھی ہوئی تھیں اس خا۔ کے سامنے ایک چھوٹا پن کشن بھی تھا جس میں گی ہو۔ ڑں کے کچھ پس

چمک رہے تھے۔ یہ سب کچھ ماربل کے ایک ہی ٹکڑے کو تراش کر بنایا گیا تھا یہ ایک مکمل قلمدان تھا اور نک کے خیال میں اسے صناعی کا ایک شاہکار قرار دیا جا سکتا تھا۔ ماربل پر اس قدر باریکی کا کام ایک شاہکار ہی تو تھا۔ ایسی چیزوں کے بنانے میں مشینوں سے زیادہ ہاتھوں کی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔

''بڑا خوب صورت قلمدان ہے۔'' نک ویلوٹ نے تصویر اس بڑھیا کو لوٹاتے ہوئے کہا۔

''یہ قلمدان چند برس پہلے میری بیٹی پاکستان سے لائی تھی۔'' بڑھیا نے بتایا۔ ''وہ اپنی ایک دوست کے ساتھ ایشیا کی سیاحت کے لیے گئی تھی۔ پاکستان کے شہر کراچی کی ایک سڑک کے فٹ پاتھ پر اسے ماربل کی بنی ہوئی چیزیں نظر آئیں ان میں قلمدان بھی تھا لیکن وہ قلمدان جو میری بیٹی نے فٹ پاتھ والی دوکان پر دیکھا تھا وہ اس سے نہ صرف چھوٹا بلکہ مختلف بھی تھا۔ یہ قلمدان میری بیٹی نے آرڈر دے کر بنوایا تھا اور تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اس کی تیاری میں دو دن لگے تھے۔ کیسے کیسے ماہر فن پڑے ہیں اس ملک میں لیکن یہ جان کر دکھ ہوتا ہے کہ وہاں کے لوگ اپنے ہنرمندوں کی قدر نہیں کرتے یہی ہنرمند اگر امریکہ یا کسی یورپی ملک میں ہوں تو انہیں آنکھوں پر بٹھایا جائے۔''

''واقعی ٹھیک کہتی ہو۔'' نک نے گہرا سانس لیا۔ وہ کئی مرتبہ کراچی جا چکا تھا۔ یہ سب کچھ اس نے خود بھی دیکھا تھا اور اسے واقعی افسوس ہوا تھا کہ پاکستان میں ہنرمندوں کی وہ قدر نہیں ہوتی جس کے وہ مستحق ہیں۔

سارہ نامی اس بڑھیا سے نک ویلوٹ کی ملاقات دو دن پہلے امریکہ ریاست نیو انگلینڈ کے وگ شائر نامی شہر میں ہوئی تھی۔ نک ویلوٹ گلوریا کے ساتھ وہاں اپنے ایک دوست سے ملنے آیا تھا۔ عین اس روز جب وہ نیو یارک واپس جانے والے تھے۔ نک کے دوست بیکر نے بتایا کہ اس کی ایک دوست اس سے ملنا چاہتی ہے۔

''اس کا ایک کام اٹکا ہوا ہے۔'' بیکر نے کہا تھا۔ ''کئی روز پہلے میں نے اس سے تمہارا ذکر کیا تھا۔ تم تین چار دن یہاں رہے لیکن مجھے تم سے اس سلسلے میں بات کرنے کا خیال ہی نہیں رہا۔ اتفاقاً آج صبح سارہ سے ملاقات ہوگئی۔ اگر تم ایک آدھ دن اور رہ جاؤ تو شاید اس کا اور تمہارا بھلا ہو جائے۔''

''کیا خیال ہے گلوریا؟'' نک نے سوالیہ نگاہوں سے گلوریا کی طرف دیکھا۔

''مجھے تو کل ہر صورت میں ڈیوٹی پر جانا ہے۔ تم چاہو تو رہ جاؤ۔'' گلوریا نے کہا۔

''ٹھیک ہے تم چلی جاؤ۔ میں آج بیکر کی دوست سے مل لیتا ہوں۔ اگر کوئی منافع بخش بات ہوئی تو چند روز کے لیے رک جاؤں گا۔ بصورت دیگر کل واپس آ جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' گلوریا نے جواب دیا۔

اس کے دو گھنٹے بعد گلوریا کو ایئر پورٹ چھوڑنے کے بعد بیکر نک ویلوٹ کو لے کر چائنا ٹاؤن میں واقع سارہ کے مکان پر پہنچ گیا تھا۔ یہ آبادی شہر کے ایک کنارے پر آباد تھی۔ مرغی کے ڈربے کی طرح چھوٹے چھوٹے مکان تھے۔ انہی ڈربوں میں بعض مکان اتنے بڑے تھے۔ کہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ سارہ کا مکان بھی بہت بڑا تھا۔ آمدورفت کے لیے الگ الگ دو بڑے بڑے گیٹ تھے۔ دونوں گیٹوں کے درمیان تقریباً سو گز کا فاصلہ تھا اور دونوں گیٹوں پر مسلح چینی محافظ بیٹھے ہوئے تھے۔ اندر جانے والے گیٹ پر بیٹھے ہوئے محافظ نے گاڑی میں بیکر کو دیکھتے ہی گیٹ کھول دیا۔ وہ یقیناً بیکر کو پہچانتا تھا۔ گیٹ میں داخل ہونے کے بعد رہائشی عمارت بھی تقریباً سو گز دور تھی۔ اس درمیانی حصے میں خوبصورت لان بنا ہوا تھا جس کے کناروں پر پختہ سڑک تھی۔

کار پورچ میں رک گئی۔ اسی لمحہ ایک بوڑھا چینی

برآمدے میں نمودار ہوا۔ اس نے پہلے مخصوص انداز میں جھک کر تعظیم دی پھر انہیں ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ یہ استقبال دیکھ کر نک کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ بیکر نے پہلے سے اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی۔

''تمہاری یہ دوست سارہ کوئی چینی خاتون ہے۔'' نک نے سوالیہ نگاہوں سے بیکر کی طرف دیکھا۔

''نہیں؟'' امریکی ہے لیکن جوانی میں ایک چینی سے عشق ہو گیا تھا جس کا نتیجہ شادی کی صورت میں نکلا اس کا شوہر وانگ سو اسی بستی میں ایک چھوٹے سے شراب خانے کا مالک تھا۔ سارہ سے شادی کے بعد اس کا بزنس پھیلتا چلا گیا۔ شادی کے بیس سال بعد اس کا انتقال ہو گیا تو سارہ کا داماد اس کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹانے لگا لیکن کچھ عرصہ بعد وہ بھی کار کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا تو سارہ کی بیوہ بیٹی اُس بزنس میں شریک ہو گئی۔ اس کے چند مہینوں بعد سارہ پر فالج کا حملہ ہوا تو سارا بزنس اس کی بیٹی یاکاماشی نے سنبھال لیا بہتر علاج اور مسلسل نگہداشت سے سارہ بولنے اور کچھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گئی لیکن وہ گھر سے باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ تقریباً دو سال پہلے اس کی بیٹی یاکاماشی کا بھی انتقال ہو گیا۔ اب سارہ کا کاروبار اس کے ملازموں نے سنبھالا ہوا ہے۔ ویسے مجھے پتا چلا ہے کہ اس بزنس میں سارہ کی بھتیجی شین کا بھی کچھ حصہ ہے اور اندرونی طور پر ان میں کوئی جھگڑا ابھی چل رہا ہے۔ اس کی تفصیل مجھے معلوم نہیں ہے۔''

نک ویلوٹ جواب دینے کے بجائے ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگا۔ کمرے کی آرائش میں چینی ثقافت کی نمائندگی کرنے والی چیزیں زیادہ استعمال کی گئی تھیں۔ مینٹل پیس پر مہاتما بدھ کا ہاتھی دانت کا ایک چھوٹا سا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ اس کے دائیں طرف ایک ادھیڑ عمر چینی مرد اور بائیں طرف ایک خوب صورت چینی عورت کی تصویر چاندی کے فریم میں لگی ہوئی تھی۔ اس عورت کی عمر نک کے اندازے کے مطابق پینتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ جب کہ مرد کی عمر کا اندازہ پچاس کے لگ بھگ لگایا جا سکتا تھا دونوں فریموں پر پھولوں کے ہار لٹکے ہوئے تھے جس سے نک کو اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ دونوں مرحوم ہو چکے تھے۔ نک ویلوٹ کو یہ بھی سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ ان میں سے ایک سارہ کا شوہر وانگ سو اور دوسری اس کی بیٹی یاکاماشی تھی۔ نک ویلوٹ ابھی کمرے کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ ایک بوڑھا چینی ایک وہیل چیئر دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ وہیل چیئر پر جو بڑھیا بیٹھی ہوئی تھی نک کے اندازے کے مطابق اس کی عمر پینسٹھ اور ستر کے درمیان رہی ہوگی۔ اس کا رنگ سفید تھا جیسے سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ چہرے پر بے شمار جھریاں تھیں وہ باری باری دونوں کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور استخوانی ہاتھ اٹھا کر ملازم کو کچھ اشارہ کر دیا۔ ملازم نے اس کی وہیل چیئر صوفے کے قریب چھوڑ دی اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے چند ہی منٹ بعد ایک نوعمر چینی لڑکی سبز قہوہ لے آئی۔ اس نے ٹرے سینٹر ٹیبل پر رکھ دی پیالیوں میں قہوہ انڈیل کر ایک ایک پیالی ان کے سامنے رکھ دی اور واپس چلی گئی۔

قہوہ کی چسکیوں کے دوران وہ رسمی گفتگو کرتے رہے قہوہ ختم کرنے کے بعد بیکر اٹھ گیا۔

''اچھا بھئی میں چلتا ہوں۔ گاڑی چھوڑے جا رہا ہوں تم آ جانا۔'' اس نے نک سے مخاطب ہو کر کہا اور رخصت ہو گیا بیکر کے جانے کے بعد ہی وہ دونوں اصل موضوع پر گفتگو کرنے لگے۔

''میں یہ قلمدان چوری کرانا چاہتی ہوں بوڑھی سارہ نے اسے قلمدان کی تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ مجھ پر فالج کا حملہ ہونے کے بعد میری بیٹی یاکاماشی نے اپنی کزن شین کو اس بزنس میں شامل کر لیا۔ یاکاماشی کے انتقال کے بعد شین کچھ عرصہ تک میرا ہاتھ بٹاتی رہی پھر ایک روز اس نے انکشاف کیا کہ یا

کاماشی یہ بزنس اس کے ہاتھ فروخت کر چکی ہے۔ اس نے مجھے کچھ کاغذات بھی دکھائے تھے جن کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ وہ جعلی ہیں بہر حال میں نے اس سلسلے میں عدالت میں کیس داخل کر رکھا ہے۔" سارہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ "بزنس کی ملکیت کا فیصلہ تو اب عدالت ہی کرے گی لیکن یہ قلمدان حاصل کرنا میرے لیے بہت ضروری ہے۔ یہ میری بیٹی کی نشانی ہے جس پر شین نے قبضہ کر رکھا ہے میں نے اس سے کہا تھا۔ کہ کم از کم میری بیٹی کی یہ نشانی ہی مجھے دے دے لیکن وہ اس کے لیے بھی تیار نہیں ہے لیکن میں ہر قیمت پر یہ قلمدان حاصل کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیا یاکاماشی نے تم سے کبھی یہ ذکر نہیں کیا تھا کہ اس نے شین کو بزنس میں شامل کر لیا ہے؟" نک نے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔" سارہ نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو یاکاماشی مجھ سے اس کا تذکرہ ضرور کرتی۔ اس نے کبھی کوئی بات مجھ سے نہیں چھپائی تھی البتہ ایک سال پہلے اس نے چند بلوں کی ادائیگی کے لیے شین سے چند ہزار ڈالر کی رقم قرض لی تھی جو چند ہفتوں بعد لوٹا دی گئی تھی۔ یاکاماشی کے پاس اس کی رسید بھی موجود تھی جو نجانے اس نے کہاں رکھ دی تھی مجھے مل نہیں رہی۔"

"یہ قلمدان اس وقت کہاں ہے؟" نک ویلوٹ نے دریافت کیا۔

"شین نے لیک سائیڈ پر ایک پرائیویٹ دفتر بنا رکھا ہے۔ یہ قلمدان اسی دفتر میں موجود ہے۔" سارہ نے کہا۔

اس دفتر کا پتا بتا دو تو مجھے کچھ آسانی رہے گی۔" نک نے کہا۔ "اس کے علاوہ میں ایک اور بات کی وضاحت کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ بیکر نے تمہیں میرے بارے میں کچھ اور بھی بتایا ہوگا۔ دراصل میرے چند اصول ہیں اور کلائنٹس کے لیے کچھ شرائط بھی جن میں پہلی شرط یہ ہے کہ میں اپنی فیس ایڈوانس لیتا ہوں اور......"

"بیکر نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔" سارہ اس کی بات کاٹ کر مسکرائی پھر اندرونی دروازے کی طرف رخ کر کے ملازمہ کو آواز دی وہی کم عمر ملازمہ کمرے میں داخل ہوئی۔ سارہ نے اسے چینی زبان میں کچھ کہا۔ ملازمہ نے قہوے کے خالی برتن اٹھائے اور واپس چلی گئی لیکن دو منٹ بعد پھر کمرے میں آ گئی۔ اس مرتبہ اس کے ہاتھ میں ایک خوب صورت ہینڈ بیگ موجود تھا جسے اس نے سارہ کے حوالے کر دیا۔ سارہ نے ہینڈ بیگ کھول کر ایک پھولا ہوا لفافہ نکال کر نک ویلوٹ کے حوالے کر دیا۔

اس میں پچیس ہزار ڈالر موجود ہیں اور شین کے دفتر کا پتا میں تمہیں زبانی بتا دیتی ہوں۔ تم آسانی سے وہاں پہنچ جاؤ گے۔" سارہ نے کہا اور اسے پتا سمجھانے لگی۔

"اس دفتر میں وہ کس قسم کا بزنس کرتی ہے؟" نک نے پوچھا۔

"یہ دفتر دراصل میرے بھائی کے باپ کا تھا۔ وہ گارمنٹس کی امپورٹ کا بزنس کرتا تھا یہ کاروبار اب شین ہی چلا رہی ہے اور شراب خانوں کے بزنس کی دیکھ بھال بھی وہ اس دفتر میں بیٹھ کر کرتی ہے دن میں ایک آدھ بار وہ شراب خانوں کا چکر بھی لگا لیتی ہے یہ دفتر رات گیارہ بجے تک کھلا رہتا ہے لیکن تمہیں ذرا احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔ رات کے وقت دفتر کے دروازے پر ایک بڑا خوفناک قسم کا محافظ موجود رہتا ہے۔"

"یہ میرا دردِ سر ہے کہ میں اس محافظ سے کس طرح نمٹوں گا یا دفتر میں کس طرح داخل ہوں گا۔ بہر حال اس کام میں دو چار دن لگ جائیں گے۔" نک کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں انتظار کروں گی۔" سارہ نے اپنا استخوانی ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

نک ویلوٹ سارہ سے ہاتھ ملا کر دروازے کی طرف مڑا ہی تھا کہ اس کی نظر اندرونی دروازے کی طرف اٹھ گئی

دروازے پر لٹکا ہوا دبیز پردہ ہلا تھا اور اس نے پردے کے نیچے کسی کے پیر بھی دیکھے تھے لیکن وہ جو کوئی بھی تھا تیزی سے وہاں سے ہٹ گیا۔ نک کے دل میں فوراً ہی یہ شبہ ابھرا کہ کوئی پردے کے پیچھے کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔

نک ویلوٹ جب باہر نکلا تو پورچ میں بیکر کی گاڑی موجود تھی اس نے اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کیا اور اسے ہلکی رفتار سے بیرونی گیٹ کی طرف لیتا چلا گیا۔ اس گیٹ پر بھی ایک چینی گن مین موجود تھا۔ اس نے گاڑی دیکھتے ہی گیٹ کھول دیا۔

سارہ کے مکان سے نکل کر نک ویلوٹ نے گاڑی کا رخ لیک سائیڈ کی طرف موڑ دیا۔ اسے وہاں پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ یہ ساحلی علاقہ تھا۔ جہاں شام ہوتے ہی رونق شباب پر پہنچ جاتی تھی اس علاقے میں بے شمار ریسٹورنٹ شراب خانے اور جوے خانے تھے جہاں رات کے آخری پہر تک لوگوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی۔ شہر میں جرائم کی سب سے زیادہ وارداتیں بھی اس علاقے میں ہوتی تھیں۔

شین کا دفتر تلاش کرنے میں ویلوٹ کو زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ یہ ایک دو منزلہ عمارت تھی اوپر والے حصے میں کسی کی رہائش تھی اور گراؤنڈ فلور دفتر کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس کے سامنے کمپاؤنڈ بھی تھا۔ گیٹ کے ساتھ ہی محافظ کا کیبن بھی موجود تھا۔ کیبن کے قریب نک کو محافظ بھی نظر آ گیا جس کے بارے میں سارہ نے بتایا تھا۔ وہ ایک دیو قامت چینی تھا۔ سر انڈے کے چھلکے کی طرح صاف تھا۔ سارہ نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ واقعی بڑا خوفناک آدمی تھا۔ دفتر والی عمارت کے دائیں طرف بھی ایک دو منزلہ عمارت تھی۔ اس میں جوا خانہ قائم تھا۔ دوسری طرف بھی دو منزلہ عمارت تھی لیکن شاید یہ عمارت خالی پڑی تھی۔ رنگ روغن اڑا ہوا اور سامنے کی دیواروں کا پلستر ادھڑا ہوا تھا۔ اندر کسی جگہ روشنی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

نک ویلوٹ نے اس سڑک پر دو چکر لگائے اور گاڑی کا رخ ایک بار پھر سارہ کے مکان کی طرف موڑ دیا۔ اس مرتبہ اندر جانے کے لیے اسے چند منٹ انتظار کرنا پڑا۔ کچھ دیر بعد جب سارہ ڈرائنگ روم میں آئی تو نک ویلوٹ چند منٹ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا اور بالآخر جب اسے پردے کے نیچے کسی کے پیر نظر آ گئے تو وہ اصل موضوع پر آتے ہوئے بولا۔

"مجھے افسوس ہے میڈم! میں آپ کا یہ کام نہیں کر سکتا۔" نک نے کہنے کے ساتھ ہی نوٹوں سے بھرا ہوا لفافہ سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا۔

"کیوں......؟" سارہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"اس دفتر کا محافظ واقعی بڑا خوفناک ہے اور مجھے اپنی جان پچیس ہزار ڈالر سے زیادہ عزیز ہے۔" نک ویلوٹ نے کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر دروازے کی طرف بڑھ گیا جاتے ہوئے اس نے کن انکھیوں سے اندرونی دروازے کی طرف بھی دیکھا تھا۔ اب اسے وہاں کسی کے پیر نظر نہیں آئے تھے۔

☆

میڈم سارہ کو جواب دینے کے بعد نک ویلوٹ شہر کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہا۔ رات دس بجے کے قریب اس نے ایک ریسٹورنٹ سے کھانا کھایا اور پھر وہاں سے اٹھ کر دوبارہ لیک سائیڈ پر آ گیا گاڑی اس نے کرائے کی ایک پارکنگ لاٹ پر کھڑی کر دی اور ٹہلتا ہوا۔ اس نائٹ کلب کی طرف چل دیا جو شین کے دفتر والی عمارت سے ملحق عمارت میں قائم تھا۔ نائٹ کلب کی یہ عمارت بھی دو منزلہ تھی۔ نچلے حصے میں شراب خانہ اور جوا خانہ قائم تھا جب کہ اوپری کی منزل بھی دو حصوں میں تقسیم تھی۔ ایک حصہ ڈائننگ ہال اور دوسرا ڈانس فلور پر مشتمل تھا۔

نک ویلوٹ ڈائننگ ہال میں آ گیا۔ یہاں اس نے

کافی کا ایک کپ پیا کچھ دیر بیٹھا لوگوں کے چہروں کو گھورتا رہا پھر وہاں سے اٹھ کر ڈانس فلور کی طرف چلا گیا۔ یہ ایک وسیع ہال نما کمرہ تھا جس کے وسط میں ڈانس فلور بنا ہوا تھا۔ اس کے ایک طرف آرکسٹرا تھا اور باقی اطراف میں صوفے بچھے ہوئے تھے۔ جن پر تماشائی بیٹھے ہوئے تھے۔ اس ہال میں دو اور دروازے تھے۔ ایک باتھ روم کا اور دوسرا کچن کی طرف کھلتا تھا۔ دائیں طرف ایک اور راستہ تھا۔ جس کے سامنے پردہ لٹکا ہوا تھا۔ نک نے وہاں سے گزرتے ہوئے پردہ ہٹا کر دیکھا۔ وہ چھت پر جانے کا زینہ تھا۔ نک ویلوٹ زینے کے قریب ہی ایک صوفے پر بیٹھ گیا اور فلور پر رقص کرتے ہوئے جوڑوں کو دیکھنے لگا۔

اسے وہاں بیٹھے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ایک ادھیڑ عمر عورت اس کے قریب آ کر رک گئی اور ایک ہاتھ نک کی طرف بڑھایا نک ویلوٹ کو اس کا مطلب سمجھنے میں دیر نہ لگی اس نے اٹھ کر عورت کا ہاتھ پکڑا اور دوسرا ہاتھ اس کی کمر میں ڈال کر رقاص جوڑوں میں شامل ہو گیا۔

وہ عورت اگرچہ ادھیڑ عمر تھی لیکن خاصی پرکشش تھی۔ نک ویلوٹ اس کے ساتھ تقریباً دس منٹ تک ڈانس فلور پر تھرکتا رہا۔ پھر فلور سے باہر آ گیا۔ اس نے عورت کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ جو ایک صوفے پر بیٹھ گئی اور نک ویلوٹ صوفے کے پیچھے اس جگہ کھڑا ہو گیا جہاں زینہ تھا وہ چند لمحے متجسس نگاہوں سے اطراف میں دیکھتا رہا۔ کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس نے موقع پا کر پردہ ہٹا دیا اور زینے میں داخل ہو گیا۔

چھت پر پہنچ کر اس نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ چھت پر پانی کے اوور ہیڈ ٹینک کے علاوہ ایک چھوٹا کمرہ بھی بنا ہوا تھا جس کا دروازہ مقفل تھا۔ وہ اس دیوار کی طرف آ گیا جو شین کے دفتر والی عمارت سے ملی ہوئی تھی یہ دیوار تقریباً آٹھ فٹ اونچی تھی اور اس کے اُوپر تقریباً چھ فٹ کی بلندی پر خاردار تاریں اس طرح لگی ہوئی تھیں کہ بلی کا بچہ بھی ان میں سے نہیں گزر سکتا تھا۔ دیوار کی بلندی اور تاریں غالباً اس لیے لگائی گئی تھیں کہ اس طرف نائٹ کلب تھا۔ ممکن ہے کسی موقع پر نائٹ کلب میں ہنگامہ ہوا ہو اور لوگ چھت سے دوسری عمارت پر کود گئے ہوں اور آئندہ ایسی باتوں سے بچنے کے لیے شین نے اپنی طرف کی دیوار اونچی کر کے خاردار تاریں لگا دی ہوں۔ نک ویلوٹ کچھ دیر وہاں کھڑا رہا اور پھر واپس آ گیا۔ تھوڑی دیر وہ ڈانس روم میں رہا پھر گراؤنڈ فلور پر واقع جوا خانے میں آ گیا۔

نک ویلوٹ شراب یا جوئے کا عادی نہیں تھا لیکن کبھی کبھار ضرورتاً یا شوقیہ طور پر یہ شغل کر لیا کرتا تھا۔ آج بھی کچھ ایسی ہی صورت حال تھی وہ شین کے دفتر میں داخلے کا راستہ تلاش کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ یہاں آیا تھا اس نے دراصل میڈم سارہ کا کیس واپس نہیں کیا تھا۔

کیس لیتے ہوئے جب اس نے پردے کی آڑ سے کسی کو اپنی اور سارہ کی باتیں سنتے ہوئے پایا تو تھوڑی دیر بعد واپس جا کر اس نے سارہ کو فیس واپس کر کے کیس لینے سے معذوری ظاہر کر دی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ان کی باتیں سننے والا جو کوئی بھی تھا۔ شین کو ضرور بتائے گا کہ سارہ نک ویلوٹ کے ذریعے اس کے دفتر سے قلمدان چوری کرانا چاہتی ہے اس کے کچھ دیر بعد کیس واپس کرنے کا مطلب یہ تھا کہ وہی "جاسوس" یہ سمجھ لے کہ اب قلمدان کو کوئی خطرہ نہیں لیکن نک نے بہر حال یہ طے کر لیا تھا کہ وہ قلمدان ضرور چوری کرے گا۔

نک ویلوٹ رات دو بجے تک رولیٹ اور دوسری مشینوں پر جوا کھیلتا رہا حسب معمول قسمت نے اس مرتبہ بھی اس کا ساتھ دیا تھا۔ جب اس نے کھیل ختم کیا تو اس کی جیب میں تقریباً دو ہزار ڈالر کی اضافی رقم شامل ہو چکی تھی۔ آخری بازی کھیلنے کے بعد وہ نائٹ کلب سے باہر نکل آیا۔ شین کے دفتر کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ محافظ کے کیبن کی بتی جل رہی تھی۔ نک ویلوٹ ٹہلتا ہوا کچھ دور نکل گیا پھر واپس پلٹا اور دفتر کے ساتھ والی خالی عمارت کی کمپاؤنڈ وال کے قریب رک گیا یہ دیوار تقریباً پانچ فٹ اونچی تھی اور اس کا پلاسٹر بھی ادھڑا ہوا تھا۔

سڑک پر لوگوں کی آمدورفت جاری تھی۔ نک کچھ دیر وہاں کھڑا رہا پھر اسے جیسے ہی موقع ملا وہ نہایت پھرتی سے دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کود گیا۔ اس کے کودنے سے دھب کی ہلکی سی آواز پیدا ہوئی تھی لیکن نک ویلوٹ کو یقین تھا کہ شین کے دفتر کا چوکیدار اگر جاگ بھی رہا تھا تو ٹریفک کے شور میں اس نے اس کے کودنے کی آواز نہیں سنی ہوگی۔ اس کے باوجود چند لمحے وہیں دبکا رہا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ اب کسی قسم کا خطرہ نہیں ہو سکتا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر عمارت کے دروازے کی طرف چلنے لگا۔

دروازہ بند تھا لیکن باہر کنڈے میں تالا بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ نک نے ٹٹول کر دیکھا دروازے میں مخفی قفل کی موجودگی کے آثار بھی نظر نہیں آئے تھے۔ اس نے دروازے کو آہستگی سے دھکیلا۔ جس سے اندازہ ہوا کہ اندر کی طرف سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ نک نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دروازے کے دونوں طرف کھڑکیوں کے علاوہ داخلے کا کوئی اور راستہ نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے دروازے پر ایک بار پھر قسمت آزمائی کی مگر کامیابی نہیں ہوئی وہ دائیں طرف والی کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ اس کھڑکی میں صرف ایک شیشہ سلامت تھا باقی سب ٹوٹے ہوئے تھے۔ نک ویلوٹ اندر ہاتھ ڈال کر ٹٹولنے لگا۔ جلدی اس کی انگلیاں چٹخنی سے ٹکرا گئیں اس نے چٹخنی گرا کر کھڑکی کا پٹ کھول دیا اور اُوپر چڑھ کر دوسری طرف کود گیا۔

یہ کمرہ بالکل خالی تھا۔ سڑک پر لگے ہوئے اسٹریٹ لیمپ کی تھوڑی بہت روشنی اس کمرے تک پہنچ رہی تھی۔ نک ویلوٹ اس دروازے کی طرف بڑھ گیا جو دائیں طرف نظر آیا تھا۔ دروازے میں داخل ہو کر وہ رک گیا۔ یہاں گہری تاریکی تھی اور اپنے سامنے کی کوئی چیز بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے جیب سے پنسل ٹارچ نکال لی اور اس کی مدھم روشنی میں اس کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

یہ کمرہ پہلے کمرے سے بڑا تھا اور اس میں کئی پرانی چیزیں اور کرسیاں ڈھیر کی صورت میں ایک دوسرے کے اُوپر پڑی تھیں۔ نک کو اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ عمارت بھی دفتر کے طور پر استعمال ہوتی رہی تھی۔ جس کا فرنیچر اس ایک کمرے میں ڈھیر کر دیا گیا تھا۔ فرنیچر پر بھی گرد جمی ہوئی تھی اور فرش پر بھی گرد کی موٹی تہہ موجود تھی۔ کئی جگہوں سے دیواروں کا پلاسٹر ادھڑا ہوا تھا۔

اس کمرے میں بھی اندر کی طرف ایک دروازہ تھا۔ نک ویلوٹ اس طرف نکل گیا اور مختلف کمروں میں گھومتا ہوا۔ اس مرکزی ہال کمرے میں آ گیا جہاں اُوپر جانے کے لیے لکڑی کا زینہ تھا۔ وہ اُوپر چڑھ گیا۔ اس کے بوجھ سے زینے کے تختے چرچرانے لگے۔ جس سے نک کو یہ اندازہ لگانے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی کہ یہ عمارت کئی برسوں سے خالی پڑی تھی۔

ایک کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے وہ چونک گیا یہ کمرہ شین والے دفتر کی دیوار سے ملحق تھا اور درمیانی دیوار میں اسے ایک خلا سی نظر آئی تھی۔ یہ خلا تقریباً نصف انچ چوڑی اور سات آٹھ انچ لمبی تھی۔ اگر دوسری طرف کے کمرے میں روشنی نہ ہو رہی ہوتی تو شاید وہ اس خلا کو کبھی نہ دیکھ سکتا۔ وہ گھٹنوں کے بل جھک کر اس خلا سے جھانکنے لگا۔

دوسری طرف کا کمرہ دفتر کے طور پر آراستہ تھا اور اندر مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا لیکن کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے اور سامنے ایک آفس ٹیبل تھی۔ جس پر ٹیلی فون ٹائپ رائیٹر اور دفتری استعمال کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ کمرے کے فرش پر قالین بچھا ہوا تھا اور

کرسیاں اور صوفے بھی نظر آ رہے تھے۔
نک نے دیوار کے خلا میں انگلی ڈالی تو تھوڑا سا پلاسٹر ادھڑ گیا۔ اس کے ساتھ یہ انکشاف بھی ہوا کہ یہ دیوار لکڑی کے تختوں کی بنی ہوئی تھی جس پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ اس دیوار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نک کے ذہن میں اچانک ہی ایک خیال ابھرا اور اس کے ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔
وہ کچھ دیر کھڑا ٹارچ کی روشنی میں کمرے کا جائزہ لیتا رہا پھر وہاں سے ہٹ کر ایک اور زینے کے راستے چھت پر آ گیا۔ چھت پر بھی کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ اس کے ایک طرف تو شین کے دفتر والی عمارت تھی اور دوسری طرف والی عمارت چار منزلہ تھی۔ پشت پر بھی ایک تین منزلہ عمارت تھی وہ کچھ دیر چھت کا جائزہ لیتا رہا پھر چھت سے اتر کر گراؤنڈ فلور پر آ گیا۔ یہاں آتے ہی اس نے ٹارچ بجھا دی پہلے کمرے میں آتے ہی اسے ٹھٹک جانا پڑا بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر کسی کمرے سے باتوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کم از کم دو آدمی تھے جو چینی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے بھی شاید نک کی موجودگی کو محسوس کر لیا تھا نک دیوار کی طرف سرک گیا۔ اس لمحہ اندر سے ایک بھاری آواز ابھری۔
”کون ہے...... یہاں کون ہے؟“
نک ویلوٹ نے جواب دینے کے بجائے اس کھڑکی طرف چھلانگ لگا دی جہاں سے وہ اندر داخل ہوا تھا۔ دروازے کی طرف وہ اس لیے نہیں بھاگا تھا کہ اندر جو کوئی بھی تھے دروازے ہی کا رخ کریں گے۔ وہ ابھی کمپاؤنڈ وال ما ہی تھا کہ فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ گولی نک ویلوٹ کے پیر کے قریب دیوار میں لگی تھی اس نے دوسری طرف چھلانگ لگانے میں دیر نہیں لگائی اسی لمحہ ایک اور فائر ہوا اور ساتھ ہی کوئی آدمی چینی زبان میں چیخنے لگا نک نے اٹھ کر ایک طرف دوڑ لگا دی لیکن اس کے ساتھ ہی اسے بڑی طرح چونک جانا پڑا۔

تیسرے فائر کے ساتھ ہی عمارت کے اندر سے کسی عورت کی چیخ بھی سنائی دی تھی۔ جس سے نک نے یہ اندازہ لگایا کہ عمارت کے اندر دو آدمیوں کے ساتھ کوئی عورت بھی تھی۔
وہ دوڑتا ہوا ایک گلی میں داخل ہو گیا اور پھر مختلف گلیوں میں ہوتا ہوا وہاں سے بہت دور دوبارہ اس سڑک پر نکل آیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا نائٹ کلب کی طرف چلنے لگا۔ نک کو یقین تھا کہ بھاگتے ہوئے کسی نے اس کی شکل نہیں دیکھی ہوگی۔ اس لیے پہچان لیے جانے کوئی اندیشہ نہیں تھا۔
جب وہ شین کے دفتر کے سامنے پہنچا تو وہاں لوگوں کا ہجوم تھا۔ آس پاس دو تین نائٹ کلب تھے لوگ فائرنگ کی آواز سنتے ہی وہاں جمع ہو گئے تھے۔ نک ویلوٹ بھی ہجوم میں شامل ہو گیا لوگوں کی باتوں سے معلوم ہوا کہ پہلی ویران عمارت میں ایک عورت کو قتل کر دیا گیا ہے اور دو آدمیوں کو دیوار پھاند کر بھاگتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ لوگوں کے بیان کے مطابق فرار ہونے والے دونوں آدمی چینی تھے اور مقتولہ بھی چینی ہی تھی۔
ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ پولیس سائرن کی آواز سنائی دی۔ ویلوٹ نے اب وہاں رکنا مناسب نہیں سمجھا اور ہجوم سے نکل کر پارکنگ لاٹ کی طرف چل دیا۔ جہاں اس کی کار کھڑی تھی۔

☆

نک ویلوٹ اس چینی عورت کے قتل کی خبروں میں گہری دلچسپی لے رہا تھا جو اخبارات میں شائع ہو رہی تھی۔ اخباری اطلاع کے مطابق چین نامی وہ عورت منشیات فروخت کرنے والے ایک گروہ کی سرگرم رکن تھی جو پہلے ہی سے پولیس لسٹ پر موجود تھی۔ اخبارات کے مطابق پولیس نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ چین کو اس کے گروہ کے آدمیوں نے قتل کیا تھا۔ ممکن ہے وہ گروہ سے باغی ہو گئی ہو اور اس نے گروہ کے آدمیوں کو پولیس

کی دھمکی دی ہو۔ بہر حال حقیقت کیا تھی نک ویلوٹ اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتا تھا اسے صرف یہ علم تھا کہ قتل اس کی موجودگی میں ہوا تھا اور اس قتل نے اس کے کام میں بہت سی رکاوٹیں پیدا کر دی تھیں۔ پولیس نے اس ویران عمارت کے گیٹ پر ایک مسلح کانسٹیبل تعینات کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کانسٹیبل کی موجودگی میں نک ویلوٹ اس عمارت کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا تھا لیکن یہ بات بھی طے تھی کہ وہ زیادہ دن انتظار نہیں کر سکتا تھا۔
قتل کے اگلے روز ہیکر نے نک ویلوٹ کو آڑے ہاتھوں لیا تھا کہ اس نے میڈم کا کیس لینے کے بعد واپس کیوں کر دیا تھا نک ویلوٹ نے اسے بھی کسی نہ کسی طرح ٹرخا ہی دیا تھا۔ جب کہ درحقیقت اس نے قلمدان چوری کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔
دو دن انتظار کرنے کے بعد نک ویلوٹ ایک بار پھر سرگرم عمل ہو گیا۔ سامنے کے راستے سے عمارت میں داخل ہونا اب ممکن نہیں رہا تھا۔ شین کے دفتر کے دوسری طرف واقع نائٹ کلب سے بھی شین کے دفتر کی عمارت میں داخل ہونا مشکل تھا۔ جب کہ وہ اس حقیقت سے بھی پوری طرح واقف ہو چکا تھا کہ اس خالی عمارت سے شین کے دفتر میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔ اس کے لیے اب دو ہی راستے رہ گئے تھے۔ یا تو خالی عمارت کے ساتھ والی عمارت کی چوتھی منزل کی چھت سے اترا جاتا یا پچھلی طرف والی عمارت کی چوتھی منزل کی چھت سے اترا جاتا یا پچھلی طرف واقع تین منزلہ عمارت سے محل وقوع کا ایک مرتبہ پھر جائزہ لینے کے بعد اس نے پچھلی طرف والی تین منزلہ عمارت کو ترجیح دی تھی۔ اب وہ تین منزلہ عمارت کے بارے میں معلومات حاصل کر رہا تھا۔ جس کا دروازہ دوسری طرف کی گلی میں تھا۔
یہ رہائشی عمارت تھی جس میں دو دو کمروں کے چھوٹے فلیٹ بنے تھے صدر دروازے کے اندر ایک طویل راہداری تھی جس کے دائیں بائیں گراؤنڈ فلور کے فلیٹوں کے دروازے تھے دو فلیٹ دائیں طرف اور دو بائیں طرف راہداری کے اختتام پر اوپر جانے کا زینہ تھا۔ اسی طرح اوپر بھی راہداریاں تھیں۔ جن کے دائیں بائیں فلیٹ تھے۔
نک ویلوٹ شام چھ بجے کے قریب اس عمارت میں داخل ہوا اور زینے طے کرتا ہوا تیسری منزل پر پہنچ گیا۔ وہ چھت والے زینے کی طرف بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ زینے کے ساتھ والے فلیٹ کا دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر چینی عورت باہر نکلی اس نے گھورتی ہوئی نگاہوں سے نک کی طرف دیکھا۔ نک نے ایک آدمی کا فرضی نام لے کر اس کے بارے میں دریافت کیا وہ عورت نفی میں سر ہلاتی ہوئی زینے کی طرف بڑھ گئی۔ نک ویلوٹ وہیں کھڑا رہا وہ عورت زینہ اتر کر جیسے ہی نگاہوں سے اوجھل ہوئی نک ویلوٹ مڑ کر تیزی سے چھت کے زینے کی طرف بڑھ گیا۔
چھت بالکل سپاٹ تھی۔ ایک طرف پانی کے اوور ہیڈ ٹینک کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ چھت کی منڈیر تقریباً تین فٹ اونچی تھی۔ چھت پر کئی جگہوں پر تقریباً ایک ایک فٹ اونچے پلرز نظر آ رہے تھے جس کا مطلب تھا کہ چوتھی منزل بنانے کا ارادہ بھی رہا ہوگا مگر پھر شاید پروگرام ترک کر دیا گیا تھا۔
نک ویلوٹ پچھلی سمت والی منڈیر کی طرف آ گیا یہاں سے دوسری طرف کی سڑک نظر آ رہی تھی لیکن اس ویران عمارت کا گیٹ نظر نہیں آ رہا تھا۔ جہاں چینی عورت کے قتل کے بعد ایک کانسٹیبل متعین کر دیا گیا تھا اور یہ بات نک کے حق میں بہتر ہی تھی اس طرف سے عمارت کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد نک ویلوٹ اس تین منزلہ عمارت سے باہر آ گیا۔
دوسرا دن اس نے شہر میں گھومتے پھرتے ہوئے گزارا اس دوران اس نے ضرورت کی کچھ چیزیں بھی خرید لی تھیں اور پھر رات دو بجے کے قریب وہ دوبارہ ویران

عمارت کی پشت والی تین منزلہ عمارت میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کینوس کا ایک بیگ تھا جس میں ضرورت کی چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ اس عمارت کے گیٹ پر کوئی چوکیدار نہیں تھا اس لیے اسے اندر داخل ہونے میں بھی کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ چھت تک جاتے ہوئے بھی کسی سے آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔

چھت پر پہنچ کر اس نے عقبی منڈیر سے دوسری طرف کا جائزہ لیا۔ سڑک پر اکا دکا گاڑیوں کی آمدورفت تھی۔ نک نے پیچھے ہٹ کر کینوس کا ایک بیگ کھول لیا اور اس میں سے نائلون کی رسی کی بنی ہوئی سیڑھی نکال لی۔ جس کا ایک سرا اس نے چھت پر ایک فٹ اونچے پلر میں پھنسا دیا اور دوسرا سرا دیوار سے نیچے لٹکانے لگا۔

نک ویلوٹ نے اس ویران عمارت میں داخل ہونے کا فیصلہ کر کے بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا وہ جانتا تھا کہ اس عمارت میں ایک عورت کا قتل ہو چکا ہے پولیس کو قاتل کی تلاش ہے اور ایک مسلح کانسٹیبل بھی عمارت کی نگرانی پر موجود ہے اگر وہ پکڑا گیا تو سیدھے سیدھے قتل کے الزام میں دھر لیا جائے گا۔

سیڑھی چھت سے تقریباً پانچ فٹ اونچی رہ گئی تھی نک نے تھیلا کندھے پر لٹکایا ہوا تھا۔ سب سے نچلے ڈنڈے پر پیر رکھ کر وہ آہستگی سے چھت پر اتر گیا اور محتاط انداز میں چلتا ہوا نیچے جانے والے زینے کی طرف بڑھنے لگا۔ فرسٹ فلور پر پہنچ کر اس نے جیب سے پنسل ٹارچ نکالی اور اس کی محدود روشنی میں چلتا ہوا اس کمرے میں پہنچ گیا جس کی دیوار شین کے دفتر سے ملی ہوئی تھی وہ دیوار کے قریب اس جگہ بیٹھ گیا جہاں تختوں میں خلا تھی۔ وہ ٹارچ کی روشنی میں کچھ دیر تک خلا کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر بیگ سے اسکریو ڈرائیور نکال کر تختوں پر چڑھا ہوا پلستر ادھیڑ نے لگا۔

یہ تختے لو انچ چوڑے اور تین تین فٹ لمبے تھے۔ پلستر ادھیڑنے کے بعد نک نے تختوں کا جائزہ لیا اور ایک ایک کر کے انہیں جگہ سے اکھاڑنے لگا۔ تمام تختے اسکریو کے ذریعے جڑے ہوئے تھے۔ جنہیں اکھاڑنے میں اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی تختے اکھاڑنے کے بعد اتنی خلا بن گئی کہ وہ آسانی سے دوسری طرف جا سکتا تھا۔

دوسرے کمرے میں مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ نک نے تھیلا اٹھایا اور جھک کر دوسری طرف گھس گیا۔ یہ شاید کلرک یا اسٹینو کا دفتر تھا۔ سامنے آفس ٹیبل کے دائیں طرف ایک دروازہ تھا۔ نک نے ہینڈل گھمایا تو دروازہ آسانی سے کھل گیا۔ اس سے آگے ایک مختصری راہداری تھی ایک کمرہ سامنے تھا اور ایک دائیں طرف راہداری کے اختتام پر اس نے سامنے والا دروازہ کھولا یہ بھی کوئی چھوٹا دفتر تھا۔ پھر وہ دائیں طرف والے کمرے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ یہ دروازہ لاک تھا اس نے جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکالا اور مختلف چابیاں آزمانے لگا۔ ایک چابی کام کر گئی اور کلک کی ہلکی سی آواز سے تالا کھل گیا اس نے نہایت آہستگی سے ہینڈل گھما کر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا اندر داخل ہونے کے بعد اس نے دروازہ بھیڑ دیا اور ٹارچ کی محدود روشنی میں کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ میز پر روشنی پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی یہ شین کا دفتر تھا شیشے کی ٹاپ والی بڑی میز پر ٹیلی فون اور دفتری استعمال کی دیگر چیزوں کے ساتھ ماربل کا وہ قلمدان بھی رکھا ہوا تھا جس کے لیے نک ویلوٹ نے اتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا۔

میز کے قریب پہنچ کر اس نے قلمدان اٹھا لیا جو خاصا وزنی تھا۔ قلمدان میں وہ چیزیں بھی موجود تھیں جو تصویر میں دکھائی گئی تھیں وہ قلمدان کو دیکھ ہی رہا تھا کہ بیرونی راہداری میں بھاری قدموں کی آواز سنائی دی نک نے قلمدان تھیلے میں ڈال لیا اور دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ قدموں کی آواز اسی طرف آ رہی تھی قدموں کی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی کیم شحیم آدمی تھا۔ نک ویلوٹ دروازے کی آڑ میں ہو گیا آواز دروازے پر رک

گئی کسی نے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے گھمایا۔ دروازہ چرچراہٹ کی ہلکی سی آواز کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ جو کوئی بھی تھا۔ یقیناً چونک گیا۔ کیوں کہ اسی لمحہ کسی کی ہلکی سی غراہٹ سنائی دی تھی پھر ایک بھاری آواز سنائی دی۔

”کون ہے اندر کون ہے؟“ یہ جملہ دو مرتبہ چینی اور انگریزی زبان میں پوچھا گیا تھا۔

نک ویلوٹ دروازے کے پیچھے دبک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنا سانس تک روک لیا تھا۔ دروازہ پوری طرح کھل گیا۔ سب سے پہلے ایک بھاری بھرکم ہاتھ اندر داخل ہوا جس میں اعشاریہ تین آٹھ کا خوفناک ریوالور دبا ہوا تھا۔ وہ ہاتھ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ نک کی نظریں ریوالور پر جمی ہوئی تھیں چند سیکنڈ بعد وہ آدمی بھی اندر آ گیا وہ شین کے دفتر کا خوفناک شکل والا محافظ تھا۔ وہ جیسے ہی ایک قدم آگے بڑھا نک ویلوٹ نے اس کے کولہوں پر پوری قوت سے لات رسید کر دی وہ شخص کراہتا ہوا سامنے والی میز سے جا ٹکرایا ریوالور بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر میز کے دوسری طرف جا گرا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ چینی سنبھلتا' نک نے دروازے کی آڑ سے نکل کر راہداری میں چھلانگ لگا دی اور دوڑتا ہوا اس پہلے کمرے میں داخل ہو گیا جس طرف سے آیا تھا۔

وہ درمیانی دیوار کی خلا سے نکلا ہی تھا کہ شین کے دفتر میں کسی جگہ فائر کی آواز گونجی محافظ نے شاید اسے خوفزدہ کرنے کے لیے گولی چلائی تھی' نک ویلوٹ ویران عمارت کی چھت پر آ گیا اسی وقت شین کے دفتر سے ایک اور فائر کی آواز سنائی دی۔ چینی محافظ شاید پاگل ہی ہو گیا تھا جو اندھادھند فائرنگ کر رہا تھا۔

چھت پر پہنچ کر نک ویلوٹ اس دیوار کی طرف دوڑا جہاں رسی کی سیڑھی لٹکی ہوئی تھی۔ اس نے کینوس کا بیگ کندھے پر لٹکایا اور سیڑھی پر لٹک کر اوپر چڑھنے لگا۔ وہ ابھی آخری سے چوتھی سیڑھی پر تھا کہ شین کے دفتر کی چھت سے شور سنائی دیا اس نے گردن گھما کر دیکھا۔

چھت پر دو آدمی تھے ایک شین کا محافظ اور دوسرا غالباً وہ پولیس کانسٹیبل تھا۔ جسے اس ویران عمارت پر متعین کیا گیا تھا۔ انہوں نے غالباً اسے دیکھ لیا تھا۔ کانسٹیبل نے پہلے چیخ کر اسے وارننگ دی پھر فائر کر دیا۔ گولی نک سے چند فٹ دور دیوار پر لگی وہ تیزی سے اوپر چڑھ گیا۔ منڈیر پر کھڑا دوسری طرف کودنے کے لیے پر تول ہی رہا تھا کہ ایک اور فائر ہوا عین اسی وقت نک نے چھلانگ لگا دی تھی اگر اسے چھلانگ لگانے میں ایک لمحہ کی بھی تاخیر ہو جاتی تو گولی اس کی کسی ٹانگ یا کولہے پر پیوست ہو جاتی چھت پر کودنے کے بعد وہ زینے کی طرف دوڑا دو منٹ کے اندر اندر وہ عمارت سے باہر آ چکا تھا۔ وہ رُکنے کے بجائے تھیلا سنبھالے اس گلی میں دوڑتا چلا گیا جہاں اس نے کار کھڑی کی تھی کار اسٹارٹ کرتے ہوئے اسے اب تین منزلہ عمارت سے بھی شور سنائی دے رہا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کار کو گیئر میں ڈالا اور ایکسیلیٹر پر پیر کا دباؤ بڑھاتا چلا گیا۔

نک ویلوٹ اپنے دوست بیکر کے مکان کے ایک کمرے میں بیٹھا ماربل کے قلمدان کو اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ بڑا خوب صورت قلمدان تھا۔ دودھیا ماربل کے ٹکڑے پر میرون رنگ کی دھاریاں اس طرح بنی ہوئی تھیں جیسے خاردار تاریں لگائی گئی ہوں خوبصورتی کے علاوہ اس میں بظاہر ایسی کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی جسے کوئی اہمیت دی جا سکتی ہو۔ میڈم سارہ نے کہا تھا کہ وہ اپنی مرحوم بیٹی کی یادگار کے طور پر اس قلمدان کو حاصل کرنا چاہتی ہے لیکن یہ نک ویلوٹ کا تجربہ تھا کہ کوئی معمولی سی چیز چوری کرانے کے لیے پچیس ہزار ڈالر اس طرح خرچ نہیں کر دیئے جاتے رشتے ناتوں کے بارے میں بھی وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ رشتے ناتوں کے حوالے سے اس نے جب بھی کوئی چیز چرائی تھی اس میں کوئی نہ کوئی راز ضرور نکلا تھا' اب یہ قلمدان اس کے خیال میں کسی خاص اہمیت کا حامل ضرور تھا۔

اس نے قلمدان کی تمام چیزیں نکال کر رکھ دی تھیں وہ کچھ دیر تک قلمدان کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر قلمدان ایک طرف رکھ دیا اور دوسری چیزوں کو اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگا۔ اس وقت سیاہ روشنائی والا قلم اس کے ہاتھ میں تھا۔ قلم کے آخری سرے پر باریک چوڑیاں سی بنی ہوئی دیکھ کر وہ چونک گیا۔ اس نے سرخ روشنائی والا قلم اٹھالیا۔ اس کے آخری سرے پر بھی اسی قسم کی چوڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک اور بات بھی محسوس کی تھی کہ یہ دونوں قلم عام قلموں سے قدرے وزنی تھے اور پھر کچھ دیر بعد اس نے یہ راز بھی معلوم کرلیا۔ دونوں قلم پلاسٹک کے نہیں بلکہ کسی دھات کے بنے ہوئے تھے۔

دفعتہً نک ویلوٹ کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ اس نے قلمدان اٹھا کر سامنے رکھ لیا اور دونوں قلم اس طرح اُلٹے ہولڈروں میں لگا دیئے کہ ان کے نب والے سرے باہر تھے وہ دونوں قلموں کو آہستہ آہستہ گھماتا رہا اسے یوں لگا جیسے چوڑیاں ہولڈروں کے اندر کسی جگہ فٹ ہورہی ہوں وہ قلموں کو گھماتا رہا اور پھر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی وہ جیسے جیسے قلموں کو گھماتا رہا تھا۔ قلمدان کا بیس آہستہ آہستہ اوپر اٹھ رہا تھا۔ قلمدان کا بیس دو حصوں میں تقسیم ہوکر صندوق کے ڈھکنے کی طرح اُوپر اٹھ گیا۔ نک ویلوٹ نے قلمدان اٹھا کر دیکھا تو اس خلاء کے اندر کوئی کاغذ تہہ کیا ہوا رکھا ہوا تھا۔ اس نے کاغذ نکال لیا اور خلا میں دیکھنے لگا۔ اندر کی طرف قلمدان کے پچھلے حصے میں باریک قبضے بڑی مہارت سے فٹ کیے ہوئے تھے۔ نک نے کاغذ کھول لیا۔ وہ اسٹامپ پیپر تھا جس پر ٹائپ میں تحریر تھی۔ نک ویلوٹ جیسے جیسے تحریر پڑھتا گیا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھتی گئی تحریر ختم کرکے اس نے کاغذ تہہ کرکے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا اور قلمدان کو اسی طرح بند کرکے بیگ میں ڈال لیا۔

اسی رات نک ویلوٹ اپنے دوست بیکر کو لے کر میڈم سارہ کے مکان پر پہنچ گیا نک کو دیکھ کر سارہ کی بھویں تن گئی تھیں لیکن جب نک نے ماربل کا قلمدان بیگ سے نکال کر اس کے سامنے رکھا تو اس کے تاثرات بدل گئے۔

''تت...... تم نے تو انکار کردیا تھا؟'' وہ نک کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''میرے انکار کی وجہ تھی کہ تمہارے گھر کا کوئی فرد ہماری باتیں چھپ کر سن رہا تھا۔ اگر میں انکار نہ کرتا تو یہ اطلاع شین تک پہنچ جاتی کہ قلمدان چرانے کی کوشش کی جائے گی اور ممکن تھا کہ قلمدان کسی ایسی جگہ پہنچا دیا جاتا جہاں تک میری رسائی ممکن نہ ہوتی اس لیے میں نے انکار کردیا تھا اس طرح وہ بات یہیں ختم ہوگئی اور میں اپنا کام کرگزرا۔'' نک نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ بہت بہت شکریہ!'' سارہ نے کہا اور اندر کی طرف منہ کرکے کسی کو پکارا اس مرتبہ بھی وہی نوعمر چینی ملازمہ اندر آئی تھی۔ نک ویلوٹ نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ میز پر ماربل کا قلمدان دیکھ کر اس کی بھویں تن گئی تھیں۔ نک کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اس روز یہی ملازمہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہی تھی۔ سارہ نے چینی زبان میں ملازمہ سے کچھ کہا وہ اندر چلی گئی اور کچھ دیر بعد اس نے وہی لفافہ لاکر سارہ کے حوالے کردیا۔

''یہ تمہاری فیس ہے تم نے میری بہت بڑی مشکل حل کردی۔ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔'' سارہ نے لفافہ نک کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد نک ویلوٹ زیادہ دیر تک وہاں نہیں رکا۔ سارہ کے مکان سے نکل کر اس نے بیکر کو تو رخصت کردیا اور خود ایک ٹیکسی پر شین کے دفتر کی طرف روانہ ہوگیا۔

ابھی رات کے آٹھ بجے تھے اور شین دفتر میں موجود تھی نک کو شین تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

''فرمایئے! میں آپ کی کیا خدمت کرسکتی ہوں؟'' شین نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں دراصل کسی بزنس کے سلسلے میں یہاں نہیں آیا۔

دراصل انسانی ہمدردی مجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔'' نک بولا۔

''کیا مطلب! میں سمجھی نہیں!'' شین نے اسے گھورا

''جائیداد کے سلسلے میں تمہارا کسی سے جھگڑا چل رہا ہے؟'' نک نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں! لیکن تم کون ہو اور کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''مجھے اپنا دوست سمجھو۔ میں تمہیں فائدہ ہی پہنچاؤں گا۔ نقصان نہیں لیکن اس سے پہلے میں اس جھگڑے کی تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔'' نک نے کہا۔

شین چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اسے بتانے لگی کہ یہ لمبا چوڑا بزنس اس کے باپ کا تھا۔ اس کی ماں کے انتقال کے بعد باپ نے سارہ نامی مقامی عورت سے شادی کرلی جس کی پہلے سے ایک بیٹی موجود تھی۔ سارہ اس کوشش میں تھی کہ شین کا باپ وانگ سو اپنی ساری جائیداد سارہ کی بیٹی یاکاماشی کے نام کردے لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا بلکہ اس نے اپنا وصیت نامہ تیار کردیا جس میں شین کو اس کا جائز اور قانونی وارث قرار دیا گیا تھا وانگ سو کے انتقال کے بعد کاروبار سارہ اور پھر اس کی بیٹی نے سنبھال لیا۔ اس دوران وانگ سو کا وصیت نامہ کسی طرح یاکاماشی کے ہاتھ لگ گیا جسے اس نے چھپا کر رکھ دیا۔ کچھ عرصہ بعد یاکاماشی کا بھی انتقال ہوگیا اس کے بعد شین اور سارہ کے درمیان جائیداد کے سلسلے میں مقدمہ بازی شروع ہوگئی۔ شین اس وصیت نامے کی تلاش میں تھی اگر اسے باپ کا وصیت نامہ مل جائے تو عدالت اس وصیت نامے کی روشنی میں اس کے حق میں فیصلہ دے سکتی ہے شین نے یہ بھی بتایا کہ سارا اسے ہر اساں کرنے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کررہی ہے سارہ کے خیال میں وہ وصیت نامہ دفتر ہی میں کسی جگہ پوشیدہ ہے جس کی تلاش میں سارہ مختلف آدمیوں کے ذریعے اس کے دفتر میں دراندازی کراتی رہتی ہے کل رات پھر کوئی آدمی دفتر میں گھس آیا تھا جو اس کی میز سے ماربل کا قلمدان چرا کرلے گیا۔

''مجھے یقین ہے کہ اس وصیت نامے کے ہوتے ہوئے دنیا کی کوئی عدالت تمہیں تمہارے حق سے محروم نہیں کرسکتی۔'' نک ویلوٹ نے اس کی باتیں سننے کے بعد وصیت نامہ جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ...... یہ تمہیں کہاں سے ملا۔ شین وصیت نامہ دیکھ کر حیرت زدہ سی ہوگئی۔

''اگر تم کوئی انتقامی کارروائی نہ کرنے کا وعدہ کرو تو میں تفصیل بتاسکتا ہوں۔'' نک بولا۔

''میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں تمہارے یا کسی اور کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہیں کروں گی۔ تم تو میرے سب سے بڑے محسن ثابت ہوئے ہو۔'' شین نے کہا۔

نک ویلوٹ نے اُسے پورے واقعے کی تفصیل بتادی آخر میں وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

''میں چور ضرور ہوں لیکن میرے بھی کچھ اصول ہیں میں کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا اور پھر تم جیسی حسین اور معصوم لڑکی کی حق تلفی تو برداشت ہی نہیں کرسکتا۔''

''ارے! مسٹر ویلوٹ! کہاں چلے بیٹھو تو مجھے شکریہ ادا کرنے کا موقع تو دو۔'' شین نے بھی اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''اگر زندگی میں پھر کبھی ملاقات ہوئی تو تمہیں ایسا موقع ضرور دوں گا۔'' نک نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

شین حیرت سے دروازے کی طرف دیکھتی رہ گئی پھر ہاتھ میں پکڑے ہوئے اپنے باپ کے وصیت نامہ کو دیکھنے لگی جس نے اس کی قسمت بدل دی تھی۔ نک ویلوٹ سے اظہار تشکر کے طور پر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک چور اس کے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوگا۔

☆......☆......☆



رات اور کنواں

کہتے ہیں کہ اگر انسان کچھ کر گزرنے کی ٹھان لے اور منزل کی جانب قدم اٹھالے قدرت آپ ہی آپ اس کی مددگار ہو جاتی ہے اور راستے کی ساری کٹھنائیاں اور اذیتیں شکست کھا جاتی ہے۔

عبدالمعبود صدیقی

ایک باحوصلہ نوجوان کی روداد' وہ بھیڑیوں کے بھٹ میں جا پھنسا تھا

ہم تین دوستوں نے نو سے بارہ والے شو میں فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا' گھر سے نکل کر سینما کی طرف روانہ ہوئے' راستے میں ایک پارک جو چمن کے نام سے مشہور تھا' اس کے قریب ایک کنواں تھا' جب ہم اس کنویں کے قریب پہنچے تو دیکھا ایک لڑکی دوڑتی ہوئی آئی اور اس کنویں میں کود گئی' ہم بہت پریشان ہوئے' لڑکی کو بچانے ہمارا ایک ساتھی کنویں میں اتر گیا' اس نے لڑکی کو کندھے پر ڈال کر اوپر آنے کی کوشش کی مگر چونکہ لڑکی بیہوش تھی' اس وجہ سے اِدھر اُدھر لڑھک جاتی تھی' ہم نے اپنے دوست کو مشورہ دیا' اس لڑکی کو اس کی ساڑھی سے اپنی پیٹھ پر باندھ لے' اس نے ایسا ہی کیا اور باہر نکل آیا' ہم نے جلدی سے لڑکی کو اس کی ساڑھی میں لپیٹا اور زمین پر لٹا دیا' اس کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے تاکہ وہ ہوش میں آ جائے اور ہم اس کو اس کے گھر یا وہ جہاں چاہے پہنچا دیں۔

لڑکی غضب کی تھی' بھرپور جواں' بھیگا ہوا جسم' گوری رنگت پر کالا چست بلاؤز۔ اف یہ کسی قیامت سے کم نہیں تھی' چاند کی روشنی میں اور زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ اس پر چاند اور بادلوں کی چھیڑ چھاڑ' چاند بھی شاید اس بیہوش چاند کو دیکھتے ہی رہنا چاہ رہا تھا اور بادل شرارت سے چاند اور اس حسینہ کے بیچ آ جاتے تھے' جب بادل دونوں کے بیچ آ جاتے تو ماحول ذرا دھندلا جاتا' پھر شاید چاند کی ناراضگی کے ڈر سے ہٹ جاتے تو چاند پوری توانائی کے ساتھ اس بیہوش حسینہ سے چمٹ جاتا' پھر بادل ان دونوں کے بیچ آ جاتے تو ایسا لگتا' کسی نے اس بیہوش حسینہ پر ہلکی سی چادر ڈال دی ہو' ہر طرف سناٹا تھا' چمن کی بتیاں بھی جیسے تھک گئی تھیں' ان کی روشنی نہ ہونے کے برابر تھی یا پھر یہ بتیاں چاند کی روشنی سے شرما رہی تھیں۔ ہمارے سامنے ایک حسین جوان لڑکی سارے اندیشوں' ڈر و خوف سے بے خبر ہمارے رحم و کرم پر اس سنسان جگہ پڑی تھی' اور ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں' اس لڑکی کو اس حالت میں چھوڑ کر کہیں جا بھی نہیں سکتے تھے' اس کو اٹھا کر لے جانا بھی بہت مشکل کام تھا' چاندنی رات نے ماحول اور بھی رومانی بنا دیا تھا۔ ایسے حالات میں کچھ بھی ہو سکتا تھا' انسان کو شیطان بننے میں لمحہ بھر کی ضرورت ہوتی ہے' ہمیں ڈر تھا کہ کہیں کوئی ایسی لغزش ہم سے نہ ہو جائے' نیکی کا اجر پانے کے بجائے کسی عذاب میں نہ آ جائیں' کوئی بندہ بشر بھٹک کر بھی ادھر سے نہیں گزر رہا تھا' شاید قدرت ہمارا امتحان لے رہی تھی کہ ہم اس کھلے دسترخوان

سے اپنی بھوک پیاس مٹاتے ہیں یا بھوکے پیاسے ہی رہ جاتے ہیں۔

ایک دوست ڈاکٹر کو لینے گیا' ہم دو اس حسین لاش کے پاس اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہے تھے لڑکی کو شاید ہوش آ رہا تھا' اس کے سینے کے زیر و بم دیکھ کر خوشی بھی ہوئی اور ہماری پیاس کی شدت بھی بڑھ گئی' شاید ہم شیطان بننے والے تھے' جزا کے بجائے سزا پر لپکنے والے تھے کہ ضمیر نے ہمیں للکارا' کیا کرتے ہو؟ اس مردہ جسم سے تمہیں کون سی لذت ملے گی؟ تم تو بے لذت گناہ کی طرف بڑھ رہے ہو' اپنا دین' اپنی دنیا' اپنی آخرت خراب کر رہے ہو' خبردار! خبردار! نیکی کو کنویں سے نکال کر کنوے میں ڈال رہے ہو۔

لڑکی نے آنکھیں کھولیں' اپنے اطراف نظر ڈالی' ہماری طرف دیکھ کر پانی پانی کی بہت ہی ہلکی ہلکی آواز اس کے منہ سے نکلی' بہت ہی نقاہت محسوس کر رہی تھی' پتہ نہیں کتنا ظلم اور کیسا ظلم ہوا تھا اس پر کہ اس نے اس قدر انتہائی قدم اٹھایا تھا' میرا دوسرا ساتھی پانی لینے چمن میں گیا' اب میں اس کے پاس اکیلا ہی تھا اور وہ میرے پاس تھی' مجھے بڑی گھبراہٹ ہو رہی تھی' میں خوف زدہ بھی تھا کیونکہ اس سے پہلے کبھی کسی حسین لڑکی کے پاس ایسی سچویشن میں نہیں رہا' مارے گھبراہٹ کے میرے پسینے چھوٹ رہے تھے' لڑکی پھر سے خاموش ہو گئی' میں اس کو چھوڑ کر بھاگ جانا چاہتا تھا کہ اجنبی بارعب آواز پر چونک گیا۔

''کون ہو تم؟ کیا کر رہے ہو یہاں؟ کہاں سے لائے ہو اس لڑکی کو؟ کون ہے یہ لڑکی؟ اتنے سارے سوالات سن کر میں اور گھبرا گیا۔''

''میں...... میں ہوں۔''

''کہاں سے لائے ہو یہ لڑکی؟''

''یہ...... یہ کنواں...... کنواں۔'' میں نے گھبراہٹ سے کہا۔

''کیا کنواں کنواں...... میں' میں کر رہے ہو؟ ٹھیک سے بتاؤ؟ کون ہے یہ لڑکی' یہ کیا حالت کر دی ہے اس کی؟''

لڑکی نے آنکھیں کھول دیں' پانی پانی اس نے نحیف سی آواز میں کہا' ایک زوردار تھپڑ میرے گال پر پڑا اور میں لڑکھڑا کر گر پڑا۔ ''ٹھیک' ٹھیک بتاؤ بدمعاش ورنہ تیری ساری بدمعاشیاں نکال دیں گے' لیلیٰ مجنوں ہو کہ شیریں فرہاد یا پھر ہیر رانجھا؟ سچ سچ بتاؤ۔''

لڑکی ہوش میں آ چکی تھی' اس قدر سخت و ترش سوالوں سے گھبرا گئی' وہ بھی میری طرح اٹک اٹک کر کچھ کہنا چاہتی تھی' پھر سے بیہوش ہو گئی یہ لوگ ایسے نہیں مانیں گے' اس کے ہاتھ' پاؤں باندھ کر گاڑی میں ڈال دو' ہوش ٹھکانے آ جائیں گے اور پھر ایسا ہی ہوا۔

پتہ نہیں کتنی دیر اور کتنی دور ہم ٹرک میں پڑے رہے کیونکہ مجھے بھی بیہوش کر دیا تھا' اور جب میں ہوش میں آیا تو ایک ویران بنگلے میں تھا' صاف ستھرا بستر دیکھ کر اندازہ ہوا کہ کیسے بھی ہوں' کچھ بھی کرتے ہوں' ہیں نفاست پسند ۔ میں حیرانی میں بستر سے اٹھا' ارد گرد نظر ڈالی' کوئی نظر نہیں آیا' نہ ہی کوئی جانور تھا' یہ بنگلہ کافی پرانا لگتا تھا کیونکہ دیواروں پر رنگ و روغن نہیں تھا' دیواروں اور چھت کا پلاستر جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا' مگر یہاں کی ہر چیز نفیس' صاف ستھری اور سلیقے سے رکھی ہوئی تھی' اندازہ ہوا کہ یہاں عورتیں بھی ضرور ہیں' مگر نہ کسی عورت' مرد یا بچے کی آواز سنائی دی' میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے سر کو پکڑ کر جھٹکے دیئے کہ شاید بیہوشی کا اثر اب تک باقی ہو' مگر ایسا نہیں تھا' پلٹ کر دیکھا تو تکیوں کے ساتھ بہت ہی قیمتی کپڑے کا جوڑا رکھا تھا' میں اٹیچ باتھ میں گیا' وہاں بھی ہر چیز سلیقے سے رکھی گئی تھی' شیمپو' صابن' شیو بنانے کا سامان' بہت ہی نفیس' صاف ستھرا تولیہ' میں یہ سب دیکھ کر حیران رہ گیا' میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتنی ساری آسائشیں مہیا کرنے والوں نے آخر مجھے اس طرح کیوں لایا ہے' میں نہا دھو کر باتھ روم سے باہر آیا' سامنے دیوار کے پاس ایک میز اور کرسی رکھی تھی' میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

صبح بخیر...... میں نے ایک لڑکی کی آواز سنی' دیکھا تو ایک حسین دوشیزہ تھی' اس کے ہاتھوں میں ایک ٹرے تھی' شاید میرا ناشتہ لائی تھی' سڈول و خوبصورت جسم کی اس دوشیزہ نے مسکراتے ہوئے ٹرے میز پر رکھ دی۔ آپ ناشتہ کیجئے' میں پھر حاضر ہوتی ہوں' جاتے جاتے اس نے پلٹ کر پوچھا' کھانے کے بعد آپ کیا لیں گے؟ چائے' کافی یا کچھ اور؟ میں نے چائے کا کہا اور اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور چلی گئی' وہ تقریباً برہنہ تھی' اس کی آدھی رانوں پر اسکرٹ تھا' بغیر آستین کے بلاؤز' گلا اتنا بڑا تھا کہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے شرم آتی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ان سب طلسماتی باتوں پر غور کر رہا تھا کہ وہ پھر اپنی خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ آ گئی' آپ کی چائے لائی ہوں جناب! میں نے شکریہ ادا کیا' وہ مسکرائی۔

''کوئی تکلیف تو نہیں جناب کو؟''

''جی نہیں! آپ کے ہوتے ہوئے کیا تکلیف ہو سکتی ہے؟''

''کسی چیز کی ضرورت؟''

''کیا کچھ دیر میرے ساتھ باتیں کر سکتی ہیں؟''

''ضرور جناب ضرور! یہاں لائے ہوئے مہمانوں کا خیال رکھنا میری ذمہ داری ہے۔''

''لائے ہوئے مہمان؟''

''شاید لوگ اتنی دور ویرانے میں آنا پسند نہیں کرتے۔''

''آپ اکیلی رہتی ہیں؟''

''جی ہاں! کبھی کبھی' ورنہ سب ہی ہوتے ہیں۔''

''سب ہی؟...... کتنے لوگ ہیں یہاں؟''

''آٹھ مرد' تین عورتیں۔''

''باقی دو عورتیں کہاں ہیں؟''

''اپنے اپنے کام پر گئی ہیں۔''

''میرے ساتھ بھی ایک لڑکی آئی ہے یہاں' وہ کہاں ہے؟''

''آئی ہے نہیں' تم نے قتل کیا تھا اس کو' مار ڈالا تھا' بیچاری کو' ایک شخص نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔'' پولیس تمہیں ڈھونڈ رہی ہے' یہ رہا اخبار' خود پڑھ لو تو بہتر ہے۔ آرام کر لو پھر سب مل کر باتیں کریں گے۔'' چلو محجوبہ آرام کرنے دو اس کو اور وہ دونوں مجھ کو اکیلا چھوڑ کر چلے گئے' میرے دماغ میں بہت سے سوالات اٹھتے رہے' میں نے تو اس لڑکی کو قتل نہیں کیا' میں بے گناہ ہوں' ہم نے تو اس کی جان بچائی تھی' اور وہ زندہ بھی تھی' جب ہی تو ان لوگوں نے ہم دونوں کے ہاتھ' پاؤں باندھ کر گاڑی میں ڈالا تھا' پھر وہ مر کیسے گئی' ایسا تو نہیں کہ ان لوگوں نے ہی اس کو مار ڈالا اور الزام میرے سر؟ کچھ بھی ہو میں خطرے میں ہوں' یہاں میرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے' مجھے ہوش و حواس سے کام لینا ہو گا' سب سے پہلے اس لڑکی کا پتہ لگانا ہو گا' جو میرے ساتھ لائی گئی تھی۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد جو سوالات ذہن میں ابھر رہے تھے' میں میں ان سے بہت ڈر گیا تھا' اور ان میں الجھ بھی گیا تھا' ذہن سے بوجھ کم کرنے کے لئے میں نے اخبار اٹھایا' سامنے ایک بڑی سرخی میرے اور اس لڑکی کے بارے میں' یہ لڑکی شہر کے بہت بڑے کروڑپتی تاجر کی بہو تھی' نیچے لکھا تھا ''کل رات تقریباً نو بجے سے ایک لڑکے کے ساتھ غائب ہے اس نے سیاہ بلاؤز اور پیلے رنگ کی ساڑھی پہنی ہوئی ہے' اس نے کنویں میں چھلانگ لگا دی تھی' تین لڑکوں نے اس کو کنویں سے نکالا تھا۔'' آگے پڑھنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ میں سب جانتا تھا' میں نے اخبار بے دلی سے میز پر پھینکا' بے مقصد کمرے میں چکر لگاتا رہا' سوچ رہا تھا کس طرح ان حالات کا مقابلہ کروں' کیسے چھٹکارا پاؤں' کیسے بھاگ نکلوں' مجھے بہت ہوشیاری سے کام لینے کی ضرورت ہے' ذرا سی غفلت یا جذباتی ہونے پر جان جا سکتی ہے۔

''کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟'' یہ محجوبہ تھی' اسم بامسمیٰ کسی محجوبے سے کم نہیں۔''

او محجوبہ رد مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں' تنہائی سے

لگا رہی تھی' نظارہ اس کی مدد کر رہی تھی' مجھے زخموں سے تکلیف ہو رہی تھی' میں بری طرح چیخ رہا تھا کہ محبوبہ نے ڈانٹا۔

بس اب چپ ہو جاؤ' میں نے کہا تھا نہ میں خود کوئی راستہ نکالوں گی مگر نہیں ہیرو بننا تھا' دیکھ لیا جذباتی ہونے کا نتیجہ؟ اب سنو کسی سے کچھ نہ کہنا' جتنا میں نے سمجھایا ہے اس سے آگے کچھ نہیں' ایک لفظ بھی نہیں' ورنہ جان سے جاؤ گے' ہمیں ابھی زندہ رہنا ہے' نظارہ کے بچے اس کا انتظار کر رہے ہیں' پھر اس نے ایک انجکشن دیا' میں نیند کی آغوش میں چلا گیا' پتہ نہیں رات کب ختم ہوئی' دن کب نکلا' مجھے محبوبہ نے جگایا تو لنچ کا وقت تھا' لنچ میرے کمرے میں ہی پہنچایا گیا' لنچ سے فارغ ہو کر وہ میرے پاس آئی' میرے زخموں کو دیکھا' مجھ سے کچھ پوچھ گچھ نہیں کی' شاید محبوبہ نے سب کچھ سنبھال لیا تھا' پھر انہوں نے محبوبہ کی طرف دیکھا۔ ''ایسی حالت میں تو ہر کوئی ایسی ہی حرکتیں کرتا ہے' جلدی تو ایڈجسٹ نہیں ہوتا' کوئی بات نہیں' ان کا خیال رکھنا۔'' شام کی چائے کے بعد وہ اپنے کاموں پر چلے گئے۔

اب میں بہتر محسوس کر رہا تھا' تر و تازہ معلوم نہیں کیسا مرہم تھا' کیسا انجکشن تھا مجھ میں جان ڈال دی تھی' باہر کرسیاں لگا دی گئی تھیں۔

''آؤ باہر چلتے ہیں۔'' نظارہ نے مجھے پکڑ کر اٹھانا چاہا میں نے منع کر دیا۔

میں ٹھیک ہوں خود چل کر جاؤں گا۔

''وری گڈ اس سے اچھی کیا بات ہو سکتی ہے۔'' محبوبہ نے مجھے چائے یا کافی کے بجائے کوئی مشروب دیا' مشروب لینے کے بعد میں نے فرحت محسوس کی' نقاہت بھی دور ہو گئی۔

''مجھے امید نہیں تھی کہ آپ جیسا بزدل اتنی جلدی جان پکڑ لے گا۔''

''مجھے بزدلی کا طعنہ نہ دو' محبوبہ میں ایک غیرت مند بہادر مرد ہوں۔''

''ارے رہنے دو بھائی' بہادر اور مرد جذبات اور عجلت کا نتیجہ دیکھ چکے ہو۔''

''چھوڑ دو بھی ان باتوں کو۔'' نظارہ نے بیزاری سے کہا۔

''اب آگے کیا کرنا ہے سوچو؟ تمہیں تو یہ ماحول راس آ گیا ہے محبوبہ! یہ بھی کوئی زندگی ہے؟ لعنت ہے لعنت۔''

''اچھا دادی اماں ہم مان گئے! بزرگوں نے کہا ہے کھانا ٹھنڈا کر کے کھانا چاہئے' ورنہ منہ جل جاتا ہے۔''

''محبوبہ مجھے بتاؤ یہاں سے باہر جانے کے کتنے راستے ہیں؟''

''ایک ہی راستہ ہے' وہ سامنے گیٹ نظر آ رہا ہے لیکن' دونوں طرف گیٹ کے خون خوار کتے ہیں' جو کسی بھی غیر آدمی کو زندہ نہیں چھوڑتے' یہاں آنے جانے والوں کی بو سونگھتے ہیں' ان سے بچنا ناممکن ہے۔''

''اچھا یہ بتاؤ یہاں بیہوش کرنے والی کوئی دوائی ہے؟''

''سوائے نیند کی گولیوں اور انجکشن کے کچھ نہیں' کیا آپ کا مطلب کتوں کو بیہوش کرنا ہے؟''

''آپ نے صحیح سمجھا میرا مطلب یہی تھا۔''

''دوسرا راستہ بھی تو نہیں' چاروں اطراف خار دار تاروں کی باڑ ہے' جس سے نکلنا بہت مشکل ہے۔''

''خیر کوئی بات نہیں' دیکھا جائے گا' اللہ مالک ہے' کوئی راستہ بھی نکل آئے گا' اب میں تھکن محسوس کر رہا ہوں' تھوڑی دیر لیٹ لوں۔''

صبح اٹھ کر میں نے ہاتھ دھویا' ناشتے سے فارغ ہو کر اپنے مشن کی تکمیل کے پہلوؤں پر غور کرتا رہا' بار بار خون خوار کتے رکاوٹ نظر آتے تھے' اور مارے خوف کے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے' ان کتوں کا کیا کیا جائے؟ میرے سامنے دیوار پر ایک چھپکلی دکھائی دی' میں اس کو یوں ہی دیکھتا رہا کہ اچانک میرے دماغ میں آیا' کیوں نہ میں کتوں کے گوشت میں چھپکلی ملا دوں' اگر کتے مریں گے نہیں تو بیہوش ضرور ہوں گے اور ہم یہاں سے بھاگ جائیں گے۔

دوپہر کے کھانے پر محبوبہ و نظارہ نے مجھے دائیں بائیں سے پکڑ کر کھانے کی میز تک پہنچایا' میں نے بھی تھوڑی ایکٹنگ کی کہ دیکھنے والے مجھے کمزور سمجھیں' دو بدمعاشوں نے اٹھ کر مجھے کرسی پر بٹھایا' کھانے سے فارغ ہو کر پوچھا' کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟

''کچھ بہتر محسوس کر رہا ہوں۔''

''میرا خیال ہے دو' تین دنوں میں ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' اپنے ذہن پر زور نہ دیں آرام کریں' محبوبہ ہے' نظارہ بھی آپ کو بور نہیں ہونے دے گی' بس ذرا ہوشیاری نہ دکھائیں' ورنہ تکلیف میں آ جاؤ گے' انہیں آرام کرنے دیں۔'' محبوبہ' نظارہ کی طرف دیکھ کر کہا گیا اور دونوں نے پھر سے میرے دائیں اور بائیں ہو کر مجھے کمرے میں پہنچا دیا' میں نے محبوبہ کو روکنا چاہا' اس نے ماسٹروں کی موجودگی کا احساس دلایا۔

''انشاء اللہ چائے پر ملاقات ہو گی' جب تک اجازت۔''

شام کو پھر سبزے پر چائے پی رہے تھے۔'' کچھ سمجھ میں آیا کہ نہیں؟ یہاں سے کس طرح نکلیں؟'' نظارہ گنگنائی۔

فکر نہ کرو نظارہ' جس کا کوئی نہیں ہوتا اللہ اس کا یار و مددگار ہوتا ہے' دیکھیں یہ کافی بوسیدہ بنگلا ہے' یہاں پر چھپکلیاں بھی گھومتی ہیں' صبح ہم کو پانچ چھ چھپکلیوں کو مارنا ہو گا' اس کے بعد ہم آزاد۔

وہ کیسے؟ وقت آنے پر سب پتہ چل جائے گا۔'' مگر دن میں وہ لوگ ہوتے ہیں ہم چھپکلی کیسے ماریں گے؟'' محبوبہ نے خدشہ ظاہر کیا۔

''کوئی بات نہیں ہم یہ کام رات ہی کو انجام دیتے ہیں۔ نظارہ نے کہا۔

''بالکل ٹھیک' کل شام کو چائے کے بعد جب یہ بدمعاش جائیں گے' انشاء اللہ ہم بھی اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں گے۔''

دیکھو اب کرنا یہ ہے کہ ان چھپکلیوں کو مار کر کتوں کے گوشت میں ملا دیں گے' گوشت کھا کر کتے ناٹیں ناٹیں نش اور ہم رفو چکر یا اللہ ہمیں کامیابی دے' ہمت دے۔'' نظارہ نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔

اپنے پلان کے مطابق شام کی چائے کے بعد ان بدمعاشوں کے جاتے ہی ہم نے چھپکلیاں ماریں' کتوں کے کھانے میں ملا دیں' کتے گوشت کھاتے ہی لمبے لمبے لیٹ گئے اور ہم اس خار دار باڑ سے باہر آ گئے' محبوبہ نے بتایا وہ لوگ اس راستے سے آتے جاتے ہیں' کیوں نہ ہم اس راستے کے مخالف سمت میں چلیں' پتہ نہیں کتنی دور چلنا پڑے' اور ہم مخالف سمت میں چل پڑے' کافی دور چلنے پر ہمیں ایک پختہ سڑک مل گئی' ہمارے حوصلے اور بڑھ گئے۔ اس امید پر کہ اب کوئی نہ کوئی سواری مل ہی جائے گی اور ہم اپنی منزل پا لیں گے' کچھ دور چلنے پر ہم کو دو بتیاں نظر آئیں' جب وہ قریب آئیں تو ہم نے لفٹ مانگی' یہ پٹرولنگ پولیس تھی' ہم نے ان کو ساری کہانی سنا دی' وہ بہت خوش ہوئے کیونکہ ہمارے ملنے پر ان کی ترقیاں و انعام یقینی تھے۔

پہلے ہم کو اس کروڑ پتی تاجر کے گھر لے گئے جس کی بہو ہمارے ساتھ تھی یعنی وہی لڑکی جس نے کنویں میں چھلانگ لگا دی تھی' وہ امیر آدمی دو لڑکیوں اور میرے ساتھ اپنی بہو کو دیکھ کر بہت خوش ہوا کیونکہ دو لڑکیاں اور بھی میرے ساتھ تھیں' کچھ پولیس کا بیان' کسی شک و شبے یا کسی اندیشے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا' اس شخص نے نظارہ کے گھر والوں کو فون پر خوشخبری دی' میرے گھر والے بھی آ گئے' مگر محبوبہ کے گھر والوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا' اب وہ کہاں جاتی کہ میری امی نے اس کو گلے لگا دیا۔

☆......☆......☆

● ● ●



غلط راستہ

گناہ کے راستے پر چلنے والی ایک خاتون کا قصہ' وہ دو بچوں اور شوہر کے موجودگی میں اپنے محبوب کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی تھی پھر اس نے اپنے محبوب کے راستے کا کانٹا بھی صاف کر دیا مگر...

انور فرہاد

ہمارے اپنے معاشرے میں کھیلے جانے والے گناہ آلود ڈرامے کی روداد

جب اس کی شادی ہوئی تو اس کی سہیلوں نے اسے بڑا چھیڑا تھا۔

''وزیراں تیری تو لاٹری نکل آئی۔''

اس نے انجان بنتے ہوئے پوچھا تھا...... ''کیسی لاٹری......؟''

اب انجان نہ بن ایسا چھیل چھبیلا...... کسی لاٹری سے کم ہوتا ہے......؟ ہمارے ماں باپ تو بیٹیوں کی شادی کے موقع پر اس طرف توجہ ہی نہیں دیتے...... بس لڑکا کماؤ ہو...... چاہے اس کی عمر کتنی ہی زیادہ ہو۔ زرینہ کے بارے میں تو تجھے معلوم ہے' اٹھارہ برس کی چھوری کو چالیس پینتالیس برس کے بوڑھے سے بیاہ دیا اس کے ماں باپ نے۔''

''اے ہے' چالیس برس کا مرد بوڑھا کب ہوتا ہے......؟'' اس نے یونہی کہہ دیا تھا مگر دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی کہ اس کے ماں باپ نے اس کے لیے واقعی بڑے چھیل چھبیلے کا انتخاب کیا ہے۔ رفیق کی عمر اس سے کم نہیں تو زیادہ بھی نہیں ہوگی۔ اماں بابا نے نکاح نامے میں اس کی عمر 19 سال لکھوائی تھی۔ مگر وہ جانتی تھی کہ اس کی اصل عمر 22 برس ہے۔ جبکہ رفیق کی عمر بھی نکاح نامے میں 22 سال ہی لکھوائی گئی تھی۔ جب رفیق کا رشتہ آیا تھا تو وزیراں نے بہت ہاتھ پیر مارا تھا کہ مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے......؟''

ہاں ابھی تو تیرے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے ہیں۔'' اس کی ماں نے گال پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا...... ''کمبخت ماری تو بائیس برس کی ہوگئی ہے اور کتنے دنوں تک ہمارے سینے پر مونگ دلتی رہے گی؟''

اس نے مزید بات نہیں بڑھائی تھی۔ یہ سوچ کر کہ اماں بھی بات کا بتنگڑ بنا دیتی ہیں۔ میں نے تو اس لیے اس رشتے سے انکار کیا تھا کہ...... کہ میری نظروں میں کوئی اور تھا...... میں تو یہی سوچ رہی تھی کہ اس کے گھر سے رشتہ

آئے گا...... اس کی ماں آکر میرے لیے اپنی جھولی پھیلا دے گی لیکن ادھر سے کسی کے آنے سے پہلے ادھر سے کوئی ٹپک گیا۔ اس نے سنا' اس کا باپ اس کی ماں سے کہہ رہا تھا۔ مجھے تو بڑا پسند ہے لونڈا گورا چٹا' صحت مند' عمر بھی زیادہ نہیں۔ پچیس سال سے بھی عمر کم ہوگی اور سب سے بڑھ کر برسرروزگار ہے۔ معقول تنخواہ ہے۔ تم کیا کہتی ہو اس کے بارے میں؟''

''اے لو...... میں کیا کہوں گی؟ جب اتنی اچھی باتیں اس میں موجود ہیں اور وہ تم کو پسند بھی ہے...... تو پھر انکار کا کیا سوال ہوتا ہے......؟'' اس پر بابا بولا تھا......

''اس سے بھی ذرا پوچھ لو......''

''اس سے کیا پوچھنا......؟ تم بھی کمال کرتے ہو...... یہ کوئی کراچی شہر ہے......؟ جب تمہارا رشتہ آیا تھا تو میرے اماں بابا نے مجھ سے کب پوچھا تھا......؟

''ہنہ......'' اس نے ماں کی بات سن کر اپنے آپ سے کہا تھا...... ''یہ تو سٹھیا گئی ہیں' اپنی شادی کی مثال دے رہی ہیں' جو آج سے پچیس تیس سال پہلے ہوئی تھی۔''

آج کا دور بے شک ربع صدی پہلے کا دور نہیں اور شہداد کوٹ کراچی کی طرح ترقی یافتہ نہیں' اس لیے وزیراں کو بھی کھل کر مخالفت کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ جبکہ دوسری طرف سے کوئی پیش رفت بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے اس نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا اور جب ایک دن اس نے اپنی دوست کلثوم سے اس رشتے کا ذکر کیا تو اس نے پوچھا۔ ''بھلا وہ ہے کون......؟''

''مجھے زیادہ تو معلوم نہیں اس کے بارے میں وزیراں بولی۔'' پر اتنا پتا ہے...... سائیکلوں کی مرمت کرنے والی دکان میں کام کرتا ہے۔ نام اس کا رفیق ہے۔''

''رفیق......!'' کلثوم نے حیرانگی بھری خوشی کے ساتھ پوچھا۔

''ہاں...... کیا تو اسے جانتی ہے......؟''

کلثوم نے جواب دینے کی بجائے لپک کر اسے دبوچ لیا اور بے اختیار اس کا بوسہ لینے لگی...... ''ارے ارے یہ کیا ہو گیا تجھے......؟''

''تجھ پر...... تیری قسمت پر پیار آگیا...... ارے وہ تو کسی فلمی ہیرو سے کم نہیں...... ہماری گلی ہی میں رہتا ہے...... جانے کتنی لڑکیاں اسے دیکھ کر آہیں بھرتی ہیں۔ افسوس کہ میں شادی شدہ ہوں...... ورنہ میں بھی......''

لمحہ بھر کو اسے بڑا اچھا لگا تھا کلثوم کی زبانی اس کی تعریف سن کر مگر اگلے لمحہ وہ کہہ رہی تھی۔ ''یہ سائیکلوں کی مرمت کا کام تو بڑا گندہ ہے...... ہاتھ پاؤں منہ سب کالا ہو جاتا ہوگا۔''

تھوڑے ہی دنوں کے بعد وزیراں اور رفیق کی شادی ہوگئی تھی۔ جو بھی انہیں دیکھتا یہی کہتا چاند سورج کی جوڑی ہے...... ساری لڑکیاں وزیراں کی قسمت پر رشک کرتی تھیں مگر خود وزیراں اندر سے خوش نہیں تھی...... کیوں......؟ یہ اس نے کسی کو بتایا نہیں تھا...... نہ ہی کبھی اپنی کسی بات سے رفیق کو بھی اس کا پتا چلنے دیا تھا۔ البتہ کچھ دنوں کے بعد اس نے مختار سے دوبارہ ملنا جلنا شروع کر دیا تھا۔ ''وزیراں! شاید تو اپنے فیصلے پر پچھتا رہی ہے......؟''

''کمال کرتا ہے تو بھی۔'' اس نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔'' لڑکی کا بھی کبھی کوئی فیصلہ ہوتا ہے؟ وہ تو ماں باپ کی کھونٹی سے بندھی گائے ہوتی ہے......'' اتنا کہہ کر وہ رکی پھر چند لمحوں کے بعد رکھائی سے بولی'' قصور تو تیرا بھی ہے...... تجھ سے تو اتنا بھی نہیں ہوا کہ کسی کو اپنے رشتے کے لیے ہمارے گھر بھیجتا...... جوان جہان بیٹیوں کو ماں باپ زیادہ دنوں گھر میں بٹھائے نہیں رکھتے۔ رفیق کا رشتہ آگیا۔ اس لیے میرے بڑوں نے ہاں کر دی۔''

شادی سے پہلے بھی ایک دن وہ مختار سے ملی تھی...... دونوں نے خوب ایک دوسرے سے شکوہ شکایت کی تھی۔ اپنے دل کی بھڑاس نکالی تھی۔ پھر وزیراں بولی تھی۔ ''شاید ہمارے مقدر میں جدائی ہی لکھی تھی۔ مگر مختار! یہ شادی

شاید میرے لیے بربادی ہی ثابت ہو۔ جس طرح میں نے اسے مقدر کا لکھا سمجھ کر قبول کرلیا ہے تو بھی مجھے بھولنے کی کوشش کر کہ اب اس کے علاوہ کوئی اور چارہ کار بھی نہیں۔''

اس نے مختار کو تو بھولنے کا مشورہ دیا تھا۔ مگر خود اسے بھلا نہ سکی تھی' مختار اس کا دور پار کا رشتہ دار بھی ہوتا تھا۔ شادی سے پہلے وزیراں کے گھر بھی آنا جانا تھا اور شادی کے بعد بھی کبھار رفیق کے گھر بھی چلا جاتا تھا۔ جبکہ دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر کبھی کبھی وہ تنہائی میں بھی ملاقات کر لیتے تھے...... وقت گزرتا رہا...... وزیراں ایک بچے کی ماں بھی بن گئی...... لیکن وہ رفیق سے خوش نہیں تھی...... بظاہر دونوں کے تعلقات ٹھیک ٹھاک ہی تھے...... رفیق کو بھی کبھی محسوس نہیں ہوا کہ اس کی بیوی وزیراں کسی بات پر اسے پسند نہیں کرتی۔ رفیق کی ماں اور دیگر عزیز رشتے دار بھی یہی سمجھتے تھے کہ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے خوش ہیں۔ وزیراں نے بھی کبھی کسی کو اپنے دل کی پھانس کے بارے میں سوچنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ البتہ اب مختار سے اس کی خفیہ ملاقاتوں کا سلسلہ تھوڑا بڑھ گیا تھا۔ جب بھی اس کا دل زیادہ ہولنے لگتا' وہ اس سے ملنے چلی جاتی۔ ایک دن ایسی ہی ایک ملاقات کے دوران مختار نے اس سے کہا۔ ''وزیراں! تو اس طرح مجھ سے ملنے نہ آیا کر۔''

''کیوں......؟ کیا میں اتنی بری ہوگئی ہوں؟ کیا میں ڈائن اور چڑیل ہوگئی ہوں کہ تجھے مجھ سے ملنے سے ڈر لگنے لگا ہے......؟''

''تجھ سے نہیں' مجھے اپنے آپ سے ڈر لگتا ہے۔''

''اپنے آپ سے ڈر......'' وزیراں اس سے اور قریب ہوگئی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ''کیا تو ذہنی مریض ہوگیا ہے؟ اپنے آپ سے ڈرنے کا کیا مطلب ہے......؟''

''مجھے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہوجاتا ہے...... اپنے جذبات پر قابو رکھنا...... یہ کہتے کہتے اس پر ایک جنونی کیفیت سی طاری ہوگئی تھی اور سچ مچ اپنے آپ کو قابو میں نہیں رکھ سکا تھا...... اور اسے جس بات کا ڈر تھا۔ وہ بات ہوگئی۔ پھر جب وہ ہوش میں آیا تو مارے شرمندگی کے وہ وہاں مزید نہ رک سکا کہ اب وزیراں سے آنکھیں کیسے چار کرے گا۔ دوسری طرف وزیراں پر ایسی پرکیف مستی چھائی ہوئی تھی کہ اپنے آپ کو ہوا میں اڑتی محسوس کر رہی تھی...... بڑی دیر بعد اپنے آپ کو نارمل کرنے میں کامیاب ہوئی۔ مگر اس کا رواں رواں کئی دنوں تک سرشاری کی کیفیت میں جھومتا رہا۔ اب اسے احساس ہورہا تھا کہ اس نے مختار کو کھو کر کتنا نقصان اٹھایا ہے۔ تیس بتیس سال کے مختار اور بائیس تیئس برس کے رفیق میں کتنا نمایاں فرق تھا...... رفیق نے تو ایک دن بھی اسے حقیقی مسرت سے ہمکنار نہیں کیا تھا...... ایسی کیا اس کی آدھی خوشی بھی اسے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ ایک دن تنہائی میں بیٹھ کر وہ بہت روئی اور اپنی قسمت پر ماتم کیا کہ اس شادی نے اسے کتنے بڑے خسارے سے دوچار کردیا۔

کئی دنوں کی کوشش بسیار کے بعد مختار اس سے ملا تو وہ ایک دم اس پر چڑھ دوڑی۔ ''کہاں مر گئے تھے......؟'' وہ بیچارہ سخت شرمندہ تھا' ذرا توقف کے بعد سر جھکائے ہوئے بولا۔

''میں تمہارا مجرم ہوں جو سزا چاہے مجھے دو۔''

وزیراں رونے لگی...... اور وہ ڈر گیا...... اسے چپ کرانا چاہا...... اس کے آنسو پونچھنے کی کوشش کی تو وہ اور زیادہ شدت سے رونے لگی...... ''مختار! تم نے......'' یہ کہتے کہتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔

''مجھے معاف کردو۔'' بہ دقت تمام وہ اتنا ہی کہہ سکا۔

''نہیں معاف کروں گی۔'' وزیراں نے ہذیانی انداز میں کہا۔ ''تم نے مجھے کھو کر اپنے آپ پر ہی نہیں۔ مجھ پر بھی بہت ظلم کیا ہے......'' اور اس کے سینے پر مکے مارتے مارتے اس سے لپٹ گئی...... اور بدستور روتے ہوئے

بولی۔ ''میں ایک نامکمل زندگی...... ناآسودہ زندگی بسر کر رہی ہوں......''

مختار کچھ اتنا بوکھلایا ہوا تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا......

''وزیراں کیا کہہ رہی ہے؟ ان باتوں کا کیا مقصد ہے؟''

مگر وزیراں نے اسے زیادہ غور و فکر کرنے کا موقع نہیں رہا۔ وہ ایک بار پھر جذبات کے دھارے میں بہہ گیا تھا...... لیکن آج وزیراں کے اس جملے نے اسے نادم ہونے کا موقع نہیں دیا تھا۔

''اب یہی تمہاری سزا ہے کہ وقتاً فوقتاً میری محرومیاں دور کرتے رہو...... مجھے سچی خوشیوں سے ہمکنار کرتے رہو۔''

مختار کو بھلا کیا انکار ہوسکتا تھا۔ اس ملاقات کے بعد سارے بندھن کھل گئے تھے جو اگلی ملاقاتوں میں کھلتے ہی چلے گئے۔ دونوں خوش تھے کہ گمشدہ لعل انہیں مل گیا تھا...... ایک دوسرے کو کھونے کے باوجود ایک دوسرے سے مل گئے تھے۔ مگر مختار ڈرتا تھا اور کبھی کبھی وزیراں سے کہتا تھا۔ ''وزیراں! ہم غلط راستے پر چل رہے ہیں۔ کبھی خدانخواستہ ہماری یہ چوری چھپے کی ملاقاتیں پکڑی گئیں تو......؟؟''

وزیراں ہنس پڑی......

''کیوں......؟ ہنستی کیوں ہو......؟ اس میں ہنسی کی کیا بات ہے؟'' مختار نے حیران ہوکر پوچھا۔

''چور کو اگر پکڑے جانے ہی کا خوف ہو تو چوری کیوں کرے؟ وہ کیا گاتا ہے...... پیار کیا تو ڈرنا کیا......؟''

''ہاں...... یہ تو میں بھی جانتا ہوں، جو ڈر گیا وہ مرگیا...... مگر یہ بھی تو سچ ہے کہ سو دن چور کا...... ایک دن......''

''کچھ بھی ہو...... میں تمہیں بھاگنے نہیں دوں گی...... میں دوسری بار تمہیں کھونے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔

''بہرحال ان کی چوری چھپے کی ملاقاتیں جاری رہیں...... وقت گزرتا گیا۔ یہاں تک کہ وزیراں دوسرے بچے کی ماں بن گئی۔ ایک دن رفیق نے اس سے پوچھا۔

''یہ بچہ کس کا ہے؟''

وزیراں ایک دم چونک پڑی۔ ''کیا مطلب......؟''

''مطلب یہ کہ اس کا باپ تمہارا وہ پریمی تو نہیں جس سے تم چوری چوری ملا کرتی ہو۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو......؟ میں کس سے چوری چوری ملتی ہوں؟''

''آخر تم کب تک میری آنکھوں میں دھول جھونکتی رہو گی؟''

''دیکھو جی! بیویاں جب بچے جننے لگتی ہیں تو شوہروں کے لیے دلچسپی کا سبب نہیں رہتیں۔'' وزیراں نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم مجھ پر ایسا اوچھا الزام لگاؤ۔''

وزیراں نے اگلی ملاقات میں مختار کو خبردار کردیا تھا کہ اب وہ اس کے گھر نہ آئے۔ رفیق کو شبہ ہوگیا ہے کہ میں تم سے چھپ چھپ کر ملتی ہوں۔''

''ارے بھئی! میں تمہارے گھر کتنا جاتا ہوں؟ وہ تو اتنے دنوں کے بعد تمہارے نئے بچے کو دیکھنے گیا تھا۔''

''یہی تو غضب ہوگیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ یہ بچہ کس کا ہے؟ اس کا باپ تمہارا وہ پریمی تو نہیں۔''

مختار ہنس دیا۔' ارے ہاں...... یہ تو میں نے بھی نہیں سوچا تھا۔''

وزیراں کی ہنسی اب آہستہ آہستہ رفوچکر ہوگئی تھی۔ اب رفیق سے اس کے تعلقات بڑی تیزی سے بگڑتے جارہے تھے...... وہ بات بات پر بیوی کو جھڑکنے لگا تھا...... وزیراں اگر کسی بات پر ترکی بہ ترکی جواب دے دیتی تو اس کے گال پر تھپڑ مارنے سے بھی گریز نہیں کرتا تھا۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ اپنی ساس سے اس کے بیٹے کی شکایت کرے لیکن یہ سوچ کر اس نے ایسا نہیں کیا کہ اس طرح بات بڑھے گی تو مختار کے ساتھ اس کی خفیہ ملاقاتوں کی بات بھی سامنے آئے گی اور ان ملاقاتوں کے راستے میں

وہ اپنی جانب سے کوئی رکاوٹ پیدا کرنا نہیں چاہتی تھی۔

ایک دو بار اس کی ساس نے بھی اس سے پوچھا۔

''کیا بات ہے آج کل رفیق کا موڈ مزاج خراب نظر آتا ہے؟''

''وہ بات دراصل یہ ہے کہ اب بال بچوں کی وجہ سے گھر کے اخراجات بڑھ گئے ہیں۔ دوسری طرف وہ مالک سے تنخواہ بڑھانے کی بات کرتے ہیں کہ تو وہ اپنا رونا دھونا لے کر بیٹھ جاتا ہے کہتا ہے۔'' یہ دھندہ روز بروز مندا ہوتا جارہا ہے۔ سائیکل چلانے والے بڑی تیزی سے کم ہوتے جارہے ہیں۔ میں تمہارے تنخواہ کیسے بڑھاؤں؟''

''ارے اتنی سی بات پر اس نے ہنسنا بولنا ختم کردیا۔ میں اسے سمجھاؤں گی۔ بیٹا پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔''

''ارے نہیں اماں جی! آپ ان سے اس بات کا تذکرہ مت کیجئے گا۔ انہوں نے مجھے منع کیا تھا کہ اماں سے اس بات کا ذکر نہ کروں۔ وہ پریشان ہوجائیں گی۔ مجھے یہ بات یاد نہیں رہی تھی اس لیے میں نے آپ سے کہہ دی۔ مگر خدا کے لیے آپ ان سے کچھ نہیں کہیے گا۔ ویسے میں اپنے طور پر بھی یہ باتیں انہیں سمجھاتی رہتی ہوں۔''

مگر حقیقتاً وہ اسے سمجھاتی کیا..... اس کی بڑھتی ہوئی ناراضگی نے تو اس کا بولنا، منہ کھولنا ہی بند کردیا تھا۔ اب وہ بھی بولتا کم تھا۔ مگر اس کے ہاتھ پیر بہت بولنے لگے تھے..... بات بے بات وہ بے دھڑک مارنا پیٹنا شروع کردیتا تھا۔ مگر اتنی بات ضرور تھی کہ وہ سب کے سامنے زدوکوب نہیں کرتا تھا۔ وزیراں ڈر کے مارے چیختی چلاتی بھی نہیں تھی..... بس اف آہ کر کے رہ جاتی تھی..... البتہ وہ انتقاماً اس کی امانت میں خیانت کچھ زیادہ ہی کرنے لگی تھی..... اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ رفیق اب اپنے پاس آنے کا بالکل موقع نہیں دیتا تھا۔ وہ اگر اس سے لاگ لپٹ کر باتیں بھی کرتی تو وہ اسے جھڑک دیتا تھا اور نفرت بھرے لہجے میں کہتا تھا..... ''جا اسی کے پاس چلی جا.....''

ایک دن مختار نے اس کے جسم پر نیلے نیلے داغوں کو دیکھ کر کہا۔ ''وزیراں! یہ کیسے نشان ہیں؟''

''تشدد کے۔'' وزیراں روہانسی آواز میں بولی۔ ''رفیق کے مارنے پیٹنے کے نشان ہیں۔''

''تو کیا وہ اب تجھے مارتا پیٹتا بھی ہے؟''

''بہت..... اب تو وہ بات کم کرتا ہے، مارتا زیادہ ہے۔ لیکن اس کی مار سے اس کی وہ باتیں زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہیں جو وہ تمہارے حوالے سے کہتا ہے۔ اسے اب گمان نہیں یقین ہوگیا ہے کہ تم سے میرے تعلقات ہیں۔''

''میں اسی دن کے لیے کہتا تھا کہ.....''

''چھوڑو اس ذکر کو.....'' وزیراں نے مختار علی کی بات کو کاٹ کر کہا۔ ''مجھے تو اب یہ فکر پریشان کرنے لگی ہے کہ کہیں وہ کسی دن موقع پا کر تم پر قاتلانہ حملہ نہ کردے۔''

''ارے نہیں..... وہ ایسا نہیں کرے گا۔''

''کر تو سکتا ہے۔ پھر کیوں نہ ہم ہی اسے راستے سے ہٹادیں؟''

''کیا مطلب.....؟''

''مطلب یہ کہ اگر ہمیں اس سے جان کا خطرہ ہے تو کیوں نہ ہم اس خطرے ہی کو ختم کردیں؟''

''یہ تو ایسی ہی بات ہوئی کہ ہم ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے دوسرا جھوٹ بولیں۔ ہم پہلے ہی۔ ایک جرم کررہے ہیں اب اس پر پردہ ڈالنے کے لیے دوسرا جرم کریں؟''

اس وقت تو یہ بات آئی گئی ہوگئی مگر منہ سے نکلی ہوئی یہ بات ایک دن سچ مچ سامنے آگئی۔ رفیق نے ایک دن دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ شاید وہ ان دونوں کی ٹوہ میں لگا ہوا تھا۔ اس نے جیب سے بڑا سا چاقو نکال کر کھٹاک سے اسے کھول لیا تھا۔

''آج میں تم دونوں کو ایک ساتھ مار کر ساتھ ہی دفن کردوں گا۔'' مگر وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہوسکا۔ وہ ان دونوں کو مارنے کی بجائے ان کے ہاتھوں

مارا گیا۔ یوں بھی وہ ایک تھا اور وہ دو تھے۔ جبکہ مختار اس سے کہیں زیادہ طاقتور تھا۔ اس نے ابھی اس پر قابو ہی پایا تھا کہ وزیراں نے چاقو اس کے سینے میں پیوست کردیا۔

''ارے! یہ تم نے کیا کیا.....؟'' مختار نے گھبرا کر کہا تھا۔

''وہی جو اس موقع پر کرنا چاہیے۔ اسے زندہ چھوڑ کر ہم زندہ رہ سکتے تھے؟''

رفیق کی لاش! ایک دن بعد قبرستان کے باہر جھاڑیوں کے پاس سے ملی تھی۔ وزیراں نے رونے دھونے کا ڈرامہ ٹھیک ٹھاک ادا کیا تھا۔ پولیس نے ضروری کارروائی کے بعد لاش ورثا کے حوالے کردی تھی جبکہ انجانے قاتل یا قاتلوں کی تلاش میں اپنا کام شروع کردیا تھا۔ وزیراں پر کئی دنوں تک غشی کے دورے پڑتے رہے..... وہ جب بھی ہوش میں آتی۔ چیخ چلا کر کہتی۔ ''ہائے میرے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کا کیا ہوگا؟ عدت کی مدت ختم ہونے سے پہلے مختار کی ماں وزیراں کی ماں سے ملی۔

''وزیراں کا رونا دھونا۔ سینہ کوبی کرنا ہم سے دیکھا نہیں جاتا۔ ہماری مانیں تو اس کے اور اس کے بچوں کو کسی سہارے، کسی سائبان کا بندوبست کردیں۔''

''آج کل تو کنواری لڑکیاں گھر بیٹھی رہتی ہیں۔ اس دو بچے کی ماں کو کون قبول کرے گا؟''

''اپنے، اپنوں ہی کے کام آتے ہیں۔ ہم سے آپ لوگوں کا دکھ دیکھا نہیں جاتا۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ اس موقع پر آپ کے کچھ کام آئیں۔ مانا کہ ہم غریب لوگ ہیں مگر ہمارا دل بڑا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ.....''

وزیراں کی ماں نے مختار کی ماں کو آگے کچھ کہنے نہیں دیا۔ اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ بہن! یہ تمہارا ہمارے خاندان پر بہت بڑا احسان ہوگا۔''

جلد ہی سارے معاملات طے ہوگئے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ عدت کے دن پورے ہونے کے بعد کوئی مناسب دن تاریخ دیکھ کر نکاح پڑھوا دیا جائے۔ پھر دونوں طرف تھوڑی بہت اس کی تیاری بھی ہونے لگی۔ عدت کے دن ختم ہوگئے تو ایک مناسب تاریخ کا بھی تعین ہوگیا۔ مگر شادی سے ایک روز پہلے سارا پانسہ پلٹ گیا۔ پولیس نے دونوں ملزموں کو گرفتار کرلیا۔ ''ہمیں اس بات کے شواہد مل گئے ہیں کہ تم دونوں نے مل کر رفیق کو قتل کیا ہے۔''

وزیراں نے زبردست احتجاج کیا۔ ''ارے واہ! میں اپنے ہاتھوں اپنا سہاگ کیوں اجاڑوں گی؟ جب تم لوگوں کو قاتلوں کی تلاش میں ناکامی ہوئی تو ہمیں ہی گرفتار کررہے ہو۔'' لیکن مختار نے گرفتاری کے بعد زیادہ ضد بحث نہیں کی۔ اقبال جرم کرلیا۔

''ہاں..... ہم دونوں ہی نے اسے قتل کیا ہے، مگر اپنی جان بچانے کی کوشش میں ہم نے اس کو قتل کیا۔''

''کھل کر بتاؤ..... جان بچانے کی کوشش سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

''اس نے ہمیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا اور چاقو نکال کر حملہ آور ہوا تھا۔ اس کوشش میں وہ ناکام ہوگیا اور ہمارے ہاتھوں مارا گیا۔''

''تم لوگ سمجھتے ہو، ناکام ہو کر ہم چپکے بیٹھ گئے تھے۔'' پولیس آفیسر نے کہا۔ ''ایسی بات نہیں ہے۔ ہم معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لیے جدوجہد کرتے رہے اور ہمیں آخر کار اس بات کے شواہد مل گئے کہ تم دونوں مرحوم کی آنکھوں میں دھول جھونک کر سماجی، مذہبی اور قانونی جرم کا ارتکاب کررہے تھے۔ شاید تم لوگ موج مستی کے دوران یہ بھول گئے کہ برائی ایک نہ ایک دن ضرور سامنے آجاتی ہے۔ اگر وزیراں اپنے شوہر سے مطمئن نہیں تھی تو اس کا سیدھا طریقہ یہ تھا کہ طلاق لے لیتی۔ غلط طریقے کا استعمال کرکے اور قتل جیسے جرم میں اپنے آپ کو ملوث کرکے تم دونوں نے شادی کا جو خواب دیکھا تھا۔ وہ اب کبھی پورا نہیں ہوگا۔ کیوں کہ تم لوگوں کا مقدر شادی کا بندھن نہیں، پھانسی کا پھندہ ہے۔''

☆☆☆

سراب کے بعد

وہ صورت کا بدصورت تھا مگر اس کا دل بہت خوب صورت تھا۔ میں اسے اپنی کم ظرفی کی وجہ سے نفرت دے رہی تھی۔ مگر وہ مجھے "محبت" دیئے جا رہا تھا۔ شاید اسی لئے کہا گیا ہے کہ صورت نہیں سیرت پیاری ہونی چاہئے۔ تو میرا میاں صورت کا نہیں سیرت کا شہکار تھا۔ اور میں کم ظرف صورت کو دیکھ کر اپنی دنیا اور آخرت دونوں برباد کرنے پر تلی ہوئی تھی لیکن پھر اچانک ہوا کا رخ بدلہ اور میرے نہاں خانوں میں بہار آ گئی۔

ایم الیاس

ایک خود نمائی کی چادر میں لپٹی اپنے حسن کی دیوانی کی داستان جو اپنے حسن کے آگے اپنا گھر برباد کرنے کو چلی تھی لیکن



بعض اوقات انسان کیا سوچتا ہے اور کیا ہوتا ہے؟ میں نے جو سوچا تھا وہ پورا نہیں ہوا تھا۔ اس میں قصور کس کا تھا......؟ میرا یا میری اس سوچ کا جو میں نے سوچا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ جب کوئی لڑکی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتی ہے تو کیا سوچتی ہے؟ کیا خواب دیکھتی ہے لیکن میں نے آغاز جوانی میں جو سوچا اور خواب دیکھا تھا وہ یہ تھا کہ میرا شریک حیات بہت خوبصورت وجیہہ اور دراز قد ہوگا۔

لیکن میرے خواب دغا باز نکلے تھے۔ میں نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ میرے والدین مجھے اپنے ہی ہاتھوں سے ساری زندگی کے لئے دردناک جہنم میں دھکا دے دیں گے۔ یہ کوئی میرے سوتیلے ماں باپ نہ تھے۔ سگے والدین تھے۔

ابو نے میرے لئے جیون ساتھی کا انتخاب کرتے وقت مجھ سے نہ تو میری پسند کے متعلق کچھ پوچھا اور نہ میری کوئی رائے لی اور نہ ہی انہوں نے راشد کے بارے میں بتایا کہ وہ کس شکل وصورت کا ہے۔ آیا وہ میرا جوڑ ہے کہ نہیں......انہوں نے باپ ہونے کی حیثیت سے ایک لمحے کے لئے بھی شاید یہ بات نہیں سوچی کہ میری بیٹی کے لئے وہ کسی بھی لحاظ سے موزوں نہیں ہے اور یہ بے جوڑ ثابت ہوگا۔ ہر باپ کو اپنی بیٹی سے بہت پیار ہوتا ہے اور اس کی خوشی کو مدنظر رکھتے ہیں۔ معلوم نہیں انہوں نے راشد میں ایسی کون سی خوبی دیکھی تھی کہ اسے خود ہی پسند کر آئے اور پھر اس کا رشتہ بھی منظور کر لیا۔ انہوں نے کسی سے رائے مشورہ نہیں لیا اور نہ ہی گھر بلا کر گھر والوں کو دکھایا۔ یہ تعجب خیز اور ناقابل فہم بات تھی۔

ابو شادی بیاہ اور لڑکیوں کے معاملے میں دقیانوسی خیالات کے آدمی تھے۔ اس جدید دور میں انہوں نے لڑکے کی تصویر تک نہیں لی۔ جب کہ آج کل لڑکی اور لڑکے ایک دوسرے کو دکھا کر ان کی پسند یا ناپسند کی رائے لی جاتی ہے لڑکی کے ناپسند کرنے پر بات ختم کر دی جاتی ہے۔

باجی نے امی سے راشد کے بارے میں پوچھا تو پتا چلا کہ وہ لاہور میں ایک کاسمیٹکس کمپنی میں منیجر ہے۔ ان دنوں کمپنی کے کسی کام سے کراچی گیا ہوا ہے وہاں اس کمپنی کا ہیڈ آفس ہے۔ دو ایک مہینے میں وہ واپس لاہور آنے والا ہے۔ اس کے کراچی چکر لگتے رہتے ہیں۔

راشد کی ماں اور بہنیں جو مجھے دیکھنے آئی تھیں وہ صورت شکل کی اچھی نہیں۔ جاذب نظر دکھائی دیتی تھیں۔ باجی نے راشد کے چھوٹے بھائی راحت کو دیکھا تھا۔ وہ نہ صرف خوب صورت اور وجیہہ تھا بلکہ دراز قد بھی تھا۔ اسی سے یہ اندازہ کیا تھا کہ راشد بھی سرخ وسپید رنگت کا خوب صورت اور اسمارٹ ہوگا۔ شادی سے صرف ایک روز پہلے میری دو ایک سہیلیوں اور رشتہ دار بہنوں نے مجھے بتایا کہ ......راشد کسی بھی لحاظ سے میرا جوڑ نہیں ہے......اگر اس میں کوئی کشش ہے تو وہ یہ کہ اس کی ملازمت بہت اچھی ہے اور مالی پوزیشن بھی مضبوط ہے۔ مال دار شخص ہے۔

جب میں نے راشد کے بارے میں سوچا تو کوئی بجلی سی آگری تھی مجھ پر...... میں نے جو خوابوں کے نہ جانے کتنے خوب صورت محل بنائے تھے وہ ایک ایک کر کے مسمار ہو گئے۔ ایک لڑکی کو شادی کی کتنی خوشی ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ مرد نہیں کر سکتا صرف وہی لڑکی کر سکتی ہے جس کی شادی ہو رہی ہے۔ شادی کی ساری خوشی ملیا میٹ ہو کر رہ گئی۔ اب چوں کہ شادی میں ایک دن باقی رہ گیا تھا اس لئے اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر دس پندرہ دن قبل راشد کے بارے میں مجھے پتا چل جاتا تو میں کسی نہ کسی صورت سے اس شادی کو رکوانے کی کوشش کرتی۔ میں اس سے شادی کرنے کے لئے کسی قیمت پر تیار نہ ہوتی۔ میں آخری وقت طوفان یا کوئی ہنگامہ کھڑا کرتی تو کوئی ساتھ نہ دیتا۔

میں بہت حسین اور بے انتہا پرکشش تھی۔ مجھ میں غیر معمولی دل کشی اور جاذبیت تھی۔ مجھ پر جوانی ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ مجھ میں جو عمدہ جامہ زیبی کا ذوق تھا وہ نفیس اور باوقار تھا۔ میرے جسم کے نشیب و فراز مرد کیا لڑکیوں اور عورتوں کو بھی متوجہ کر لیتے تھے۔ خاندان میں کوئی لڑکی میرے مقابلے کی بھی نہ تھی۔ میری دودھیا رنگت تھی جو مردوں کی کمزوری تھی۔ مائیں اور بہنیں مجھ جیسی چاندی بہو کی تلاش میں نکلتی ہیں اور لڑکے خوابوں میں دیکھتے ہیں۔ مجھے اپنے حسن و جمال اور شباب پر بڑا ناز تھا۔ کیوں نہ ہوتا اور کیوں نہ کرتی......؟ جب کہ معمولی اور سانولے رنگ کی لڑکیاں اتراتی پھرتی ہیں تو کیا مجھے اس بات کا حق نہیں تھا کہ میں اپنی خوبصورتی پر اتراتی پھروں' ناز کروں۔ میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی بھی تھی۔

میرا غم زدہ چہرہ اور مجھے روتا ہوا دیکھ کر میرے گھر والے یہی کہتے رہے کہ میں ان سے جدائی کے غم میں ہلکان ہو رہی ہوں۔ شادی والے روز ایک مردے کو سجا کر دلہن بنا دیا گیا۔ میں ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہو کر بھی کس قدر بے بس اور مجبور سی ہو گئی تھی۔

سہاگ کی پہلی رات میں نے راشد کو دیکھا تو دل پر ایک چابک سی لگی۔ میری بہنوں اور سہیلیوں نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ ایک بدصورت شخص تھا جو شوہر کے روپ میں ملا۔ ایک ایسا بے کشش مرد جسے ایک بدصورت عورت بھی پسند نہ کرے۔ میری سہیلیوں اور خاندان کی لڑکیوں میں جو شادی شدہ تھیں ان میں کسی کا شوہر ایسا بدصورت نہ ہوگا۔ وہ دراز قد اور صحت مند تو تھا لیکن پکے رنگ کا تھا۔ چہرے پر چیچک کے ہلکے ہلکے سے داغ تھے۔ شادی میں شریک خاندان کی لڑکیوں کو یقین نہ آیا تھا کہ میں ایک بدصورت شخص کے پلے باندھ دی گئی ہوں۔ بڑی چہ میگوئیاں ہوئی تھیں۔ کچھ عورتیں تو ابوامی سے کہے بغیر نہ رہ سکی تھیں کہ عرفانہ کو کس بات کی سزا دی گئی؟

سہاگ رات ایک لڑکی کے لئے اس کی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہوتا ہے۔ یہ حسین اور خواب ناک اور سحر زدہ رات جو ساری زندگی پر بھاری ہوتی ہے۔ اس رات جو خوشی ملتی ہے وہ ہر وقت یاد آتی اور محسوس ہوتی ہے۔ ایک ایک لمحہ یادگار اور ناقابل فراموش بن جاتا ہے۔ ہر عورت کی طرح میں نے بھی یہ خواب دیکھے تھے اور میرے دل میں بھی بڑے ارمان تھے۔ مگر اس رات ہوا کیا......؟ میرے آبگینہ دل پر ایک پتھر تڑ سے آ کر لگا تھا۔ میرے خواب کرچیوں کی طرح میرے دل میں چبھ گئے۔ ان میں سے لہو آنے لگا تو یہ لہو مجھے آپ پینا پڑا۔

اس رات میں نے اپنے آپ کو ایک سرد لاش کی طرح اس کے حوالے کر دیا اور جبر و زیادتی سے برداشت کیا جو میرا شوہر......میرا مجازی خدا بن گیا تھا۔ میرے دل نے نہ تو کوئی خوشی محسوس کی اور نہ ہی وہ کیف و سرور محسوس ہوا جو ایک نوجوان لڑکی پہلی بار کسی مرد کی آغوش میں سہاگ کی پہلی رات پاتی ہے۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں کسی گدھ کا نشانہ بن رہی ہوں۔ میں اس سے جلد سے جلد نجات پانے کے لئے دل میں دعائیں مانگ رہی تھی۔ میری ساری زندگی میں کبھی اذیت ناک لمحے نہیں آئے تھے کہتے ہیں کہ سولی پر بھی نیند آ جاتی ہے۔ مگر مجھے ایک پل کے لئے بھی نیند نہیں آئی۔ رات کے آخری پہر تک میں دو تین طوفانوں کی زد میں رہی تھی۔

وہ ایک فاتح بن کر گہری نیند سو گیا۔ طوفانوں نے مجھے تاخت و تاراج کر دیا تھا۔ میری حالت ایک مفتوحہ علاقے کی سی ہو کر رہ گئی تھی۔ تھکن سے پور پور......جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ اس نے کس بے رحمی سے مجھے فتح کیا تھا۔ تسخیر کیا تھا۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے اس کے چہرے کو دیکھا۔ بڑے غور سے اور قریب سے......میرے دل میں نفرت کی شدید لہر اٹھی...... میں سوچنے لگی......کیا میں اپنے دل میں نفرت کا زہر لیے اس کے ساتھ زندگی گزار سکوں گی......؟ یہ میرے جسم کا مالک بن کر کھیلتا رہے گا۔

صبح سنگھار میز کے بڑے آئینے کے سامنے کھڑی بال سنوارتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ دنیا میں ... میں ایک ہی حسین عورت نہیں ہوں جس کی شادی بدصورت مرد سے ہوئی ہو۔ ایسی بیشمار شادیاں ہوئی ہیں اور ہوتی رہتی ہیں۔ میں کئی ایسی کئی حسین لڑکیوں اور بے پناہ خوب صورت عورتوں سے واقف تھی اور ان سے میری راہ و رسم بھی تھی جن کے شوہر بدصورت اور بے کشش بھی تھے۔ مگر ... ان کے ساتھ ایک پرمسرت ازدواجی زندگی گزار رہی ہیں۔ ان کے خوش رہنے کی وجہ کبھی بھی میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ میں یہ بات سمجھنے سے قاصر تھی کہ ان عورتوں نے اپنے شوہروں کو کس طرح اور کیسے قبول کر لیا تھا۔ ان کی آغوش میں کیا وہ متنفر نہیں ہوتی ہوں گی؟ ان کے بوسے کراہت انگیز نہیں بن جاتے ہوں گے......؟ جب مرد انہیں اپنے جذبات کا نشانہ بناتے ہوں گے تو کیا انہیں ایسا محسوس نہیں ہوتا ہوگا کہ کوئی بھیڑیا صفت مرد ان کی جبر و زیادتی سے بے حرمتی کر رہا ہو......؟ ان کی باتوں سے ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو بڑے وارفتگی' گرم جوشی اور خود سپردگی سے شوہروں کے حوالے کر دیتی ہیں' فیاض عورت بن جاتی ہیں۔

پھر ایک خیال اور بھی آتا تھا کہ...... شاید وہ اس سے مجبور ہیں کہ وہ ان کے مجازی خدا ہیں۔ ان طاقت ور مردوں کے مقابلے میں وہ کم زور اور نازک صنف تھیں۔ ان کی غلام تھیں مگر مرد ان کی روح کے مالک تو نہیں بن سکتے تھے۔ میں نے غیر محسوس انداز سے یہ بات کی تھی کہ کیا وہ اپنے شوہروں کی آغوش میں دل پر پتھر نہیں رکھ لیتی ہیں؟ ان کا جواب تھا نہیں۔ وہ بغیر کسی تذبذب اور تامل اور بے رغبتی کے شوہر کی آغوش میں۔ قرب میں سرشاری اور بڑی محبت محسوس کرتی ہیں۔

میری دور کی ایک رشتہ دار بہن جو میری ہم جماعت رہ چکی تھی اور بہت حسین و جمیل اور طرح دار بھی تھی۔ اس کا شوہر موٹا' بھدا اور گنجا اور پستہ قد تھا۔ ایک روز میں نے اس سے مذاق میں کہا کہ...... نشاط' تمہارے والدین نے اس گینڈے سے تمہاری شادی کر کے اچھا نہیں کیا۔ تمہارا اس سے کوئی جوڑ نہیں۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو خودکشی کر چکی ہوتی۔ ایسے شخص کی آغوش کا تصور بڑا ہی کراہت انگیز ہے۔ تم دو برس سے اس کے ساتھ جو ازدواجی زندگی گزار رہی ہو وہ بڑی اذیت ناک ہوگی......وہ میرے یہ الفاظ سن کر بہت برہم ہوئی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ......وہ جیسا بھی ہے جو بھی ہے اس کا شوہر ہے اور اس کی محبت' زندگی اور عزت ہے۔ وہ اس کا

سرتاج ہے۔ اگر میں نے آئندہ اس کے شوہر کو برا کہا اور اس کی تضحیک کی تو اس سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ میں سمجھ نہ سکی تھی کہ یہ حسین اور جوان عورتیں جن میں کوئی خامی اور عیب نہیں ہے کس طرح سے ایسے شوہروں ہنسی خوشی سے زندگی گزارتی ہیں۔

راشد کو میں نے سارا سارا دن بہت خوش اور سرشار دیکھا تو میں اندر ہی اندر سلگتی رہی تھی۔ وہ مجھے فاتحانہ نظروں سے دیکھتا اور مسکراتا رہتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کی نگاہیں کہہ رہی ہوں کہ آج میں نے ایک نہایت حسین عورت کو زیر کرلیا۔ کلی سے پھول بنادیا۔ پھول کو مسل دیا۔ تمہاری زندگی میں آنے والا پہلا مرد جس نے تمہارا کنوارا پن پالیا...... میرے جی میں کئی بار آیا کہ اس کا منہ نوچ لوں۔ اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے نہ صرف اس کا چہرہ لہولہان کردوں بلکہ اس کی چمکتی فاتحانہ آنکھیں پھوڑ دوں۔ ظاہر ہے ایسا کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ میں اس کی طرف دیکھتی بھی نہیں تھی۔ میں سوچتی رہ گئی کہ اس سے کہہ دوں کہ رات تو میں ایک سرد لاش کی مانند تمہاری آغوش میں تھی۔ کیا تم نے میری سردمہری اور بے رغبتی محسوس نہیں کی۔ میں آنکھیں بند کیے رہی۔ تمہیں ایک پل کے لئے طوفانوں کی زد میں نہیں دیکھا۔ میری حالت اس کشتی کی سی تھی جو بے رحم طوفانی لہروں پر بے بس اور مجبور تھی۔ تم نے ایک کمزور اور نازک عورت کو فتح کر کے کیا مردانگی دکھائی؟ ایسی باتیں کہی نہیں جاتیں۔ کہہ دیتی تو بے شرم بے حیا اور بدچلن کا خطاب مل جاتا اور جانے کیا زہر اور تلخی گھل جاتی۔ چوں کہ ایک بدصورت شخص کو ایک حسین اور نوجوان دوشیزہ مل گئی تھی اس لئے وہ خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ اس سے میری شادی ہوئی تھی...... کیا شادی ہونے سے دو دلوں کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے......؟ ایک مرد ایک عورت سے جسمانی تعلق کر کے یہ کیوں سمجھتا ہے کہ بیوی اس کی کنیز بن گئی۔ اسے ایک کھلونا مل گیا۔ اب وہ اس کھلونے سے جب بھی جی چاہے کھیل سکتا ہے۔ کھیلتا رہے گا۔

وہ ایک ضروری کام سے دس پندرہ دن کے بعد ایک مہینے کے لئے کراچی جانے والا تھا۔ میں اس کے روز روز کے والہانہ پن اور اس کی قربت کی آگ سے تنگ آگئی تھی۔ جب بھی جی چاہا دبوچ لیا۔ من مانی کی۔ میں جیسے عورت نہیں تھی۔ بیوی نہیں تھی کھلونا تھی...... کوئی رات ایسی نہ ہوتی تھی۔ جو میں اس کے جذبات کی بھینٹ نہ چڑھی ہوں۔ میں چاہتی تھی کہ دس پندرہ دن تک اسے قریب نہ آنے دوں۔ بیس دنوں بعد ایک ہفتے ناغہ رہا لیکن اس کی من مانیاں اور ہم آغوشی سے محفوظ نہ رہ سکی۔ میں یہ چاہتی تھی کہ وہ کراچی جائے تو دل میں حسرت لے کر جائے۔ جدائی سے تڑپتا رہے اور فراق کی آگ اسے جلاتی رہے۔ اس کی یہ حالت میرے لئے خوشی و مسرت کا باعث بنتی۔ میں اس کی اذیت اور کرب کا تماشا دیکھنا چاہتی تھی تاکہ میں لطف اندوز ہوسکوں۔

میں نے سوچا کہ ایسا کس طرح سے ہوسکتا ہے۔ جب میں نے بہت سوچا تو مجھے اپنی دو شادی شدہ سہیلیوں کا خیال آیا۔ وہ مجھ سے بہت قریب تھیں۔ ان سے میری اور مجھ سے ان کی کوئی بات چھپی نہ رہ سکی۔ وہ دونوں مجھے اپنی اپنی سہاگ راتوں کی باتیں بتاتی رہی تھیں۔ ایک ایک بات...... یہ ایسی باتیں ہوتی ہیں جو ہر کسی سہیلی کو نہیں بتائی جاتی ہیں۔ میں نے ان دونوں کو اعتماد میں لے کر صلاح و مشورے کیے ان میں ایک سہیلی کی شادی کو تین برس اور دوسری کو دو ڈھائی برس ہو رہے تھے۔ ہم تینوں ساحل سمندر سیر کرنے گئی تھیں۔ اس جگہ ہم تینوں کے سوا کوئی اور نہیں تھا اور آپس میں بڑی کھل کر باتیں ہوئی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے سہاگ کی پہلی رات سے لے کر بیس دنوں کی ایک ایک بات پوچھی تھی۔ ہفتہ بھر کے ناغہ میں بھی راشد جو من مانیاں کرتا تھا اس کے بارے میں بھی...... میں راشد سے یوں بھی جلی بیٹھی تھی۔ سخت ناراض تھی۔ اس لئے ان سے کوئی ایک بات... نہیں چھپائی

تھی۔ پھر انہوں نے مجھے ایسی تدبیر بتائی کہ میں خوشی سے اچھل پڑی۔ میں اس تدبیر پر عمل کر کے نجات پاسکتی تھی۔ راشد دیکھتا رہ جاتا۔

میں خرابی طبیعت کا بہانہ کر کے امی کے پاس آگئی۔ پندرہ دن بڑے سکون و آرام سے گزرے میں اس کی چیرہ دستیوں سے محفوظ اور راتوں کی ہم آغوشی سے محفوظ رہی تھی۔ جب میں امی کے ہاں آئی تھی وہ تین دن بعد مجھے دیکھنے اور ملنے آیا تھا اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر خوب من مانی کر کے گیا۔ اس دن کے بعد وہ نہیں آیا۔ پندرہ دن اس کے لئے پندرہ برس سے کم نہ تھے۔ کیوں کہ میرے قرب کی معیت میں وہ ایک ایک لمحہ جنونی انداز میں گزار رہا تھا۔ میں سوچتی تھی کہ ایک لڑکی کا حسین اور پرشباب ہونا بھی کس قدر عذاب ہے۔ یہ مرد گدھ بن جاتے ہیں...... یہ پندرہ دن میرے لئے پندرہ لمحوں کی طرح ہیں جو پر لگا کر اڑ جائیں گے۔ مگر پھر بھی غنیمت تھے۔ میں نے سوچ کر دل کو دلاسا دیا کہ یہ پندرہ دن گزر جائیں گے۔ اس کے بعد میں اپنی سہیلیوں سے کوئی اور تدبیر پوچھ لوں گی۔

میں تصور میں اسے انگاروں پر لوٹتا ہوا دیکھتی تھی۔ وہ مجھے ٹیلی فون کرتا اور ایک بار جو ملنے آیا تھا تو کہہ رہا تھا کہ راتیں بے کیف گزرتی ہیں کیا تمہاری تین راتیں بے کیف گزرتی ہیں...... میں صرف سر ہلا دیتی۔ یہ سچ تھا۔ کیوں کہ وہ رات دو تین بجے تک مجھے سونے نہیں دیتا تھا مجھے اپنے بازوؤں کی گرفت میں نیند آنے تک لیے رہتا تھا۔ جب وہ سو جاتا تو میں غیر محسوس انداز سے اس کے بازوؤں میں سے نکل آتی۔

کراچی روانگی سے ایک روز پہلے اس نے ٹیلی فون پر مجھ سے کہا کہ...... آج شام میں اس کے ہاں آجاؤں۔ اس لئے کہ اس کی واپسی مہینے ڈیڑھ مہینے کے بعد ہوگی۔ میں نے خرابی طبیعت کا حیلہ بہانہ کر کے صاف کہہ دیا۔ میں جانتی تھی کہ اگر میں جاؤں تو وہ پندرہ دن کی کسر ایک دن میں نکال لے گا اور مجھے کسی وحشی درندے کی طرح بھنبھوڑ کر رکھ دے گا۔ میں نے ٹیلی فون پر جو اس سے بات کی اس سے ایسا محسوس ہوا تھا کہ میری اس بات سے اس کے دل کو تکلیف پہنچی ہے اور آج کی رات اس کے لئے کسی قیامت سے کم نہ ہوگی۔

صبح ہی سے موسم بڑا سہانا ہوگیا تھا۔ اگر راشد خوب صورت ہوتا تو میں یہ پندرہ دن اور آج کا دن میکے میں نہیں گزارتی۔ اللہ نے اسے وجاہت دی تھی اور ایسا دراز قد دیا تھا جس کی تمنا عورتیں کرتی ہیں۔ خوب صورتی دے دیتا تو وہ لاکھوں میں ایک ہوتا۔ صبح چار بجے بڑے زور کا طوفان آیا تھا۔ اس وقت سے زوروں کی بارش شروع ہوگئی تھی۔ بادل دھمک اور بجلیاں کوند رہی تھیں۔ بارش تھی کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ صرف شام کو تھوڑی دیر کے لئے رکی تھی۔ پھر بارش کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ موسم کا حسن نکھرنے لگا۔ اس بارش نے خوابیدہ سپنوں کو جیسے جگا دیا تھا۔ دل میں پیار کی شدت بھر گئی تھی۔ راشد خوبرو ہوتا تو بارش کی پروا کیے بغیر سسرال چلی جاتی یا پھر اسے اپنے ہاں بلالیتی۔ ایسے بدصورت مرد کے ساتھ موسم کا لطف لینے سے بہتر تھا کہ اکیلا رہا جائے۔ اس لئے میں اکیلی ہی کمرے میں سوگئی۔ سوتے وقت خوش تھی کہ وہ یہ رات جاگ کر اور فراق کی آگ میں جل کر گزارے گا۔

میں نے نیند کی حالت میں محسوس کیا کہ کوئی مجھ سے من مانی کر رہا ہے۔ میری آنکھ کھلی تو میں نے راشد کو دیکھا۔ میں اس کے بازوؤں میں پوری طرح محصور تھی۔ گو کہ وہ میرا شوہر تھا لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں کسی کالے ناگ کی دسترس میں ہوں۔ میری کوئی بات اس نے نہیں سنی، کوئی حیلہ بہانہ نہ چلنے دیا۔ تیز و تند موجوں کے آگے ایک ناؤ کی حقیقت ہی کیا ہوتی ہے۔ مجھے اس کی فتح مندی پر اتنا غصہ نہیں آیا جتنا اپنے گھر والوں پر کہ انہوں نے مجھے اس کے اچانک اور غیر متوقع آنے پر جگایا کیوں نہیں۔ اگر وہ مجھے جگا دیتے تو اس کی نوبت نہیں آتی۔ میں کوئی نہ

کوئی بہانہ کرکے اسے رکنے نہ دیتی اور اسے واپس اس کے گھر چلتا کردیتی۔ وہ بڑا خوش تھا کہ کراچی جانے سے پہلے اسے موقع مل گیا۔ میں جلد صبح ہونے کی دعائیں مانگتی رہی۔

وہ کوئی ڈیڑھ ماہ تک کراچی میں رہا تھا۔ میرے لئے یہ دن بڑے پرسکون تھے۔ رات جیسے گھوڑے بیچ کر سوتی تھی۔ اس کا دو دن میں ٹیلی فون ضرور آتا تھا۔ وہ مجھے بتاتا تھا کہ کس طرح اس کے رات دن بے کیف گزر رہے ہیں اور ایک ایک دن صدی کی طرح اس پر بھاری ہو رہا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں کراچی آجاؤں۔ کمپنی نے اسے ایک بہت ہی اچھے ہوٹل کے کمرے میں رہائش دی ہوئی ہے۔ وہ شام پانچ بجے فارغ ہوجاتا ہے۔ کراچی شہر میں بڑا حسن رنگینیاں اور ہوٹل ہیں۔ ساحل سمندر بھی ہے کمپنی نے ایک ساحل سمندر پر ہٹ لے رکھا ہے ہم کسی دن رات کے وقت وہاں جا کر تفریح کرسکتے ہیں۔ چاندنی راتوں میں نہائیں گے، تیریں گے، شوخیاں اور مستیاں کریں گے۔ میں تمہارے لئے پیراکی کا ایسا لباس دوں گا جو یورپ اور امریکہ کی عورتیں ساحل سمندر پر پہنتی ہیں۔ اس لباس میں تمہارے حسن و شباب کی کرشمہ سازیاں واضح ہوجائیں گی۔ وہاں کی رات سہاگ کی پہلی رات کی طرح ہوگی۔ اس کی یہ باتیں بڑی سنسنی اور دل کو برمادینے والی تھیں۔ جذبات کو تند کردیتی تھیں۔ میرے دل کے کسی کونے میں بھی یہ ارمان چھپے ہوئے تھے۔ میں بھی زندگی کی ان رنگینیوں سے محظوظ ہوتا اور لطف اٹھانا چاہتی تھی۔ اس کی بدصورتی آڑے آجاتی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ کراچی جانے سے صاف انکار کردیا تھا۔ علاج کا بہانہ کرلیا تھا۔ دوسری طرف میرا دل کراچی جانے کو بہت چاہ رہا تھا۔ لیکن مجھے اپنے دل پر پتھر رکھنا پڑا تھا۔ میں ریسیور ہاتھ میں تھامے اس کی باتیں خاموشی سے سنتی، ہوں، ہاں اور نا کرتی رہتی تھی۔

یہ دن کسی سہانے خواب کی طرح بیت گئے۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی ناپسندیدہ شخص کے دست برد سے محفوظ رہی ہوں۔ وہ کراچی سے آیا تو آندھی کی طرح...... میں اپنے آپ کو طوفان سے کیسے اور کب تک بچا سکتی تھی۔ بکرے کی ماں کب تک خیر منا سکتی تھی میری مثل ایک تنکے کی سی تھی جو طوفان میں بے بس ہوکر رہ جاتا ہے۔ میں سر دلاش بنی رہی تھی۔ اور کیا کرتی۔

اس نے ایک ہفتے کے بعد ایک اچھا سا مکان ماڈل ٹاؤن میں کرایہ پر لے لیا۔ میری دیور کی شادی ہونے والی تھی یہ مکان چھوڑنا پڑ رہا تھا۔ اس میں اتنی گنجائش نہ تھی اور پھر کمپنی اس کا کرایہ دے رہی تھی۔ اندھے کو کیا چاہئے دو آنکھیں...... اس نئے مکان میں اسے اور آزادی مل گئی تھی۔ یہاں ہم دونوں کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ تنہائی اور اس کی قربت میرے لئے سوہان روح تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہم اس مکان میں ہنی مون منانے آئے ہوں لیکن یہ ہنی مون بھی نہ تھا۔ ایسا لگتا تھا وہ مجھے اغوا کرکے لایا ہو اور تنہائی کے ایک ایک لمحے سے فائدہ اٹھا لے کہیں میں اس کے ہاتھ سے نہ نکل جاؤں۔

راشد کو کمپنی نے گاڑی بھی دے رکھی تھی۔ وہ شام کے وقت مجھے اپنے ساتھ گھمانے ...... پارٹیوں میں اور دوستوں کے ہاں لے جانا چاہتا تھا۔ میں اس کے ساتھ جانے سے احتراز کرتی تھی۔ اس کے ساتھ جانا مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ بدصورت شوہر کے ساتھ کہیں جاتے ہوئے مجھے سبکی اور شرمساری کا احساس ہوتا تھا یہ میرے حسن و حیاں کی توہین تھی۔ میں ندامت کے احساس تلے ایسی دب گئی تھی کہ کسی سہیلی کو بھی اپنے گھر نہیں بلاتی تھی۔ شادی ہوئے تین ماہ کا عرصہ ہو رہا تھا۔ ابھی تک میرا اندر ہی اندر کڑھنا بند نہیں ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ باجی سے کہوں کہ میرا شوہر اور اس کی حرکات و سکنات اور جذباتیت اذیت ناک ہوتی جارہی ہے۔ آخر یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی دن میں نفسیاتی مریض بن جاؤں......؟

دوسری طرف میں نے راشد کو جیسے اپنا زرخرید غلام بنا لیا۔ وہ میرے اشاروں پر چلنے اور ناچنے لگا تھا۔ وہ کٹھ پتلی بن جائے گا مجھے اس کی امید نہیں تھی۔ میرے حسن جہاں سوز نے اسے کسی پتھر کی طرح پگھلا کر رکھ دیا تھا۔ اس لئے کہ میں اس کی کمزوری بن گئی تھی۔ آخر میں کیوں نہ ہوتی، میں حسن اور کشش کے خزانوں سے مالا مال جو تھی۔ جب وہ چہکنے اور بہکنے کے موڈ میں آتا تھا اور کسی ہیرو کی طرح جذباتی ہوکر طرح طرح کی حرکتیں کرنے لگتا تو میں اس سے بری طرح بے رخی برتتی یا پھر بری طرح جھڑک دیتی تو وہ سیدھی طرح راستے پر آجاتا تھا...... اسے بہت ترسانے اور مچلانے کے بعد پندرہ بیس دن میں صرف چند لمحے دیتی تھی۔

میں اس کے ساتھ اس بے اعتنائی اور بے رغبتی اور سرد مہری کا سلوک کرتی تھی کہ وہ مجھے طلاق دینے پر مجبور ہو جائے۔ اسے طلاق دینے پر اسی طرح آمادہ کیا جاسکتا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی اور صورت نہیں تھی۔ اس سے علیحدگی میری سب سے بڑی خواہش بن گئی تھی۔ طلاق کی صورت میں میرے لئے دوسری شادی مشکل نہ تھی۔ اس لئے کہ میں نوجوان اور حسین بھی تھی۔ میرا جوان جسم اور گداز تھا بہت سے خاندان میں اور ملنے اور جاننے والوں میں حسن پرست موجود تھے جو مجھے اپنا سکتے تھے۔

میں نے اس سے نجات پانے کے لئے شاہ خرچی شروع کردی تھی۔ کبھی اس نے اس فضول خرچی پر کبھی اف نہیں کی مگر میں محسوس کرتی تھی کہ اسے میری شاہ خرچیاں قطعی پسند نہیں ہیں۔ وہ میری ناراضی کے ڈر سے چپ رہتا ہے۔ میں رات کے کھانے کے بعد خوب سنگھار کرکے شب خوابی کے لباس میں جو بے حجاب کئے رہتا تھا نشست گاہ میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھتی تھی۔ کیبل پر ایک سو دس چینلز دکھائے جاتے تھے۔ وہ بیڈ روم میں میرے انتظار میں بستر پر دیر تک کروٹیں بدلتا رہتا یا پھر میرے پاس آکر تھوڑی دیر تک بیٹھ جاتا۔ اسے ٹی وی یا ہندوستانی اور دیگر پروگراموں کے چینلز سے کوئی بھی دل چسپی نہ تھی۔ اس کی دل چسپی کا محور صرف میری ذات تھی۔ مجھ میں جو ہیجان خیز کشش تھی وہ کسی اور میں کہاں ہوسکتی تھی۔ وہ میری بے اعتنائی سے دل شکستہ سے بستر پر چلا جاتا۔ ایک مرتبہ وہ ایسا بے قابو ہوا کہ مجھے گود میں اٹھا کرلے گیا اور میرا شب خوابی کا لباس پھاڑ دیا۔ میں اس کے ہاتھوں کھلونا بن گئی۔ میں نے بڑی مزاحمت کی اور دفاع کیا لیکن میں ناکام رہی۔ جب میں نے اس کی خوب خبر لی اور کہا کہ میں میکے جارہی ہوں تو اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑے اور وعدہ کیا کہ اب وہ ایسی حرکت نہیں کرے گا تو میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ پھر اس نے ایسی حرکت نہیں کی۔

وہ کوئی بچہ نہیں تھا۔ اسے اس بات کا اندازہ تھا کہ جب وہ گہری نیند میں غرق ہوجاتا تھا تب میں ٹی وی بند کرکے بستر پر سونے کے لئے دراز ہوجاتی ہوں۔ وہ تیس برس کا پورا مرد تھا۔ اپنے دفتر میں وہ منیجر کے عہدے پر فائز تھا۔ اس نے میری بے اعتنائی اور سرد مہری سے محسوس کرلیا تھا کہ میری حرکات و سکنات اور باتوں میں نفرت کی بو آگئی ہے میں اس سے نفرت کرنے لگی ہوں۔ شادی کو چھ ماہ کا عرصہ ہوچکا تھا اس نے مجھ میں محبت کے جذبے کی کوئی گرمی محسوس نہیں کی تھی۔ اس کا خیال رکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس سے بیگانگی سے پیش آتی تھی۔ جب اسے ان باتوں کا احساس ہوا تھا وہ افسردہ اور کھویا سا رہنے لگا تھا۔

میری ایک دیرینہ شادی شدہ سہیلی نیلوفر نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا تم اپنے شوہر سے خوش ہو؟ جب میں نے اسے ساری باتیں بتائیں تو اس نے پہلے تو مجھے بری طرح ڈانٹا اور پھر مجھے مشورہ دیا کہ اپنے شوہر کے ساتھ اس قسم کا سلوک نہ کروں اس لئے کہ وہ کسی وقت بھی بھٹک سکتا ہے۔ وہ خوب صورت نہ ہوا تو کیا ہوا......؟ اس کے پاس گاڑی ہے اس کی ایک حیثیت ہے۔ اور اس کی جیب بھاری ہے۔ اس کے دفتر میں بہت ساری جوان لڑکیاں

اور حسین عورتیں بھی کام کرتی ہیں۔ میری ایک کزن بھی اس دفتر میں جاب کرتی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ کچھ لڑکیاں ایسی ہیں جو شکار کی تلاش میں رہتی ہیں۔ اگر اس نے ان لڑکیوں میں دل لگالیا تو تم کیا کروگی......؟ اگر اس نے تمہیں طلاق دے دی تو تمہاری ذات اور خاندان پر بہت بڑا دھبا لگ جائے گا۔

میں نے اس کی باتوں کو ہنسی اور مذاق میں اڑادیا اس لئے کہ میں دل سے چاہتی تھی کہ وہ مجھے طلاق دے دے۔ اگر وہ دفتر کی کسی لڑکی یا عورت میں دل چسپی لیتا تو میری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا......اور پھر میں یہ بات جانتی تھی کہ کوئی حسین اور جوان لڑکی راشد میں بھولے سے دل چسپی نہیں لے گی۔ کیوں کہ وہ بدصورت شخص ہے۔

میرے رویے نے اسے دل گرفتہ بنادیا۔ اس نے مجھے نہ صرف اپنے ساتھ باہر لے جانا بند کردیا بلکہ گھر میں بھی دیر سے آنا شروع کردیا تھا۔ ہم ایک گھر ایک چھت تلے اجنبیوں کی طرح رہنے لگے تھے۔ رات کے کھانے کے بعد میں ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتی۔ فلمیں دیکھنے لگتی۔ وہ خواب گاہ میں لیٹا کوئی ناول پڑھتا رہتا۔ پھر میرا انتظار کیے بغیر اس طرح سو جاتا جیسے اسے میری ضرورت اور طلب نہ ہو۔ اس نے مجھے چھونا اور زیادہ بات کرنا بند کردیا تھا۔ ہمارے درمیان فاصلے بڑھتے گئے۔

ایک روز میں سہ پہر کے وقت امی کے ہاں جانے کے لئے تیار ہورہی تھی۔ چوں کہ راشد کے رات دس بجے سے پہلے آنے کی امید نہیں تھی اس لئے میں وقت گزاری کے لئے جارہی تھی۔ میں کبھی شام کے وقت نیلوفر یا کسی اور سہیلی کے ہاں پہنچ جاتی تاکہ وقت کاٹ سکوں۔ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا تو دوسری طرف کوئی لڑکی تھی۔

''کیا مسٹر راشد کمال صاحب گھر پر تشریف رکھتے ہیں؟'' اس نے اپنی رسیلی آواز میں پوچھا۔ ''اگر ہیں تو ان سے بات کرادیں۔''

''جی نہیں......'' میں نے جواب دیا۔ ''وہ رات دس بجے سے پہلے گھر نہیں آتے......شاید اس وقت دفتر میں ہوں گے۔''

''دفتر میں......؟'' میں نے پہلے دفتر میں ہی فون کیا تھا تو معلوم ہوا کہ تھوڑی دیر پہلے ہی وہ دفتر سے نکلے ہیں......'' اس کا لہجہ بڑا نفیس اور شائستہ تھا......'' میں نے انہیں شام پانچ بجے کا وقت دیا تھا......اگر ان کا فون آیا......یا وہ گھر آگئے تو ان سے کہیے کہ......نازنین کا فون آیا تھا۔ پلیز! یاد سے......بہت بہت شکریہ......اللہ حافظ!''

اس نے جواب سنے بغیر ریسیور رکھ دیا تھا۔ میں نے بھی ریسیور رکھ دیا تھا...... یہ نازنین کون تھی؟ میں نہیں جانتی تھی۔ یہ پہلی عورت تھی جس کا فون آیا تھا۔ تب مجھے لگا نیلوفر کی بات یاد آگئی' اس نے کہا تھا کہ میری سردمہری' بے رغبتی اور بے اعتنائی سے راشد بھٹک سکتا ہے تم اس کی بیوی ہو اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ جب اس کا دل کرے من مانی اور وظیفہ زوجیت ادا کرے' تم اسے چھونے اور ہم آغوشی سے روک نہیں سکتی ہو۔ تم نے جو بتایا تھا کہ اس رات وہ بے قابو ہو کر اس نے تمہارے ساتھ جبر و زیادتی سے اپنے جذبات کا اس طرح سے نشانہ بنایا جس طرح ایک اغوا شدہ لڑکی کو بے حرمتی کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ تمہارا دفاع اور مزاحمت کوئی کام نہ آسکی۔ تم نے اسے بہت بری طرح جھاڑ دیا۔ یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ اسے تم آبروریزی' زیادتی اور بے حرمتی کا نام نہیں دے سکتیں۔ اس لئے کہ وہ تمہارا شوہر ہے۔ میرا شوہر میرے ساتھ اس طرح پیش آئے تو میں خوش اور سرشار ہوجاؤں۔ اس لئے اس میں ایک عجیب طرح کی نشاط انگیزی ہوتی ہے۔ شادی اور بچے ہونے کے بعد شوہر میں بہت کم والہانہ پن اور گرم جوشی ہوتی ہے۔ ایک رسمی انداز ہوتا ہے۔ عورت مرد کی گرم جوشی اور جذباتیت کو ترستی ہے اور خواہش کرتی ہے کہ ہر رات سہاگ کی پہلی رات کی طرح ہو۔

میں نے ان تمام خیالات کو جھٹک دیا۔ کیوں کہ ایک لڑکی کا فون کرنا یہ بات ایک طرح سے اچھی تھی اور میرے حق میں جارہی تھی۔ اور پھر یہ کہ میرے حق میں جارہی تھی۔ وہ دوسری عورت کے چکر میں پڑ کر مجھ سے نجات پانے کے لئے مجھے طلاق دے دے اور اس بات کا سو فیصد امکان تھا کہ مجھے طلاق دے سکتا تھا۔ آج کا دن میرے لئے خوشی اور تہوار کے دن کی طرح تھا۔ میں نے اس عورت کے لب و لہجے میں اور اس کی کھنکتی آواز سے محسوس کیا تھا کہ وہ ایک خوب صورت اور نفیس قسم کی لڑکی ہے۔

آج رات راشد بہت دیر سے گھر آیا تھا۔ وہ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے آیا تھا۔ جب سے اس بات کا احساس ہوا تھا کہ میں اس سے سخت متنفر ہوں شادی کو اتنے دن گزر جانے کے بعد میری سردمہری میں کمی نہیں آئی ہے تب سے وہ دیر سے گھر آنے لگا۔ اس رات کا بھی اس نے بہت اثر لیا جب اس نے مجھے اپنے بازوؤں کے زور پر قابو کرکے بے بس کردیا تھا۔ میں باوجود کوشش کے اس کی گرفت سے نہ نکل سکی تھی۔ میں نے اسے خوب سنائی تھی کہ تم بھیڑیے...... درندہ صفت اور وحشی ہو۔ میں نے اس سے کبھی دیر سے گھر آنے کی وجہ نہیں پوچھی تھی اور نہ ہی میں نے اس کی ضرورت محسوس کی تھی۔ وہ گھر میں داخل ہوتا تو اس کا چہرہ سپاٹ ہوتا۔ سیدھا خواب گاہ میں چلا جاتا...... کپڑے بدل کر منہ ہاتھ دھو کر یا نہا کر کھانے کی میز پر آتا۔ میں چوں کہ کھانا کھا چکی ہوتی تھی اس لئے وہ اکیلا خاموشی سے کھا کر اٹھ جاتا تھا۔ کبھی کبھی اس کے اور میرے درمیان چند رسمی جملوں کا تبادلہ ہوتا۔ وہ اپنے کمرے میں چلا جاتا اور میں برتن سمیٹ کر اور دھو کر نشست گاہ میں آجاتی۔ کبھی کوئی اچھی انڈین فلم آئی ہوتی تو میں اس کی سی ڈی نیلوفر کے ہاں سے لا کر ڈی وی ڈی پر دیکھتی۔ فلم کے ہیرو کو دیکھتی تو میرے دل پر ایک چوٹ سی لگتی...... میں سوچتی کہ کاش میرا شوہر بھی اس ہیرو جیسا ہوتا اور اس میں کے بازوؤں میں سما جاتی وہ میرے چہرے پر جھک جاتا۔

آج وہ آیا تو یکسر بدلا ہوا شخص لگ رہا تھا۔ اس کا چہرہ کسی ان جانی خوشی سے دمک رہا تھا۔ اس کی سرشاری سے میرے دل کو ایک ان جانا خوف سا دامن گیر ہوا کہ مجھ سے من مانی نہ کرے اور اس رات کی طرح نشست گاہ سے گود میں اٹھا کر بیڈ روم میں لے جائے۔ پھر قابو میں کرکے بے بس نہ کردے۔ اس کا امکان یوں بھی تھا کہ بیس دن سے میں نے اسے چھونے اور بوسہ تک لینے نہیں دیا تھا۔ اگر وہ پیش قدمی کرتا تو میں اسے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ میں نے اسے نازنین کے ٹیلی فون کے بارے میں بھی نہیں بتایا۔ آج اس نے مجھے ذرا بھی لفٹ نہیں دی اور نہ ہی دیکھنے کی ضرورت محسوس کی۔ پھر وہ بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔ میں کھانے کا پوچھنے کے لئے بیڈ روم کی طرف گئی۔ مگر دہلیز پر ہی رک گئی کہ کہیں وہ اس خوشی میں چپکنے کی کوشش نہ کرے میں نے دیکھا کہ وہ سنگھار میز کے آئینے کے سامنے کھڑا ٹائی کی گرہ کھول رہا تھا اور کوئی فلمی گیت گنگناتا ہوا جھوم سا رہا تھا اور اس کا چہرہ کسی تیز روشنی کے بلب کی طرح روشن تھا۔ اس کی آنکھوں میں مسرت کی سرخی پھول رہی تھی۔

''کیا آپ کھانا کھائیں گے......؟'' میں نے کڑوا سا منہ بناتے ہوئے پوچھا۔ ''میں میز پر کھانا چن رہی ہوں۔ آپ جلدی سے آجائیں۔'' ''کھانا......؟'' اس نے جواب دیتے وقت میری طرف پلٹ کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ ''جی نہیں...... میں اپنے ایک دوست کے ہاں کھا کر آرہا ہوں...... پیٹ بھرا ہوا ہے...... میں نے تمہیں بتانے کے لئے فون کیا تھا کہ سہ پہر کے وقت میں رات کا کھانا کھا کر آؤں گا۔ تم میرے لئے کھانا تیار نہ کرنا...... پھر ایک گھنٹے بعد...... شاید تم گھر پر نہیں تھیں۔ شاید کسی سہیلی کے ہاں چلی گئی تھیں۔''

''ہاں...... میں سہ پہر کے وقت گئی ہوئی تھی۔''

میں نے جواب دیا۔ ”سہیلی کے ہاں نہیں امی کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ چائے یا کافی......!“

”ان میں سے کچھ نہیں......“ وہ کوٹ اتارتے ہوئے الماری کی طرف بڑھ گیا۔ ”میرے لئے ایک گلاس جوس بنادو۔ بغیر برف کے......“

تھوڑی دیر کے بعد میں اس کے لئے فریش لیمن جوس بنا کر خواب گاہ میں داخل ہوئی تو وہ ایک فلمی رسالے کی ورق گردان کررہا تھا اس مرتبہ وہ لاتعلقی سے بیٹھا رہا۔ میری طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ میں جوس کا گلاس تپائی پر رکھ کر نشست گاہ میں آگئی۔ پھر میں ڈی وی ڈی آن کرکے جو فلم چھوڑ کر آئی تھی اسے دیکھنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میں فلم تو دیکھ رہی ہوں۔ میری نظروں کے سامنے ایک انتہائی جذباتی منظر تھا۔ یہ ایک انگریزی فلم تھی جو سنسر شدہ نہیں تھی۔ امریکہ اور یورپ میں فلموں کا سنسر ہونا نہ ہونا ایک ہی بات تھی۔ ان کے چینلو پر بھی ایسی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ اس سنسنی خیز منظر کے باوجود میرا ذہن کہیں اور تھا۔ میں یہ محسوس کررہی تھی۔ صرف نظریں ٹی وی کے اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ منظر بھی میری توجہ حاصل نہ کرسکا تھا۔

اس لمحے میرا ذہن اس عورت کے بارے میں سوچ رہا تھا جس نے میرے شوہر کو پسند کیا تھا اور میرے شوہر پر مر مٹی تھی۔ ... وہ عورت شاید میرے شوہر پر نہیں بلکہ اس کی گاڑی پر مر مٹی ہوگی۔ کمپنی نے اسے نئی اور شاندار گاڑی ٹویوٹا کرولا دی ہوئی تھی۔ اس عورت کو کیا پتا...... جس کے پاس ایسی گاڑی ہو وہ کسی لکھ پتی سے کم نہیں ہوتا تھا...... اگر وہ کوئی حسین اور جوان عورت تھی تو میرے شوہر کی حیثیت جیسے سینکڑوں لوگ اسے مل سکتے تھے۔ شاید وہ خوب صورت نہ تھی۔ جبھی وہ میرے شوہر اور اس کی حیثیت پر فریفتہ ہوگئی تھی۔ کوئی حسین عورت اس قدر بد ذوق نہیں ہوسکتی تھی کہ ایسے بدصورت مرد سے اپنا رشتہ ناتا جوڑ لے۔

اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں تھا کہ اس عورت کی آواز بہت خوب صورت تھی۔ آواز سے عمر کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ لیکن بعض عورتیں خوب صورت نہیں ہوتی ہیں لیکن ان کی آواز خوب صورت ہوتی ہے۔

بہر حال میری بلا سے وہ عورت کیسی بھی ہو۔ مجھے کیا کرنا ہے......؟ اچھا ہے اس بہانے سے اس بدصورت دیو سے نجات مل جائے' چھٹکارا تو ملے گا۔ میں آزاد تو ہو جاؤں گی۔ میرا مسئلہ آپ ہی آپ حل ہو رہا تھا۔ اس غیبی امداد سے میری مشکل جلد ہی آسان ہو جائے گی۔ میں نے دل میں نازنین کو دعا دی کہ اللہ تمہیں سدا خوش رکھے۔ تم میرے لئے فرشتہ ہو فرشتہ......

میں نے ایک خیال کے تحت ڈی وی ڈی اور ٹی وی آف کیا...... میں یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ میرے شوہر کا کیا رد عمل ہوتا ہے۔ اگر اس نے وحشیانہ انداز یا رسمی طور پر بھی میری طرف پیش قدمی کی کوشش کی تو نازنین کے فون کا حوالہ دے کر دماغ درست کرکے رکھ دوں گی۔ بوسہ لینا...... من مانی کرنا تو در کنار اسے چھونے تک نہیں دوں گی۔ بہت ذلیل کروں گی۔

میں خواب گاہ میں داخل ہوئی تو وہ پلنگ پر تکیوں کے سہارے نیم دراز تھا اور بیڈ لیمپ روشن کرکے ناول پڑھنے میں لگا تھا۔ میں نے اس پر بجلی گرانے کے لئے اس کا پسندیدہ جال دار سیاہ شب خوابی کا لباس پہنا جس میں جسم اس طرح جھلکتا تھا جیسے کانچ کی صراحی میں شراب جھلکتی ہے۔ بستر پر دراز ہو کر میں نے اس کی طرف پشت کرلی کہ میرا سراپا اس پر قیامت ڈھا دے گا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے ناول رکھ کر بیڈ لیمپ آف کردیا۔ پھر وہ بستر پر دراز ہوگیا۔ یہ سب کچھ میں نے دیکھا نہیں محسوس کیا تھا۔

میرے دل نے دھڑکنا شروع کردیا۔ ایسا لگا کہ اس کا ہاتھ کسی سانپ کی طرح رینگتا ہوا میری طرف بڑھے گا۔ پہلے تو وہ میرے بال سلجھائے گا پھر میں اپنے جسم پر محسوس کروں گی۔ پھر وہ مجھے دبوچ لے گا...... پانچ منٹ......

دس منٹ...... اس طرح نصف گھنٹا گزر گیا۔ اس کی طرف سے کوئی پیش قدمی اور گرم جوشی اور والہانہ پن کی کوئی حرکت ہوئی اور نہ ہی فاصلہ کم ہوا...... ایسا لگا جیسے وہ بستر پر موجود نہ ہو اور غیر محسوس انداز سے اتر کر نشست گاہ میں چلا گیا ہو۔ حیرت کی بات میری اس حالت نے بھی اسے بہکایا نہیں اور اس کے جذبات میں ابال پیدا نہیں کیا......؟ جب کہ اس وقت میں نہ صرف آتش فشاں کی طرح دہک رہی تھی بلکہ میرے بدن کی سوندھی سوندھی خوشبو بھی بستر میں رچ بس گئی تھی اور میں رات کی رانی کی طرح مہک رہی تھی۔ وہ برف کا تودہ نہ تھا۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ اس نے جذبات پر پہرہ بٹھا دیا ہے۔ میرے بدن پر صرف شب خوابی کا لباس تھا۔ پھر میں اس نے پیش قدمی کیوں نہیں کی تھی۔ میں بہت کم ایسی حالت میں ہوتی تھی۔ جب مجھے اسے جلانا' ترسانا اور تڑپانا مقصود ہوتا تھا تب میں اس حالت میں ہوتی تھی۔

پھر میں نے غیر محسوس انداز سے اس کی طرف کروٹ لے کر دیکھا تو اسے دیوار کی طرف منہ کرکے گہری نیند سوتے ہوئے دیکھا۔ خراٹے بتا رہے تھے کہ وہ گہری نیند میں غرق ہے۔ یہ بڑی حیران کن اور ناقابل فہم بات تھی کہ آج اس پر میری قربت کا جادو نہ چل سکا تھا۔

صبح نو بجے وہ دفتر جانے کے لئے گھر سے نکلتا تھا۔ آٹھ بجے ماسی آجاتی تھی وہی ناشتہ تیار کرتی تھی۔ اس روز میں صبح ساڑھے آٹھ بجے بیدار ہوئی تو وہ دفتر جا چکا تھا۔ ماسی نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ اس کے آنے کے دس منٹ کے بعد کسی عورت کا فون آیا تھا۔ فون ماسی نے ہی اٹھایا تھا۔ کیوں کہ اس وقت وہ شیو کررہا تھا۔ فون سنتے ہی وہ دس منٹ میں تیار ہو کر اور ناشتہ کیے بغیر چل دیا۔

تین بجے امی کا فون آیا کہ میں رات کا کھانا راشد کے ساتھ آکر کھاؤں۔ امی کو میں نے ٹالنا چاہا تو انہوں نے میری ایک نہ سنی کیوں کہ وہ اپنے داماد پر بہت فدا تھیں۔ اسے عادت واطوار اور اخلاق کے باعث مثالی قرار دیتی تھیں۔ انہوں نے کبھی اس کی بدصورتی کو محسوس نہ کیا تھا۔ جب کہ خاندان میں اب بھی لوگ کہتے تھے کہ راشد میرے جوڑ کا نہیں ہے۔

میں نے کبھی راشد کو دفتر فون کرکے اس سے بات نہیں کی تھی۔ اس کے پاس موبائل فون تھا لیکن میرے پاس اس کا نمبر نہیں تھا اور نہ مجھے اس کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ میں نے بھی موبائل نہیں لیا ہوا تھا۔ یہ ان دنوں اتنا عام ہی نہیں تھا۔ اور پھر مجھے راشد کو دفتر فون کرکے بات کرنا پسند نہیں تھا۔ جب وہ پسند ہی نہیں تھا تو اس سے بات کیا کرنا تھی؟ اسے دفتر فون کرکے بات کرنا یوں ضروری بھی تھی کہ کہیں وہ رات دیر سے گھر نہ آئے۔ امی نے شام سات بجے پہنچنے کی تاکید کی تھی۔ اسے اطلاع دینا ضروری تھا۔

میرے پاس اس کے دفتر کا فون نمبر تھا۔ میں نے اس نمبر کو ملایا۔ دوسری طرف سے ایک مترنم آواز کا زیر و بم لہرایا۔

”آپ کون بول رہی ہیں......؟“ مجھے اس کی آواز پر نازنین کا دھوکا ہوا تھا۔ لب و لہجہ انداز بھی وہی تھا۔ فرق نہ تھا۔ میں نے اپنا شک دور کرنے کے لئے پوچھ لیا تھا۔ گویا وہ عورت نازنین اس کے دفتر میں ملازمت کررہی تھی۔

”جی میں...... مسٹر راشد کی پرائیویٹ سیکریٹری نگہت چوہدری بول رہی ہوں۔ آپ نے بتایا نہیں کہ آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟“

”راشد کمال صاحب سے......!“ میں نے پہلی بار فون کیا تھا پھر بھی میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ”آپ نے مجھے پہچانا نہیں......؟“

”سو فیصد پہچان لیا......!“ وہ شوخ لہجے میں بولی۔ ”میں اور آپ کو نہیں پہچانوں گی......! آپ مس شازیہ شجاعت ہیں نا......؟ اس روز آپ راشد صاحب کے ساتھ صبح دس بجے سیر و تفریح کے لئے ہاکس بے گئی تھیں اور واپسی آٹھ بجے شام ہوئی تھی...... شاید آپ کل مس

نازنین اور صاحب کے جانے کے بعد آئی تھیں...... صبح میں نے صاحب کو آپ کا پیغام پہنچا دیا تھا......"

"جی ہاں...... میں وہی تھی وہ......" میں گڑبڑا سی گئی۔ دوسرے لمحے میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا پھر میں نے مزید ٹوہ لینے کی غرض سے پوچھا۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے صاحب تک میرا پیغام پہنچا دیا...... کیا صاحب دفتر میں موجود نہیں ہیں؟"

"جی نہیں ہیں......" اس نے جواب دیا۔ "وہ مس صابرہ بٹ کے ساتھ گئے ہوئے ہیں...... کیا کوئی پیغام دینا ہے انہیں......"

"یہ مس صابرہ بٹ کون صاحبہ ہیں......؟" میں نے پوچھا۔ "آپ کو زحمت نہ ہو تو بتا دیں۔ کیوں کہ اس نام کی تمیں......؟"

"حیرت ہے آپ مس صابرہ بٹ کو نہیں جانتی ہیں؟" اس کے جواب میں حیرت تھی۔ "یہ شوبزنس کی مشہور و معروف فن کارہ ہیں جن کی ماڈلنگ نے دھوم مچا رکھی ہے۔ ان کا کون سا کمرشل ایسا ہے جو روز ٹی وی پر دکھایا نہ جاتا ہو۔"

"وہ کیوں اور کس لئے اس کے ساتھ گئے ہوئے ہیں......؟" میں نے تجسس کے زیر اثر دریافت کیا۔ "کیا کچھ بتا کر گئے ہیں......؟"

"کسی کمرشل کے سلسلے میں گئے ہوئے ہیں۔" پرائیویٹ سیکریٹری نگہت چوہدری نے جواب دیا۔ "کس کمرشل کے لئے...... یہ نہیں بتایا صاحب نے۔"

"کیا وہ اس کمرشل کی شوٹنگ کے لئے اسٹوڈیو گئے ہوئے ہیں؟" میں بولی۔ "کیا آپ کو کچھ معلوم ہے کہ ان کی واپسی کب تک ہوگی؟"

"آج ان کا کوئی خاص پروگرام ہے...... پہلے تو انٹرنیشنل اسٹوڈیو جائیں گے...... شاید رات دونوں وہیں گزاریں" سیکریٹری کا لہجہ بڑا سنسنی خیز تھا...... وہ ہنسنے لگی۔ "یہ میرا انداز ہے...... شاید آپ بھی تو ایک روز کسی ہوٹل میں ان کے ساتھ رہی ہیں...... کمرا میں نے ہی تو بک کرایا تھا...... اور ہاں آج اس ہوٹل کا بل آیا ہے...... سات ہزار سات سو......"

"اوہ......" میں ریسیور تھامے سوچنے لگی کہ اس سے کیا کہوں......؟ اس نے راشد کے سارے کرتوت بیان کر دیئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ موصوف نے سیکریٹری کو بھی نہیں بخشا ہے اس لئے اس دل جلی نے ہنسی میں ساری باتیں کہہ ڈالی تھیں۔

"مس شازیہ چوہدری...... کوئی پیغام تو نہیں ہے......؟ میں آپ کو ایک مخلصانہ مشورہ دوں؟ آپ کچھ خیال تو نہیں کریں گی؟"

"جی نہیں......" میں نے کہا۔ "کوئی پیغام نہیں دینا ہے......! ہاں تو آپ کیا مشورہ دینا چاہتی ہیں۔ میں کیوں برا مانوں گی......؟"

"آپ...... صاحب کو تلاش کرنے کی کوشش نہ کریں۔" وہ بے حد سنجیدہ ہو گئی۔ اس لئے کہ وہ آپ کے ہاتھ نہیں لگیں گے...... مس نازنین بھی بہت کوشش کر چکی ہیں...... لہٰذا آپ اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ صاحب آج کل بہت اونچے جا رہے ہیں......"

میں نے بڑی طرح جھنجھلا کر ریسیور پٹخ دیا۔ میرے شوہر نامدار کا اصل چہرہ سامنے آ گیا تھا۔ وہ راجہ اندر بنا ہوا تھا۔ حسین، نوجوان اور پرشباب لڑکیاں...... رنگین تتلیوں کی طرح اس کے اردگرد اڑنے لگی تھیں۔ اس لئے وہ میری بے رخی اور سرد مہری سے تنگ آ کر ان کے ساتھ شامیں گزارنے لگا تھا۔ اس کی تو پانچوں گھی میں تھیں۔ اس لئے اسے اب میری کوئی پروا نہیں رہی تھی۔

مجھے ذرا سی دیر کے لئے گہرے صدمے کا احساس ہوا۔ ایک جلن سی میرے وجود میں ہونے لگی۔ میرے سینے میں وحشت سی بھر گئی...... پھر میں نے سوچا کہ میں اس شخص کے بارے میں اس انداز سے دکھ سے کس لئے سوچ رہی ہوں......؟ جب کہ مجھے اس سے نفرت ہے وہ جو کرتا ہے

کرتا پھرے میری بلا سے...... میری جوتی...... اچھا ہے اس سے جتنی جلدی جان چھوٹ جائے۔

میں سکون اور خوشی کے لئے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ یہ مجھے اس طرح مل سکتی تھی کہ وہ طلاق دے دے۔ اس کے لئے ایک ہی راستہ اور ایک ہی تدبیر تھی کہ میں اس سے نفرت اور حقارت سے پیش آؤں اور میاں بیوی کے تعلقات نہ رکھوں۔ اگر اس نے قریب آنا چاہا تو جھاڑ دوں کہ...... یہ جو تم کیزوں کے ساتھ گل چھرے اڑاتے پھر رہے ہو کیا اس سے جی نہیں بھرتا؟ شاید یہ طعنہ سن کر وہ طیش میں آ جائے اور میں اس سے فائدہ اٹھا کر جلتی پر تیل چھڑکوں۔ میرے خاندان میں ایک طلاق کا واقعہ رونما ہوا تھا۔ میری ایک کزن کا شوہر پڑوسن سے تعلقات استوار کئے ہوئے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میری کزن تین بچوں کی ماں تھی۔ پڑوس میں ایک عورت جن کی آمد و رفت تھی۔ گو میری کزن سے خوب صورت اور پرکشش نہ تھی۔ میری کزن تیس برس کی تھی۔ وہ عورت چالیس برس کی اس کا شوہر دبئی میں ملازمت کرتا تھا۔ اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ صرف ایک بوڑھی ساس تھی۔ جو رات کو خواب آور گولیاں کھا کر سو جاتی تھی۔ پھر اپنی بیٹی کے ہاں جا کر وہ ایک دن رک کر آتی تھی۔ اس عورت کا شوہر ایک برس میں صرف ایک مہینے کے لئے آتا تھا۔ اس کی بیوی کہتی تھی کہ آخر تم کس لئے اتنا کما رہے ہو؟ ہمارا اپنا ایک گھر ہے اور ایک گھر کرایہ پر اٹھایا ہوا ہے جس سے اتنا کرایہ آتا ہے کہ ہماری زندگی آسانی سے گزر بسر ہو سکتی ہے۔ لیکن اسے دولت کمانے کی اور بڑا آدمی بننے کی دھن سوار تھی۔ اس کے جنون نے بیوی سے بے پروا کر دیا تھا۔ بیوی شوہر کی جدائی کے فراق میں جلتی رہتی تھی۔ اس کے جذبات و احساسات کی کوئی فکر نہ تھی۔ پھر ایک دن وہ میری کزن کے شوہر کی جھولی میں پکے آم کی طرح گر پڑی ان کے درمیان جو تعلقات قائم ہو گئے تھے میری کزن کو اس کی ہوا تک نہیں لگی تھی۔ ایک روز پڑوسن کی ساس اپنی بیٹی کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ دن ڈوب چکا تھا۔ میری کزن جب کسی کام سے اس کے ہاں گئی تو اس نے ان دونوں کو غلاظت کے دلدل میں دھنسے ہوئے دیکھا۔ اس روز وہ دروازہ بند کرنا بھول گئے تھے۔ میری کزن نے اس وقت کوئی ہنگامہ نہیں کھڑا کیا خاموش واپس چلی آئی۔ رات جب اس نے میری کزن کو آغوش میں لیا تو وہ تڑپ کر نکل آئی پھر اسے طعنہ دیا کہ تم مجھے آرام کرنے اور سونے دو' میں دن بھر کی تھکی ماندی ہوں۔ جب بات بڑھی تو کزن نے کہا کہ بھابی کے پاس جاؤ۔ تم اس سے منہ کالا کرتے رہتے ہو۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔ اس پر کزن کے شوہر نے کہا کہ اس کی وجہ تم ہو۔ آخر میں کب تک تمہارے نخرے برداشت کرتا اس کا شوہر بھی پتھر ہے۔ ایک عورت کے جذبات کا' احساسات کا خیال نہیں کرتا...... میاں بیوی میں تلخی بڑھی تو اس نے کھڑے کھڑے تین طلاقیں دے دیں۔

میں بھی یہی چاہتی تھی کہ اسے اس قدر اشتعال دلاؤں کہ مجھے طلاق دے دے۔ اب مجھے ایک راستہ مل گیا تھا۔ میں نازنین کے اور اس کی سیکریٹری کی گفتگو جو فون پر ہوئی تھی سنا کر طعنے دے کر مشتعل کر سکتی تھی۔ طلاق دینے کا امکان اس لئے بھی تھا کہ وہ بدچلن لڑکیوں کا رسیا ہو گیا تھا۔ ماڈل لڑکیوں کے بارے میں سن رکھا تھا کہ ان کی راتیں کالی اور آمدنی کا بھی ذریعہ ہوتی ہیں۔

اس سے میرا رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ اس لئے میں نے امی کو فون کر کے کہہ دیا کہ وہ آج کسی وجہ سے دیر سے گھر آئیں گے لہٰذا کھانے کا پروگرام کسی اور دن رکھ لیں۔ امی نے راشد کے دیر سے آنے کی وجہ پوچھی تو میں نے کہا کہ کمپنی نے ایک غیر ملکی وفد کو ڈنر دیا ہوا ہے وہ رات بارہ بجے آیا تو اس کی حالت کل جیسی تھی۔ بہت خوش و خرم تھا۔ وہ گھر آتے ہی کپڑے بدل کر رسمی باتیں کر کے سونے کے لئے بستر پر دراز ہو گیا۔ میں نے فوراً ہی ایک تدبیر سوچی جس سے ایک طوفان کھڑا ہو سکتا تھا۔ میں نے

خواب گاہ میں آ کر کپڑے بڑے اطمینان سے بدلے کوئی تین چار منٹ تک اس کی نظروں کے سامنے بے نیام تلوار کی طرح رہی۔ وہ چور نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے اس حالت میں دیکھ کر وہ خود پر قابو نہ پا سکے گا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر بستر میں کھینچ لے گا۔ میں اس کے بالکل سامنے تھی۔ لیکن تماشا نہ ہوا۔

دوسری دن شام پانچ بجے وہ دفتر سے گھر آیا تو میں نے سوچا کہ شاید اس کی محبوباؤں نے اسے دھتکار دیا ہو۔ اس لئے آج وہ جلدی گھر آ گیا کہ گھر میں بھینس پالی ہوئی ہے۔ رات اس نے جو مجھے کپڑے بدلتے دیکھا تھا اس سے یہ سمجھا کہ میں رات اسے خوش کرنے کے موڈ میں تھی۔ کیوں نہ اس حرکت سے فائدہ اٹھا لیا جائے۔ لیکن اس نے میرا اندازہ غلط ثابت کر دیا۔ اس نے شیو بنایا اور غسل کیا۔ جب کہ وہ روز ہی شیو اور غسل کرتا تھا۔ آج صبح بھی کیا تھا۔ پھر اس نے کپڑے بدلے۔ شادی والا سوٹ نکال کر پہنا میں اسے تیار ہوتا ہوا نشست گاہ سے دیکھتی رہی تھی۔ وہ تیار ہو کر آیا اور پھر اس نے کہا۔

''میں ایک فلمی تقریب میں شرکت کرنے کے لئے جا رہا ہوں۔ رات وہیں گزرے گی...... تم اکیلی گھر پر رہ کر کیا کرو گی...... کہو تو میں تمہیں تمہاری امی کے ہاں چھوڑتا چلوں...... جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ کہیں مجھے دیر نہ ہو جائے۔''

میں نے اس کی بات سن کر اسے آزمانے کے خیال سے سوچا کہ کہہ کر دیکھوں۔ کہنے میں کیا حرج ہے۔ دیکھوں کیا کہتا ہے۔

''میں امی کے ہاں رکنے کے لیے جانا چاہتی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''صرف رات نہیں بلکہ کچھ دن رکنا چاہتی ہوں کیا رک جاؤں؟''

''چلی جاؤ......'' اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔ جتنے دن رکنا چاہو رک جاؤ۔ اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟''

اس کا جواب سن کر میں بہت حیران ہوئی۔ دوسری طرف خوشی بھی ہو رہی تھی۔ حیران اس بات پر تھی کہ اسے مجھ سے ایک رات بھی جدا رہنا منظور نہیں تھا لیکن اب وہ کچھ دن امی کے ہاں رہنے کی خوشی سے اجازت دے رہا تھا...... مجھے خوشی اس بات سے ہو رہی تھی کہ کچھ دنوں تک اس کی منحوس صورت دیکھنے کو نہیں ملے گی۔ وہ میری جدائی میں کسی ماہی بے آب کی طرح تڑپتا رہے گا۔ اور اس کی ساری ساری رات انگاروں پر لوٹتی ہوئی گزرے گی...... کیا ہوا جو وہ دوسری لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ رنگ رنگلیاں مناتا ہے۔ ان عورتوں میں مجھ جیسی حسین اور دل کش ایک بھی نہیں ہو سکتی۔ نیلوفر اور ایک قریبی شادی شدہ سہیلیاں کہتی تھیں کہ تمہارا ابھی بھرا بدن ہے۔ تمہارا شوہر کسی اور عورت کی طرف نہیں دیکھ سکتا۔ اسے راتوں کو میری یاد ستائے گی۔ میری جدائی شاق گزرے گی...... میری حشر سامانیاں تڑپائیں گی۔ گو کہ میں اس سے کبھی گرم جوشی سے پیش نہ آ سکی۔ نیلوفر کے مشورے کے مطابق دس دن میں ایک بار میں اسے خوش ہونے دیتی تھی۔ بڑی ناگواری اور تندی اور سرد مہری سے جیسے سرد لاش ہوں۔ کڑوی کسیلی گولی دوا حلق سے اتار رہی ہوں۔ اس میں جذب ہونے اور خود سپردگی سے پیش آنے کی حماقت نہیں کرتی تھی۔ لیکن وہ تو جیسے ایک درندہ صفت تھا جو اس بات کا خیال نہیں کرتا اور نہ محسوس ہوتا تھا کہ میں اس کے ساتھ کس طرح سے پیش آتی ہوں۔ بس وہ تو ایک گدھ بن جاتا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور مرد ہوتا تو وہ میرے قریب بھی نہ بھٹکتا کہ اس بے کیف لمحات سے تو بہتر ہے کہ آدمی ایک لمبی نیند لے کر اٹھے۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ میں امی کے ہاں ایک مہینہ رہوں گی۔ اگر وہ درمیان میں آ کر لے گیا اور مجھ پر وحشی کی طرح ٹوٹ پڑا اور بھنبھوڑ دیا تو اس کی زندگی میں ایسا زہر گھول دوں گی کہ وہ مجھے جلد سے جلد اپنی زندگی سے نکالنے پر مجبور ہو

جائیگا یا پھر مشتعل ہو کر تین الفاظ میں اپنا وہ فیصلہ سنا دے گا جس کے لئے میں بے چین سی ہوں۔

اس سے اتنا بھی نہ ہوا کہ وہ میرے تیار ہونے کا انتظار کرتا اور امی کے ہاں چھوڑتا چلا جاتا۔ اس نے اس لئے میرے تیار ہونے کا انتظار نہیں کیا کہ میں دانستہ دیر لگا رہی تھی۔ لیکن وہ چوں کہ وقت پر پہنچنے کے لئے بے تاب تھا اس لئے مجھ سے معذرت کر کے نکل گیا۔ میں امی کے ہاں جانے سے پہلے نیلوفر کے ہاں چلی گئی تاکہ ایک ڈیڑھ گھنٹہ گزار لوں۔ امی کے ہاں جا کر کیا کروں۔ اب تو امی کے ہاں ایک مہینہ بھی رہنا تھا۔ اور میرے پاس وقت ہی تھا۔ نیلوفر سے حال دل کہہ کر اپنا جی ہلکا کر لیتی تھی۔

نیلوفر کے ہاں ایک عورت بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ اس عورت کی عمر چھبیس، ستائیس برس کی ہوگی۔ بلاشبہ وہ مجھ سے کہیں حسین اور پرکشش تھی۔ میں نے دل میں اس کے حسن و شباب اور جسمانی شباب کو سراہا۔ اس نے کیا جسم اور کیا رنگت پائی تھی۔ نیلوفر نے ہم دونوں کو آپس میں تعارف کرایا۔ اس کا نام صاعقہ تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بے حد اداس اور مغموم ہے۔ دل گرفتہ انداز میں باتیں کر رہی تھی۔ اس کی افسردگی میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ کیوں کہ وضع قطع اور چہرے سے امیر کبیر لگتی تھی۔

''تم بڑے اچھے موقع پر آئی ہو......'' نیلوفر نے کچھ دیر کے بعد ایک موقع پر کہا۔ ''تم صاعقہ کی زندگی سے سبق سیکھو...... اس نے وہی سنگین غلطی کی جو تم کر رہی ہو اور مزید کرنا چاہتی ہو...... وہ غلطی اس کی ساری زندگی کا روگ بن گئی ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ تمہیں ٹیلی فون کر کے بلا لوں۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ تم خود ہی آ گئی ہو۔''

''کیسی غلطی......!'' صاعقہ نے نیلوفر کی بات سن کر میری طرف حیرت سے دیکھا۔ ''کیا آپ کی شادی ہو چکی ہے......؟''

''طلاق کی حماقت...... عاقبت نا اندیشی......'' میرے جواب دینے سے پہلے نیلوفر بول اٹھی۔ ''اس کی شادی کو چھ سات مہینے ہو چکے ہیں...... یہ محترمہ اپنے شوہر سے طلاق لینے کیلئے فضا تیار کر رہی ہے...... راستہ ہموار کر رہی ہے؟''

''وہ کس لئے......؟'' صاعقہ کی بڑی بڑی خوب صورت اور سیاہ آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''کہیں آپ کے شوہر آپ سے عمر میں پچیس تیس برس بڑے...... یا پھر ظالم و جابر اور شکی مزاج شخص تو نہیں ہیں......؟ ان مردوں کو حسین اور پرکشش اور جوان عورتوں سے شادی نہیں کرنی چاہئے جو شکی مزاج واقع ہوتے ہیں......''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' نیلوفر نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''اصل بات یہ ہے کہ ان کے شوہر نامدار کالے رنگ اور بدصورت ہیں...... یہ ملکہ حسن چوں کہ سفید فام ہیں اس لئے اپنے سیاہ فام شوہر سے نفرت کرتی ہیں۔ شادی سے خوش نہیں ہیں۔ اور...... ان کی تمنا اور سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ اپنے سیاہ فام شوہر سے طلاق لے کر کسی خوب صورت مرد سے شادی کر کے گھر بسا لیں...... جیسے بہت سارے امیدواران سے شادی کی راہ دیکھ رہے ہیں۔'' نیلوفر کا لہجہ طنز بھرا تھا۔

''کیا آپ کو طلاق لینے کے بعد اس بات کی امید ہے کہ آپ کی دوسری شادی جلد ہو جائے گی......؟'' صاعقہ نے منجمد آنکھوں سے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا آپ نے کسی سے آس لگائی ہوئی ہے......؟ کوئی نظر میں ہے؟''

''جی ہاں......!'' میں نے سر ہلا دیا۔ لیکن میں نے نہ تو کسی سے آس لگائی ہوئی ہے اور نہ ہی کوئی نظر میں موجود ہے؟''

''تو پھر آپ نے کیسے یقین کر لیا......!'' وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ ''کیا آپ کو خوش فہمی ہے کوئی......!''

''آپ جانتی ہیں کہ حسین اور پرکشش لڑکیوں کا کیسا کال ہے......''

میں نے سر ہلا دیا۔ ”اس لئے جلد دوسری شادی کی توقع ہے۔“

”یہ بات آپ قبل از وقت اتنے اعتماد اور وثوق سے کس بنا پر کہہ رہی ہیں۔؟“ وہ میرے جواب سے مطمئن نہیں لگ رہی تھی۔

”اس بنا پر کہ...... میرے خاندان میں دو تین لڑکے مجھ سے شادی کرنے کے خواہش مند تھے...... میری شادی تنازع بن گئی۔ خاندان کے کسی لڑکے سے میری شادی ہو جاتی پھر بڑی تلخیاں پیدا ہو جاتیں۔ اس لئے میرے ابو نے ان میں سے کسی ایک سے شادی کرنے کے بجائے میری شادی خاندان سے باہر کردی۔ پھر لڑکے والے خاموش ہو گئے ناراضگی اور بدمزگی نہ ہو سکی۔“

”ویسے آپ کے شوہر...... مزاج‘ عادت و اطوار کے کیسے ہیں......؟ کیا وہ صاحب حیثیت ہیں؟“ وہ جیسے میرا انٹرویو لے رہی تھی۔

”یوں تو ان میں بہت ساری خوبیاں موجود ہیں...... مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ محبت شاید اس لئے ٹوٹ کر کرتے ہیں کہ میں بہت حسین ہوں...... شاید اس وجہ سے میرا خیال بھی بہت رکھتے ہیں۔ با اخلاق اور منکسار ہیں...... اپنے دفتر میں جو کاسمیٹکس کی فرم ہے اس میں منیجر کے عہدے پر ہیں۔“ میں نے تفصیل سے بتایا۔ ”ان میں صرف خرابی یہ ہے کہ وہ بدصورت ہیں۔“

”آپ صرف اتنی سی بات پر ان سے طلاق لے رہی ہیں؟“ اس کے لہجے میں شدید حیرت بھی تھی۔ ”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی......!

”آپ کے نزدیک یہ کوئی بات ہی نہیں......؟“ میرا لہجہ تند ہو گیا۔ ”یہ تو میرا دل ہی جانتا ہے کہ میں ایک بد صورت شخص کی بیوی بن کر کس کرب اور اذیت اور گھٹن سے گزر رہی ہوں...... مجھ پر تو قیامت ٹوٹ پڑی ہے...... میں بتا نہیں سکتی ہوں کہ مجھے اس کے ساتھ کہیں آتے جاتے اور سہیلیوں کو گھر بلاتے کیسی خجالت اور کراہت ہوتی اور شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔“

”اگر آپ نے اپنے شوہر سے طلاق لے لی تو یہ سمجھیے کہ...... آپ نے خود ہی پیروں پر کلہاڑی ماری ہے۔“ وہ سنجیدگی سے کہنے لگی۔ ”میں نے چھ سات برس پہلی ایسی ہی غلطی کی تھی جس کا خمیازہ آج تک بھگت رہی ہوں......

“ قں صرف اتنا تھا کہ میرا شوہر بدصورت نہ تھا۔ وہ ایک معمولی شخص تھا۔ وہ میرے خواب پورے نہیں کر سکتا تھا...... میں ایک خواب ناک زندگی چاہتی تھی۔ گاڑی ہو...... نہایت آراستہ اور کشادہ گھر ہو۔ اے سی ہو...... شہزادیوں کی طرح رہوں۔ زندگی بھی میری طرح حسین اور رنگین ہو...... وہ یہ کہتا تھا کہ میں تمہیں صرف محبت سے مالا مال کر سکتا ہوں۔ تم جو چاہتی ہو وہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے...... پھر میں نے اپنے حسن کے زعم میں آکر اس سے طلاق لے لی۔ شادی سے پہلے میرے خاندان میں بہت سارے مرد مجھ سے شادی کے خواہش مند تھے۔ لیکن طلاق لینے کے بعد کوئی بھی مجھ سے شادی کر کے گھر بسانے کے لئے آگے نہیں بڑھا۔ اس لئے کہ مجھ پر طلاق کا داغ لگ چکا تھا۔ ہمارے معاشرے میں اس سے بدنما داغ عورت کے لئے کوئی نہیں ہے۔

طلاق لینے کے بعد میں ایک کوڑھ زدہ ہو کر رہ گئی۔ میرے وجود سے جیسے تعفن اٹھنے لگا۔ لوگ مطلقہ کو بڑی نفرت اور حقارت سے دیکھتے ہیں۔ میں نے جس بنا پر طلاق لی اس نے مجھے اور گرا دیا۔ میں ذلت آمیز سی زندگی گزارنے لگی۔ میں چاہتی تھی کہ میری شادی ہو جائے۔ کسی بھی مرد سے...... اب میں ایسے خواب نہیں دیکھوں گی جس نے مجھے اپنی ہی نظروں میں ذلیل اور حقیر بنا دیا۔ آخر میرے گھر والوں کی پانچ برسوں تک دوڑ دھوپ کرنے کے بعد میری شادی ایک ایسے مرد کے ساتھ ہو گئی جو بوڑھا اور چار بچوں کا باپ ہے۔ اس کی پہلی بیوی مر چکی ہے۔ اس شخص سے شادی کرنے کے بعد میں نہ تو

خوش ہوں اور نہ سکون سے ہوں...... وہ مجھے گالیاں دیتا اور مارتا بھی ہے۔ ایسے ایسے طعنے دیتا ہے کہ میرے وجود پر تازیانے لگتے ہیں۔ آج مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرا پہلا شوہر اس سے لاکھ درجے بہتر تھا۔ اس نے عزت اور محبت سے رکھا ہوا تھا۔ عورت کے لئے شوہر کی محبت ہی بہت کچھ ہوتی ہے۔ اس سے طلاق لینے کے بعد پچھتاوا میرا روگ بن گیا ہے...... خدا کے لئے آپ ایسی غلطی ہرگز نہ کریں......!“

”آپ جیسی حسین و جمیل عورت کی شادی ایک بوڑھے شخص سے کر دی آپ کے گھر والوں نے......؟“ میں نے تعجب سے کہا۔ ”انہوں نے آپ کی عمر اور خوب صورتی کا خیال بھی نہیں کیا......؟ یہ بھی نہیں دیکھا کہ اس شخص کے چار بچے ہیں......؟ کیا ایک طرح انہوں نے آپ پر کوئی ظلم نہیں کیا......؟ آپ سوتیلی اولاد تو نہیں تھیں......؟“

”میرے گھر والے کرتے بھی کیا......؟“ وہ ایک گہرا سانس لے کر بولی۔ ”میرے لئے کوئی اچھا رشتہ نہیں آرہا تھا...... جو آتا مجھے اور میرے بے مثال حسن و شباب کو دیکھتا متاثر ہو جاتا لیکن یہ بات کہے بغیر نہیں رہتا کہ مجھ میں ایسی کوئی خامی تھی جس کے باعث مجھے طلاق ہو گئی...... اس لئے ہر کوئی مجھ سے دور بھاگتا جیسے میں کوئی بلا ہوں۔ چڑیل ہوں۔ آسیب زدہ ہوں...... سچ پوچھیے تو میرا یہ حسن و شباب میرے لئے عذاب بن گیا تھا۔ اب لگتا تھا کہ ساری زندگی اس سے نجات نہیں ملے گی۔“

”آپ نے بھی جانتے بوجھتے اس شخص سے شادی کرنا کیوں منظور کر لیا کیا اس طرح آپ اپنی غلطی کا خمیازہ نہیں بھگت رہی ہیں؟“

”میں نے اس لئے اس شخص سے شادی کرنے پر رضا مندی ظاہر کر دی تھی کہ اپنے گھر والوں پر بوجھ بن گئی تھی۔“ وہ دل گرفتہ انداز سے کہنے لگی۔ ”میرے والدین زندہ ہوتے تو میں اپنے گھر میں ذلیل اور بے سہارا نہ ہوتی...... بھائیوں کا گھر میرے لئے جہنم بن گیا تھا...... بھابھیوں نے طعنے دے دے کر میرا جینا حرام کر رکھا تھا۔ اس لئے میں نے شادی کر لی۔ شادی کے بعد پتا چلا کہ پھر کسی جہنم میں پہنچ گئی ہوں۔“

”آپ اس بوڑھے اور خبیث شخص سے طلاق کیوں نہیں لے لیتی ہیں؟“ میں نے اسے مشورہ دیا۔ ”آپ آج بھی لاکھوں میں ایک ہیں......؟ میں اس سے طلاق لے کر کہاں جاؤں گی......؟ میرے سگے بھائیوں نے مجھ پر دروازے بند کر دیئے ہیں...... میرے خاندان کے مرد مجھ سے شادی کرنا نہیں صرف کھلونا بنانا چاہتے ہیں...... میں نے انہیں آزما کر دیکھ لیا...... اب مزید فریب کھانا نہیں چاہتی۔ میں اس جہنم میں جانا نہیں چاہتی...... اپنا غم دور کرنے اور دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے کبھی کبھار نیلوفر کے ہاں چلی آتی ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد وہ چلی گئی تو نیلوفر نے مجھ سے پوچھا۔ ”کیا صاعقہ کی کہانی اور اس کی زندگی تمہاری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی نہیں ہیں؟“

”اس میں اور مجھ میں بڑا فرق موجود ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں ابھی نوجوان ہوں...... اور میرے گھر والے مجھ پر جان چھڑکتے ہیں جب میں نے نیلوفر کو راشد کی رنگ رلیوں کی روداد سنائی تو وہ فکر مند ہو گئی ”یار! یہ بہت برا ہوا۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہے۔“

نیلوفر مجھے بڑی دیر تک سمجھاتی اور نصیحتیں کرتی رہی۔ مگر میرے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی...... اور نہ ہی میں نے صاعقہ کی باتوں کا کوئی اثر لیا۔ صاعقہ ایک بے وقوف عورت تھی جو اس نے جلد بازی سے جذباتی فیصلہ کر کے بوڑھے شخص سے شادی کر لی تھی۔ میں اس کی جگہ ہوتی تو ایسا نہ کرتی۔ میں اس سے خاصی دیر تک بحث و تکرار کر کے امی کے ہاں رکنے چلی گئی۔ پھر میں نے رات امی کے ہاں گزاری...... صبح ناشتا کر کے اپنے گھر آگئی تا کہ کپڑے لے کر امی کے ہاں رہنے چلی جاؤں۔

”تم اپنی امی کے ہاں...... کچھ دن رہنے کے لئے گئی

نہیں......!" راشد نے حیران ہو کر پوچھا۔ "واپس کس لئے آگئیں......!"

"میں زیورات اور کپڑے لینے آئی تھی۔" میں نے طنز بھرے لہجے میں جواب دیا۔ میں کل صبح چلی جاؤں گی۔ آپ فکر مند اور پریشان نہ ہوں۔"

میرا یہ جواب سن کر اس نے کچھ نہیں کہا۔ پھر وہ تیار ہو کر چلا گیا...... اس کے جانے کے بعد میں سوچتی رہی کہ وہ چاہتا ہے کہ میں کچھ دنوں کے لئے میکے جاؤں تو وہ یہاں عورتوں کو لایا کرے۔ میرے ذہن میں ایک خیال کوندا بن کر لپکا تو میں نے اس پر عمل کر کے دیکھنے کا فیصلہ کر لیا...... اس طرح میں یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ کہیں وہ اداکاری تو نہیں کر رہا ہے؟ دوری...... لاتعلقی...... اور بے نیازی ڈھونگ تو نہیں ہے......؟ مجھے جلانے اور میری توہین کرنے کے لئے تو ایسی حرکتیں نہیں کر رہا ہے......؟

یہ سب کچھ سوچ کر رات نو بجے میں نے غسل کیا اور بال اچھی طرح خشک کر کے...... گیلے چھوڑ دیئے۔ پھر ہلکا اور نفیس میک اپ کیا جو اس کی بہت بڑی کمزوری تھی۔ پھر ایک بھڑکیلا لباس نکال کر پہنا تو نئی نویلی دلہن لگ رہی تھی۔ میرا حسن نکھر گیا تھا۔

وہ رات گیارہ بجے آیا تو نہ صرف میرا بدن بلکہ خواب گاہ بھی خوشبوؤں سے مہک رہی تھی۔ میں نے بستر کو بھی خوشبو سے مہکا دیا تھا۔ وہ آیا تو بہت خوش تھا۔ اس نے مجھ پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور خواب گاہ کی طرف تیزی سے بڑھ گیا۔

آج میں اس کے صبر و ضبط کا امتحان لے کر یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ...... اگر وہ میری طرف راغب نہیں ہوتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ وہ جس عورت کے پیچھے بھاگ رہا ہے یا وہ جو عورت کسی وجہ سے اس پر ریشہ خطمی ہو گئی ہے وہ مجھ سے زیادہ حسین اور پرکشش ہے۔ وہ میری طرف بڑھا تو میں اسے بری طرح جھڑک دوں گی۔ اس کی توہین و تذلیل کروں گی تاکہ یہ ازدواجی زندگی کا آخری دن ثابت ہو۔ میں اس سے صاف کہہ دوں گی کہ...... وہ مجھے طلاق دے دے۔ میں آج ابھی اور اسی وقت اپنی امی کے پاس چلی جاؤں گی۔

تھوڑی دیر بعد جب میں خواب گاہ میں داخل ہوئی تو وہ سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ ہم دونوں کی نظریں ملیں اور ایک دوسرے میں پیوست ہو گئیں تو میں نے اس کی طرف مسکراتے ہوئے دزدیدہ نظروں سے دیکھا۔ شادی کے بعد میں نے پہلی مرتبہ مسکرا کے اس کی طرف دیکھا تھا۔ عشوہ' ناز و ادا سے کام لیا تھا۔ اس پر بھی اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا تھا کہ وہ مجھ پر ٹوٹ پڑے گا۔

میں ابھی مایوس نہیں ہوئی تھی۔ اس طلسم کو توڑنا تھا جس میں وہ جکڑا ہوا تھا۔ میرے پاس ایک اور ترپ کا پتا تھا۔ کھیل میرے ہاتھ میں تھا۔ نکلا نہیں تھا۔ میں عورت تھی، ایسی عورت جو ہار ماننا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے زیرو پاور کا بلب روشن کر دیا۔ اس کی ملگجی روشنی میں میرا بدن آتشیں بن گیا۔ ڈستا ہوا' پھنکارتا ہوا' اس کی مار کسی مرد کے لئے سہنا ناممکن سا تھا۔

میں نے دل پر جبر کر کے اس کی طرف پیش قدمی کی اپنی مرمریں اور عریاں بانہیں اس کے گلے میں حائل کرنا چاہیں۔

"عرفانہ!......" اس نے بیزار لہجے میں کہا۔ "مجھے سونے دو' مجھے بڑے زور کی نیند آرہی ہے آج میں بہت تھکا ہوا بھی ہوں۔"

اس عورت کے آگے میرا سحر ماند پڑ گیا تھا جس سے وہ مانوس اور متاثر تھا۔ جس کے دل اور جسم سے قریب تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا...... کیا وہ عورت مجھ سے زیادہ حسین ہے......؟ کیا کوئی حسین عورت ایسے بدصورت مرد کی جھولی میں کسی پکے ہوئے پھل کی طرح گر سکتی ہے......؟ اس کی اس بے رخی اور سرد مہری کی حرکت سے مجھے اپنی توہین کا احساس ہوا۔ میرے دل کو ایک

طرح سے شدید صدمہ پہنچا تھا۔ اس نے تو مجھے اس طرح جھڑک دیا تھا جیسے میں کوئی بدصورت اور بے کشش عورت ہوں۔ پہلی مرتبہ وہ میرے ساتھ اس طرح سے پیش آیا تھا۔ میں نے سوچا کہیں ایسا تو نہیں کہ اس نے مجھ سے اس روز کا بدلہ لیا ہو۔

اس پر میں حیران بھی تھی اور اپنی ناکامی پر غصہ بھی آرہا تھا۔ مجھے ساری رات نیند نہیں آئی۔ لیکن وہ مزے سے سوتا رہا تھا۔ اس روز رات کے وقت میں نے اس کے سامنے کپڑے تبدیل کئے تھے۔ بڑے اطمینان سے...... اس میں ذرا سے وقت صرف کیا تھا۔ وہ مجھے چور نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جب کہ ایسی حالت میں اس کا برف کا تودہ بنے رہنا تعجب خیز تھا۔ لیکن آج یہ بات سمجھ میں آئی کہ چوں کہ وہ کسی حسین عورت کے قیامت خیز بدن کا اسیر ہے اور اس لئے اس پر میرا جادو چل نہ سکا۔

میں دوسرے دن اپنے میکے اس خیال سے چلی آئی کہ میں رہ کر کیا کروں گی۔ میرا اپنا گھر پرایا ہو چکا ہے کسی عورت نے مجھے شکست دے دی ہے۔ لیکن میں میکے میں دو دن سے زیادہ نہ رہ سکی۔ میں نے ماسی کو راشد کی جاسوسی پر لگا دیا تھا۔ ماسی کا گھر قریب ہی تھا۔ یوں بھی اسے دن میں ایک مرتبہ صفائی اور ناشتہ بنانے کے لئے آنا ہی ہوتا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ رات کے وقت کام کے بہانے ادھر کا ایک چکر لگایا کرے۔ راشد کی حرکات و سکنات پر نظر رکھے۔

میں تیسرے دن شام کے وقت لوٹ آئی۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ میری غیر موجودگی میں کوئی عورت تو نہیں آئی تھی۔ اس نے نفی میں جواب دیا اور بتایا کہ...... کل صبح صاحب ٹیلی فون پر کسی عورت سے بات کر رہے تھے...... آج شام ان دونوں نے تقی علی مارکیٹ' مال روڈ پر ملنے اور خریداری کا پروگرام بنایا ہے...... شاید شادی کی خریداری کر رہے ہیں...... کس کی شادی......! یہ معلوم نہ ہو سکا۔ میں نے بہت غور سے دھیان سے سنا۔ صاحب بہت محتاط ہو کر بات کر رہے تھے۔

اب میں سمجھی کہ وہ مجھ سے کس لئے دور ہوتا جا رہا ہے۔ وہ کسی عورت سے شادی کر رہا تھا۔ اس لئے مجھے لفٹ نہیں دے رہا تھا اور نہ ہی قریب آرہا تھا۔ میری پیش قدمی اور خود سپردگی کو روک دیا تھا۔ میرے جذبات کو روند دیا اور پھول کی طرح مسل دیا تھا۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ شام کو مال روڈ پر ان دونوں کو دیکھوں گی...... ان کا تعاقب بھی کروں گی۔ میں یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ عورت کیسی ہے جس نے مجھے ماند کر دیا...... مجھے ان کی شادی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ خوشی تھی کہ اس عورت کی بدولت مجھے طلاق اور چھٹکارا نصیب ہو جائے گا۔

میری شادی پر جہیز میں میرے والدین نے روایت کے مطابق برقعہ بھی دیا تھا میں اسے پہن کر شام کے وقت مال روڈ تقی علی مارکیٹ پہنچ گئی۔ تھوڑی دیر بعد راشد کی گاڑی آکر رکی۔ میں نے ایک نوجوان لڑکی کو گاڑی سے اترتے دیکھا۔ اس کی عمر بہ مشکل بیس برس کی ہوگی۔ بہت حسین تھی۔ بلاشبہ وہ حسن و شباب کا ایسا دل کش اور ترشیدہ پیکر تھی جو شاذ و نادر نظر آتی تھی۔ راشد نے معلوم نہیں یہ نگینہ کہاں سے اور کیسے حاصل کیا تھا۔ دوسری بات جو سمجھ سے بالاتر اور ناقابل فہم تھی کہ اس نے راشد میں ایسی کون سی خوبی اور کشش محسوس کی کہ وہ اس سے شادی کرنے پر تیار ہو گئی۔ اسے تو کوئی بھی کروڑ پتی اپنا جیون ساتھی بنا سکتا تھا۔

وہ سامنے والی جیولری کی شاپ کی طرف خراماں خراماں بڑھ رہے تھے۔ دکان کے اندر داخل ہوئے تو میں باہر رک گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں بھی اندر داخل ہو گئی۔ لڑکی نے سونے کے زیورات کا ایک خوب صورت سیٹ پسند کیا۔ راشد نے اس کی قیمت ادا کرتے ہوئے کہا۔

"تم یہ سیٹ شادی کے دن پہنو گی...... ولیمے کے روز پہننے والا سیٹ جس کا آرڈر دیا گیا ہے کل شام تیار ہو کر آجائے گا......"

لڑکی کا چہرہ جیسے سرخ ہوگیا۔ وہ اور حسین دکھائی دے رہی تھی۔ اس دکان سے نکلنے کے بعد انہوں نے مختلف دکانوں سے میک اپ کے لوازمات' ملبوسات' جوتے اور بہت ساری چیزوں کی خریداری کی کوئی دو گھنٹے تک یہ سلسلہ جاری رہا تھا...... جب شاپنگ کر چکے تو وہ ایک قریبی ریسٹورنٹ میں چلے گئے۔ پھر میں گھر چلی آئی۔

راشد دس بجے گھر آیا تو میں اس کے انتظار میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ وہ اس قدر خوش تھا جیسے اس نے ملت اقلیم کی دولت پالی ہو۔ وہ آج تو بہت ہی خوش دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے دل کا ولولہ اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ میں نے اس کے گھر میں قدم رکھتے ہی فیصلہ کرلیا تھا کہ آج اسے طلاق دینے کے لئے کہوں گی...... کہوں گی کہ اگر تم اس لڑکی سے شادی کر رہے ہو تو شوق سے کرلو۔ مگر مجھے تو نجات دے دو۔ میں بھی کسی خوب صورت مرد سے شادی کر کے ایک خوب صورت زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔

معلوم نہیں کیوں آج میں نے اسے بڑے غور اور ناقدانہ نظروں سے دیکھا...... ایک عورت کی نظر سے...... پھر میرے من کے نہاں خانو کے اندھیرے میں ایک دم سے اجالا ہوگیا...... میری نظروں کے سامنے چھائی ہوئی دھند چھٹنے لگی۔ وہ اتنا بدصورت نہیں تھا جتنا میں نے سمجھ لیا تھا۔ مجھے یک بیک یہ احساس ہونے لگا وہ جیسا بھی ہے اور جو بھی ہے میرا ہے...... میرا شوہر ہے۔ میں نے اسے ساری دنیا کے سامنے قبول کیا ہے۔ وہ مجھ سے ٹوٹ کر محبت کرتا رہا تھا۔ میری بے توجہی اور نفرت نے اسے دوسری عورت کی طرف راغب کردیا وہ اس عورت کا اسیر ہوگیا۔ مجھ سے زیادہ حسین عورت اس سے محبت کرسکتی ہے تو میں اس سے محبت کیوں نہیں کرسکتی......؟ میں اسے کسی قیمت پر اس عورت کا شوہر بننے نہیں دوں گی۔ راشد میرا ہے...... صرف میرا...... وہ کسی کا نہیں ہوسکتا......!"

میں بے اختیار اس کے پاس اس کے قدموں پر گر پڑی۔ پھر اپنے جذبات پر قابو نہ پاسکی۔

"مجھے معاف کردو راشد!...... میں نے تمہارا دل بہت دکھایا......"

اس نے لپک کر میرے شانے تھام لیے پھر مجھے اوپر اٹھایا۔ میری پرنم آنکھوں میں محبت بھری نظروں سے جھانکا۔ پھر اس نے پوری خوشی سے مجھے اپنے بازوؤں کی گرفت میں لے لیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے سارے بدن کی ہڈیاں چٹخ جائیں گی۔ میں چاہتی بھی یہی تھی میں بولے بغیر نہ رہ سکی۔

"مجھے تم سے محبت ہے راشد! تم مجھے چھوڑ تو نہ دو گے......؟ میرے راشد!" میں اس کے سینے پر سر رکھ کر سسک پڑی۔

سچ پوچھیے تو آج کی رات میری زندگی کی سب سے حسین اور پہلی حقیقی سہاگ رات تھی۔ نہ تو وہ مجھے بدصورت لگا اور نہ میرے دل میں کوئی کراہت پیدا ہوئی۔ صبح میں بیدار ہوئی تو مجھ پر مدہوشی کی سی کیفیت طاری تھی۔ پلکیں بار بار بند ہوئی جارہی تھیں۔ میں نے راشد کو دیکھا۔ وہ بستر پر تھا۔ دیوار گیر گھڑی میں گیارہ بج کر دس منٹ ہو رہے تھے۔ میں نے بستر سے نکل کر نشست گاہ میں جھانکا۔ وہ صوفے پر بیٹھا ٹیلی فون پر کسی سے بہت آہستہ اور پراسرار انداز میں باتیں کر رہا تھا۔ اس کی پشت میری جانب تھی۔ میں اس کی باتیں سننے کے لئے دو تین قدم بے آواز بڑھی۔ وہ کہہ رہا تھا

"نگہت! تمہارا بہت بہت شکریہ۔ تمہارے مشورے ڈرامے اور بے مثل اداکاری کی وجہ سے پتھر پگھل گیا۔ تمہاری شادی میں اگر اپنی بیگم کے ساتھ آیا تو سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ پھر مجھ سے نفرت کرنے لگے۔ میں آج ہی اس کے ساتھ مری جارہا ہوں تاکہ ہنی مون منایا جاسکے۔ پھر ایک بار تمہارا شکریہ اور شادی کی پیشگی مبارک باد...... باقی باتیں واپسی پر......"

☆......☆......☆



سُرنگ

دولت اور آسائشیں جب حد سے زیادہ بڑھ جائیں تو عیاش سے عیاش شخص بھی اکتا جاتا ہے۔ دولت مند گھرانے کی تین باغی دوشیزاؤں کا قصہ وہ زندگی میں تبدیلی چاہتی تھیں۔

ثریا صغیر صدیقی

مشہور زمانہ پرانے قلم کار جان لٹنر کی پر تحیر اور چکرادینے والی کہانی

روز کی ناک پر مٹی لگی ہوئی تھی۔ بہت ذرا سی معمولی سی مٹی لیکن نے سوچا کہ اسے بتا دے۔ مگر پھر اس نے ارادہ بدل دیا۔ اس کے بجائے اس نے زرد اور سبز لکیروں والی ٹائی کی تعریف شروع کردی۔

"خوب۔" اس نے ٹائی کو چھوتے ہوئے کہا۔

روز کو چوکس ہونا پڑا۔ یہ کسٹمر کوئی تیس بتیس سال کا ہوگا وجیہہ سا۔ نیلی آنکھیں اور لہردار بال۔ اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ تھی جو غالباً ہمیشہ بیٹھی رہتی ہوگی۔ اس کا سوٹ بھی ٹھیک تھا۔ آدھا اونی گرے رنگ۔ روز یوں چوکس ہوئی تھی کہ اسے اندازہ ہوگیا تھا اس شخص کو ٹائی پسند نہیں آئی تھی اور اس کے باوجود وہ بڑا پراعتماد لگ رہا تھا۔ جیسے وہ کوئی ایسی بات جانتا ہو جو اور کسی کو نہ معلوم ہو۔

روز نے خود کو سمجھایا...... ہونے دو۔ بہت سے لوگوں کے پاس کچھ راز ہوتے ہیں۔ وہ کچھ اسی طرح کی تھی۔

"کیا یہاں بس ٹائیاں ہی فروخت ہوتی ہیں؟" کسٹمر نے پوچھا۔

پھر روز اور اس نے ایک ساتھ ہی دکان کے اندر دیکھا۔ جو ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ تنگ سی۔ نیچی چھت والی جہاں ریکوں پر ٹائیاں رکھی ہوئی تھیں۔

"جگہ چھوٹی ہے بس ٹائیاں ہیں۔" اس نے کہا۔

وہ چپ رہی۔ مگر کسٹمر نے یہ نہیں کہا کہ یہاں بہت

بڑی ٹائیاں رکھی ہوئی ہیں۔ واقعی یہ بہت بری طرح رکھی تھیں اور آنکھوں کو ناگوار لگتی تھیں۔

"تم کو یہ ٹائی چاہیے؟" روز نے کاؤنٹر کے پیچھے سے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے جیب سے دس ڈالر کے پانچ نوٹ نکالے اور ادائیگی کی۔ اس نے اسے رجسٹر میں ڈالتے دیکھا۔

"چینج نہیں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"پچاس ہی بنتے ہیں۔"

روز نے اس بڑی سی ٹائی کو احتیاط سے بیگ میں ڈالا۔

"رسید؟"

"ٹائی تو تمہیں مل چکی ہے۔" وہ مسکرائی۔

آدمی نے بیگ لے لیا اور دروازے کی طرف گیا۔ دروازہ کھلتے ہی اس کے اوپر لگی چھوٹی سی گھنٹی بجی۔ پھر وہ باہر چلا گیا۔

روز اس کے جاتے ہی پردہ ہٹا کر عقبی کمرے میں گئی پھر اس نے لکڑی کے زینے طے کیے اور وہاں پہنچی جہاں کھدائی ہو رہی تھی۔ "میں نے ایک ٹائی فروخت کردی ہے۔" اس نے بیزاری سے کہا۔

ڈونا اور کورین نے کھدائی روک دی۔ گندی ہونے کے باوجود اپنے لانبے ہلکے اخروٹی بالوں اور بڑی بڑی آنکھوں کے ساتھ ڈونا خوب صورت لگ رہی تھی۔

کورین کے بال ہلکے سرخ تھے اس کا چہرہ بکھون سا تھا۔ وہ بھی بہت دلکش تھی۔ وہ ذرا دبلی تھی اس کا بیلچہ ہلکا تھا۔ وہ ابھی گندی نہیں ہوئی تھی۔ تینوں کی عمریں پاس پاس تھیں۔ اکیس سال۔ انہوں نے پیریونٹ یونیورسٹی میں اپنا سمسٹر دیا تھا اور چھٹیاں تھیں وہ ایک سر پروجیکٹ پر کام کررہی تھیں...... وہ ایک بینک کو لوٹنے والی تھیں۔

یہ بینک اس ٹائی ون نامی دکان کے بالکل سامنے تھا۔ اس دکان کو انہوں نے اونر سے حال ہی میں خریدا تھا کیوں کہ وہ بزنس بند کررہا تھا۔ پہلے اس میں جیولری بکتی تھی۔ مگر بینک لوٹنے والیوں نے اسے ٹائی شاپ بنا دیا تھا اور اس میں الٹی، سیدھی ٹائیاں بھردی تھیں۔ عموماً وہ کسٹمر کو بھگا دیا کرتی تھیں۔ سارا زور ان کا کھدائی پر تھا۔

یہ ایک سرنگ تھی. وہ آدھی تو تیار ہو چکی تھی۔ یہ سڑک تلے بینک کے اندر جارہی تھی اسے نیشنل بینک کے والٹ کے نیچے کھلنا تھا۔

"ٹائیاں تو بکیں گی ضرور۔" ڈونا نے بیلچہ رکھتے ہوئے اپنے دستانے درست کیے۔

"یہ کسٹمر جو آیا تھا۔" روز نے کہا۔ "ذرا مختلف سا تھا۔"

روز بذات خود پستہ قامت ، دبلی، جلی ہوئی رنگت کی، بھوری آنکھوں والی بلی جیسی تھی۔ کسی بھی سُرنگ میں آسانی سے گھسنے والی۔

"کیا کوئی پولیس والا لگتا تھا؟" کورین نے پوچھا۔

روز نے سوچا۔ "ٹھیک سے کہہ نہیں سکتی۔ مجھے تو وہ ایسا لگا تھا جیسے اسے یہاں کی ٹائیاں بہت ہی بری لگی ہوں۔"

"وہ خوب صورت تھا۔" ڈونا نے کہا۔ "تمہاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے۔"

"ہاں اور خطرناک بھی۔" روز نے کہا۔

"تمہاری قسم؟"

روز نے مخالفت نہیں کی۔

"ٹائیاں بیچنا ہمارے پلان کا حصہ ہے؟" کورین نے کہا۔ "ہم بزنس کرتے ہیں۔"

یہ ایک مذاق جیسی بات تھی۔ یہ تینوں لڑکیاں بہت مالدار گھرانوں کی تھیں جبھی، وہ بہت مہنگے اسکول پیریونٹ میں پڑھ رہی تھیں۔ ان کی فطرت ایسی تھی کہ اپنے گھرانے کی دولت کے ساتھ اس پر انحصار سے بھی نفرت زدہ تھیں۔ باغی ہونا۔ عام سی بات تھی۔ عورتوں کے پاس بغاوت کے بہت سے طریقے تھے۔ اسی لیے روز نے سب کو ایک طرف کرکے تجویز دی تھی کہ وہ کسی ملک میں ڈاکا ڈالیں گی۔ یہ کام رقم حاصل کے لیے نہ تھا۔ یہ ایسا کام تھا کہ عموماً لوگ اسے رقم کے لیے ہی کرتے تھے یہی نکتہ تھا اس میں۔ اس طرح ان پر کسی قسم کا شبہ نہیں آسکتا تھا کیوں کہ ان کے گھرانے میں بہت دولت تھی۔ مگر سوائے اس کے۔

تینوں تیار ہوگئی تھیں اسی لیے وہ یہاں نظر آرہی تھیں اور سڑک تلے سُرنگ کھود رہی تھیں۔ ہر شام، روز ٹریک سے جہاں اس کا کام ہو رہا تھا بھورا ٹرک کھڑا ہوتا تھا پھر وہ اسے لے کر ٹائی شاپ تک لاتی تھی۔ پھر اسے ڈلیوری کے لیے عقبی دروازے کی سمت بیک کرتی تھی۔ اسی میں وہ مٹی بھری جاتی تھی اور اسے نیو جرسی میں ٹھکانے لگایا جاتا تھا۔

"ہم ٹائی بیچتے ہیں اس سے کوئی طوفان نہیں کھڑا ہو رہا ہے" کورین نے کہا۔

"وہ ٹائی۔" روز نے کہا۔ "طوفان بن سکتی ہے۔"

"پھر، ہم کیا کریں؟" ڈونا نے بیلچے پر زور ڈال کر کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

روز نے اپنے ہاتھوں پر دستانے چڑھائے اور بیلچہ سنبھال لیا۔

"ہم کھدائی کرتے ہیں۔"

☆

کھدائی مشکل کام تھی۔

ان تینوں کے کسی ہاتھ میں کوئی گھٹے نہیں تھے مگر اب یہ پیدا ہو رہے تھے حالاں کہ وہ دستانے پہن کر کام کرتی تھیں۔ وہ یہ سڑک تقریباً مہینے بھر سے کھود رہی تھیں۔

ذرا ان تینوں کے بارے میں تصور کیجیے کہ اس وقت ان کا حال کیا ہوگا جب شام کا کام ختم کرکے اوپر دکان میں آئی تھیں تاکہ منہ ہاتھ دھوسکیں اور یہاں سے رخصت ہوں...... اور انہوں نے تین عدد وردی پوش پولیس والوں کو دیکھا تھا۔

روز بھی دوسروں کی طرح ایک دم سے چونکی ہوگئی تھی مگر اسے فوراً ہی احساس ہوا کہ یہاں کوئی نئی بات ہو رہی ہے۔

یہ پولیس والے اپنی جگہ آرام سے کھڑے تھے جبکہ جو صورت لڑکیوں نے سوچی تھی اگر ایسی ہوتی تو یہ اطمینان اس طرح رکے نہ ہوتے کہ جب لڑکیاں اوپر نمودار ہوئی تھیں انہیں دیکھ سکتی تھیں۔ انہوں نے عقبی کمرے کا پردہ ہٹا دیا تھا۔ ایک تو کاؤنٹر کے پاس اس جگہ بیٹھا تھا جہاں رجسٹر رکھا ہوا تھا۔ دوسرا فرش پر کھڑا تھا۔ تیسرا ایک دیوار سے ٹیک لگائے اس طرح کھڑا تھا جیسے لوگ بس کے انتظار میں ہوشیار کھڑے ہوتے ہیں اور یہ آدمی ہی تھا جس نے کچھ وقت پہلے دکان سے ٹائی خریدی تھی کافی ڈراونا سا منظر تھا۔

نیلی وردیاں...... چمکتا ہوا سیاہ چمڑا۔ چاندی جیسے بیج اور ان کے پسٹل بینک لوٹنے والیوں کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔

"او میرے خدا۔" ڈونا بولی۔

"ا...... ہو...... ہو۔" کورین منمنائی۔

"میں نہیں سمجھتی کہ تم واقعی پولیس والے نکلو گے" روز نے اس آدمی سے کہا جس نے ٹائی خریدی تھی۔

"چلو اب سمجھ لو۔" آدمی نے کہا۔ وہ دیوار سے لگ کر سیدھا کھڑا ہوتے ہوئے بولا...... "میرا نام لیکر ہے۔ اس کاؤنٹر کے پاس آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ ہیں آفیسر لنک۔"

"لنک۔" نے مسکرا کر سر ہلایا۔ وہ گلابی آنکھوں والا دبلا سا آدمی تھا۔ اس کے بال ڈونا جیسے رنگ کے تھے۔

"اور یہ ہیں آفیسر اینڈری۔"

اینڈری اچھی شکل تھا کا صرف اس کی ناک قدرے لمبی تھی۔ اس نے مسکرا کر سر ہلایا۔

"کیا تم ہمیں ہمارے حقوق پڑھ کر سنانے والے ہو۔"

ڈونا نے لنک سے پوچھا جس کے بال اس کے بالوں جیسے تھے۔

تینوں آفیسروں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر انہوں

نے اپنی گنیں ہولسٹروں میں ڈال لیں۔
"اوہ۔" روز کراہی۔
"ہم تینوں سکس ٹن تھانے سے متعلق ہیں۔ شعبہ حفاظت اور گشت۔"
"اچھا، تو تم تینوں ایک یونٹ ہو۔" کورین نے کہا۔
"کہہ سکتے ہو۔" آفیسر لیکر نے کہا۔ "ہم لوگ کئی ہفتے سے تم لوگوں پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ ہماری سمجھ میں آ گیا ہے کہ تم تینوں دراصل سُرنگ سے ادھر والے بینک میں نقب لگا رہی ہو اسے لوٹنے کے لیے۔"
"اچھا۔" ڈونا نے دوبارہ آفیسر لنک کی طرف دیکھا جو اس کی توجہ سے مخلوط ہو رہا تھا۔
"تمہیں گرفتار کرنا ہمارا کام ہے۔" آفیسر لیکر نے کہا۔
"کام نہیں فرض ہے ہمارا۔" لنک نے ٹکڑا لگایا۔
"مگر تم یہ کام نہیں کرو گے۔" روز نے کہا۔ لنک نے ڈونا کی طرف دیکھا۔
"ہم نے معلوم کیا ہے کہ تم تینوں نہایت مال دار گھرانے سے تعلق رکھتی ہو۔ ہمیں تمہارے پتے معلوم ہیں۔"
"تم بولتے بھی ہو؟" روز نے تیسرے آدمی سے پوچھا جس کا نام اینڈری تھا۔ تو تم نے ہماری رپورٹ اوپر کر دی ہے۔
"ہاں، یہ بولتا بھی ہے۔" لیکر نے کہا۔ مگر ابھی رپورٹ نہیں کی یوں سمجھ لو کہ ابھی سب کچھ صرف ہم تینوں تک محدود ہے گویا تمہارا یہ منصوبہ صرف چھ افراد جانتے ہیں۔ تم تینوں یا ہم تینوں۔"
"یہ بتاؤ تم ہم کو جیل بھجواؤ گے یا اس سے بھی بری کوئی سزا؟" ڈونا نے پوچھا۔ وہ لنک کی طرف دیکھ رہی تھی۔
"تم لوگ غلط نہ سمجھو۔" لیکر نے کہا۔ "دراصل ہم تینوں تمہیں اغوا کرنے آئے ہیں۔"
"خوب۔" روز نے کہا۔
"سوچو......" لیکر نے کہا۔ "یہ خیال برا نہیں ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم بینک کو رقم کے لیے نہیں لوٹ رہی ہو۔ تم تینوں دراصل ہائی لڑکیاں ہو۔ اب بتاؤ کیا کرو گی؟ دس سے پندرہ سال جیل میں رہنا چاہتی ہو یا ہمارے ساتھ اغوا ہو کر اپنے گھر والوں سے ہمیں رقم اینٹھنے کا موقع فراہم کرو گی۔ چلو جو رقم ہمیں ملے گی تمہارے والدین سے ہم سب مل کر اسے آپس میں بانٹ لیں گے۔ تم تینوں مال دار گھرانے کی ہو۔ تمہارا انشورنس ضرور ہوگا اغوا کے ضمن میں۔ تمہارے والدین کو ساری کمپنیوں سے رقم واپس مل جائے گی اس طرح ہم سب کو مال بھی مل جائے گا اور کسی کا کوئی نقصان بھی نہیں ہوگا۔"
"اغوا کا انشورنس میں نے کبھی نہیں سنا۔" روز نے کہا۔
"پرائیونٹ یونیورسٹی کے ہر طالب علم کو یہ انشورنس کرنا ہوتا ہے۔" لیکر نے بتایا۔
"اچھا۔"
"ہم لوگ تمہیں یہاں سے لے کر ایک اور کنٹری لے جائیں گے جہاں ہم میں سے ایک تمہارے ساتھ ہر وقت رہے گا ہمیں معلوم ہے تم کو لگژری کی احتیاج ہوگی۔ تمہارے پاس ٹی وی ہوگا اور میگزین بھی ہوں گے۔ اچھا کھانا پینا۔ سب کچھ بس فون نہیں ہوگا۔ تم کو ہمارا ساتھ دینا ہوگا۔ بتانا ہوگا کہ تم زندہ ہو اور تم خاندان والوں سے کہنا کہ وہ پولیس وغیرہ سے مدد نہ لیں میں سمجھتا ہوں کہ تم تینوں بہت ہوشیار ہو۔ گھر والوں کو اچھی طرح سمجھا سکو گی نمٹ سکو گی۔"
"ہم باہر والوں سے بھی نمٹ سکتے ہیں۔" ڈونا نے کہا۔
"ہم سے نہیں۔" اینڈری بولا۔
دیر تک خاموشی رہی۔
"تو یہ ہے کہانی؟" روز نے کہا۔
"ہاں، اور یہ بینک لوٹنے سے کہیں زیادہ محفوظ طریقہ

بھی ہے۔"
پھر روز نے ڈونا کو دیکھا۔ ڈونا نے کورین کو دیکھا۔
"مجھے تجویز پسند آئی ہے۔" روز نے کہا۔
لیکر مسکرایا۔ کام ٹھیک سے ہو رہا تھا۔ "چلو ہماری SUV باہر کھڑی ہے۔ آٹھ سیٹیں ہیں۔ آرام دہ قسم کی اور دروازے کھڑکیاں ڈرامور کے ذریعے کھلتی بند ہوتی ہیں۔"
"تم ہمیں گرفتار تو نہیں کر رہے ہو۔" ڈونا نے کہا۔
"لیکن ہم پھر بھی قیدی ہیں۔"
"بالکل۔" لنک نے کہا۔
"ام۔"
"کپڑے؟" کورین نے پوچھا۔
"شاپنگ لسٹ دے دو۔" لیکر نے کہا۔
تینوں لڑکیاں مسکرائیں۔
"خوب۔" روز نے کہا۔
اسے یہ لیکر اچھا لگنے لگا تھا۔

☆

دو گھنٹے بعد یہ چھے کے چھے اشترا کی ایک بڑی شکاری لاج میں جو ایک دور افتادہ مقام پر تھی ایک دور افتادہ جھیل کے کنارے ایک دور افتادہ جنگل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سارے دروازے لکڑی کے پٹ والے جڑ کر بند کر دیے گئے تھے اس کی ساری کھڑکیاں بند تھیں۔ دروازوں کو صرف کنجیوں سے کھولا جا سکتا تھا۔ تینوں پولیس والے لیدر آرم چیئرز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی قیدی لڑکیاں دوسرے کمرے میں تھیں اور دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ تینوں ایک گول میز کے گرد پھنسی ہوئی تھیں اور شاپنگ لسٹ کو دیکھ رہی تھیں۔ تینوں بڑی مگن نظر آ رہی تھیں۔
"تمہیں یقین ہے ادھر کوئی نہیں آئے گا؟" اینڈرین نے پوچھا۔
"اسے صرف سردیوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ جدھر ہرن کا شکار ہوتا ہے۔" لیکر نے بتایا۔ "پہلی شفٹ میں تم ان لڑکیوں کی نگرانی کرو گے۔" اس نے اینڈرین سے کہا۔
اینڈرین نے سر ہلایا۔ "میں تم سب کے لیے کھانا پکاؤں گا مجھے یقین نہیں ان لڑکیوں میں سے کسی کو کھانا پکانا آتا ہوگا وہاں انہیں تو مینو سے ہی آرڈر دینا آتا ہے۔" لیکر نے کہا۔ "اچھا اب ہمیں مصروف ہو جانا ہے۔"
"تمہارا مطلب ہے تاوان کے لیے فون وغیرہ ہو۔"
"یہ کام ہم کل کریں گے۔" لیکر نے کہا۔
اینڈریو نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "تو پھر ہم کیا کریں گے اب؟"
"ہم کھدائی کریں گے۔" لیکر نے کہا۔

☆

جتنا گہرائی میں جانا چاہو جا سکتے ہو، جیسے ہربرٹ نالفر نے کہا جو نالفر کنسالیڈ ڈ انڈسٹریز کا چیئرمین اور CEO تھا۔ وہ اس وقت اپنی کمپنی کے چیف سیکیورٹی آفیسر اوٹو لوگر سے مخاطب تھا۔ "پتا کرو وہ کون حرامزادہ ہے جس نے میری بیٹی کا اغوا کیا ہے۔ کوئی بھی......" اس نے اپنی موٹی انگلی لوگر کی طرف اٹھائی۔ جیسے، ہربرٹ نالفر سے اس کی ایک کوڑی بھی نہیں چھین سکتا۔ کوئی بھی۔
"بالکل۔" لوگر نے تیزی سے ہامی بھری۔ اپنی اسی پالیسی سے اس نے کئی پروموشن حاصل کیے تھے۔
نالفر مسکرایا تلخی سے۔ وہ ایک ناٹے قد کا آدمی تھا۔ گھنی گھنی بھویں تھیں۔ تیز چمکیلی آنکھیں ذرا سی اوپر اٹھی ہوئی ناک۔ یہ روز کی خوش قسمتی تھی کہ اپنی ماں پر گئی تھی ورنہ بے حد خشم ناک لگتی۔ اس کی ماں کو عرصہ ہوا نالفر نے ترک کر دیا تھا۔ جب اسے معلوم ہوا تھا کہ اب اس کے ہاں کوئی اور بچہ نہیں ہو سکتا۔ جو چیز کچھ پیدا نہیں کر سکے فضول ہوتی ہے۔ یہ تھا نالفر کا نظریہ اور لوگر اس سے

خوب واقف تھا۔

''یاد رکھنا۔'' نالفر نے کہا۔ ''پولیس یا حکام کو مت شامل کرنا۔ اگر ہم نے کوئی ایسی حرکت کی تو اغوا کرنے والے روز کے ساتھ...... '' میں بالکل نہیں چاہتا سمجھے۔ فکر نہ کریں۔ پولیس کے بغیر بھی میں کچھ کرسکتا ہوں۔

لوگر شکل سے پورا ٹھگ لگتا تھا۔ کسی بیل جیسا تھا یہ آدمی۔ سر گنجا تھا اور ہونٹ کسی لکیر کی طرح...... وہ بہت چست آدمی تھا اور قابل بھروسہ بھی نہ تھا اور نالفر کو یہی بات پسند تھی۔ لوگر سب سے بڑی بولی والے کا ہو جاتا تھا اور نالفر نے سب سے بڑی بولی دی تھی۔ وہ لوگر کو کنٹرول کرسکتا تھا۔ مگر یہ بھروسے والی بات نہ تھی۔

لوگر کرسی سے اٹھا۔ اس کا قد ساڑھے چھ فٹ تھا۔

''میرے پاس ایک چنیدہ ٹیم ہے۔'' اس نے کہا۔ ''سب کچھ راز میں رہے گا۔''

''ٹھیک۔ یہ ضروری ہے۔''

''ہم تاوان کی کال کی ریکارڈنگ صرف اپنی لیب میں دیں گے۔ ہماری ساؤنڈ انالسس ہمیں کوئی سراغ ضرور دے گی۔ ذرا سا بھی پتا کافی ہوگا۔ ہم نمٹ لیں گے۔ سر آپ کی بیٹی روز آپ کے پاس آجائے گی کوئی تاوان دینے کی ضرورت نہیں۔''

اسے معلوم تھا کہ نالفر نتائج کا خواہاں ہے۔

☆

''چند ہی دنوں میں ہم اس جگہ ہوں گے۔'' لیکر نے کہا اور بیلچہ رکھ دیا۔

فنک نے سر جھکائے کہا تاکہ اس کا سر سرنگ کی چھت سے نہ ٹکرائے...... ''کام تو ہوتا نظر آرہا ہے۔ انہوں نے حکام سے رجوع نہیں کیا ہے۔''

''وہ رقم ادا کریں گے۔'' لیکر نے کہا۔ ''اور پھر انہیں رقم مل جائے گی۔''

''لڑکیاں تو ساتھ دے رہی ہیں۔''

''وہ کورین تو کھانا بھی عمدہ پکاتی ہے۔''

''اینڈرین اسے پسند کرنے لگا ہے۔'' فنک نے کہا۔

''افسوس ڈونا کھانا نہیں پکاسکتی۔ ویسے وہ ہے بہت حسین۔''

''اور روز......''

''اسے خوش رکھنا بہت مشکل ہے۔'' فنک نے کہا۔

لیکر نے سوچا۔ مگر وہ میرے ساتھ تو خوش رہتی ہے۔ آج کل وہ ایک موٹی سی نوٹ بک میں کچھ لکھتی رہتی تھی اسے اس نے بتایا تھا کہ وہ ایک ناول لکھ رہی ہے۔ لیکر کا خیال تھا کہ اس سے کوئی نقصان نہیں۔ وہ ایک انگلش ٹیچر تھی۔

فنک نے اس ٹائی کو ماتھے پر درست کیا جسے اس نے پسینہ روکنے کے لیے اوڑھ رکھا تھا۔

''ہم چند روز ہی میں والٹ تلے ہوں گے ہمیں ایک کٹنگ ٹارچ کی ضرورت ہوگی تاکہ اسٹیل فلور کو کاٹ سکیں۔''

''ہم خرید لیں گے۔'' لیکر نے کہا۔ ''ہم کسی بھی طرح سے ہو۔ الدار ہونے والے ہیں، یہاں سے یا وہاں سے۔''

☆

''تاوان کے لیے ڈیڈ لائن تو گزر چکی ہے۔'' دو روز بعد اینڈرین نے کہا جب وہ بالکل والٹ تلے پہنچ چکے تھے۔ ''ادھر سے تو مال ملنے کی امید نہیں۔ لعنت ہو، کورین کو کیا بتاؤں گا۔ وہ بہت مایوس ہو جائے گی۔''

''سبھی مایوس ہوں گے۔'' لیکر نے کہا۔

''میرا خیال ہے روز پرامید ہے۔'' اینڈرین نے کہا۔ ''وہ بہت آہنی مزاج کی لگتی ہے۔''

''تم صحیح کہتے ہو۔'' لیکر نے کہا۔

روز کا یہ عالم تھا کہ وہ جھنجلا کر اپنی نوٹ بک گودنا شروع کردیتی تھی۔ کسی نہ کسی دن لیکر کو اسے پڑھنا تھا۔ اس سے قبل کہ یہ جلا دی جاتی۔

''اب ہم کیا کریں گے؟'' اینڈریو نے جیب سے مٹی اچھالتے ہوئے پوچھا۔

آج اس نے سہ پہر کوئی ٹائی نہیں باندھی تھی۔ اسے یہ ٹائی پسند تھی اور اس نے فنک سے اسے لے لیا تھا دھونے کے بعد یہ استعمال کی جاسکتی تھی۔ یہ ایک یادگار چیز تھی۔

''ہم نے تو دھمکی بھی دی ہے کہ رقم نہ ملی تو ہم انہیں مار دیں گے۔''

''ہاں۔'' لیکر نے کہا۔

تینوں لڑکیوں کو معلوم تھا کہ ڈیڈ لائن گزر چکی ہے۔ انہوں نے فون پر بہت کہا تھا کہ ان کی زندگیاں خطرے میں ہیں۔

''کوئی آئیڈیا ہے؟'' اینڈرین نے پوچھا۔

لیکر نے ہاتھ سے دستانہ اتارتے ہوئے کہا۔ ''بہتر ہے کہ ہم اب باہر چلیں اور کہیں سے کٹنگ ٹارچ خریدیں۔''

☆

جب وہ دونوں لاج پر واپس ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ فنک اپنی تینوں قیدیوں کے ساتھ بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا ہے۔ وہ سب کے سب ایپل مارٹنی پی رہے تھے۔

لیکر نے لمبی سانس بھری۔ ''میرا خیال ہے سب کو معلوم ہے ڈیڈ لائن گزر چکی ہے۔''

''اسے بھول جاؤ۔'' روز نے کہا۔ اس نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی بند کردیا اور بولی۔ ''بیٹھ جاؤ۔''

لیکر اور اینڈرین نے اسے گھورا۔

اس نے مارٹینی کی سپ لی۔

''تم دونوں ذرا خود کو دیکھو۔'' اس نے کہا۔ ''دونوں کے لباس میں مٹی لگی ہے اور اسی طرح تمہاری عقلوں کو بھی۔''

''میرا خیال ہے پلان کے مطابق کچھ نہیں ہورہا ہے۔'' اینڈرین نے کہا۔

''بھول جاؤ۔'' کورین نے اس کا دل بڑھایا...... اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ دبایا۔

''ابھی تو کچھ نہیں ہورہا ہے۔'' روز بولی۔

''وہ سمجھیں گے ہم نے تمہیں مار دیا ہے۔'' اینڈرین نے کہا۔ ''وہ مسلسل ہماری کھوج میں رہیں گے۔''

''تم ٹھیک کہتے۔'' فنک جو ڈونا کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا بولا۔ اس نے شاید زیادہ پی لی تھی اور کچھ نشے میں تھا۔ ''اس کی فکر نہ کرو۔ ہم جب انہیں زندہ ملیں گے تو یہ مسئلہ نہیں اٹھے گا۔ چلو تاوان والی رقم نہ سہی بینک سے تو ضرور ملنا چاہیے۔''

''تمہاری سوچ اچھی ہے۔'' لیکر نے کہا۔

''والٹ تلے پہنچے؟''

''تقریباً...... ہم نے ایک کٹنگ ٹارچ بھی خرید لی ہے۔''

''جب بینک سے رقم مل جائے گی۔ ہم اس کے حصے کریں گے اس کے بعد تینوں اپنے اپنے راستے پر چلے جانا۔ ہم تینوں اپنے خاندان میں جا کر گھر والوں سے کچھ بتا کر معاملہ ختم کرادیں گے۔ ہم کہہ دیں کہ ہم لوگ BELIZE چلے گئے تھے یا اور کہیں۔''

''اس سے تمہیں کیا ملے گا؟'' لیکر نے پوچھا۔ ''رقم تو تم کو چاہیے نہیں۔''

''یہ بات نہیں۔ ہم لوگ مالی طور پر خود کفیل ہونا چاہتے ہیں۔ ہمیں ایسے افراد سے کیا کام جو ہمارے لیے تاوان بھی نہ دیں۔''

''جب تم واپس جاؤ گی تو تمہارے ساتھ کیا ہوگا؟'' لیکر نے پوچھا۔

''میں آرام سے چکر دے دوں گی سب کو۔'' ڈونا ہنسی۔

''میں ایڑیاں پٹخوں گی، چیخوں گی چلاؤں گی اور پھر کھسک لوں گی۔'' روز نے کہا۔

کورین نے کہا...... ''مجھے خطرہ ہے مجھے کئی ہفتوں تک گھر میں بند رکھا جائے گا۔''

''اوہ۔'' ڈونا نے اسے ترحم سے دیکھا۔

☆

لوگر نے ایک اجلاس طلب کیا۔ اس میں دوسری دونوں کمپنیوں کے سیکورٹی چیف بھی تھے یعنی ڈونا کے باپ کی کمپنی اور کورین کی باپ کی کمپنی۔ یہ میٹنگ ناظر کی عمارت کی چودھویں منزل پر ہوئی تھی۔ یہ لوگ ایک بڑی سی کانفرنس ٹیبل پر بیٹھے ہوئے تھے۔

لوگر کی باتیں دونوں کمپنیوں کے چیف سن رہے تھے۔

''ہمیں مل کر کام کرنا ہوگا۔'' لوگر بول رہا تھا۔

''یعنی، اطلاعات کا تبادلہ۔'' ایک چیف نے کہا۔ وہ بھی خاصا دیوپیکر آدمی تھا مگر پڑھا لکھا لگتا تھا۔

''ٹھیک ہے؟'' اس نے سب کی طرف دیکھا۔

''ہاں۔ اسی لیے میں نے یہ میٹنگ طلب کی۔'' لوگر نے کہا۔ ''ابھی تک اغوا کرنے والوں کو نہیں ملا ہے مگر وہ پھر کوشش کر سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں ابھی انہوں نے اپنی قیدیوں کو مارا نہیں ہوگا۔ مگر ہمیں قیدیوں کی زندگی یا موت سے زیادہ فکر ہے کہ ہم کسی طرح ان اغوا کرنے والوں کا پتا چلا لیں۔ نہیں تو خود ہماری اپنی زندگی مختصر ہو جائے گی۔''

کورین کے باپ کی کمپنی کا آفیسر اسمتھ ذرا ناٹے قد کا آدمی تھا اس نے ہامی بھری اور اپنا سر ہلایا۔ اس کے چہرے کے نقش کسی کوبرے جیسے تھے۔ اس کی آنکھیں نکلی ہوئی سی تھیں اور پلکیں ناپید تھیں۔ ''ہم ساتھ ہیں ہمارے ایکشن بھی ساتھ ہوں گے۔'' اس نے کہا۔

''یہی بہتر طریقہ ہے۔'' لوگر نے کہا۔

کسی نے مخالفت نہیں کی مگر کوئی کسی پر بھروسہ نہیں کر رہا تھا۔ تینوں چاہتے تھے کہ جس کسی نے بھی ڈبل کراس کیا اسے مار دیا جائے گا۔

چوں کہ اجتماعی کوشش والی بات لوگر کی تھی اس نے سب سے پہلے اپنی معلومات ظاہر کیں۔ مگر یہ کچھ زیادہ نہ تھیں۔ پھر اسمتھ نے بتایا۔

پھر دیسٹین نے۔

بات ہو چکی تو وہ سب چپ ہو گئے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ ان کے پاس کوئی سراغ نہ تھا۔ سب بیٹھے ایک دوسرے کی باتوں پر غور کر رہے تھے پھر دیسٹین نے اسمتھ سے کہا۔ ''تم نے بتایا کہ تمہارے کسی آدمی نے یونیورسٹی کے کسی طالب علم سے بات کی تھی جس نے بتایا تھا کہ کورین نے اس کی کار میں بیٹھ کر ایک ٹائی شاپ تک گئی تھی۔''

اسمتھ نے کہا۔

''سوال یہ ہے کہ ایک کالج گرل کسی ٹائی شاپ میں کیوں گئی تھی؟'' اسمتھ نے شانے اچھالے..... ''کسی بوائے فرینڈ کو تحفہ دینا ہوگا' میں نے یہ بات صرف اس لیے پوچھی تھی کہ ہمارا ایک آدمی یہ پتا کرتا ہے کہ پچھلے دنوں لڑکی نے کس کس سے باتیں کی تھیں۔ اس نے ایک کال کا پتا کیا ہے جو فلوریڈا کی گئی تھی۔ ایک ریٹائرڈ آدمی سے جو کوئی ستر سال کا ہے۔''

''اور یہ باتیں کیا تھیں؟'' لوگر نے پوچھا۔

''معلوم نہیں۔ مگر ہم نے اسے چیک کیا تھا۔ پتا چلا کہ وہ پہلے ادھر ہی تھا پھر اس نے اپنی جیولری شاپ بیچ دی تھی جس میں کوئی ٹائی شاپ قائم کرنا چاہتا تھا۔''

تینوں افسروں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر وہ مسکرائے۔ انہوں نے اپنی ٹائی ٹائٹس بے خیالی میں چھوئیں جو کسی بھی طرح ٹائٹ نہیں تھیں۔

☆

صید اور صیاد یعنی چھ اشترا کی کھانے کے بعد SUV میں شہر کی طرف جا رہے تھے۔

یہ کام کا وقت تھا۔

کٹنگ ٹارچ گاڑی میں رکھی ہوئی تھی۔ آج شام میں اس کی ضرورت پڑنے والی تھی اور کل تک وہ سب کے سب دولت مند ہونے والے تھے۔

''کچھ تو زیادہ مالدار ہونے والے تھے اور غیر قانونی طرح ہی سے سہی خود کفیل ہو رہے تھے۔

ٹائی شاپ کے پیچھے گاڑی پارک کرنے کے بعد وہ سامنے آئے اور دروازے اندر چل دیے۔

یہ جگہ گرم ہو رہی تھی اور بو دے رہی تھی۔ بالکل سرنگ کی طرح۔ لیکر عقبی کمرے کی طرف سب کو لے گیا اور پھر سرنگ میں۔ اس کے پیچھے اینڈرین تھا اور تینوں لڑکیاں تھیں اس کے بعد لنک تھا۔ پانچ فٹ گہرائی میں لیکر نے لائٹ روشن کی۔ روز نے دیکھا اور خوش ہوئی سرنگ بس ختم ہونے والی تھی۔

معاً اینڈرین اس کے سامنے رک گیا۔ پھر سبھی رک گئے۔

''کیا..... کیا ہو رہا ہے؟'' روز نے ڈوبتے لہجے میں پوچھا وہ اپنے باپ سے خوب واقف تھی۔ اسے آسانی سے شکست نہیں دی جا سکتی تھی۔

''میں نے یہاں سارے اوزار لائن سے رکھے تھے۔ سب غائب ہیں۔'' لیکر نے تشویش سے کہا۔

''آ جاؤ سب اندر آ جاؤ۔ انہیں ہم نے تمہارے لیے ادھر جمع کر دیا ہے۔'' ایک گونجیلی آواز ابھری۔

لیکر کا دماغ چکرانے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یہ کیا ہو رہا ہے۔ گویا قسمت ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ اب آواز کے حکم پر آگے بڑھنا ہی تھا۔ والٹ تلے۔ پھر اس کے پیچھے بقیہ بوگیاں بھی متحرک ہو گئیں۔

دو بھاری بھرکم افراد ان کے منتظر تھے۔ دونوں کے پاس اسلحہ تھا۔ لیکر نے انہیں دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ یہ لوگ بہرحال پولیس کے نہ تھے۔ ان کے جسم پر سوٹ تھے۔ مہنگے سوٹ، ان کے جوتے بھی عمدہ تھے۔ ایک ہاتھ میں بڑی سی ہیرے کی انگوٹھی تھی..... ایک نے رولیکس باندھ رکھی تھی۔ ان کے عقب میں ان کے اوزار بیلچے، ٹوکریاں، سلاخیں وغیرہ پڑی تھیں۔

لنک آخری آنے والا نہ تھا۔ اس کے سر پر ایک شخص پستول سمیت مسلط تھا۔ یہ بقیہ دونوں سے قد میں ناٹا تھا۔ مگر شکل میں کسی کوبرے جیسا تھا۔

لیکر کو یقین تھا کہ یہ لڑکیوں کے باپ نہیں ہیں۔ یہ شکلوں سے غنڈے لگتے تھے۔

''روز ناظر۔'' ان بھاری بھرکم لوگوں میں سے ایک نے کہا۔ جس کی آنکھیں برفیلی سی تھیں۔ ''میں تمہارے باپ کے لیے کام کرتا ہوں۔'' روز نے جان لیا کہ یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وہ اسے ایک بار دیکھ چکی تھی۔ اسے یاد آیا کہ اس کا نام لوگر ہے۔

''تم تینوں۔'' ناٹے قد والے کوبرے نے کہا۔ ''ایک جگہ کھڑے ہو جاؤ۔ ادھر تا کہ ہم تمہیں دیکھ سکیں۔''

اس نے لنک کو دھکا دیا۔ ''لڑکیوں سے ہٹ کر۔''

''ٹھہرو۔'' ڈونا نے آواز نکالی۔

''پیچھے ہٹو۔'' لنک جھنجلایا جب اسے دوسرا دھکا لگا۔

لیکر نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''کچھ کہنے کی ضرورت نہیں یہ پولیس کے لوگ نہیں ہیں۔''

''ہم سیکورٹی کے لوگ ہیں۔'' دوسرے آدمی نے کہا اور پستول لہرایا۔ ''اپنے ساتھیوں کی طرف جاؤ۔'' اس نے لیکر سے کہا۔

برفیلی آنکھوں والا مسکرایا۔ ''کوئی پولیس ادھر نہیں آئے گی۔ تم لوگوں نے خود ہی منع کیا تھا نا۔ اب ہم تم کو اپنے آقاؤں کی خدمت میں پیش کریں گے اس کے بعد تمہاری ملاقات پولیس سے بھی ہوگی مگر کہاں۔ یہ ہمیں نہیں معلوم۔''

''شکر ہے کہ تم یہاں ہو۔'' روز نے کہا۔

سبھوں نے حیرت سے روز کو دیکھا۔ پھر وہ مڑی اور سرنگ سے باہر چل دی ٹائی شاپ میں۔

''تم کہاں چلیں؟'' ناٹے قد والے کوبرے نے پوچھا۔ مگر اس نے مزید کچھ نہیں کہا۔

''میں فادر کو فون کروں گی۔ بتاؤں گی کہ میں محفوظ ہوں یہاں میرا اسیل فون کام نہیں کر سکتا یہ سرنگ ہے۔''

''م..... مس ناظر۔'' برفیلی آنکھوں والا بولا..... ''اس کی کوئی ضرورت.....''

''یعنی تم مجھے فون سے روک رہے ہو؟'' روز نے اپنی آنکھیں اس پر مرکوز کردیں جن میں غصہ لہرا رہا تھا...... اس کی آنکھیں اس کے باپ کی آنکھوں کی طرح چبھتی ہوئی سی تھیں۔ ''یعنی تم...... اور مجھے......'' وہ غصے سے ہکلائی۔

''اوکے۔'' برفیلی آنکھوں نے تذبذب سے کہا۔

''ٹھیک ہے کرلیں فون مگر واپس آجانا۔''

وہ اس کو گھورتی رہی۔

''پلیز۔'' پھر وہ اپنے دونوں ساتھیوں سے بولا۔

''کوئی ہرج نہیں ہم تو خود فون کرنے والے تھے۔''

''مگر۔'' کوبرے نے مزاحمت کی۔

''ارے یار جو کچھ ہم چاہتے تھے وہ تو مل گیا۔'' برفیلی آنکھوں والے نے اسے قائل کرنا چاہا۔

سب چپ کھڑے تھے۔ پھر روز گھومی اور چلی گئی۔ جب وہ پلٹی تو اس کے ہاتھ میں ایک پرانا سا براؤن تھیلا تھا۔ اس نے لیکر کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ ''سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' اس نے کہا۔...... ''میں نے پولیس کو فون کردیا ہے۔''

بولتے ہوئے وہ گھومی اس کی پیٹھ تینوں سیکیورٹی آفیسروں کی طرف تھی۔ اس نے لفافے سے تین چھوٹے چھوٹے پسٹل برآمد کیے اور عجلت سے انہیں اپنی ساتھی لڑکیوں کو دیے۔ یہ ہتھیار انہی کے تھے۔ روز نے انہیں لیکر اینڈریو اور لنک کی جیکٹوں کی جیب سے برآمد کیے تھے جنہیں ان لوگوں نے باہر شاپ کے کاؤنٹر پر چھوڑ دیا تھا۔

پھر سبھی ششدر ہو کر رہ گئے سوائے تینوں لڑکیوں کے۔ انہوں نے سامنے کے سیکیورٹی آفیسروں کو پستول کی زد پر رکھ لیا تھا۔

پہلی والی پوزیشن ایک دم سے بدل گئی تھی۔

''مس ناظر۔ میں سمجھا نہیں یہ کیا کررہی ہو تم؟'' برفیلی آنکھوں نے بالآخر سوال کیا۔ اس کی گن لیکر پر اٹھی ہوئی تھی۔

''میں سمجھ گیا ہوں۔'' لیکر نے کہا۔ اس عرصے میں اس نے واقعی اس لڑکی کو قدرے سمجھ لیا تھا۔ لڑکی اس کی بات پر مسکرائی...... ''میرے ساتھیوں کو اور مجھے خبر ملی تھی کہ کوئی اس ٹائی شاپ کے اندر سے بینک لوٹنے کے لیے سرنگ تیار کررہا ہے۔ ہم نے چند ہفتوں سے اس دکان کو نظر میں رکھا ہوا تھا۔ تم تینوں......'' اس نے لوگر اور بقیہ دونوں سیکورٹی افسروں کی سمت اشارہ کیا۔

''خود کو زیر حراست سمجھو تم پر بینک لوٹنے کی کوشش کا الزام عائد کیا جارہا ہے۔''

سیکوریٹی والے حیرت زدہ ہوگئے تھے۔

''یعنی...... تم پولیس کے آدمی ہو؟'' کوبرے نے دریافت کیا۔

لنک کی شیلڈ اس کی ہپ پاکٹ میں تھی اس نے اسے نکال کر لہرایا۔

لوگر نے التجائی نظروں سے روز کو دیکھا اور گھگھیایا۔

''مس ناظر۔''

''میں یہاں نہیں ہوں۔'' روز چیخی۔ ''تم جانو تمہارا کام جانے۔'' اس نے ڈونا کو دھکیلا اور پھر وہ تینوں لڑکیاں تیزی سے سرنگ سے نکل گئیں۔

ذرا سی دیر بعد باہر سائرن گونجنے لگے۔ پولیس کار شاید کہیں قریب ہی رہی ہوگی۔

''تمہاری باتیں کام نہیں کریں گی۔'' لوگر نے کہا۔

لیکر مسکرایا...... ''چلیں گی۔ ہم ان اوزاروں کو ہمیشہ دستانوں کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ جب کہ تم نے انہیں ہاتھوں سے اٹھایا ہے اور پھر شاپ میں بھی تمہارے ہاتھوں کے نشانات ہوں گے کیا یہ ثبوت کافی نہیں ہے اس کے علاوہ بھی......''

''وہ کیا ہے؟''

''تم اس وقت اس سرنگ میں جو نیشنل بینک کے والٹ کے نیچے بنی ہے۔''

پھر سرنگ کے منہ پر شور اٹھا آوازیں ابھری۔ پولیس آچکی تھی۔ دوسری پولیس۔ دوسرے پولیس والے۔

''میرا مشورہ ہے تم لوگ اپنے پستول نیچے ڈال دو۔ لیکر نے کہا...... ''یہ تمہارے لیے خطرناک ہوں گے۔''

تینوں سیکورٹی چیف مجبور ہوچکے تھے ان کے سامنے کوئی اور راہ نہ تھی۔ یہ تینوں لیکر کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''تم جو کچھ کہو گے...... تمہارے خلاف استعمال کیا جائے گا۔'' لیکر نے قانونی عمل کیا اور انہیں ان کے حقوق پڑھ کر سنائے۔

''تمہاری کسی بات کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔'' لنک نے ناٹے کوبرے کو گھورتے ہوئے کہا۔ جس نے اسے دھکے دیے تھے۔

☆

اور واقعی ان کی باتوں کو نہیں مانا گیا تھا۔ کیوں کہ روز، ڈونا اور کورین تینوں نے لیکر، اینڈریو اور لنک کے ساتھ گواہی دی تھی۔

ان تینوں پر مقدمہ چلا تھا اور انہیں بنک لوٹنے کی کوشش کے جرم میں دس دس سال کی سزائیں دی گئی تھیں۔ ان کے آقاؤں نے ان سے کہا تھا کہ وہ جیل میں باہر کے مقابلے میں زیادہ محفوظ رہیں گے۔

ڈونا نے پیر پٹخے تھے۔

کورین چیخی چلائی تھی۔

اور ان کے گھر والوں نے انہیں معاف کردیا تھا۔ انہوں نے ان سے کہا تھا کہ یہ اغوا والی بات خود انہوں نے اڑائی تھی دراصل وہ تینوں خفیہ طور پر BELIZE گھومنے چلی گئی تھیں۔

البتہ روز اپنے باپ کو مطمئن نہیں کرسکی تھی کہ جو کچھ ہوا بس بات اسی قدر تھی۔ ادھر خود ناظر نے مناسب نہیں سمجھا تھا کہ بہت زیادہ کھوج کرے۔ کیوں کہ اب تو سب کچھ ٹھیک ہوچکا تھا۔ اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔

اس کا کچھ نہیں گیا تھا سوائے ایک ناقابل اعتبار سیکیورٹی چیف کے۔

لیکر...... اینڈری اور فنک کو اس کارنامے پر بہت داد ملی تھی۔

پھر کورین اور اینڈریو نے ملاقاتیں شروع کردی تھیں اسی طرح لنک اور ڈورا کے درمیان بھی سلسلہ چل پڑا تھا...... تاہم ان کے درمیان بات بس دوستانہ تعلقات تک ہی تھیں اور بس۔

جبکہ لیکر اور روز کے ساتھ معاملات کافی آگے چلے گئے تھے...... اور پھر ایک روز، روز نے لیکر سے کہا کہ اب انہیں شادی کرلینی چاہیے۔ وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اب خود کفیل ہوچکی تھی۔ اس کا ناول۔ ''ڈرٹ اینڈ لو'' چھپ کر بیسٹ سیلر ثابت ہوا تھا اور یہ ساری کہانی حقیقت تھی مگر کسی کو بھی شبہ نہیں ہوا تھا۔

''دیکھو میں صاف بتادوں۔ مجھ سے یہ مجرمانہ حرکات نہیں چھٹنے کی۔'' اس نے جواباً کہا۔ ''کیا تم اپنے شوہر کو جیل میں دیکھنا چاہو گی؟''

روز ہنسی...... تمہارے سارے معاملات قانونی ہوں گے چاہے جس طرح چلو۔''

''دیکھو روز۔'' اس نے تذبذب سے کہا۔ ''بعد میں مجھے کچھ نہ کہنا۔''

''میں تمہیں ایک بات بتاتی ہوں...... یہ تو ڈونا اور کورین کو بھی نہیں معلوم۔'' روز نے کہا۔ ''یہ جو نیشنل بینک ہے نا...... یہ میرے فادر کی ملکیت ہے۔'' وہ ہنسی۔ ''تم کیوں گھبرا رہے ہو۔ تم چاہو تو میں تمہیں اس بینک کا وائس پریزیڈنٹ بنوا دیتی ہوں۔''

لیکر نے اسے منہ کھول کر حیرت سے دیکھا اور پھر آنکھیں موند لیں...... وہ سوچنے لگا تھا کہ واقعی کہانی کوئی سا موڑ بھی لے سکتی ہے اگر مصنف کی ایسا شامل حال ہو۔

☆☆☆

جلن

شوبز کی دنیا بظاہر روشنیوں اور شہرت زندگی کی رنگینیوں سے آراستہ ہوتی ہے مگر اس کی تہ میں چھپی تاریکی کا اندازہ صرف اس سمندر میں اترنے والوں کو ہی ہوتا ہے۔ جہاں قدم قدم پر سازشیں انڈر ورلڈ کے خطرات عوام کے چہیتے اداکاروں کی زندگی کو اجیرن بنا دیتے ہیں۔
ایک اداکار کا احوال' وہ اپنے محسن چکانا چاہتا تھا مگر اس شہرت کی بلندیوں تک پہنچانے والا محسن اس کے لیے کچھ اور ہی سوچ بیٹھا تھا۔

فاروق انجم

جرم وسزا کے موضوع پر ایک اچھوتی تحریر' غیر متوقع انجام کی دلچسپ کہانی

فلم انڈسٹری میں جہاں دوسرے اوّل کلاس کے ہیرو تھے وہاں راہول کپور کا نام بھی ان کے ساتھ ہی لیا جاتا تھا۔

راہول نے یکے بعد دیگرے چند کامیاب فلمیں دے کر اپنا ایک نمایاں مقام بنالیا تھا۔ فلم انڈسٹری کا ہر بڑا فلم ساز اُسے اپنی فلم میں لینے کا متمنی تھا۔ وہ دن رات شوٹنگ میں مصروف تھا ایک سیٹ سے نکل کر اس کی گاڑی دوسرے سیٹ کی طرف دوڑ پڑتی تھی۔ رات گئے وہ اپنے بنگلے میں لوٹتا تھا' ایسا بھی ہوتا تھا کہ جب سورج اپنی پہلی آنکھ کھولتا تو راہول کی گاڑی اس کے بنگلے کے اندر جارہی ہوتی تھی۔

راہول کو اپنے کام سے پیار تھا۔ وہ کسی بھی فلمساز کو ناجائز تنگ نہیں کرتا تھا۔ کام کرنے کا اُس نے اپنا ایک اصول وضع کر رکھا تھا اور وہ اس کے اندر رہ کر ہی کام کرتا تھا۔ فلم انڈسٹری کا ہر آدمی یہ جانتا تھا کہ راہول اپنے اصول کے حصار سے نہ کبھی باہر نکلے گا اور نہ ہی کسی کو اس سے باہر نکلنے کی اجازت دے گا۔ اس لئے ہر فلمساز اس کے ساتھ کام کر کے خوش ہوتا تھا۔

راہول نے یہ مقام بڑی محنت سے حاصل کیا تھا۔ وہ جب اس شہر میں آیا تھا تو اُس نے کئی راتیں فٹ پاتھ پر گزاری تھیں۔ بھوکے پیٹ اُس نے اسٹوڈیوز کے کئی کئی چکر لگائے تھے۔ وہ اپنا ماضی نہیں بھولا تھا۔ جب وہ اس شہر میں فلم انڈسٹری میں درج کرنے کا خواب لے کر آیا تھا تو اُس نے یہ بات اپنے دل میں بٹھالی تھی کہ وہ کبھی بھی کسی بھی کمرشل میں کام نہیں کرے گا۔ وہ فلم کا ہیرو بنے گا کسی کمپنی کی پروڈکٹ کا سیل مین نہیں بنے گا۔ خواہ اس کے لئے اُسے کتنی ہی پیشکش کیوں نہ ہو۔ اس لئے اس نے ابتدائی دنوں میں بھی کبھی کسی کمرشل کے لئے جدوجہد نہیں کی تھی۔

راہول کا سیکریٹری اشوک چالیس سال کی عمر کے لگ بھگ شخص تھا۔ وہ اپنی شکل وصورت سے کسی بھی طرح کسی ہیرو سے کم نظر نہیں آتا تھا۔ وہ بھی اس شہر میں ہیرو بننے کا ہی خواب لے کر آیا تھا لیکن اُس کی قسمت نے ساتھ نہیں دیا اور وہ ایک دن راہول کا سیکریٹری بن گیا تھا۔

اشوک بہت تیز طرار اور زیرک شخص ہونے کے ساتھ ساتھ بہادر بھی تھا۔ دن کے وقت وہ اپنی آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھائے رکھتا تھا۔ کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ اس کی نگاہ کس پر اور کہاں ہے۔ اس کی بیوی جوشی خوبصورت

عورت تھی۔ وہ راہول کی ڈریس ڈیزائنر کی حیثیت سے کام کرتی تھی اور اپنے کام میں وہ بہت ماہر تھی۔

اشوک اور جوشی کا ایک خواب اور بھی تھا کہ وہ اپنی پروڈکشن کمپنی کھول کر فلم ساز کی حیثیت سے بھی جانے جائیں۔ وہ اپنا کام راہول کے ساتھ ایمانداری کے ساتھ کر رہے تھے۔

ان دنوں راہول دو فلموں کی شوٹنگ میں مصروف تھا۔ وہ جلد از جلد اپنی دی ہوئی تاریخوں میں اپنا کام ختم کرادینا چاہتا تھا۔ اس کے بعد وہ کچھ آرام کرنے کے بعد اپنا کام جاری رکھنے کا پلان کر چکا تھا۔

اُس صبح جب راہول اپنے کام پر جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا' ایک بڑی گاڑی اس کے بنگلے میں داخل ہوئی۔ راہول نے اپنے چوکیدار سے کہہ رکھا تھا کہ دیپک چوپڑہ جب بھی آئیں' ان کی گاڑی ایک پل کے لئے بھی باہر نہیں رکنی چاہیے اور اُس گاڑی میں دیپک چوپڑہ ہی تھا۔

دیپک چوپڑہ درمیانے قد کا پچاس سال کی عمر کا ایک شخص تھا۔ اُس کے سر کے بال بے ترتیب بڑھے رہتے تھے۔ یہی اس کے بالوں کا انداز تھا۔ وہ کمرشل فلموں کا بے تاج بادشاہ تھا۔

اس کی بہت بڑی کمرشل بنانے کی کمپنی تھی۔ وہ بہت مہنگا کمرشل تیار کرتا تھا اور اس کے کمرشل کا انداز جہاں الگ ہوتا تھا' وہاں اس میں ایسے چہرے ہوتے تھے جو اس سے پہلے لوگوں نے کسی اشتہار میں نہیں دیکھے ہوئے تھے۔ وہ اپنے دیکھنے والوں کو ہی نہیں اپنے ہم عصروں کو بھی چونکنے پر مجبور کر دیتا تھا۔

جب دیپک اندر آگیا تو اُس وقت اشوک ایک طرف بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ دونوں نے ایک ساتھ ایک دوسرے کو دیکھا۔ دیپک اُسی جگہ رک گیا اور اشوک اپنی جگہ بیٹھا محض اُسے دیکھتا رہا تھا۔

اس بات کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ایک بہت بڑی پارٹی میں جہاں فلم کے بڑے بڑے لوگ شریک تھے' اشوک کی ایک چھوٹی سی بات پر مشتعل ہو کر دیپک نے اُس کے منہ پر اتنی زور سے تھپڑ مار دیا تھا کہ اس کی گونج ہال کے شاید آخری کونے تک گئی تھی۔

اس تھپڑ کی آواز سن کر ہر وہ شخصیت جو پارٹی میں شریک تھی' دم بخود رہ گئی تھی۔ بات شاید اُس وقت مزید آگے بڑھ جاتی' قریب کھڑے لوگوں نے ان کے درمیان میں آ کر بات آگے نہیں بڑھنے دی تھی۔

اس بات کو پریس نے کئی دن تک اپنی خبر کا حصہ بنائے رکھا تھا۔ اس بات کو جو لوگ نہیں جانتے تھے وہ بھی جان گئے تھے۔ اشوک نے اس بات کو اپنی بہت بڑی بے عزتی سمجھ کر اپنے دل میں بٹھالیا تھا۔ وہ ہر روز اُس تھپڑ کو یاد کرتا تھا اور دیپک سے اپنی اس بے عزتی کا انتقام لینے کے بارے میں اندر ہی اندر کڑھتا رہتا تھا۔

اُس وقت بھی اُس نے اچانک دیپک کو دیکھا تو اس کا دل ودماغ جیسے اُبلتی ہوئی ہنڈیا کی مانند کھولنے لگا تھا۔ دیپک نے اشوک کی طرف دیکھ کر اپنا منہ دوسری طرف کیا اور اسی اثناء میں ملازم بھاگ کر اس کے پاس آگیا۔

''راہول کو بتاؤ کہ میں آیا ہوں۔'' دیپک نے کہا اور خود ایک طرف بیٹھ کر میز سے ایک رسالہ اُٹھا کر دیکھنے لگا۔

اشوک نے اپنی ڈائری بند کی اور اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اُسے جاتا دیکھ کر دیپک نے ایک تمکنت سے اپنے چہرے پر مسکراہٹ چھوڑی اور اپنی نگاہیں پھر رسالے پر مرکوز کر دیں۔

''ہیلو مسٹر دیپک۔'' راہول جیسے ہی سیڑھیاں نیچے اُترا اور وہ خوش دلی سے بولا اور دیپک کے گلے لگ گیا۔ اسی وقت اشوک بھی آگیا۔

''سیٹ پر آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔'' اشوک نے آتے ہی اپنی گھڑی پر وقت دیکھتے ہوئے راہول کو باخبر کیا۔

''ہاں بس چلتے ہیں۔'' راہول نے کہا اور دیپک کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ''آپ مجھے حکم کرتے میں آپ کے پاس آجاتا۔''

''اپنی چائے بچانے کے چکر میں ہو۔'' دیپک مسکرایا۔
راہول ہنسا۔ ''آپ کے لئے ایک کپ چائے کیا' پانچ فٹ دس انچ کا یہ شخص بھی حاضر ہے۔''
''دراصل میں اس پانچ فٹ دس انچ کے آدمی کے لئے ہی آیا ہوں۔'' دیپک نے کہا اور اپنی جیب سے کچھ کاغذات نکال کر اس کے آگے کرتے ہوئے' اپنے دوسرے ہاتھ سے پنسل نکالی اور راہول کی طرف بڑھا کر کہا۔ ''یہاں سائن کر دو۔''
راہول نے ایک نظر ان کاغذات کی طرف دیکھا اور پھر رکتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ...... کیا ہے۔؟''
دیپک نے آنکھیں اس کی آنکھوں میں پیوست کرتے ہوئے پوچھا۔ ''راہول کیا تم مجھے جانتے ہو؟''
''ہاں کیوں نہیں جانتا...... یہ کیسا سوال ہے۔'' راہول نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ اشوک بھی متحیر تھا۔
''کون ہوں میں؟'' دیپک نے متانت سے پوچھا۔
''آپ دیپک چوپڑہ ہیں۔ اس ملک کے بہت بڑے ایڈمیکر۔'' راہول کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔
''بس......؟'' اس نے پھر دیکھا۔
''جب میں سڑکوں پر مارا مارا پھر رہا تھا تو آپ نے میری مدد کی تھی اور مجھے ایک فلم میں اہم رول دلایا تھا۔ وہ رول مجھے عروج پر لے گیا تھا۔'' راہول نے کہا۔ ''مجھے اپنے دفتر میں بلا کر آپ کی ایک فون کال نے مجھے فلمی ہیرو بنا دیا تھا۔''
''جب تم کامیاب ہو گئے تھے تو تم نے مجھے ڈنر پر بلایا تھا اور مجھے کہا تھا کہ میرا یہ فن آپ کا ہے۔ زندگی میں جب بھی کبھی آپ مجھے کوئی حکم کریں گے تو آپ کو انکار نہیں کروں گا۔ میں تمہیں حکم تو نہیں دیتا گزارش کرتا ہوں کہ تم اس ایگریمنٹ پر دستخط کر دو۔ تم میرے ایک کمرشل میں کام کرنے کا معاہدہ کر رہے ہو۔'' دیپک نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

راہول کے ساتھ ساتھ اشوک بھی چونک پڑا تھا۔ کئی سال گزرنے کے بعد کئے ہوئے احسان کا جو پتا دیپک نے سنبھال کر رکھا تھا وہ عین راہول کے عروج پر کھیلنے کے لئے آ گیا تھا۔
راہول تذبذب میں بیٹھا ان کاغذات کو دیکھے جا رہا تھا۔ اُسے وہ وقت یاد آ گیا جب حال ہی میں ایک بہت بڑے کمرشل کی بہت بڑی آفر کو اس نے ٹھکرا دیا تھا تو ایک موقعہ پر صحافی کے سوال پر اُس نے کہا تھا کہ وہ کوئی سیل مین نہیں ہے۔ ایک اداکار ہے وہ کبھی بھی کمرشل نہیں کرے گا۔''
''اور اگر زندگی میں کبھی آپ اپنے اس فیصلے کو تبدیل کرنے پر مجبور ہو گئے تو؟'' صحافی کا اگلا سوال تھا۔
راہول نے مسکرا کر کہا تھا۔ ''کوئی مجبوری بھی میرا یہ فیصلہ نہیں بدل سکتی۔''
وہ سوال و جواب ٹی وی کی اسکرین پر سب نے دیکھا اور سنا تھا۔ اتنی بڑی پیشکش کو ٹھکرانے کی بھی خبر کئی دن تک اخبارات میں آ رہی تھی۔
''کیا سوچ رہے ہو؟'' اچانک دیپک نے پوچھا۔
''کچھ...... نہیں۔'' راہول نے کہا۔
''تو پھر دستخط کر دو یا میرے کاغذات مجھے لوٹا دو۔'' دیپک نے کہا۔
راہول احسان فراموش نہیں تھا۔ آج وہ جس مقام پر تھا وہ دیپک کی وجہ سے ہی تھا۔ اُس نے اسی بات کو سامنے رکھ کر معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ اشوک کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔
دیپک نے وہ کاغذات اپنی جیب میں ڈالے اور کہا۔ ''شکریہ تم نے میرا مان رکھا۔ میں آج تک کسی کے پاس بھی کسی کو اپنے کمرشل میں سائن کرنے کے لئے نہیں گیا لیکن تمہارے پاس خود چل کر آیا۔ اس لئے کہ پارٹی صرف تمہارے ساتھ کمرشل کرنا چاہتی تھی اور میں اُنہیں زبان دے آیا تھا کہ ساری دنیا کو راہول انکار کر سکتا ہے

لیکن مجھے نہیں۔ یہ بات ایک ہفتہ تک خفیہ رہے گی۔ اس کے بعد ایک بڑی پریس کانفرنس ہو گی جس میں کمرشل میں کام کرنے کا اعلان کیا جائے گا اور اس کے بعد چار دن کا کام ہو گا۔ کوئی بھی تاریخیں ایک ساتھ دے دینا۔''
دیپک نے مزید کہا۔ ''تم نوٹ کر لو آج ہفتہ ہے اور اگلے ہفتے شام چھ بجے پریس کانفرنس ہو گی۔''
دیپک نے کہا اور اُٹھ کر چلا گیا۔ راہول یوں کھڑا تھا جیسے اس نے اپنی بہت ہی قیمتی چیز اُٹھا کر کسی کو دے دی ہو۔ اشوک خیرہ نگاہوں سے اس کا منہ دیکھے جا رہا تھا۔

☆☆☆

راہول نے اپنا سین جیسے تیسے ختم کرایا اور اپنی کار میں جا کر بیٹھ گیا۔ اُس نے اشوک کو بھی وہاں بلا لیا تھا۔ کوئی بات کرنے کے لئے اس سے محفوظ جگہ اور کوئی جگہ نہیں تھی۔ کار کے شیشے چڑھے ہوئے تھے۔
''میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ نے یہ کیا کیا ہے۔'' اشوک کو بھی اسی وقت بات کرنے کا موقعہ ملا تھا۔ وہ اندر بیٹھتے ہی بولا۔
''مسٹر دیپک چوپڑہ کے احسان کا تقاضا یہی تھا کہ میں اُس معاہدے پر سائن کر دیتا۔ جو کہ میں نے کر دیئے۔'' راہول کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔
''آپ اس وقت کوئی بھی بہانہ کر سکتے تھے۔'' اشوک نے کہا۔
''جب میں کچھ بھی نہیں تھا تو مسٹر دیپک نے بغیر کسی تردد کے میرے لئے فون کر کے مجھے ایک فلم دلا دی تھی۔ میں نے ویسا ہی کر دیا۔ اب وقت ان باتوں کا نہیں ہے کہ اس بات پر بحث کی جائے۔ اشوک میں نے معاہدے پر سائن کر کے مسٹر دیپک کا احسان اتار دیا ہے۔ اب کچھ ایسا سوچو کہ سانپ مر جائے اور لاٹھی بچ جائے۔''
اشوک نے کچھ توقف کے بعد سوچ کر کہا۔ ''آپ کیا چا[illegible]؟''
''[illegible]سا کرو لیکن مجھے کمرشل میں کام نہ کرنا پڑے۔ میں اپنی کہی ہوئی بات پر ساری زندگی قائم رہنا چاہتا ہوں۔'' راہول نے مضطربانہ انداز میں اپنے سر کے بالوں میں اُنگلیاں پھیریں۔
''میں ایسا کر سکتا ہوں کہ آپ پر آنچ بھی نہ آئے اور یہ معاملہ ختم ہو جائے۔'' اشوک نے معنی خیز انداز میں کہا۔
راہول نے اس کی طرف دیکھا۔ ''ویسے تم کیا کرو گے؟''
''یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔'' اشوک بولا۔
''اتنا خیال رہے کہ مجھ پر نہ تو اُنگلی اُٹھے اور نہ ایسے حالات ہوں کہ میرے ماتھے پر احسان فراموش کا لیبل لگے۔'' راہول نے ہدایت کی۔
''ایسا ہی ہو گا۔ سب جانتے ہیں کہ آپ کو فلم میں پہلا چانس دیپک کے کہنے پر ملا تھا۔ جو میں کروں گا اُس سے سارا معاملہ صفائی سے ختم ہو جائے گا اور اس کے بعد ہم یہ بات عیاں کریں گے کہ آپ نے اُس احسان کے بدلے میں ان کا کمرشل بھی سائن کر لیا تھا۔ اس سے آپ کو اور بھی عزت ملے گی۔'' اشوک نے کہا۔
''اس بات پر ہم بعد میں سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے۔ پہلے تم اس معاملے کو ختم کرو اور یہ یاد رہے کہ پریس کانفرنس سے پہلے سب کچھ صاف ہو جانا چاہئے۔'' راہول نے کہا۔
''ایسا ہی ہو گا۔ آپ بے فکر ہو جائیں اور اپنے کام کی طرف توجہ دیں۔'' اشوک نے کہا
اگلا شاٹ تیار تھا۔ راہول گاڑی سے باہر نکل گیا۔ اشوک کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔
پارٹی میں دیپک کے تھپڑ سے جو آگ اشوک کے سینے میں شعلے بن کر جل رہی تھی۔ اُس کو بجھانے کا وقت آ گیا تھا۔ وہ راہول کی آڑ میں اپنی آگ کو بجھانے کی سوچ رہا تھا۔ دیپک کو دیکھتے ہی جو جلن اسے ہوتی تھی وہ اس کے مرہم کا سامان کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

اشوک ایک تنگ سی گلی میں گیا اور ایک مکان کے سامنے کھڑے ہو کر اُس کی بیل دی۔ کچھ ہی دیر بعد دروازہ کھلا اور اندر سے ایک چہرہ نمودار ہوا اور اُس نے اشوک کو اندر آنے کے لئے کہا۔

صحن سے ہو کر وہ ایک بڑے کمرے میں چلے گئے۔ وہاں ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ ٹیلی وژن پر میچ چل رہا تھا۔ کمرے میں سگریٹ کا دھواں پھیلا ہوا تھا اور اُس آدمی کے سامنے رکھی ایش ٹرے مسلے ہوئے سگریٹوں سے بھری ہوئی تھی۔ وہ آدمی اشوک کو دیکھتے ہی یکدم اُٹھ کھڑا ہوا اور گرم جوشی سے اس سے مل کر اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔ اشوک کو اندر لانے والا آدمی باہر نکل گیا تھا۔

"آج کیسے اِدھر کا راستہ بھول گئے؟" اُس آدمی نے پوچھا۔

"تم تو جانتے ہی ہو کہ مصروفیت اتنی ہے کہ اپنی شکل بھی آئینے میں دیکھنے کی فرصت نہیں ہے۔" اشوک نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں بھئی ایک بڑے ہیرو کے سیکریٹری ہو۔ نہ اُسے فرصت ہے اور نہ تجھے۔" وہ آدمی بولا۔ "کیا منگواؤں۔ ٹھنڈا گرم؟ جو تجھے پسند ہو۔"

"وقت نہیں ہے بس کام کی بات کروں گا اور چلتا بنوں گا۔ ایک آدمی کو ٹھکانے لگانا ہے۔" اشوک نے مطلب پر آتے ہوئے کہا۔

"کون ہے؟" اس نے پوچھا۔

"اس کا نام دیپک چوپڑہ ہے۔" اشوک نے اُس کا نام بتایا۔

نام سنتے ہی وہ ہنس پڑا۔ "تجھے تو تب بھی کہا تھا کہ ہم یاروں کے یار ہیں۔ تیرے منہ پر اُس نے تھپڑ جڑا ہے بول دوستی میں پار کر دوں۔ مگر تم مانے ہی نہیں۔ اَب کیا ہو گیا۔؟"

"بات وہ نہیں ہے۔ دراصل بات کچھ اور ہے۔" اشوک نے کہا اور دروازے کی طرف دیکھ کر اختصار سے اُسے ساری بات بتا دی۔

"اچھا...... ٹھیک ہے کام ہو جائے گا۔" ساری بات سن کر وہ آدمی بولا۔

"اَب تم سے کیا چھپانا' کام دوسرے طریقے سے بھی ہو سکتا ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس کام کے ساتھ ساتھ میرا حساب بھی چکتا ہو جائے۔" اشوک نے ایک آنکھ دبا کر کہا۔

وہ آدمی پھر ہنسا۔ "اچھا ہے...... اچھا ہے۔ یہ بتاؤ کہ سیدھا سیدھا ٹھوک دوں یا کہ کچھ اور معاملہ کرنا ہے؟"

"یہ کام کرے گا کون؟" اشوک نے پوچھا۔

"میں خود کروں گا۔" اس نے جواب دیا۔

"میں بھی یہ ہی چاہتا ہوں کہ یہ کام تم ہی کرو۔ دیپک کی ایک عرصے سے روٹین ہے کہ وہ رات دو بجے تک کام کرتا ہے اور رات تین' ساڑھے تین بجے تک وہ اپنے گھر آ جاتا ہے۔ اپنے اس شیڈول سے وہ باہر نہیں نکلتا۔ تم اس سے پہلے اس کے گھر جا کر اس کے اہلِ خانہ کو باندھ کر اپنے مطلب کی جو چیز لوٹنا چاہو لوٹ لینا۔ یعنی کہ یہ نظر آئے کہ نامعلوم چوروں نے گھر لوٹنے کے دوران مزاحمت پر دیپک کو مار دیا۔"

"میں سمجھ گیا۔" وہ بولا۔

"دیپک اپنی گاڑی میں آتا ہے۔ اس کے گھر کے باہر کوئی گیٹ اور باؤنڈری وال نہیں ہے۔ گھر کے باہر ایک باغیچہ ہے اور اس کے ساتھ ہی گھر کا مین دروازہ ہے تم اندر اُس کا انتظار کرنا۔ گاڑی کی آواز سے تمہیں پتہ چل جائے گا کہ وہ آ گیا ہے' اس کے اندر آتے تم کام تمام کر دینا۔" اشوک نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ایسا ہی ہو گا تم بے فکر ہو جاؤ۔" اُس آدمی نے کہا۔

اشوک نے اپنے کوٹ کی جیب سے ہزار ہزار کے نوٹوں کی گڈی نکال کر اس کی طرف بڑھا کر کہا۔ "کام ہوتے ہی تمہیں خوش کر دیا جائے گا۔ یاد رہے کہ راز داری بہر صورت ممکن رکھنی ہے۔ اُن کے گھر کا سامان بکھیر دینا۔"

وہ آدمی جس کا نام گرو تھا۔ اُس کی بات سن کر ہنسا اور بولا۔ "اَب تم بطخ کے بچے کو بتاؤ گے کہ تیرنا کیسے ہے؟"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔" اشوک نے کہا اور اجازت لے کر اس گھر سے باہر نکل گیا۔ وہ دل ہی دل میں خوش تھا کہ وہ ایک تیر سے دو نشانے لے گا۔

واپس جا کر اُس نے راہول کو ساری بات تو نہیں بتائی' البتہ اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ اُس نے ایک ایسا جال بچھا دیا کہ دیپک اس میں پھنس جائے گا اور کبھی بھی وہ کمرشل شروع نہیں کر سکے گا' جو اُسے راہول کے ساتھ کرنا تھا۔

راہول کی مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ اسے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ کیسے اور کیوں ہو گا' اُسے اشوک پر بہت اعتماد تھا۔ اس لئے وہ مطمئن ہو کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

رات کے دو بجے گرو اُس وقت دیپک کے گھر اپنے دو آدمیوں سمیت داخل ہوا' دیپک کے بیٹے کو اس کا دوست اپنی گاڑی میں چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ اپنے دوست کے ساتھ ایک کلب سے لوٹا تھا۔

گرو اپنے دو آدمیوں کے ساتھ اس گھر کے سامنے دوسرے گھر کے باغیچے میں ایک تناور درخت کے پیچھے بنی ہوئی جگہ میں چھپا بیٹھا تھا۔ وہ دن کی روشنی میں اس جگہ کا جائزہ لے چکا تھا۔ اُس درخت کے پیچھے دیوار تھی اور ساتھ ہی کچھ گملے رکھے ہوئے تھے جس سے وہ جگہ چھپنے کے لئے بڑی موزوں بن گئی تھی۔

گرو اپنے آدمیوں کے ساتھ دیپک کے گھر میں جانے کا سوچ رہا تھا کہ اچانک دیپک کا بیٹا گاڑی سے اُترا اور اپنے گھر کی طرف بڑھا' جیسے ہی اُس کی ماں نے دروازہ کھولا گرو اپنے آدمیوں کے ساتھ مستعدی سے بھاگ کر اُس جانب بڑھا اور اُس لڑکے کے سر پر پستول رکھتے ہی گھر کے اندر چلے گئے۔ کوئی شور نہ ہوا گھر کا دروازہ بند ہو گیا' کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوئی کہ کیا ہو گیا ہے۔

دیپک کی فیملی چھوٹی تھی۔ بیوی دو بیٹے اور ایک بارہ سال کی بیٹی تھی۔ گرو نے سب کو ایک کمرے میں اکٹھا کیا اور کرسیوں پر بٹھا کر باندھ دیا۔ گرو اور اُس کے دونوں آدمیوں کے چہروں پر نقاب تھے۔

"کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو۔" دیپک کی بیوی نے پوچھا۔ وہ سب بری طرح سے گھبرائے ہوئے تھے۔

"کوئی آواز نہیں۔ ورنہ میرے پستول کی آواز پھر سارا محلہ سنے گا۔" گرو کی دھمکی میں وحشت تھی۔

"دیکھو جو تم لوگوں کو چاہئے وہ تم لے جاؤ لیکن ہمیں کچھ نہیں ہونا چاہئے۔" بڑے بیٹے نے استدعا کی۔

"تم لوگوں کو نقصان پہنچا کر ہم نے کیا لینا ہے۔ ہم تو نقدی اور زیورات لیں گے اور چلتے بنیں گے۔ بس تم میں سے کوئی ہوشیاری نہ دکھائے۔" گرو نے کہا اور ایک آدمی کو ان پر مسلط کر کے دوسرے آدمی کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

دوسرے کمرے میں جا کر گرو اور اس کے آدمی نے سامان اِدھر اُدھر بکھیرنا شروع کر دیا۔ جو نقدی ان کے ہاتھ لگی وہ بھی اُنہوں نے اپنی جیب میں ڈال لی تھی۔ کچھ زیور بھی مل گیا تھا۔ دونوں نے گھر کا سامان جگہ جگہ بکھیر دیا تھا۔ اس کے بعد وہ دیپک کے انتظار میں بیٹھ گئے۔

رات کے تین بج گئے تھے لیکن دیپک نہیں آیا تھا۔ دیپک کی فیملی پر وہی آدمی پستول تانے کھڑا تھا۔ جبکہ وہ دونوں اس سے ملحق کمرے میں دیپک کا انتظار کرتے ہوئے کبھی کبھار کسی چیز کی ہلکی آواز پیدا کر دیتے تھے جس سے اس گھر کے مکین کو لگے کہ وہ اندر اپنے مطلب کا سامان لوٹ رہے ہیں۔ گرو بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ تین بج کر دس منٹ ہو گئے تھے۔

گرو اس کے انتظار میں مضطرب سا ہو گیا تھا۔

☆

دیپک اپنے وقت پر ہی اپنے گھر کے پاس پہنچ گیا تھا لیکن اس کی گاڑی خراب ہوگئی تھی۔ اُس کا ڈرائیور بونٹ کھول کر دیکھتا رہا کہ گاڑی اسٹارٹ ہوجائے لیکن ایسا نہ ہوا تو دیپک نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔

''تین سے زیادہ وقت ہوگیا ہے۔ تم ایسا کرو کہ یہ گاڑی اس جگہ لاک کرو اور اپنے گھر چلے جاؤ۔ اس علاقے کے چوکیدار کو وہ اس کا خیال رکھے گا' تم جاؤ۔''

ڈرائیور نے بونٹ بند کرنے کے بعد کہا۔ ''آپ کیسے جائیں گے؟''

''میرا گھر کون سا دور ہے۔ میں پیدل چلا جاؤں گا۔'' دیپک نے کہا۔

کچھ دیر بعد دونوں اپنی اپنی سمت چل پڑے۔ دیپک کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ پوش علاقے کی ہر گلی سنسان تھی۔ دیپک اس پوش علاقے میں رہتا ضرور تھا لیکن اس کا طرز زندگی بہت سادہ تھا۔

گرد کا منہ کمرے کی اس کھڑکی کی طرف تھا جس پر پردے لٹک رہے تھے اور وہ گاڑی کی آواز اور اس کی تیز روشنی دیکھنے کا منتظر تھا۔ دیپک اسی کھڑکی کے سامنے سے پیدل گزر کر مین دروازے کی طرف گیا اور اپنی جیب سے چابی نکال کر اپنی عادت کے مطابق آہستہ سے دروازہ کھولا تا کہ گھر میں سوئے ہوئے افراد کی آنکھ نہ کھل جائے۔ اندر جا کر اس نے اسی طرح دروازہ بند کردیا۔

دیپک نے ابھی اپنا پہلا قدم اُٹھایا ہی تھا کہ عین اُسی وقت گرو کی اکتاہٹ آمیز آواز اُبھری۔ ''بہت وقت ہوگیا ہے۔''

دیپک کے قدم اُسی جگہ رُک گئے۔ اس کا چہرہ حیرت میں ڈوب گیا کہ گھر میں کون ہے۔ پھر اسی اثنا میں گرد نے اپنا نقاب اپنے چہرے پر کیا اور واپس اُسی کمرے میں جا کر دیپک کی بیوی سے تحکمانہ انداز میں مخاطب ہوا۔ ''اور قیمتی سامان کہاں ہے؟''

''جو کچھ بھی ہے کمروں کی الماریوں میں ہے۔'' دیپک کی بیوی کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

''الماریوں کی چابیاں کہاں ہیں؟'' گرد نے پوچھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ ہر طرح سے اس کو ایک واردات ثابت کرے۔

دیپک کی سمجھ میں آگیا کہ گھر میں چور ہیں۔ وہ بغیر آواز پیدا کئے کمرے کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھا اور کی ہول سے اپنی آنکھ لگا کر اندر دیکھا۔ سب کچھ واضح ہوگیا تھا۔

دیپک بلی کی چال چل کر اوپر چلا گیا۔ وہاں سے اُس نے اپنے دوست انسپکٹر کو فون کیا اور ساری بات بتا کر کچھ ہدایت کی اور پھر واپس آکر مین دروازے کے ساتھ جا کر لگ کر کھڑا ہوگیا۔

گرد اُلجھن کا شکار تھا۔ وہ وقت گزار رہا تھا۔ کہ کسی طرح سے دیپک آجائے۔ ایک دوبار اُس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر بھی دیکھا۔ باہر سنسان گلی تھی۔

تھانہ وہاں سے دور نہیں تھا۔ پولیس اپنی جیپ دور ہی کھڑی کر کے دیپک کے گھر کی طرف بڑھی۔ دیپک تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی اُس نے اپنے دوست انسپکٹر کی شکل دیکھی اُس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ اندر کسی کو بھی پتہ نہ چلا کہ پولیس اس گھر میں داخل ہوگئی ہے۔

سب سے پہلے پولیس نے بڑی ہوشیاری اور مستعدی سے اس کمرے میں موجود اُس شخص کو قابو کرلیا جو دیپک کی فیملی پر پستول تانے ہوئے تھا۔ ایک بار پھر جیسے ہی گرد اُس کمرے سے باہر آیا پولیس نے اُسے بھی قابو کرلیا اور تیسرا آدمی پکڑنا پولیس کے لئے کچھ مشکل نہ رہا تھا۔ تینوں پولیس کی گرفت میں اس طرح سے آگئے تھے کہ اپنی اچانک گرفتاری کو دیکھ کر گرد کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔

☆

اشوک اپنے گھر میں رات کے اس پہر گرد کی کال کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی پریشانی اور بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ وہ کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اس کی بیوی جوشی کی اچانک آنکھ کھل گئی تو اُس نے پہلے اشوک کی طرف دیکھا اور پھر گھڑی کی طرف دیکھ کر ٹیبل لیمپ روشن کردیا۔

''کیا بات ہے تم جاگ رہے ہو؟'' جوشی نے پوچھا۔

''ہاں...... میں گرد کی کال کا انتظار کر رہا ہوں۔'' اشوک نے بتایا۔ وہ سب کچھ جوشی کو بتا چکا تھا۔

جوشی نے اُٹھ کر اس کی طرف دیکھا۔ ''اشوک مجھے لگتا ہے کہ تم نے بہت رسکی کام کیا ہے۔ تم اپنا انتقام بھول کر کچھ اور سوچتے تو بہتر تھا۔''

''کوئی رسک نہیں ہے۔ گرد اپنے کام میں بہت ماہر ہے۔'' اشوک نے کہا وہ خود بھی اُلجھن کا شکار تھا۔

''وقت دیکھو ساڑھے چار ہوگئے ہیں اور ابھی تک گرد کی کال نہیں آئی۔'' جوشی نے ایک بار پھر گھڑی کی طرف دیکھا۔

اشوک نے بھی گھڑی کی طرف دیکھا۔ وہ مزید الجھن میں مبتلا ہوگیا تھا۔ بہت سے خیالات اس کے ذہن میں آنے لگے تھے۔ ان میں یہ بھی تھا کہ اگر کچھ گڑبڑ ہوگئی تو پھر کیا ہوگا؟ لیکن یہ سوچ اس خیال کو رد کردیتی تھی کہ گرد اپنا کام کرنے میں بہت تیز ہے۔

اشوک بمشکل ایک گھنٹہ ہی سو سکا تھا۔ دن کا اُجالا ہر سو پھیل گیا تھا۔ ابھی جوشی سوئی ہوئی تھی کہ اشوک اُٹھ کر اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔

اچانک اس کے موبائل پر گرد کے ایک ساتھی کا فون آگیا' وہ بولا۔ ''سیٹھ بری خبر ہے۔ گرد کو پولیس نے پکڑ لیا ہے۔''

''کیا......؟'' اشوک کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ ''کیا کہہ رہے ہو تم؟''

''ہم ٹھیک بول رہا ہوں۔ اس کے دو ساتھی تو کرائے کے تھے جن کو صرف یہ پتہ تھا کہ چوری کرنی ہے۔ ان کی پروا نہیں ہے لیکن گرد کو سب پتہ ہے۔ اگر اس نے کچھ بول دیا تو غلط ہوجائے گا۔ اس لئے کچھ کرو سیٹھ' گرد کو باہر نکالو ورنہ ہم سب کچھ بتا دے گا۔'' اس نے دھمکی دی۔

''تم کیا بتاؤ گے بولو۔'' اشوک نے کہا۔

''یہی کہ آپ نے گرد کو روپیہ دیا تھا کسی کام کے کرنے کے لئے۔ کام کیا تھا' میرے اس بیان پر پولیس تم سے پوچھ ہی لے گی۔'' اُس نے کہا۔

''تم لوگ اپنے مطلب کے پکے ہو بس۔ ٹھیک ہے میں کچھ کرتا ہوں۔''

اشوک بہت پریشان ہوگیا تھا۔ اگر گرد نے کچھ اگل دیا تو تب سب کچھ عیاں ہوجائے گا۔ راہول پریس اور میڈیا کی لیڈ نیوز بن جائے گا۔ اس کا فلمی مستقبل تباہ ہوجائے گا۔ ایک طوفان برپا ہوجائے گا اور گرد نے زبان بند رکھی اور وہ جیل میں بند رہا تو پھر اُس کا قریبی ساتھی گرد کو بچانے کے لئے ان پر دباؤ ڈالے گا۔ ایک بھنور میں پھنس گیا تھا۔

☆

راہول کو حقیقت بتانا اشوک کے لئے ناگزیر تھا۔

راہول نے جیسے ہی اس کے منہ سے سب کچھ سنا وہ اپنی جگہ سے یوں اُٹھا جیسے کسی نے اس کے پاؤں پر بم مار دیا ہو۔ اس وقت اشوک کی بیوی جوشی بھی وہاں تھی۔

''یہ تم نے کیا کیا؟ تم ...... تم دیپک کو جان سے مار دینا چاہتے تھے؟ مجھے یقین نہیں آرہا کہ یہ تم ہو جس پر میں نے اندھا اعتماد کیا اور تم نے انتہائی غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کر کے میرے لئے ایک نئی آفت کھڑی کردی۔'' راہول نے ایک ہی سانس میں اُس پر برستے ہوئے کہا۔ ''جانتے ہو کہ اگر کوئی بات بھی اس کے منہ سے باہر نکل گئی تو کیا ہوگا؟ میں کہاں سے کہاں چلا جاؤں گا؟ اور دیپک' سب جانتے ہیں کہ اس کے تعلقات کہاں نہیں ہیں۔ وہ بال کی کھال جب تک نہ اُدھیڑ لے وہ سکون سے نہیں بیٹھتا۔''

''میں تو اسے ایک واردات کا رنگ دے کر......''

اشوک نے کہنا چاہا۔
''چپ رہو تم۔'' راہول نے ڈانٹ دیا۔ ''میں نے اس وقت تم سے تمہارا پلان پوچھ کیوں نہیں لیا۔'' راہول نے افسوس اور پچھتاوے سے کہا۔
''جو ہوا وہ تو ہو گیا۔ اب ہمیں ان باتوں میں اُلجھ کر وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔'' جوشی نے آگے بڑھ کر کہا۔
راہول کا غصہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ وہ مضطربانہ انداز میں کبھی اپنے ہاتھ ملتا تھا اور کبھی اپنے دانت بھینچ لیتا تھا۔ جوشی کی بات نے اُسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا تھا۔ اُس نے ایک گلاس پانی پیا اور اپنے آپ کو سنبھال کر جوشی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''بتاؤ کیا کریں۔ اس نے جو میری بدنامی کے معاہدے پر دستخط کئے ہیں وہ کیسے مٹاؤں؟''
جوشی نے ایک نظر اشوک کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''اس علاقے کے تھانے کا انچارج' روی کا دوست ہے اور روی پیسے کے لئے کوئی بھی کام کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ اشوک کی روی کے ساتھ بھی اچھی بات چیت ہے۔ اگر ہم اس کے منہ میں نوالہ ڈال دیں تو وہ انچارج کے ساتھ مل کر گرو کو فرار کرا سکتا ہے۔''
جوشی کی بات سن کر راہول نے اشوک کی طرف دیکھا اور اپنے لہجے میں نرم تغیر لا کر پوچھا۔ ''کیوں اشوک تم کیا کہتے ہو؟''
''جوشی ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' اشوک نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔
''ٹھیک ہے جتنا بھی پیسہ خرچ ہو' گرو کو حوالات سے نکال کر فرار کرا دو۔ بلکہ اسے اپنے خرچے پر اس ملک سے باہر بھیج دو اور اس کے بعد آگے کی سوچتے ہیں۔ جاؤ اور جلدی کرو۔'' راہول نے کہا۔
اشوک اُسی وقت باہر نکل گیا۔
روی قتل و غارت کے علاوہ ہر وہ کام کرتا تھا جو کسی کے بس میں نہیں رہتا تھا۔ اس کی ہر جگہ واقفیت تھی۔ بلکہ وہ ہر اُس آدمی کو جانتا تھا کہ کون کتنا ایماندار ہے۔ اشوک نے اس کی پوری فیس اس کی جیب میں ڈالی اور تاکید کی کہ یہ کام چند گھنٹوں میں ہو جانا چاہئے۔
چوکی کا انچارج انتہائی لالچی اور رشوت خور تھا۔ روی نے اُس سے ملتے ہی گرو کو باہر نکالنے کی فیس پوچھی اور کم مکا کر کے جلد کام کرنے کا کہہ کر اور اس کی فیس دے کر وہ وہاں سے چلا گیا۔ اس کا اتنا ہی کام تھا۔
دیپک نے اس معاملے کو چوری کی واردات سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ اُس نے گرو کے خلاف پرچہ بھی چوری کا ہی کٹوایا تھا۔ لیکن اُس وقت اُسے حیرت ہوئی تھی جب اُس نے اشوک کو روی کے ساتھ دیکھا تھا اور پھر اُس وقت اس کی حیرت دو چند ہو گئی تھی جب دیپک کی نظر نے روی اور تھانے کے انچارج کو ایک ساتھ دیکھ لیا تھا۔ اُس وقت دیپک کا گزر تھانے کے سامنے سے ہو رہا تھا۔
دیپک بہت اچھی طرح سے جانتا تھا کہ روی کیا ہے اور جب کوئی اس سے ملتا ہے تو کیوں ملتا ہے۔ دیپک ابھی کڑی سے کڑی ملا کر ان سوچوں میں ہی تھا کہ شام کو اسے اچانک یہ خبر مل گئی کہ حوالات سے گرو اُس وقت فرار ہو گیا جب تھانے میں دو سپاہی تھے اور باقی عملہ کسی ایمرجنسی میں گیا ہوا تھا۔
اس خبر کو سن کر دیپک اپنا کام کرنا بھول گیا تھا اور بیٹھ کر سوچنے لگا کہ اشوک کا گرو کے ساتھ کوئی تعلق ہے۔ گرو فرار نہیں ہوا بلکہ اُسے فرار کرایا گیا ہے۔ اُس وقت وہ اپنے دوست انسپکٹر شانی کے پاس چلا گیا۔
''ہمارا مجرم بھاگا ہے کہ فرار کرایا گیا ہے۔'' دیپک نے سوال یوں کیا جیسے کسی کو سوئی چبھوئی جاتی ہے۔
انسپکٹر ہنسا۔ ''اس سوال کا جواب میں تحقیق کے بعد ہی دے سکتا ہوں۔''
''ویسے کیا نام تھا اس کا...... ہاں گرو...... یہ ہے کون؟'' دیپک نے پوچھا۔
''اس کا تعلق انڈر ورلڈ کے لوگوں سے ہے۔ آپ کو یہ

بھی بتا دوں کہ جب سے میں نے اسے پکڑا تھا میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ گرو چوری تو کرتا ہی نہیں ہے۔ اس کا کام تو مرنا مارنا ہے۔ وہ آپ کے گھر میں چوری کی نیت سے نہیں گیا تھا۔ اس کا مقصد کچھ اور تھا۔'' انسپکٹر شانی نے کہا۔
''اس شک کے باوجود تم نے کوئی پوچھ گچھ نہیں کی؟'' دیپک نے پوچھا۔
''مجھے ایک اور کام کے آرڈر موصول ہو گئے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ پہلے وہ کام کر لوں اس کے بعد میں گرو سے اس کی تحقیق کروں گا۔ بہرحال آپ فکر نہ کریں میں اس کو جلد پکڑ لوں گا۔ ہاں آپ ذرا احتیاط کریں۔'' انسپکٹر شانی نے کہا۔
کچھ دیر بیٹھنے کے بعد دیپک وہاں سے آ گیا۔ اُس کا ذہن مسلسل اشوک اور روی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کہیں اشوک اس تھپڑ کا بدلہ تو نہیں لے رہا؟'' اس خیال نے دیپک کو مزید شک میں مبتلا کر دیا تھا اور اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس معاملے کی تہہ تک پہنچ کر رہے گا۔

☆

گرو حوالات سے بھاگ کر سیدھا ایک گودام میں چلا گیا تھا۔ وہ کباڑ کا گودام تھا اور گرو کے ایک جاننے والے سیٹھ کا تھا۔ گرو اس جگہ کسی پناہ کے لئے نہیں آیا تھا کیونکہ انسپکٹر شانی اور گرو کی مخالفت کے بارے میں سبھی جانتے تھے۔ وہ گرو کو پکڑنا چاہتا تھا اور گرو ہر بار کسی ثبوت کے نہ ہونے کی وجہ سے اس کی نگاہوں کے سامنے کھلے عام پھرتا رہتا تھا اور اب وہ جان گیا تھا کہ انسپکٹر شانی کے ہاتھ اس کے خلاف کیس آ گیا ہے وہ اسے کسی بھی صورت نہیں چھوڑے گا۔ یہ ٹھکانہ بھی محفوظ نہیں تھا۔
اس جگہ سے گرو' اشوک کو فون کرنا چاہتا تھا۔ ابھی اس نے وہ موبائل جو اس کا ساتھی اُسے دے کر گیا تھا' نکالا ہی تھا کہ اُسے لگا کہ باہر کوئی آیا ہے۔ اُس نے موبائل اپنی جیب میں ڈالا اور ایک ڈرم پر چڑھ کر روشن دان سے باہر دیکھا۔ بلب کی روشنی میں اس کی نگاہ جیسے ہی انسپکٹر شانی پر پڑی وہ یکدم اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور نیچے گر گیا۔ خاموشی میں آواز کسی بم کی طرح گونجی تھی۔ باہر پولیس نے جیسے ہی آواز سنی انہوں نے گودام کے اندر جانے کیلئے دوڑ لگا دی۔
گرو کو اس گودام کے ہر راستے کا علم تھا۔ وہ بھاگتا ہوا تیزی سے جا رہا تھا۔ انسپکٹر شانی بھی برق رفتاری سے اندر آیا تھا اور اُس نے گرو کو دیکھتے ہی اُس پر گولی چلا دی تھی۔ گولی گرو کے پاس ہی دیوار پر لگی تھی۔ وہ تیزی سے بھاگ کر دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا۔ انسپکٹر شانی اپنی پولیس کے ساتھ ہی اس کے پیچھے بھاگا۔ گرو کی بھاگنے کی رفتار بہت تیز تھی۔ وہ اس تیزی سے سڑک سے ہوتا ہوا دوسری سڑک پر چلا گیا اور وہاں سے اُس نے پل کی طرف دوڑ لگا دی۔
انسپکٹر شانی سڑک کے کبھی اس طرف اور کبھی اُس طرف متلاشی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ دور تک گرو کا کوئی نشان نہیں تھا۔
راہول کے بنگلے کے چوکیدار نے اندر اشوک کو انٹر کام پر اطلاع دی کہ 'وجے نام کا ایک آدمی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔
اشوک اس نام کا سن کر پہلے تو حیران ہوا کہ یہ کون ہے۔ کیونکہ وہ اس نام کے کسی آدمی کو نہیں جانتا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے کہا کہ وہ وہاں آتا ہے۔
اشوک نے جیسے اُس جگہ جا کر دیکھا وہ چونک پڑا' سامنے گرو کھڑا تھا۔ اشوک نے اس جگہ بات کرنی مناسب نہ سمجھی اور اُسے لے کر اندر آ گیا۔
''یہاں کیوں آئے ہو؟'' اشوک نے کمرے میں آتے ہی سوال کیا۔
''اور کہاں جاتا۔'' گرو نے اُلٹا سوال کر دیا۔
''مجھے کیا پتہ کہ کہاں جاتے۔ یہاں نہیں آتے۔'' اشوک نے اُلجھن سے کہا۔

''دیکھو اشوک بابو۔ ہم میں کچھ دوستی بھی ہے اور پھر یہ کہ میں نے تمہارا کام پکڑا لیکن میں تو پھنس کر رہ گیا ہوں۔ وہ انسپکٹر شانی میرا دشمن جو پہلے ہی مجھے پکڑنے کے لئے موقع کی تلاش میں تھا۔ وہ اب میرے پیچھے کسی سائے کی طرح لگ گیا ہے اور اس جگہ سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہے جہاں میں چند دن گزار سکوں۔'' گرو نے کہا۔

''تم یہاں رہو گے؟'' اشوک نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

''یہ ہی وہ جگہ ہے جہاں پولیس نہیں آئے گی۔ میں یہاں رہوں گا۔'' گرو نے اطمینان سے کہا۔

''دیکھو میں تمہارے باہر جانے کا بندوبست کرتا ہوں۔ تم باہر نکل جاؤ۔'' اشوک نے کہا۔

''میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ چار دن بعد میرا ساتھی اور دوست جیل سے باہر آرہا ہے۔ اُس کے آتے ہی ہم انسپکٹر شانی کو پہلے پار کریں گے۔ یہاں ہمارا دھندا ہے وہ چھوڑ کر ہم کہیں بھی نہیں جائیں گے۔'' گرو نے کہا۔

''تم کچھ بھی کرو لیکن یہاں سے چلے جاؤ'' اشوک نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے میں چلا جاتا ہوں۔ لیکن سید حاد یپک کے پاس جاؤں گا اور سب کچھ سچ بیان کردوں گا۔'' گرو نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''تم تو کہتے ہو کہ میرے دھندے کا اصول راز داری ہے۔'' اشوک نے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں ... اُس وقت تک جب تک اپنی جان کو کوئی خطرہ نہ ہو۔'' گرو نے کہا۔

اشوک اس کی طرف بے بسی سے دیکھنے لگا تھا۔ وہ لاچار ہو گیا تھا۔ اُسے خود کو اور راہول کو بھی بچانا تھا۔ اس کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ چپ رہتا۔ اُس نے گرو کو اسی کمرے میں رُکنے کے لئے کہا اور خود باہر نکل گیا۔

اشوک جیسے ہی نشست گاہ میں پہنچا ٹھٹک گیا۔ سامنے راہول اور دیپک براجمان تھے۔

''آؤ اشوک۔'' راہول نے اُسے دیکھتے ہی کہا۔ اشوک اس کے پاس چلا گیا۔ راہول نے ایک نظر دیپک کی طرف دیکھ کر اشوک کو مخاطب کر کے بولا۔ ''مسٹر دیپک کا خیال ہے کہ اس گھر میں کوئی واردات نہیں ہو رہی تھی بلکہ وہ اشوک کا کوئی چکر تھا۔''

''میرا چکر تھا؟'' اشوک نے متحیر نگاہوں سے راہول کی طرف دیکھا۔ اُس نے دیپک کی طرف دیکھنا گوارا نہیں کیا تھا۔

راہول پھر بولا۔ ''ان کا کہنا ہے کہ وہ تمہاری ان کے خلاف ایک سازش تھی۔ کیونکہ انہوں نے دیکھا کہ تم روی سے ملے ہو اور اسی دن روی پولیس اسٹیشن گیا اور گرو بھاگ گیا۔''

''میں کسی سے بھی مل سکتا ہوں۔ فلم انڈسٹری کی کون سی شخصیت ہے جس کے ساتھ روی کے تعلقات نہیں ہیں۔ خود یہ بھی ان سے ملتے ہیں۔'' اشوک نے جواب دیا۔ ''اور پھر میں ان کے خلاف کیوں کوئی سازش کروں۔''

دیپک نے اپنے چہرے پر زعم سے ایک مسکراہٹ سجائی اور کہا۔ ''تم میرے خلاف کیوں کوئی سازش کرو گے یہ تم بھی جانتے ہو اور میں بھی جانتا ہوں۔''

اشوک اس کا اشارہ سمجھ گیا اور اس کے بات کرنے کا انداز اُسے مزید غصہ دلا گیا تھا۔ ''جب مجھے اس حوالے سے کوئی کام کرنا ہوگا تو میں سامنے سے وار کروں گا۔''

دیپک نے اس کی طرف حقارت سے دیکھا اور راہول سے کہا۔ ''پہلی بات یہ ہے کہ گرو چوری چکاری نہیں کرتا۔ وہ کسی کی جان لینے کے لئے ہی کوئی کام اپنے ہاتھ میں لیتا ہے۔ گرو کی تلاش تو ابھی جاری ہے۔ لیکن روی شاید اب تک انسپکٹر شانی کے ہاتھ لگ بھی گیا ہو۔'' دیپک کی یہ بات سن کر راہول گھبرا گیا تھا۔ دیپک بولا۔ ''میں یہ ہی کہنے کے لئے آیا تھا۔ جب تک میں سراغ نہ نکالوں چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ میرے لئے اب یہی کام ہے۔''

دیپک اُٹھ کھڑا ہوا تو راہول نے اُس سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔ ''وہ پریس کانفرنس کا کیا پروگرام ہے تاکہ ہم شیڈول طے کر لیں۔''

''وہ اپنے وقت پر ہی ہوگی۔'' دیپک نے معنی خیز انداز میں کہا اور اجازت لے کر باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی راہول نے اشوک کی طرف دیکھا اور مضطربانہ انداز میں کہا۔

''تم نے میرے لئے ایک مصیبت کھڑی کر دی ہے۔ اگر روی اس کے ہاتھ لگ گیا تو کیا ہوگا؟''

اشوک نے اطمینان سے کہا۔ ''وہ شہر سے باہر ہے۔ وہ مجھ سے مل کر گیا تھا۔ وہ کہاں گیا ہے اور کتنے دنوں کے لئے گیا ہے اس کا مجھے پتہ ہے۔''

''اور وہ گرو......؟'' راہول نے پوچھا۔

''اس تک وہ نہیں پہنچ پائیں گے۔'' اشوک نے کہا۔

''کیسے نہیں پہنچ پائیں گے؟'' راہول نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''کیوں کہ وہ یہاں ہے۔'' اشوک نے بتایا۔

راہول اس کی بات سن کر چونکا۔ ''کیا کہا تم نے وہ یہاں ہے؟''

''آپ بے فکر ہو جائیں اَب یہ میری ذمہ داری ہے کہ میں آپ پر اور آپ کی شخصیت پر کوئی آنچ نہ آنے دوں۔ لیکن ایک بات سوچنے کی ہے۔'' اشوک نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر پھر کہا۔

''وہ کیا؟'' راہول نے اس کی طرف دیکھا۔

''لگتا ہے دیپک کسی کے لئے استعمال ہو رہا ہے۔'' اشوک نے سوچتے ہوئے کہا۔

''میں سمجھا نہیں۔'' راہول نے اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر پیوست کر کے پوچھا۔

''آپ کے بھی کئی مخالف ہیں۔ کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ آپ کو اپنی سازش کا نشانہ بنائیں۔ دیپک کو کوئی استعمال کر رہا ہے۔ دیپک نے اپنے احسان کا بوجھ آپ کے سر پر رکھ کر آپ کو انکار کا موقعہ ہی نہیں دیا اور آپ احسان فراموش نہیں ہیں۔ اپنے احسان کا فائدہ دیپک نے یہ بھی اُٹھایا کہ اس نے کس چیز کا کمرشل ہے' آپ کا معاوضہ کیا ہوگا' کچھ نہیں بتایا۔ معاہدے پر دستخط کرائے اور پریس کانفرنس کا بتا کر چلا گیا۔ جس میں یہ اعلان ہوگا کہ آپ کمرشل میں کام کر رہے ہیں۔ وہ کمپنی سامنے آئے گی اور پھر سوالات کا ایک طوفان آپ کی طرف اُٹھے گا۔'' اشوک نے تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا۔

راہول اس کی بات سنتے ہوئے سوچ بھی رہا تھا۔ وہ گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

''کیونکہ آپ کا کسی بھی کمرشل میں کام کرنے کا موقف سخت رہا ہے اس لئے یہ سب آپ کی طرف پتھر پھینکنے کا ایک اہتمام ہے۔'' اشوک نے مزید کہا۔

راہول سوچنے لگا۔ اس کے چہرے پر تغیر اُبھرنے لگا تھا۔ پھر وہ چونک کر بولا۔ ''ایک منٹ...... میرا مخالف ٹولہ جو میری کسی بھی کمزوری کو پکڑ کر واویلہ مچا دیتا ہے۔''

''اَب آپ مجھے وہ کرنے دیجئے جو میں کرنا چاہتا ہوں۔ آپ پر بھی کوئی حرف نہیں آنے دوں گا اور دیپک کا کمرشل بھی نہیں بننے دوں گا۔''

اس بار راہول نے محض اثبات میں سر ہلایا تھا۔

☆

اشوک کا خیال ٹھیک تھا۔ دیپک ایک بڑے فلم میکر کا ہتھیار بنا ہوا تھا۔ وہ دیپک کا دوست بھی تھا اور اس کی ایڈ کمپنی میں اس کا کچھ حصہ بھی تھا۔

اُس فلم میکر کی بہت خواہش تھی کہ راہول اس کی فلم میں کام کرے۔ اس کے لئے اس نے کئی بار اُسے پیشکش بھی کی تھی۔ راہول کو اس کے کام کرنے کا انداز پسند نہیں تھا۔ اس لئے اس نے ہر بار اس کے ساتھ کام کرنے کی معذرت ہی کی تھی۔ جب راہول کی آخری ریلیز ہو کر کامیاب ہونے والی فلم کے بارے میں اُس فلم میکر کو پتا

چلا تو اس کے سینے میں جیسے راہول کے بارے میں آگ جل اُٹھی تھی۔ کامیاب ترین اداکار اس کے ساتھ کام کیوں نہیں کر رہا؟ اگر وہ اس کی ایک فلم کرلے تو وہ بھی کروڑوں کما سکے۔ اس آگ نے اُسے مجبور کر دیا کہ وہ راہول کو نشانہ بنائے۔ اس کے اندر کی جلن برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

اس کا جب اُس نے ذکر دیپک سے کیا تو وہ جیسے اسی انتظار میں تھا۔ وہ اتنا بڑا ایڈ میکر تھا' ہر ہیرو اس کی ایڈ میں اس کے ساتھ کام کرنے کا خواہشمند رہتا تھا اور ایک راہول تھا جس نے کبھی اُسے کسی کمرشل کے لئے گھاس بھی نہیں ڈالی تھی اور پھر اس کی ایک فون کال پر اتنا بڑا ہیرو بننے والا جو اس کے کام کا نہیں تھا اس جلن نے بھی اسے اندر ہی اندر مضطرب کیا ہوا تھا۔

نوٹوں کا ایک بریف کیس لے کر اُس نے راہول کو اپنے کمرشل کے لئے سائن کر لیا تھا۔ دیپک نے نوٹوں کی تقسیم کا عمل بھی مکمل کر لیا تھا۔ اُس نے نام نہاد صحافیوں کا ایک ٹولہ بھی ترتیب دے دیا تھا جن کے لئے سوالات لکھے جا رہے تھے اور ایسے سوالات کہ جسے سن کر راہول کو پسینہ آ جاتا۔ سوالات کی آڑ میں وہ راہول کی تذلیل کا بندوبست کئے ہوئے تھے۔ وہ تذلیل ایک بڑے نیٹ ورک پر براہِ راست دکھانے کا بھی سوچے بیٹھا تھا۔

☆

دیپک اَب یہ بھی چاہتا تھا کہ وہ اشوک کو پولیس کے آگے کسی مجرم کی طرح پیش کر دے۔ اس لئے وہ انسپکٹر شانی کی مدد سے پوری کوشش میں تھا کہ اشوک بھی اس لپیٹ میں آ جائے۔

انسپکٹر شانی کو مخبر کے ذریعے سے یہ پتہ چل گیا تھا کہ رودی شام کی ٹرین سے واپس آ رہا ہے۔ اُس کی جیب میں بھی چونکہ دیپک نے بہت سے پیسے ڈال دیئے تھے اس لئے اُس نے ریلوے اسٹیشن پر اپنی پولیس ٹرین آنے سے پہلے ہی سادہ لباس میں تعینات کر دی تھی۔

اشوک بھی اپنی نگاہیں چاروں طرف لگائے بیٹھا تھا۔ اُسے ہر حال میں راہول کو بچانا تھا۔ اُس کے آدمی بھی دائیں بائیں پھیلے ہوئے تھے۔ رودی آ رہا تھا اور اس کے لئے انسپکٹر شانی نے کیا کیا اقدامات کئے ہوئے تھے' اشوک کو علم تھا۔ اُسے کم وقت میں بہت کچھ کرنا تھا۔ وہ سب منصوبہ بنا چکا تھا۔

جس وقت انسپکٹر شانی اپنے آفس میں' دیپک اپنے کمرشل کی شوٹنگ کے سیٹ پر اور سادہ کپڑوں میں ملبوس پولیس ریلوے اسٹیشن پر تھی' ٹھیک اس وقت راہول کی وین دیپک کے گھر کے قریب سے گزرتے ہوئے رک گئی۔

اُس وین میں راہول' جوشی' اشوک' اس کا میک اَپ مین اور باڈی گارڈ براجمان تھے۔ اسٹوڈیو جاتے ہوئے پہلے دیپک کا گھر آتا تھا۔ راہول نے دیپک کی بیوی کے گھر فون کیا اور جیسے ہی اُس نے فون اُٹھایا وہ بولا۔ ''راہول بول رہا ہوں۔''

''راہول...... کیسے ہو؟'' دیپک کی بیوی خوش ہو کر بولی۔

''بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں اور اس وقت آپ کے گھر کے پاس ہوں۔'' راہول نے مسکرا کر کہا۔

''میرے گھر کے پاس ہو اور فون کر رہے ہو؟ گھر کیوں نہیں آ رہے۔'' اُس کی بیوی خفا ہو کر بولی۔

''دراصل آپ کے گھر کے پاس ہی میری گاڑی رک گئی ہے۔ سوچا آپ سے ہیلو ہائے ہی کر لوں۔''

''کوئی ہیلو ہائے نہیں فوراً میرے گھر آؤ۔'' اس کی بیوی نے زور دے کر کہا۔

''ارے نہیں آنٹی جی۔ میرے ساتھ میرا عملہ بھی ہے۔'' راہول نے کہا۔

''ٹھیک ہے میں فون رکھ رہی ہوں۔ کھڑے رہو سڑک پر اور آئندہ کبھی مجھے فون مت کرنا۔'' اس کی بیوی نے کہا۔ وہ ناراض ہو گئی تھیں اس کے ساتھ ہی اُس نے فون رکھ

دیا۔

راہول اور اشوک نے مسکرا کر ایک دوسرے کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھا اور اس کے بعد ان دونوں کے ساتھ جوشی اور میک اَپ مین وین سے باہر نکل کر دیپک کے گھر کی طرف چل پڑے۔

دیپک کی بیوی اس وقت گھر میں اپنی نوکرانی کے ساتھ تھی۔ راہول کو دیکھ کر خوش ہو گئی تھی۔ جب راہول کی وہ پہلی فلم کامیاب ہوئی تھی جو دیپک کی ایک فون کال پر اُسے ملی تھی تب راہول سیدھا ان کے گھر آیا تھا۔ اُس وقت سے دیپک کی بیوی' راہول کو اپنے بیٹے کی طرح چاہنے لگی تھی۔

راہول نے دیپک کی بیوی کے ہاتھ کی کافی پینے کی فرمائش کی تھی۔ نوکرانی دوسرے کاموں میں مشغول ہو گئی تھی۔ جوشی اس کے ساتھ باورچی خانے میں چلی گئی تھی۔

اسی موقعے سے فائدہ اُٹھا کر اشوک نے برق رفتاری سے دیپک کے کمرے کا رُخ کیا اور اس کی الماری سے وہ معاہدہ تلاش کرنے لگا جس پر راہول کے دستخط تھے۔ مختلف دراز میں بہت سے کاغذات پڑے تھے۔ اشوک ایک ایک کاغذ دیکھ رہا تھا۔ لیکن وہ معاہدہ کہیں بھی نہیں تھا۔ اس کے بعد اُس نے دوسری جگہ پر بھی وہ کاغذ تلاش کیا' اُسے پورے کمرے میں کسی دراز اور کسی فائل میں وہ معاہدہ نہیں ملا تھا۔ پوری تسلی کرنے کے بعد وہ کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔

دیپک کی بیوی نے ابھی اشوک کے بارے میں پوچھا ہی تھا کہ وہ کہاں گیا ہے اور راہول اس سے پہلے کہ کوئی جواب دیتا' اشوک نے آ کر کہا۔ ''میں آپ کا گھر دیکھ رہا تھا۔ بہت سجا لیا ہے گھر آپ نے۔''

''ہاں گھر سجانا مجھے اچھا لگتا ہے۔'' دیپک کی بیوی نے کہا اور مسکراتی ہوئی پھر کچن میں چلی گئی۔

''نہیں ملا۔'' اشوک نے کہا۔

''کہاں رکھا ہوگا اُس نے۔'' راہول اس کی بات سن کر بے چین ہو گیا تھا۔ دونوں چپ ہو گئے تھے۔ جس مقصد کے لئے وہ سارا کھیل کھیل رہے تھے' اُس میں وہ ناکام ہوتے دکھائی دینے لگے تھے۔

اچانک اشوک چونکا۔ راہول نے اس کی طرف دیکھا۔

''کیا ہوا؟''

''دیپک نے وہ کاغذ اپنے اس کوٹ کی جیب میں ڈال لیا تھا۔ وہ کوٹ اس کے کپڑوں کی الماری میں ہینگ کیا ہوا ہے۔ وہ کاغذ اسی کوٹ میں تو نہیں ہے؟'' اشوک نے کہا۔

اسی اثنا میں دیپک کی بیوی' جوشی اور ملازمہ اندر آ گئے۔ ملازمہ نے کافی اور کھانے پینے کی ٹرالی پکڑی ہوئی تھی۔ مختلف باتوں میں کافی بھی پی رہے تھے۔ اشوک اور راہول کا ذہن اس بات پر اٹکا ہوا تھا کہ وہ کوٹ کیسے چیک کیا جائے۔

''اشوک تم کہہ رہے تھے کہ گھر میں کچھ لکڑی کا کام کرانا ہے۔ ایک سوئنگ الماری بنوانی ہے۔'' اچانک راہول نے کہا۔

''ہاں بنوانی تو ہے لیکن کوئی اچھا کہیں ڈیزائن بھی تو نظر آئے۔'' اشوک اس کی بات فوراً سمجھ کر بولا۔

''ان کی الماری دیکھو نا کیا خوبصورت بنوائی ہے اپنے کمرے میں۔'' راہول نے کہا۔

دیپک کی بیوی فوراً بول پڑی۔ ''دیپک نے وہ الماری پونا کے ایک کاریگر سے بنوائی تھی۔''

''اچھا پھر تو وہ دیکھنے کے قابل ہوگی۔'' اشوک نے کہا۔

''ہاں آ جاؤ دکھاؤں۔'' دیپک کی بیوی نے کہا۔ وہ تینوں اُٹھ کر اس کے پیچھے اس کمرے میں چلے گئے۔ الماری واقعی بہت خوبصورت بنائی گئی تھی۔ جوشی نے ایک طرف لے جا کر دیپک کی بیوی کو باتوں میں لگا لیا۔ اس دوران اشوک نے جلدی سے اُس کوٹ کی جیبیں ٹٹولنی شروع کر دیں۔ ایک جیب میں وہ کاغذ تھا۔ اشوک نے وہ کاغذ نکال کر ایک نظر دیکھا اور اپنی جیب میں ڈال لیا۔

اسکے ساتھ ہی اشوک نے کہا۔ ''اچھا ڈیزائن ہے۔ چلیں وین ٹھیک ہوگئی ہے۔ مجھے ڈرائیور کی کال آگئی ہے۔'' چاروں نے اجازت لی اور دیپک کے گھر سے باہر آگئے۔

☆

راہول ابھی وین ہی میں تھا کہ دیپک کا فون آگیا۔ اُس نے بتایا۔ ''راہول میں نے پریس کانفرنس کرنے کا آج ہی پروگرام بنایا ہے۔ آج رات نو بجے کا وقت فائنل ہوا ہے۔''

''اتنی ایمرجنسی' مسٹر دیپک۔؟'' راہول نے پوچھا۔

''پارٹی کی مرضی ہے۔ تم تیار رہنا۔'' دیپک نے کہا۔

''میں تیار ہوں۔ ایک بات ہے۔ آپ نے مجھے کہا کہ کمرشل کرنا ہے میں نے کوئی چوں چرا کئے بغیر معاہدے پر دستخط کردیے۔ کیونکہ میں آپ کے احسان کے بوجھ تلے تھا۔ سائن کرنے کے بعد میں نے آپ کا احسان اُتار دیا۔ اَب بات ہوجائے پیسے کی...... مجھے کمرشل کا معاوضہ کیا ملے گا؟'' راہول نے کہا۔

''مجھے انکار نہ کرکے تم نے احسان اُتارا ہے؟ کیا چاہتے ہو؟'' دیپک نے خشک لہجے میں پوچھا۔

''میں کچھ نہیں چاہتا آپ کی مرضی چلے گی۔ خواہ ایک ہزار روپیہ ہی کیوں نہ ہو۔ آپ میرے پاس وہ معاہدہ لے کر آجایئے گا تاکہ اُس پر رقم بھی لکھ لی جائے۔''

''ٹھیک ہے میں وہ معاہدہ لے کر آجاتا ہوں۔ کہاں ملو گے؟'' دیپک نے کہا۔

''میں گھر میں ملوں گا۔ آج میری شوٹنگ رات کو ہے۔'' راہول نے کہا۔ سلسلہ منقطع ہوگیا تھا۔

دیپک کو راہول کی بات پر بہت غصہ آیا تھا۔ محض پیچ و تاب کھانے کے وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ وہ سیدھا اپنے گھر چلا گیا۔ اس نے جاتے ہی الماری کھولی اور کوٹ کی ہر جیب دیکھ لی' لیکن کہیں بھی اُسے وہ کاغذ نہ ملا تو اس کے چہرے پر پریشانی عیاں ہوگئی تھی۔ اس کے ماتھے کی سلوٹیں اُبھر آئی تھیں۔

''کیا بات ہے کیا تلاش کر رہے ہیں؟'' اچانک اس کی بیوی نے اندر آکر پوچھا۔

''میرے کوٹ کی جیب میں ایک کاغذ تھا۔ کس نے نکالا ہے' کون آیا تھا؟'' دیپک نے پوچھا۔

''نکالنا کس نے ہے۔ باہر سے تو کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ راہول آیا تھا۔'' اس کی بیوی نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ساری تفصیل بتادی تھی' ساری بات سن کر دیپک نے اپنے دانت پیس لئے تھے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ راہول نے احسان اُتارنے کی بات کرکے اس سے معاوضے کی بات کیوں کردی تھی۔

دیپک وہ معاہدہ پریس کانفرنس میں نہیں دکھا سکتا تھا۔ جس کے بل بوتے پر اُن سب نے راہول کی تذلیل کا سوچا تھا' وہ سب خاک میں مل گیا تھا۔ اس کا غصہ اور بھی بڑھ گیا تھا۔ ابھی وہ اس بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی بیوی نے آکر اطلاع دی کہ کوئی اس سے ملنا چاہتا ہے۔ پہلے تو اس نے ملنے سے انکار کردیا لیکن فوراً ہی اس نے اپنی بیوی کو روک لیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کون ہے۔

دیپک نے اس نوجوان کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''جی کہیے۔''

''آپ دیپک صاحب ہیں۔'' اس نوجوان نے پوچھا۔

''ہاں میں ہوں کیا بات ہے۔'' دیپک نے ایک بار پھر اس کا جائزہ لیا۔

''میں نے آپ کا نام سنا تھا۔ آپ کے کام کا پیسہ لیتے ہوئے بھی اُستاد گرد کو دیکھا تھا۔'' وہ نوجوان بولا۔

''تم گرد کو جانتے ہو؟'' اچانک دیپک نے چونک کر پوچھا۔

''میرا استاد ہے۔ اسی لئے تو آپ کو تلاش کرکے یہاں تک آیا ہوں۔'' وہ بولا۔

''گرد کہاں ہے اور تم کیا جانتے ہو؟'' دیپک نے پوچھا۔

''اس دن ایک آدمی آیا تھا۔ آپ کو شوٹ کرنے کا پیسہ دے کر چلا گیا تھا۔ پھر وہ ہوگیا جو گرد نے نہیں سوچا تھا۔ مجھے سارے معاملے کا تو پتہ نہیں ہے۔ آج کل مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے۔ اگر گرد کا بتادوں تو کیا کچھ ملے گا؟'' اُس نوجوان نے اپنا ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ اشوک کا نام وہ جان بوجھ کر گول کر گیا تھا تاکہ اگلی قسط پر اس کا نام بتا کر بھی کچھ وصول کرسکے۔

دیپک کسی ہارے ہوئے زخمی جواری کی طرح تھا۔ ایک بار پھر بازی اپنے ہاتھ کرنے کے لئے اُس نے فوراً جیب سے ہزار ہزار کے نوٹ نکال کر اس کے سامنے گنے اور کہا۔ ''دس ہزار ہیں۔''

نوٹ دیکھتے ہی اس کے منہ سے رال ٹپکنے لگی تھی۔ وہ جلدی سے بولا۔ ''بہت ہیں' کئی دن سے جیب خالی تھی۔ میں بولوں گا تو یقین نہیں کریں گے آپ۔ اس لئے آپ خود سنیں۔'' اُس نے جلدی سے موبائل نکال کر نمبر ملایا۔ نوٹ دیکھ کر وہ مضطرب ہوگیا تھا۔ رابطہ ہوتے ہی دوسری طرف سے گرد کی آواز آئی۔

''ہاں بول چھوٹے۔ کیا بات ہے۔''

''میں نے سوچا تمہاری خیریت ہی پوچھ لوں۔ مزے میں ہو؟'' اس نے کہا۔ موبائل کا اسپیکر آن تھا۔ اس لئے دیپک بھی سن رہا تھا۔

''اتنے بڑے ہیرو راہول کے بنگلے میں رہ رہا ہوں۔ مزے میں نہیں ہوں گا تو کیا ہوگا۔ خوب عیش میں ہوں۔ پولیس ٹھنڈی ہوئی کہ نہیں ابھی؟''

''ابھی حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ لگے رہو۔ او کے۔'' اس نے کہہ کر موبائل بند کردیا اور نوٹوں کی طرف دیکھا۔ دیپک نے اسے نوٹ دے دیے۔

ابھی وہ اندر گیا ہی تھا کہ اُسے انسپکٹر شانی کی کال آگئی۔ اُس نے بتایا کہ شہر سے پہلے آنے والے اسٹیشن پر ایک جھڑپ میں کوئی نامعلوم آدمی روی کو گولی مار کر فرار ہوگیا ہے۔

دیپک کے لئے جہاں یہ خبر بری تھی' وہاں اُس نے انسپکٹر شانی کے ساتھ گرد کے بارے میں بات کرنی شروع کردی تھی۔ اُس نے گرد کو راہول کے بنگلے سے برآمد کرکے ایک اور پریس کانفرنس کرنے کا سوچ لیا تھا کہ پوری دنیا راہول کا ایک نیا روپ دیکھے گی۔

☆

اشوک کو روی کی خبر مل چکی تھی۔ اس نے معنی خیز انداز میں اپنے لبوں پر تبسم کی ایک ہلکی لکیر عیاں کرتے ہوئے دل ہی دل میں کہا تھا کہ ایک برائی کی کمی ہوگئی ہے۔

ابھی وہ اوپر کمرے سے باہر نکلنے لگا ہی تھا کہ وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ نیچے دیپک اور انسپکٹر شانی پولیس کے آدمیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ انسپکٹر شانی سرچ وارنٹ دکھاتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ انہیں پتہ چلا ہے کہ گرد اس گھر میں ہے۔ دیپک کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے براجمان تھا۔ جیسے کوئی بہت بڑا تماشائی ہو۔

اشوک نے برق رفتاری سے اپنے فون پر باہر گارڈ کو فون کرکے پوچھا اور کچھ مزید کہہ کر اس نے فون بند کردیا اور بھاگتا ہوا گرد کے کمرے میں چلا گیا۔

راہول گھبرا گیا تھا۔ لیکن وہ ایک بڑا اداکار تھا اس لئے اس نے اپنے چہرے سے اپنی گھبراہٹ مترشح نہیں ہونے دی تھی۔ تلاش کا عمل دائیں طرف سے شروع ہوا تھا۔ راہول' دیپک کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ آٹھ سپاہی اور ان میں ایک انسپکٹر شانی تھا۔ ان کے ساتھ راہول کا خاص ملازم تھا۔

اشوک نے گرد کے کمرے میں جاتے ہی اُسے کہا کہ وہ جلدی سے باتھ روم میں چلے۔ گرد نے متحیر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''کیوں کیا ہوا ہے۔؟''

''باہر پولیس آگئی ہے تمہیں اس طرف سے فرار ہونا ہے۔'' اشوک نے اس کی سنے بغیر اس کا بازو پکڑا اور باتھ روم میں لے گیا۔ پولیس اسی منزل پر آگئی تھی۔ انسپکٹر شانی کو دیپک نے اتنا یقین دلا دیا تھا کہ وہ بھی اطمینان سے

ہر کمرہ چیک کر رہا تھا۔ وہ اس کمرے سے جہاں گرد تھا' چار کمرے پیچھے تھا۔ باتھ روم میں جاتے ہی اشوک نے ایک پل کی دیر کیے بغیر اپنی جیب سے انتہائی تیز دھار کا آلہ جو چھوٹا تھا' نکالا اور ایک ہی وار کر کے گرد کی شہ رگ کاٹ دی۔ پورے باتھ روم میں خون ایک پھوارے کی طرح پھیل گیا۔ اشوک کا چہرہ اور کپڑے بھی اس کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ گرد تڑپا اور نیچے گر گیا۔

انسپکٹر شانی اور اس کی پولیس اس کے ساتھ والے کمرے میں تھی۔ دیپک نیچے بڑے اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس قدر پُر یقین تھا کہ ابھی انسپکٹر شانی' گرد کو گردن سے پکڑ کر سامنے لے آئے گا۔

اسی اثنا میں دوسری طرف سے اشوک کی ہدایت پر راہول کے ذاتی محافظ ایک موٹی چادر لئے اندر آ گئے۔ اشوک نے اُنہیں باتھ روم میں آنے کا اشارہ کیا۔ گرد کو اُنہوں نے چادر میں لپیٹا اور بڑی احتیاط سے کہ کہیں کوئی قطرہ خون کا نہ گر جائے' وہ اسی طرف سے باہر لے گئے۔

اس کے ساتھ ہی اشوک نے باتھ روم کا دروازہ اندر سے مقفل کیا اور اپنے کپڑے اُتار کر باتھ روم کی صفائی کرنے لگا۔ باتھ روم دھو کر اس نے اپنے کپڑے ٹوائلٹ پریشر کی ٹنکی کھول کر اس میں ٹھونسے اور اسے پھر بند کر دیا۔

اسی اثنا میں انسپکٹر شانی اور اس کے آدمی اس کمرے میں آ گئے تھے۔ کمرے کی تلاشی شروع ہو گئی تھی۔ باتھ روم کے اندر پانی چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ پولیس اور انسپکٹر شانی وہاں کھڑے ہو گئے۔

''اندر کون ہے؟'' انسپکٹر شانی نے آواز دی۔

فوراً اشوک نے اپنا بھیگا ہوا سر باہر نکالا اور پوچھا۔ ''جی فرمایئے۔'' اور پھر وہ یوں سب کو دیکھنے لگا جیسے اُنہیں اچانک دیکھ کر اُسے حیرت ہوئی ہو۔

''آپ اس وقت نہا رہے ہیں۔'' انسپکٹر شانی نے پوچھا۔

''جب ساری دنیا سوتی ہے تو ہم لوگوں کا دن نکلتا ہے۔ راہول صاحب کے ساتھ شوٹنگ پر جانے کی تیاری ہے۔ لیکن آپ یہاں کیوں؟''

انسپکٹر شانی اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ''آپ ایک منٹ باہر آیئے۔''

اشوک نے تولیہ اپنے جسم کے ساتھ لپیٹا اور باہر آ گیا۔ انسپکٹر شانی نے ایک نظر اندر دیکھا اور اپنے آدمیوں کے ساتھ باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی اشوک بڑبڑایا۔ ''آپ کے آنے سے پہلے میں نے ایک برائی اور کم کر دی ہے۔''

سارا بنگلہ چھان لیا تھا۔ گرد کہیں نہیں ملا تھا۔ دیپک کو بہت حیرانی ہوئی تھی۔ وہ بار بار سب کا منہ حیرت سے دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ کہیں گرد اور اس آدمی کی اس سے پیسے حاصل کرنے کی کوئی سازش تو نہیں تھی۔ اُسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ راہول اس کی طرف مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔

سب وہاں سے نکل پڑے۔ دیپک سوچے جا رہا تھا۔ اس کے اعصاب ڈھیلے ہو گئے تھے۔ ان سب کو رخصت کرنے کے لئے سب ہی مین دروازے پر تھے۔

پولیس اپنی وین میں چلی گئی تھی۔ دیپک اپنی گاڑی میں جاتے ہوئے بھی سوچ رہا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ ابھی واپس جائے اور راہول کا بنگلہ خود دیکھے۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اچانک آگے پولیس ناکے پر اس کی گاڑی کو روک لیا۔ اس علاقے میں کچھ دیر قبل ہی ایک بڑی واردات ہو گئی تھی۔ پولیس اس کی کار کی تلاشی لینے لگی۔ ڈکی کھولی تو پولیس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ فوراً دیپک کو حراست میں لے لیا۔ وہ حیران تھا کہ اسے کیوں پکڑا گیا ہے۔ اُس نے جیسے ہی اپنی ڈکی میں دیکھا' اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ گرد کی خون میں لت پت لاش اس کی کار کی ڈکی میں تھی۔

☆☆☆



پلاسٹک سرجری

ایک چالاک تاجر کا احوال'
اس کا واسطہ ایک تیز وطرار
مجرم سے پڑ گیا تھا۔

راشد سعید

فارغ لمحوں کے لیے 'ایک' منفی انجام کی پر مزاح تحریر

شنکر داس نے انٹرکام کا ریسیور اٹھایا اور اپنی سیکریٹری نیتو کا نمبر ملایا۔ رابطہ ملنے پر اس نے نیتو سے کہا۔ ''تم ذرا میرے پاس آ جاؤ۔'' اس نے ریسیور واپس رکھ دیا اور اپنی شاندار بڑی میز پر بے چینی سے انگلیاں مارنے لگا۔

ذرا دیر بعد نیتو اس کے پاس آئی۔ وہ اس کے سامنے بیٹھنے کے بعد بولی۔ ''جی سر؟''

''نیتو... کل ہمیں دہلی کے لیے روانہ ہونا ہے۔ میں نے تمام تیاریاں مکمل کر والی ہیں۔ ہم ٹرین کے ذریعے جائیں گے۔ میں نے ٹرین کی سیٹیں بھی بک کروالی ہیں۔ اس مرتبہ ہمیں بہت ہوشیار رہنا ہے۔ مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ ان جواہرات کو چھیننے کے لیے ہمارے مخالف لوگوں نے شاکا گروپ سے بات کی ہے۔'' وہ بولا۔

''اوہ......'' نیتو کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''یہ تو واقعی خطرناک معاملہ ہو گیا ہے۔'' وہ جانتی تھی کہ شاکا گروپ بہت خطرناک ہے۔ اس گروپ کا لیڈر شاکا تھا۔ یہ گروپ جرائم کی دنیا کا ایک خطرناک ترین گروپ مانا جاتا تھا۔ قتل و غارت، لوٹ مار، اغوا، ڈکیتی اور دیگر جرائم ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے تھے۔

''ویسے تم فکر نہ کرو۔ میرے پاس بھی اسلحہ ہے گا اور میں نے دو پرائیوٹ جاسوسوں کی خدمات بھی حاصل کر لی ہیں۔ وہ بھی ہمارے آس پاس ہی رہیں گے اور بغیر ظاہر ہوئے ہماری حفاظت کریں گے۔'' نیتو کو پریشان ہوتے

دیکھ کر شنکر داس نے کہا۔

"ٹھیک ہے سر!" نیتو کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"او کے بس اب تم جاؤ اور کام نمٹالو۔" شنکر داس نے کہا۔

"بہتر سر!" کہہ کر نیتو اٹھ کھڑی ہوئی۔

شنکر داس جواہرات کا ایک بہت بڑا بیوپاری تھا۔ اس کی ملک بھر میں کئی جیولری شاپس بھی تھیں۔ پورے ملک میں اور ملک سے باہر بھی اس کے جواہرات کے کئی کسٹمرز تھے۔ وہ یا تو خود مال لے جاتے تھے یا پھر شنکر داس کو پہنچانے کا کہہ دیتے تھے۔ شنکر داس کسی پر اعتبار نہیں کرتا تھا اس لیے جب کوئی کسٹمر اسے کہیں مال پہنچانے کا کہتا تو وہ خود آرڈر لے کر جاتا تھا۔ جیسے حالات ہوتے تھے ان کے حساب سے وہ حفاظتی انتظامات کرتا تھا۔ اس مرتبہ بھی اسے دہلی کا ایک آرڈر ملا تھا اور اسے یہاں ممبئی سے آرڈر لے کر جانا تھا۔ دہلی ائیر پورٹ پر اس سے ایک مرتبہ پہلے بھی مال چھین لیا گیا تھا اس لیے اس مرتبہ وہ ٹرین سے مال لے کر جانا چاہتا تھا۔

نیتو، شنکر داس کی پرانی اور قابل اعتماد سیکریٹری تھی۔ وہ اس کے ساتھ گزشتہ پندرہ سال سے کام کر رہی تھی۔ شنکر داس کو اب اس پر مکمل اعتبار تھا اس لیے وہ نیتو کو کئی اہم ترین باتیں بھی بتا دیتا تھا۔ نیتو بھی اس سے بہت مخلص تھی اور اس نے کبھی اس کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی تھی۔

☆

شنکر داس اور نیتو ریلوے اسٹیشن پہنچنے کے بعد اپنے کمپارٹمنٹ میں آ چکے تھے۔ یہ ائیر کنڈیشنڈ کمپارٹمنٹ تھا اور یہاں ان کے علاوہ مزید چار آدمی موجود تھے جن میں سے دو وہی جاسوس تھے جنہیں شنکر داس نے ہائر کیا تھا۔ وہ بظاہر شنکر داس اور نیتو سے لاتعلق تھے۔ انہوں نے ہلکی پلاسٹک سرجری کے ذریعے اپنے چہرے تبدیل کیے ہوئے تھے۔ ان میں سے شوکت علی نے کسی عالم فاضل اور ادیب قسم کے آدمی کا حلیہ بنایا ہوا تھا جبکہ للت ورمانے ایک کاروباری کا روپ دھارا ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے حلیے کے مطابق اپنے سامان میں بھی کچھ ایسی چیزیں رکھی تھیں جو ان کے حلیے سے مماثلت رکھتی تھیں۔ باقی دو اجنبی مسافر تھے جبکہ وہ چاروں ان دونوں مسافروں سے پوری طرح محتاط تھے۔

شنکر داس نے ٹرین چلنے کے ذرا دیر بعد ہی نیتو سے کہا۔ "میں اب اوپر برتھ پر جا رہا ہوں، میں محتاط رہوں گا تم بھی محتاط رہنا۔"

"آپ بے فکر رہیں۔" وہ بولی۔

شنکر داس برتھ پر آ گیا۔ وہ بریف کیس جس میں جواہرات تھے، شنکر داس اسے اپنے سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ اس کے جسم کے ساتھ اس کا ریوالور بھی لگا ہوا تھا۔

کمپارٹمنٹ میں موجود تمام لوگ ایک دوسرے سے لاتعلق تھے۔ للت اخبار پڑھ رہا تھا، شوکت علی ایک کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا، ایک مسافر سیٹ پر لیٹا کچھ سوچ رہا تھا جبکہ دوسرا مسافر اپنا سوٹ کیس کھولے اس میں موجود کپڑوں اور چیزوں کو الٹ پلٹ کر رہا تھا۔

نیتو نے سر سیٹ کی پشت گاہ سے ٹکا دیا اور کسی سوچ میں ڈوب گئی۔

اچانک لیٹا ہوا مسافر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے دیگر لوگوں پر نظر ڈالی اور مسکرا کر للت سے بولا۔ "کیا ہم لوگ اسی طرح خاموشی سے سفر گزار دیں گے؟"

"نہیں نہیں۔" للت نے بھی مسکرا کر کہا۔ "میں تو چاہ رہا ہوں کہ کوئی بات شروع کرے۔"

"لیجیے...... میں نے شروع کر دی۔" وہ آدمی گہری مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"سب سے پہلے تو ہو جائے تعارف۔" للت نے کہا۔

"جی ہاں بالکل...... میرا نام راکیش ہے ممبئی کا رہنے والا ہوں اپنا پریس ہے میرا۔" اس نے تعارف کروایا۔

"میرا نام امیت ہے...... میں کپڑے کا کام کرتا ہوں۔ ہول سیل کا کام ہے میرا اور ایک سودے کے سلسلے میں دہلی جا رہا ہوں۔" للت بولا۔ اسے ان دونوں اجنبی مسافروں پر شک تھا کہ وہ شنکر داس سے جواہرات چھیننے کے لیے اس کمپارٹمنٹ میں سفر کر رہے ہیں لیکن یہ صرف شک ہی تھا کیونکہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ للت کو شک بھی اس لیے تھا کہ ہر کسی پر شک کرنا اس کے پروفیشن کا تقاضا تھا۔ ان دونوں نے عام موضوعات پر بات چیت شروع کر دی۔ اس دوران شوکت علی بھی یہ سمجھ کر کہ راکیش غلط نیت سے سفر کر رہا ہے، اس کی اور للت کی گفتگو میں شریک ہو گیا۔

ذرا دیر بعد ہی دوسرے مسافر نے اپنا تعارف اجے سکسینہ کے نام سے کروایا اور وہ بھی ان کی گفتگو میں شریک ہو گیا۔ نیتو ان سے لاتعلق تھی۔

"محترمہ!...... کیا آپ ہماری گفتگو میں شریک ہونا پسند کریں گی؟" للت نے نیتو سے کہا۔ وہ چاہتا تھا کہ نیتو بھی بات چیت کرے ورنہ اسے خدشہ تھا کہ وہ بوریت کا شکار ہو جائے گی۔

"جی میں کیا بات کروں؟" نیتو نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"بات تو آپ نے کر دی، پھر بھلا بولنے والی کون سی بات رہ گئی؟" للت دھیرے سے ہنستے ہوئے بولا۔ نیتو کی بات پر باقی لوگ بھی ہنس دیے۔

اوپر برتھ پر شنکر داس ان سب کی گفتگو سن رہا تھا۔ اسے یہ شک ہوا تھا کہ امیت اور اجے سکسینہ نے بات چیت تو شروع کر دی ہے۔ اب وہ دونوں کسی بھی لمحے اور کسی بہانے سے اپنی کارروائی کا آغاز کر کے اس سے بریف کیس چھیننے کی کوشش کریں گے۔ وہ پوری طرح محتاط اور تیار تھا۔ اس نے اپنا ریوالور نکال لیا تھا۔

بات چیت کے دوران اجے سکسینہ نے کہا۔ "آج کل حالات بہت خراب ہو گئے ہیں، کسی جگہ جان اور مال محفوظ نہیں ہے۔ ٹرینوں میں بھی اکثر لوٹ مار ہوتی رہتی ہے، اس لیے میں تو پورے انتظامات کے ساتھ چلتا ہوں۔" اس نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈالا۔ اسی وقت للت اور شوکت علی کے ہاتھ ان کے ریوالوروں کی طرف چلے گئے اور انہوں نے ریوالوروں کو گرفت میں لے لیا جو کہ ان کی جیبوں میں تھے۔ انہوں نے ان کی نالوں کا رخ اجے سکسینہ کی طرف کر دیا تھا کہ اگر وہ کوئی الٹی سیدھی حرکت کرنے کا ارادہ کرے گا تو وہ اسے گولی مار دیں گے۔

اجے سکسینہ نے ایک بڑا سا خنجر نکالا اور سب کو دکھاتے ہوئے بولا۔ "یہ دیکھو دوستو! یہ میں اپنے ساتھ رکھتا ہوں، یہ میرے کسی بھی برے وقت میں میرے کام آ سکتا ہے......" اس نے خنجر واپس بیگ میں رکھ دیا۔

للت اور شوکت علی کچھ مطمئن ہو گئے تھے کہ امیت نے کوئی کارروائی نہیں کی تھی لیکن وہ دونوں اب بھی اس کی طرف سے پوری طرح محتاط تھے۔

"آج کل تو ریوالور اور گنوں کا دور ہے جبکہ آپ خنجر حفاظت کے لیے رکھتے ہیں؟" راکیش نے آداب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اجے سکسینہ سے کہا۔

"بھئی!...... میں احتیاطاً ریوالور نہیں رکھتا ہوں کیونکہ ریوالور اگر چل جائے تو بڑا مسئلہ ہو جاتا ہے۔ اس کے ٹریگر پر دباؤ ڈالنے کی دیر ہوتی ہے۔ انسان لڑھک جاتا ہے جبکہ خنجر کو جب تک بھرپور طریقے سے استعمال نہ کیا جائے اس سے کسی کا کچھ نہیں بگڑتا۔" اجے بولا۔

"یہ بہتر سوچ ہے آپ کی۔" راکیش نے بظاہر اس کی بات کو تسلیم کر لیا تھا لیکن دل سے تسلیم نہیں کیا تھا لیکن پھر اس نے سوچا کہ دنیا میں طرح طرح کے لوگ ہیں اور ہر ایک کی اپنی اپنی نفسیات ہے۔

سب مرد بہت باتیں کر رہے تھے جبکہ نیتو خاموش خاموش تھی۔ "کیا بات ہے...... آپ زیادہ نہیں بولتیں جبکہ خواتین کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ وہ زیادہ بولتی ہیں لیکن لگتا ہے کہ آج ہم مردوں نے خواتین کا ریکارڈ توڑ دیا ہے۔" راکیش نے ہنس کر نیتو سے کہا۔ وہ

بھی ہنس دی اور بولی۔

''مجھے سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ میں کیا بولوں؟''

''میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ بار بار کچھ سوچنے لگتی ہیں...... کہیں آپ کو کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟'' راکیش بولا۔

''نہیں...... کوئی خاص نہیں۔ بس عام سی گھریلو باتیں ہیں...... دراصل میرا بڑا بھائی مجھ سے ناراض ہو گیا ہے اور میں اسے منا نہیں سکی ہوں۔ بس دل اسی کی طرف اٹکا ہوا ہے۔'' نیتو نے جواب دیا۔

''او ہو ہو...... واقعی یہ تو افسوس ناک بات ہے۔'' راکیش نے کہا۔ ''بہرحال!...... فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے...... بھائی تو تمہارا اپنا ہی ہے ناں...... کسی بھی وقت منا لینا۔''

''ہاں بھئی...... یہ بات تو انہوں نے درست کہی کہ وہ بھائی تو تمہارا اپنا ہی ہے، کسی بھی وقت منا لینا اسے۔'' اسے سکینہ نے کہا۔

نیتو نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''آپ لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔''

''اچھا یہ بتائیں کہ آپ لوگ چائے پینا پسند کریں گے؟'' راکیش نے سب کی طرف دیکھا۔ ''میرے پاس تھرماس میں چائے موجود ہے۔''

للت اور شوکت علی نے انکار کر دیا۔ راکیش نے نیتو اور اسے سکینہ کو چائے دی اور خود بھی پینے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ سب لوگ بات چیت بھی کر رہے تھے۔

کچھ دیر بعد شنکر داس اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے نیتو سے کافی مانگی۔

''کافی تو میں بھی پیوں گا۔'' راکیش نے کہا۔

''سب ہی پئیں گے' آپ فکر کیوں کرتے ہیں؟'' نیتو نے مسکرا کر کہا اور پھر اس نے سب کو کافی پیش کی۔

کچھ دیر مزید گزری تو وہ سب مزید بے تکلف ہو گئے لیکن شنکر داس نے خود کو ان سے دور ہی رکھا تھا۔ البتہ کسی وقت وہ ذرا سی دیر کے لیے نیچے اترتا اور پھر واپس اوپر برتھ پر چلا جاتا۔

رات ہو گئی' سب لوگوں نے کھانا کھایا اور اس کے بعد نیتو نے سب کو کافی پیش کی۔

کافی پینے کے تقریباً پندرہ منٹ بعد سوائے نیتو کے سب لوگ بے ہوش ہو گئے۔ نیتو نے خود کافی نہیں پی تھی اس لیے اس کے بے ہوش ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ آگے ایک چھوٹا اسٹیشن آ رہا تھا' جس پر ذرا دیر کے لیے گاڑی رکنا تھی۔

نیتو نے شنکر داس کے سر کے نیچے سے بریف کیس نکال لیا۔

کچھ دیر بعد گاڑی اسٹیشن پر رکی۔ نیتو وہاں اتر گئی۔ وہ اسٹیشن سے خوب واقف تھی۔ وہ جا کر ویٹنگ روم میں بیٹھ گئی۔

ذرا دیر بعد گاڑی چلی گئی۔ گیٹ پر جو چیکر کھڑا تھا' وہ بھی ہٹ گیا۔ نیتو اٹھی اور محتاط انداز میں ادھر ادھر دیکھتی ہوئی اسٹیشن کی عمارت سے باہر آئی۔ ذرا دور ہی اسے اپنی مطلوبہ کار نظر آ گئی۔ وہ اس میں بیٹھ گئی اور ڈرائیور نے کار چلا دی۔

☆

جب ٹرین دہلی کے اسٹیشن پر پہنچ گئی اور اس کا سفر اختتام پذیر ہو گیا تو گاڑی میں ڈائننگ کمپارٹمنٹ کے ایک بیرے نے شنکر داس وغیرہ کو بے ہوش دیکھ کر پولیس کو مطلع کیا۔ پولیس نے اپنی کارروائی کی اور ان لوگوں کو پہلے اسپتال پہنچایا گیا۔ جب وہ لوگ ہوش میں آ گئے تو شنکر داس نے صورت حال معلوم ہونے کے بعد اپنا سر پیٹ لیا۔

''حوصلہ کیجیے مسٹر شنکر داس!...... ہم آپ کی سیکریٹری نیتو کو جلد ہی گرفتار کر لیں گے۔'' انسپکٹر ورما نے شنکر داس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''اب...... اب وہ کہاں ملے گی انسپکٹر صاحب؟'' شنکر داس روتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''وہ تو جواہرات لے کر نہ جانے کہاں سے کہاں چلی گئی ہوگی۔''

''آپ حوصلہ کریں...... آپ کا تعاون ہمارے ساتھ رہا تو ہم ضرور اسے پکڑ لیں گے۔'' انسپکٹر ورما بولا۔

اچانک شنکر داس کے موبائل فون کی بیل بجی اس نے فون کان سے لگایا اور شکستہ لہجے میں بولا۔ ''ہیلو؟''

''شنکر داس جی؟'' ایک مردانہ آواز آئی۔

''وہ بول رہا ہوں۔''

''آپ کی سیکریٹری نیتو آپ سے بات کریں گی۔''

''مجھ سے؟'' شنکر داس چراغ پا ہو کر بولا۔ ''کراؤ اس سے میری بات۔''

''ہیلو سر!...... کیسے ہیں آپ؟ خیریت سے تو ہیں ناں؟'' نیتو کی مری مری آواز آئی۔

''ہاں میں ٹھیک ہوں لیکن میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔ پولیس لگ چکی ہے تمہارے پیچھے۔'' وہ تلخ لہجے میں بولا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں سر آپ؟'' نیتو حیرت سے بولی۔ ''پولیس میرے پیچھے کیوں لگ گئی؟''

''اچھا!'' شنکر داس طنزیہ انداز میں بولا۔ ''تم اتنی بڑی واردات کر کے چلی گئی ہو اور پھر بھی پولیس تمہارے پیچھے نہیں لگے گی؟''

''لیکن سر!...... میں نے کون سی واردات کی ہے؟'' نیتو کا لہجہ اب مزید حیرت زدہ ہو گیا تھا۔

''جواہرات لے آؤ شرافت سے' میں پولیس سے سفارش کر کے تمہیں بچا لوں گا۔'' شنکر داس بولا۔

''سر!...... یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟...... میں تو کل سے یہاں ممبئی کے سٹی اسپتال میں ہوں۔''

''کیا؟'' اب حیرت زدہ ہونے کی باری شنکر داس کی تھی۔ ''یہ کیا بکواس کر رہی ہو؟...... اوہ اچھا...... اب میں سمجھا...... تم کوئی چال چلنے کی کوشش کر رہی ہو۔'' پھر وہ کڑک دار آواز میں بولا۔ ''یہ بات ذہن سے نکال دو کہ تم کوئی چال چل سکو گی' سمجھیں؟...... بس ایک ہی راستہ ہے تمہارے پاس بچنے کا...... شرافت سے زیورات لے آؤ' معافی مانگ لو۔ میں اب پھر کہتا ہوں کہ میں پولیس سے سفارش کر کے تمہیں سزا سے بچا لوں گا۔''

''آپ میری بات تو سنیں سر!'' نیتو زچ ہو کر بولی۔ ''میں کل سے یہاں سٹی اسپتال میں بے ہوش تھی۔ ابھی ہوش آیا ہے تو میں نے یہاں ڈاکٹر سے کہا کہ فوراً آپ کی خیریت دریافت کی جائے۔''

''یہ...... یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟'' شنکر داس الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں سر!''

''نہیں...... یہ جھوٹ ہے...... یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم کل سے وہاں اسپتال میں ہو؟...... تم تو میرے ساتھ سفر کر رہی تھیں۔''

''میں نے تو آپ کے ساتھ سفر کیا ہی نہیں۔ سر!...... میں تو جب آپ کے پاس آفس آنے کے لیے گھر سے نکلی تو مجھے آپ کے ریفرنس سے ایک عورت مل گئی۔ وہ کہنے لگی کہ آپ کے حوالے سے کچھ بات کرنا چاہتی ہے۔ وہ مجھے ایک ریسٹورنٹ میں لے گئی۔ اس نے مجھے کوئی مشروب پلایا اور پھر مجھے پولیس والوں نے ایک جگہ جھاڑیوں میں بے ہوش پایا اور مجھے اسپتال میں داخل کروا دیا گیا۔ اب مجھے ہوش آیا ہے۔''

''یہ...... یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟'' شنکر داس نے اپنا سر کھجاتے ہوئے کہا۔

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں سر!...... میری بات کا ثبوت یہ اسپتال والے اور وہ پولیس والے ہیں جو مجھے بے ہوشی کی حالت میں یہاں لے کر آئے تھے۔'' وہ بولی۔

''مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا ہے۔'' شنکر داس جھنجلا کر بولا۔

''کیا بات ہے شنکر داس جی؟'' انسپکٹر ورما نے اس سے پوچھا۔

شنکر داس نے مختصراً اسے سب کچھ بتا دیا۔

”لا یئے یہ فون مجھے دیجئے!“ انسپکٹر ورما نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ شنکر داس نے فون اسے دے دیا۔

”میں انسپکٹر ورما بات کر رہا ہوں۔“ انسپکٹر ورما نے کہا۔

”اوہ سر!...... میں...... میں نیتو بول رہی ہوں۔ شنکر جی کی سیکریٹری...... وہ...... دراصل...... میں۔“

”حوصلہ کریں نیتو جی!...... مجھے اطمینان سے بتائیں کہ معاملہ کیا ہے؟“ انسپکٹر ورما بولا۔

نیتو نے اسے بھی وہی کچھ بتا دیا جو شنکر داس کو بتایا تھا۔

”اچھا کوئی پولیس مین آپ کے پاس موجود ہے؟“ انسپکٹر ورما نے پوچھا۔

”جی ہاں...... انسپکٹر اجیت ہیں۔“

”ذرا فون انہیں دیں۔“

”ہیلو!...... انسپکٹر اجیت اسپیکنگ!“ انسپکٹر ورما کے کان میں آواز آئی۔

”میں انسپکٹر ورما بات کر رہا ہوں...... انسپکٹر کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ وہاں کیا معاملہ ہے؟“

”یہ لڑکی کل ہمیں جھاڑیوں میں بے ہوش ملی تھی۔ ہم نے اسے اسپتال میں داخل کروا دیا اور اب اسے ہوش آیا ہے...... بس یہی معاملہ ہے۔“ انسپکٹر اجیت نے جواب دیا۔

”اوکے!...... میں تمہیں بتاتا ہوں کہ شنکر داس جی کے ساتھ کیا معاملہ رہا ہے؟“ اس نے شنکر داس کا سارا واقعہ اسے سنا دیا۔

”اوہ انسپکٹر ورما!“ انسپکٹر اجیت نے کہا۔ ”تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ کوئی لڑکی نیتو بن کر شنکر داس کے ساتھ سفر کرتی رہی اور اپنا کام کر کے چلتی بنی۔“

”ہاں بالکل!“ انسپکٹر ورما نے اس کی تائید کی۔ ”اس کے علاوہ کوئی اور بات نہیں ہو سکتی۔“

”اوکے!...... تم وہاں معاملہ سنبھالو اور میں یہاں سنبھالتا ہوں...... اب ہمارا مقصد اس نقلی نیتو کو پکڑنا ہوگا۔“ انسپکٹر اجیت بولا۔

”بے شک!...... اوکے؟“

”اوکے۔“

ان لوگوں کا رابطہ منقطع ہو گیا۔

”انسپکٹر صاحب!...... یہ نقلی نیتو کا کیا معاملہ آ گیا؟“ شنکر داس نے کہا، وہ بہت پریشان تھا۔

”کوئی لڑکی نیتو بن کر آپ کے ساتھ سفر کرتی رہی اور اس نے وہاں ممبئی میں اصلی نیتو کو بھی کچھ کھلا پلا کر بے ہوش کر دیا اور اسے جھاڑیوں میں پھینک دیا تھا۔ ممکن ہے ان لوگوں کا خیال ہو کہ اصلی نیتو مر چکی ہے یا مر جائے گی لیکن وہاں اسے پولیس والوں نے دیکھ لیا اور اسپتال پہنچا دیا...... اب کیس واضح ہو چکا ہے۔ انسپکٹر اجیت وہاں ممبئی میں اس نقلی نیتو کو پکڑنے کی کوشش کرے گا اور ہم یہاں کوشش کریں گے۔“ انسپکٹر ورما نے کہا۔

”مہربانی کرو انسپکٹر!...... اس نقلی نیتو کو کسی طرح پکڑو...... میرے وہ جواہرات بہت قیمتی ہیں۔ میں...... میں سفارش کر کے تمہارا عہدہ بڑھوا دوں گا۔ حکومت کے لوگوں سے میری اچھی خاصی بات ہے۔“ شنکر داس نے کہا۔

”نہیں...... مجھے کسی عہدے کی تمنا نہیں ہے۔“ انسپکٹر ورما بولا۔ ”میری تو بس یہ خواہش ہے کہ وہ نقلی نیتو پکڑی جائے۔“

☆

دو دن گزر گئے لیکن پولیس کو اس نقلی نیتو کو پکڑنے میں کامیابی نہیں ہوئی۔

”انسپکٹر صاحب!...... آپ لوگوں کی کوششیں تو مجھے رائیگاں جاتی نظر آتی ہیں۔“ شنکر داس نے انسپکٹر ورما سے کہا۔ وہ لوگ اس وقت پولیس اسٹیشن میں بیٹھے ہوئے تھے۔

”نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ [illegible] کیسز میں وقت تو لگتا ہے۔“ انسپکٹر نے فائل پر سے [illegible] اٹھا کر

اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”شنکر جی!...... فکر نہ کریں...... ہم بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ آپ کا مال جلد ہی مل جائے گا۔“ انسپکٹر نے تسلی دی۔

شنکر داس نے ایک گہرا سانس لیا۔ ساتھ ہی اس کے چہرے پر شدید مایوسی کے تاثرات بھی آ گئے تھے۔ اس نے اپنی آنکھوں پر سے چشمہ اتار لیا اور رومال سے اس کے شیشے صاف کرنے لگا۔

اور پھر ایک ہفتہ گزر گیا لیکن معاملہ ذرا ٹس سے مس نہ ہوا۔ بالآخر تنگ آ کر شنکر داس نے انسپکٹر ورما سے کہا۔

”انسپکٹر صاحب!...... میرے کام کا بڑا حرج ہو رہا ہے۔ میرے لیے اب مناسب یہ ہے کہ میں واپس ممبئی چلا جاؤں اور آپ سے رابطہ رکھوں۔“

”جی یہ بہت مناسب رہے گا۔“ انسپکٹر ورما نے کہا۔ ”اس کیس میں مزید دن بھی لگ سکتے ہیں اور یہاں آپ کا وقت ضائع ہوگا۔ یہ بہت مناسب ہے کہ آپ واپس ممبئی چلے جائیں اور مجھ سے رابطہ رکھیں۔ میں تو یہاں کوشش کر ہی رہا ہوں۔ وہاں آپ انسپکٹر اجیت کی کارکردگی بھی دیکھ سکیں گے۔“

”پیش رفت تو اس طرف سے بھی نہیں ہوئی ہے ناں کوئی۔“ شنکر داس اب بھی اداسی کے شکنجے میں تھا۔ ”وہ بھی بس اب تک کوششیں کر رہا ہے۔“

”شنکر جی!...... یہ ایک بڑی واردات ہے۔“ انسپکٹر ورما قدرے چڑچڑاہٹ سے بولا۔ ”یہ کوئی چھوٹی موٹی چوری کی واردات نہیں ہے۔ بڑی پلاننگ سے یہ بڑا کام کیا گیا ہے۔ اگر یہ مسئلہ جلد حل ہو جائے تو آپ کی خوش قسمتی ہوگی ورنہ ایسے کیسز تو مہینوں لے لیتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے جی!...... آپ جیسا بہتر سمجھیں کریں...... مجھے تو اپنا مال واپس چاہیے ورنہ میں اوپر کسی وزیر مشیر سے بات کر لوں گا۔“

”نہیں...... اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ انسپکٹر ورما فوراً سنبھل گیا۔ شنکر داس کی دھمکی نے اس پر اثر کیا تھا۔ ”میں آپ سے کہہ رہا ہوں ناں کہ ہم اپنی پوری طاقت اور صلاحیت کے ساتھ کام کر رہے ہیں لیکن آپ مہربانی کریں کہ ہمیں ٹارچر نہ کریں، اس طرح ہماری کارکردگی متاثر ہوگی۔ ہمیں ذرا تسلی سے کام کرنے دیں۔“

”ٹھیک ہے صاحب!“ شنکر داس بولا۔ ”آپ تسلی سے کام کریں لیکن اگر دس دن کے اندر اندر مجھے میرا مال واپس نہ ملا تو میں اوپر بات کر لوں گا۔“

”بہتر ہے۔“ انسپکٹر ورما سوچتے ہوئے بولا۔

اسی روز شنکر داس نے واپسی کے لیے ہوائی جہاز کے ٹکٹ منگوا لیے۔ جب وہ ٹیکسی میں ایئرپورٹ جا رہا تھا تو اس کے موبائل فون کی بیل بجی۔ اس نے حسب عادت اسکرین پر نمبر دیکھے بغیر فون کان سے لگا لیا اور بولا۔

”ہیلو؟“

”کیسے ہو شنکر داس؟“ ایک مردانہ جانی پہچانی آواز اسے آئی۔

”تت...... تم...... لکشمن؟“ وہ جلدی سے بولا۔

”ہاں...... خوب پہچانتے ہو میری آواز؟“ لکشمن دھیرے سے ہنس کر بولا۔

”بولو...... کیا بات ہے؟“ شنکر داس نے کرخت لہجے میں کہا۔ وہ لکشمن سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لکشمن جرائم کی دنیا کا آدمی تھا اور اس کا اپنا گروپ تھا۔ شنکر داس پہلے اس سے مختلف غیر قانونی کام لیتا رہتا تھا لیکن بعد میں ان دونوں میں تلخی ہو گئی تھی جو ترک تعلقات پر منتج ہوئی۔ اب تقریباً چھ ماہ بعد لکشمن نے شنکر داس سے رابطہ کیا تھا۔

”سنا ہے...... بڑا مال چلا گیا ہے تمہارا؟“ لکشمن نے خوش گوار لہجے میں کہا۔

”ہاں تو تمہیں کیا؟“ شنکر داس نے چٹاخ سے جواب دیا۔

”سنا ہے کہ دو جاسوس بھی رکھے ہوئے تھے تم نے؟“ لکشمن نے اس کی تلخی کو نظر انداز کرتے ہوئے بدستور

خوش گوار انداز میں کہا۔

''لیکن تمہیں کیا تکلیف ہے؟''

''اور یہ بھی سنا ہے کہ وہ دونوں جاسوس پلاسٹ سرجری سے چہرہ بدلے ہوئے تھے؟''

''ہاں......تو پھر؟''

''بڑے افسوس کی بات ہے...... کیسے جاسوس رکھ لیے تھے تم نے؟......ان کی موجودگی میں ایک عورت انہی کی طرح پلاسٹک سرجری میں سب کو دھوکا دے گئی۔''

''کیا؟'' اب شنکر داس کا ماتھا ٹھنکا۔ ''یہ تمہیں کیسے معلوم ہے؟''

''ارے چھوڑو شنکر جی!...... اب وہ مال واپس نہیں آنے کا...... میں نے تو افسوس کے لیے فون کیا تھا...... جے رام جی کی۔'' اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

شنکر داس کچھ دیر تو سکتے کی کیفیت میں رہا' پھر جب اسے ہوش آیا تو اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اب اسے پوری طرح یقین ہو گیا تھا کہ اس کا مال واپس نہیں ملے گا۔ کیونکہ لکشمن ایک چھلاوہ تھا اور اس تک پہنچنا پولیس یا کسی اور کے بس کی بات نہیں تھی۔

اگلے ہی لمحوں میں ٹیکسی ایک سگنل پر رک گئی۔

دوسری گاڑیوں وغیرہ کے ساتھ ایک اسپورٹس موٹر سائیکل بھی شنکر داس کی کھڑکی کے بالکل ساتھ آ کر رکی۔ شنکر داس نے اس پر سوار آدمی کو دیکھا جس نے ہیلمٹ میں اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ اس آدمی نے ہیلمٹ اتار کر فوراً پہن لیا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی شنکر داس مچھلی کی طرح تڑپ گیا تھا اور وہ فوراً دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اس سے پہلے کہ وہ ٹیکسی سے نیچے اترتا اور موٹر سائیکل سوار تیزی سے گاڑیوں کے درمیان سے جگہ بناتا آگے چلا گیا۔

شنکر داس چند قدم اس کی طرف بھاگا لیکن پھر فوراً پلٹا۔ اس وقت سگنل گرین ہو گیا۔ موٹر سائیکل سوار تیزی سے آگے نکل گیا۔

شنکر داس ٹیکسی میں بیٹھا اور سامنے ٹریفک کی طرف دیکھتا ہوا ڈرائیور سے بولا۔ ''وہ......وہ جو موٹر سائیکل والا تھا......تم......تم اس کا تعاقب کرو......''

''لیکن صاحب!...... وہ تو پتہ نہیں کہاں کا کہاں چلا گیا۔ آگے اتنی گاڑیاں ہیں اور پھر ٹیکسی میں اس موٹر سائیکل کا تعاقب نہیں ہو سکتا اسپورٹس موٹر سائیکل ہے اور اس کا سوار بھی کوئی ایکسپرٹ لگتا ہے۔'' ڈرائیور نے معذرت کر لی۔

''کیسی ٹیکسی ہے یہ!'' شنکر داس نے جھنجلا کر ڈرائیور کی سیٹ کے عقبی حصے پر مکا مارا۔

''جی...... میں سمجھا نہیں؟'' ڈرائیور الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

''تمہیں پتہ ہے وہ موٹر سائیکل والا کون تھا؟'' شنکر داس بولا۔

''کون تھا صاحب؟'' ڈرائیور جلدی سے بولا۔

''ایک بڑے مجرم لکشمن کا نام سنا ہے؟''

''لکشمن؟...... ممبئی والا؟'' ڈرائیور نے قدرے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔ لکشمن کی شہرت لکشمن ممبئی والا کے نام سے ہی تھی۔

''ہاں ہاں وہی ...... وہ تھا اس موٹر سائیکل پر۔''

''کیا؟'' ڈرائیور کی آنکھیں پھیل گئیں۔ پھر وہ بولا۔ ''اچھا ہوا صاحب ہم نے اس کا پیچھا نہیں کیا۔ ایسے لوگوں سے تو کوئی جھگڑا مول نہیں لینا چاہیے۔''

شنکر داس اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے لگا لیکن ڈرائیور نے اس کی پروا نہ کرتے ہوئے ٹیکسی چلا دی۔

☆☆☆



بٹلر

اے ایس صدیقی

ہر مجرم اپنے طور پر بڑا بے داغ منصوبہ تشکیل دیتا ہے ایسے میں وہ خود کو دنیا کا ذہین ترین شخص تصور کرتا ہے تاہم وہ قدرت کے اس اصول کو فراموش کر دیتا ہے کہ وہ خون ناحق کا معاف نہیں کرتا۔

ایک قاتل کا احوال' اس نے قتل کرتے ہوئے ایک معمولی غلطی کر دی تھی

ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے کہ کوئی بٹلر میرے گھر آئے اور اس سے بھی کم یہ کہ اپنے ساتھ وہ ایک لنچ باسکٹ بھی لائے بہرحال میں نے ہیگن کو گھر کے اندر بلا لیا تھا کیونکہ وہ ولیم شا کے ہاں ملازم تھا اور ولیم شا ایک بار میرے بہت کام آیا تھا۔

ہیگن بہت ہی بانکلف آدمی تھا اس نے اپنے آقا کی نیک خواہشات مجھے پہنچائیں۔ میں نے اسے بہت عمدہ قسم کی شراب سے نوازا کیونکہ میں ولیم شا کا ابھی تک احسان مند تھا اور وہ میرا بہت پرانا اور قابل اعتبار دوست تھا۔

''ذرا مجھے بتانا۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے کافی عرصے سے مسز شا کو نہیں دیکھا......شاید اس کی......''

''شادی کے بعد سے۔'' ہیگن نے میری طرف سے بات مکمل کر دی۔ میں ہمیشہ سے ہیگن کی ذہانت اور خاموش اندازہ کا دلدادہ رہا ہوں۔ وہ کچھ اس قسم کا بٹلر تھا' جسے ہر موقع کی نزاکت کے پیش نظر اقدامات کرنے کا ہنر آتا تھا۔ اس وقت وہ بے حد سنجیدہ ہو رہا تھا۔ اس کا چہرہ بے تاثر اور پتھریلا سا ہو رہا تھا۔ ''شادی کے بعد سے۔'' اس نے دہرایا۔

''اس کی بیوی گریس شا۔ میں سمجھتا ہوں شاید کچھ تنگ خیال سی ہے' اس نے ملنے ملانے والوں پر رکاوٹیں ڈال دی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''مسٹر شا میں بہت کمزوریاں ہیں۔'' بٹلر نے کہا۔ ''ان کی بیوی ان کی ایک کمزوری تھی۔'' ذرا عمر رسیدہ تھے' بیوی کم عمر تھی۔ ان کے آخری برس اسی لیے دشواری کا شکار تھے۔''

ہیگن نے اپنے پالش شدہ سیاہ جوتے کی نوک سے اپنی لنچ باسکٹ کو حرکت دی۔ ''مسٹر شا لوگوں کی مدد کے عادی تھے انہیں کافی بری پوزیشن کا سامنا تھا۔'' ہیگن نے کہا۔ ''اب اس میں سے بہت کم بچا ہے جو کبھی ایک بڑی جائیداد تھی۔ طلاق کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کیونکہ مسز شا اس کے بڑے حصے کے بغیر راضی نہیں ہو سکتی تھیں۔''

مجھے شا کے گھرانے سے اپنی آخری ملاقات یاد آئی مجھے وہ چمکتا ہوا ہار یاد آیا جو گریس شا نے پہن رکھا تھا اور یہ بھی یاد آیا کہ اس کو وہ کس محبت سے بار بار سہلا رہی تھی۔

”بے شک طلاق ممکن نہ تھی۔“ میں نے بے خیالانہ کہا۔

”بیوی کو چھوڑ کر کہیں چھپ کر رہنے کی بات کچھ اچھی نہیں کہی جا سکتی۔“ ہیگن نے کہا۔ ”ظاہر ہے اس کی وجہ سے وہ شخص اپنے دوستوں سے بھی کٹ جاتا ہے اور مسٹر شا تو دوستوں کے بنا جی ہی نہیں سکتے تھے۔“

”بے شک مجھے اس کی دوستی کا علم ہے۔“ میں نے کہا۔

”اس کے علاوہ یہ جو حادثے ہوتے ہیں، ان کی وضاحت بھی آسان نہیں ہوتی۔“ ہیگن بولتا رہا۔

اب میں نے لنچ باسکٹ کو تجسس کے ساتھ دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ مجھے کچھ کراہت بھی ہو رہی تھی۔

میں لرزا...... مگر یہ شراب بھی ہو سکتی تھی۔ جب ہیگن نے گلاس اٹھایا جو سورج کی روشنی میں وہ اس کی زرد انگلیوں کے درمیان خون کی طرح سرخ نظر آیا تھا۔ میری کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور ادھر سے مٹی کی سوندھی بو ندآ رہی تھی۔

”آپ کا گھر بہت عمدہ ہے۔“ ہیگن نے کہا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ ”آپ نے بہت ترقی کی ہے۔ مسٹر شا کو معلوم ہوگا تو وہ خوش ہوں گے۔“

”ایک موقع پر میں خودکشی کرتے کرتے بچا ہوں۔“ اس کے لہجے میں کچھ ایسی بات اپنائیت تھی کہ میں نے اسے اعتماد میں لینے میں کچھ حرج نہیں پایا۔ ”اس وقت میرا حال ابتر تھا۔ میری حالت بہت بگڑ گئی تھی اور میری کوئی فیملی بھی نہ تھی۔ میں بیمار بھی تھا اور میرے پاس دوا تک کے پیسے نہ تھے۔ میں بس ہائی وڈ اٹز کی سمت چل دیا۔ لوگ اس سے کود کر خودکشی کرتے ہیں۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے۔“

”مگر تبھی آپ کی ملاقات مسٹر شا سے ہو گئی تھی۔“ ہیگن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ یہ میری زندگی کا اہم موڑ تھا۔“ میں نے کہا۔ ”شا میرے لیے ایک اجنبی تھا۔ اس نے مجھ پر وقت بھی خرچ کیا اور رقم بھی اور مجھے اپنے پیروں پر کھڑا کرنے میں مدد دی۔ میں یہ احسان کبھی نہیں بھول سکتا۔“

”آپ نے درست کہا۔“ ہیگن بولا۔ ”مسٹر شا کے ایسے کوئی بیس عدد دوست ہیں، جو مشکل میں تھے اور مسٹر شا نے جن کی مدد کی تھی۔“

ہیگن نے باسکٹ کو پھر سرکایا اور میرے مزید نزدیک کیا۔ اس کے لبوں پر ایک گرم جوش مسکراہٹ تھی۔

”میری ہمیشہ سے خواہش رہی ہے کہ میں اس احسان کا بدلہ چکا سکوں۔“ میں نے کہا۔

”مسٹر شا کو کسی سے کوئی بدلہ نہیں چاہیے۔“

”پھر بھی میں......“ میں نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا کیونکہ ہیگن کی مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔ وہ پھر سپاٹ ہو گیا تھا۔

”لگتا ہے کہ وہ شخص جو ہمیشہ سے مہربان رہا ہے، حکومت کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر جائے گا۔“ ہیگن نے متاسف لہجے میں کہا۔ ”ویسے ہو سکتا ہے گریس شا کی گمشدگی کوئی اہم بات نہ ثابت ہو۔ وہ پہلے بھی اس طرح غائب رہ چکی ہے۔ ایک بار ایک ٹرک ڈرائیور کے ساتھ بھاگی تھی اور ایک بار ایک ملاح کے ساتھ۔“

”ہاں یہ خبریں میں نے بھی سنی تھیں۔“ میں نے کہا۔

”اس بار پتا نہیں کون ہوگا؟ کوئی قصائی یا سیلز مین وہ چلی گئی ہے اور مسٹر شا بالکل نوعمر لڑکوں کی طرح ہو رہے ہیں، جیسے انکے اوپر سے کوئی بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ البتہ عورت کا ایک بھائی انہیں پریشان کر رہا ہے۔ تاہم مسٹر شا نے اس کو بھگا دیا ہے۔“

اس نے اپنا گلاس خالی کر دیا اور اٹھ پڑا۔ ”مسٹر شا کے سارے عمدہ دوست ان کی مدد کر رہے ہیں۔ ان کی تعداد بیس کے لگ بھگ ہے۔ یہ بھی ان کے احسان مند ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم آپ پر بھی بھروسہ کر سکتے ہیں۔“

”میں...... میں۔“

ہیگن نے سر خم کر کے تعظیم دی اور دروازے کی طرف چلا۔

”آپ کی جگہ میں ہوتا تو دیر نہ کرتا۔“ اس نے کہا۔ ”موسم گرم ہے اور برف زیادہ دیر نہیں رہ سکتی۔ اچھا اب رخصت مسٹر ہلسن، مگر یہ رخصتی الوداعی نہیں ہے۔ ہم سب جلد ہی اکٹھے ہوں گے اور جشن منائیں گے۔ آپ اور آپ کی بیگم کو ہم دلی طور سے مدعو کر رہے ہیں۔“

میں اسے دروازے تک چھوڑنے گیا۔ میں اس کے ساتھ پورچ تک گیا اور پھر اس کی رولز رائس تک۔

”میں ان معاملات میں خاصا اناڑی ہوں۔“ میں نے کہا۔

”مسٹر گڈلیس، سمندر میں گئے ہوئے ہیں۔ مچھلی کے شکار پر۔“ ہیگن نے کہا۔ ”مسٹر آلڈرے مکان ٹھیک کر رہے ہیں۔ ایلن ولسن باغیچے کو درست کر رہی تھی۔ سوچا جائے تو بہت کچھ ممکن ہوتا ہے۔“ اس نے میرا ہاتھ دبایا، مسکرایا۔ ”اپنا خیال رکھیے گا مسٹر ہلسن۔ آپ کا رنگ اڑا ہوا سا ہے۔ میرا خیال ہے جا کر لیٹ جائیں اور آرام کر لیں۔ مسٹر شا البتہ آپ کے بارے میں......“

پھر اس کی کار چلی گئی۔

میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو اپنے باغیچوں وغیرہ میں کھدائی وغیرہ کرتے رہتے ہیں، لیکن میرے اہل خانہ باہر گئے ہوئے تھے اور یہ خوشگوار سی سہ پہر تھی۔ میں نے بیلچہ اٹھایا اور صحن میں چلا گیا۔ میں نے باسکٹ اٹھا کر گیرج میں رکھ دی تھی۔ جہاں میں نے کھدائی شروع کی تھی زمین ذرا سخت تھی تاہم اس کے پہلو میں زمین نرم تھی۔

میں کام میں لگا ہوا تھا کہ مجھے کسی اور کسی موجودی کا احساس ہوا۔

”یہ کیا کر رہے ہیں؟“ یہ ایک چھوٹا سا لڑکا تھا۔ وہ مجھے بہت سنجیدگی سے دیکھ رہا تھا۔

جواب کی تھی میں نے مختصر سا جواب دیا۔

”کھدائی کر رہا ہوں۔“

”کیوں؟“ ہمسائے کے بچے نے دوسرا سوال کیا۔ یہ ذہین تھا اور بہت متجسس لڑکا تھا۔ باتوں کو پھیلانے میں بھی ماہر تھا۔

”گڑھا بنا رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ میں نے رک کر سانس درست کی۔ ایسے کام کی عادت نہ ہونے سے میں تھک رہا تھا۔ ابھی میں نے چھ انچ تہہ بھی نہیں الٹی تھی۔

اس کے سوالوں کے جواب میں بالآخر میں نے کہا“۔ میں گلاب کا ایک پودا لگانے والا ہوں۔“

”میری ممی اتنی گہرائی میں گلاب نہیں لگاتیں۔“ اس نے کہا اور مشکوک نظروں سے مجھے دیکھا۔ بہ ظاہر وہ ایک ذہین چہرے والا لڑکا تھا۔ آج اس کا چہرہ مجھے بدنما لگ رہا تھا۔

”تم درست کہہ رہے ہو۔“ میں نے کھدائی روک دی۔ ادھر درجن بھر لڑکے گھوم پھر رہے تھے ایسے میں یہ کام مناسب نہ تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ وقت کم تھا۔ میری بیوی پانچ بجے آنے والی تھی اور میرا بیٹا نانی کے ساتھ چھ بجے۔

بہت سے لوگوں کو معلوم نہیں کہ آج کے دور میں کوڑا گھروں کی کیا افادیت ہے۔ اب یہ پرانے زمانے کے نہیں رہے تھے۔ ڈبے...... اونچے ڈسٹ بن وغیرہ ریلوے لائنوں کے پاس رکھے جاتے تھے۔

اب انہیں کمپنیاں چلاتی تھیں۔ میرے گھر کے پاس والا کچرا گھر JHK کنسٹرکشن کمپنی چلاتی تھی۔ یہ ایک نشیبی زمین کا ٹکڑا تھا جہاں کچرا ڈالا جاتا تھا۔ تاکہ یہ جگہ بھر جائے پھر اس پر عمارتیں بنی تھیں۔ اسے تاروں سے گھیر دیا گیا تھا۔ گیٹ میں ادھر بہت سے ٹرکیں تھیں۔ ٹرک کے آتے ہی ایک بلڈوزر کام شروع کر دیتا تھا۔ جو تمام کچرے کو لیول کرتا تھا۔ ہر روز ایک تہہ پر دوسری تہہ چڑھتی تھی اور یہ سلسلہ چلے جا رہا تھا۔

گیٹ میں داخل ہوتے ہی بہت سے ٹرک نظر آتے تھے۔ جن میں ٹریلر چڑھے ہوئے تھے۔ لوگ جا کر بلڈوزر میں کچھ فاصلے پر اپنا کچرا ڈال دیتے تھے۔ یہاں لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔

میں نے اپنی کار میں گیرج میں دھری ان اشیا کو رکھا

جنہیں میں عرصے سے کچرے گھر میں پھینکنے کے لیے سوچ رہا تھا۔ یہ ایسی چیزیں تھیں جنہیں وہ کچرا گاڑی نہیں اٹھاتی تھی جو ہر ہفتے آتی تھی۔ ان اشیاء میں ہیگن کی لائی ہوئی باسکٹ نظروں سے تقریباً اوجھل ہوگئی تھی۔

میں اپنی کار کو ایک ڈمپنگ اسپاٹ پر بیک کر ہی رہا تھا کہ میری نظر ایک دوسری کار پر پڑی جو مجھ سے آگے تھے۔ یہ کار مجھے مانوس سی لگی۔ میں نے کچھ عرصے سے بن جیکسن کو نہیں دیکھا تھا' مگر مجھے معلوم تھا کہ یہ بھی مسٹر شا کا گہرا دوست ہے اور اب...... میں اس کی کار کو دیکھ رہا تھا جو کچرا ڈالنے والوں میں شامل تھی۔ کار خود بن جیکسن ہی چلا رہا تھا۔

میں نے کار کو قطار سے الگ کر کے روکا اور بن کے طرف چل دیا۔ مجھے دیکھ وہ شاید بہت خوش نہیں ہوا تھا اور جب میں نے اس کے ٹریلر کو دیکھا جس میں کافی کچرا ابھرا ہوا تھا۔ میں اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ اس کے بھرے ہونے میں ہیگن کی کارروائی کا ہاتھ ضرور ہے۔ وہ آج ہفتے کے روز مجھ ہی سے نہیں اوروں سے بھی ضرور ملا ہوگا۔

"میرے ذہن میں یہ خیال سب سے پہلے آیا تھا۔" وہ چیخا۔

"یہ بہت بڑا کچرا خانہ ہے۔" میں نے کہا۔

بن ایک ناٹے قد کا موٹا سا آدمی تھا۔ اس کے سر کے بال غائب تھے اور آنکھیں بھوری تھیں۔

"تمہاری وجہ سے گڑبڑ ہوگئی۔" اس نے کہا۔

"کیوں؟"

"دو دو کاریں مشکوک ہو سکتی ہیں۔"

"مگر میری مجبوری ہے۔" میں نے کہا۔ "گھبراؤ نہیں یہاں بہت سی جگہیں ہیں۔"

اور یہ اسی وقت کی بات ہے کہ حادثہ ہوا تھا۔ پتا نہیں کہ میں پھسلا تھا یا بن۔ میرے پڑوس سے ایک ٹرک گزرا تھا۔ اس سے میں ٹکرایا اور ایک طرف جا گرا۔

مجھے کچھ یاد نہیں رہا۔ البتہ جب میں سنبھلا تو دکھا کہ کچرے گھر کا ایک اٹنڈنٹ مجھے میری کار کی سیٹ پر ٹھونس رہا ہے۔

"اب تم رخصت ہو جاؤ۔" اس نے کہا۔ "تمہارا ٹریلر تمہارے دوست نے خالی کر دیا ہے اور جا چکا ہے۔ اب تم آرام سے جا سکتے ہو۔"

وہ بلاوجہ مجھے نہیں بھگا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مجھے گہری چوٹ بھی لگی ہوگی۔ میں کچرے خانے والے پر مقدمہ بھی کر سکتا تھا۔ بہرحال میرے لیے بھی اچھا تھا کہ میں نہیں رکوں اور کھسک لوں۔ میں کھسک لیا۔

راستے میں میں نے مڑ کر دیکھا۔ کچرا صاف ہو چکا تھا۔ مجھے خوشی ہوئی۔ البتہ بیک سیٹ پر مجھے دو عدد باسکٹیں رکھی دکھائی دیں' جو ہرگز میری والی نہ تھی۔

میری سمجھ میں کچھ نہ آسکا۔ حادثے سے میرا ذہن ابھی دھندلایا ہوا تھا۔ گو کہ مجھے کوئی خاص چوٹ نہیں آئی تھی۔ میں نے طے کیا گھر جا کر میں بن کا پتا دیکھوں 'ور بات کروں گا۔

میں اس کی حرکت پر بہت بھنایا ہوا تھا۔ جس وقت میں اپنے گھر کے سامنے پہنچا۔ مجھے فرنٹ پورچ پر ایک بہت مانوس سی باسکٹ رکھی نظر آئی۔ اس کے ساتھ ایک نوٹ منسلک تھا۔ یہ کسی زنانہ تحریر میں تھا۔

"تمہیں یاد ہوگا۔" اس میں لکھا تھا۔ "ولیم شا کی ایک دوست سارہ کنگ تھی۔ میں تم سے عرصے سے نہیں ملی ہوں۔ مسٹر ہیلسن مگر امید ہے تم تعاون کرو گے میں آج کل ایک چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں گوشہ نشین سی ہوں۔ تم ایک شریف آدمی ہو میری ضرور مدد کرو گے۔

میں اب عمر رسیدہ ہو رہی ہو خود کچھ نہیں کر پاتی۔

مسٹر شا نے پھولوں کی ٹوکری بھیجی ہے۔ ذرا تم کو سنبھالنا ہوگا۔ تم میرے گھر میرے پاس آسکتے ہو اور تمہارے پاس ایک عمدہ سا باغیچہ بھی ہے۔" اس پر سارہ کے دستخط تھے۔

میں گھر کے اندر لپکا۔ میں خاصہ سراسیمہ ہو چکا تھا۔

بے شک شا نے میری بہت مدد کی تھی۔ مگر احسان مندی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔

اندر فون کی گھنٹی تواتر بجے جا رہی تھی۔

یہ کال چارلس مورس کی تھی۔ گریس یعنی شا کی بیوی کا بھائی تھا یہ۔ میں نے اس کی کھر دالی جارحانہ آواز پہچان لی۔

"تم نے گریس کو تو نہیں دیکھا؟"

"نہیں۔" میں نے کہا...... میں نے کوشش کی کہ میرے لہجے سے خوف نہ ظاہر ہو۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے تو اسے زمانے سے نہیں دیکھا ہے۔ میں نے درست ہی کہا تھا۔ میں نے اسے کب دیکھا تھا۔ میں نے تو صرف سفید کاغذوں کے کچھ پیکٹ دیکھے تھے جو تین عدد باسکٹوں میں رکھے ہوئے تھے۔

"میرے معروف بہنوئی مسٹر شا کا کہنا ہے کہ وہ لاپتا ہوگئی ہے۔" مورس نے کہا۔ "جبکہ میں سمجھتا ہوں یہ معاملہ بہت مشکوک ہے اور اس میں اس کے دوستوں کا بھی ہاتھ ہے۔"

میرے ذہن میں اس شخص کا تصور ابھرا۔ میں اسے دیکھ چکا تھ۔ بہت مقطع لب ولہجہ' گنجا سر' بھیگے بھیگے ہاتھ' زرد گول آنکھیں۔ یہ کسی بھی طرح اچھا آدمی نہیں لگا تھا مجھے۔ مجھے شا کی خوش مزاجی یاد آئی۔ مجھے اس کی بات پر غصہ محسوس ہوا۔ بھناتے ہوتے میں نے کہا۔ "مسٹر تمہاری بہن کی شہرت کچھ اچھی نہیں۔ وہ گھر پر رکنا کب پسند کرتی تھی؟"

"وہ ٹھیک ہے۔" مورس نے کہا۔ "مگر اس بار یہ معاملہ خاصا الگ ہے۔ میرا ارادہ تم سے ملنے کا ہے۔ میں اس کے کچھ دوسرے نام نہاد دوستوں سے بھی ملوں گا اور پولیس کے پاس تو میں جاؤں گا ہی۔"

"ٹھیک ہے جب چاہو مل لو۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں کسی بھی طرح اپنے دوست شا کو اس کا شکار بنتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ میں مورس کے آنے کی توقع میں تھا۔ میرا خیال تھا کوئی پولیس والا بھی آئے گا۔ میں تیار تھا اور میرے پاس اس ہفتے اپنی مصروفیات کے لیے گواہ بھی موجود تھے۔ کوئی نہیں آیا۔ اخبار میں بھی کوئی خبر نہ تھی۔

ایک بار میں کار لے کر ہل اسٹر بھی گیا جہاں شا کا مکان تھا۔ وہاں میں نے صرف ایک باوردی چوکیدار کو دیکھا جو نگرانی پر تھا۔ میں نے ہیگن کو فون کرنے کی کوشش بھی کی مگر ہر بار مجھے وہاں سے کسی گارڈ نے جواب دیا' جس نے بتایا کہ گھر پر کوئی نہیں ہے۔

"یہ تناؤ بدستور تھا' مگر کوئی الجھن نہیں ہوئی۔ البتہ میری بیوی نے شکایت کی کہ میں ادھر تب خاموش سا ہوں۔ ایک روز میں غصے میں لڑکے پر بہت چیخا بھی تھا۔

بہرحال پھر سکون کی صورت نکلی۔

مجھے ہیگن کی طرف سے ایک رقعہ ملا۔ اس نے لکھا تھا...... "مسٹر شا یورپ کے دورے پر جا رہے ہیں۔ وہ اگلی خزاں پر لوٹیں گے پھر سارے دوستوں سے ملیں گے۔"

اس طرح یہ معاملہ ختم ہوگیا۔ گویا شا ٹھیک ٹھاک تھا۔ اب ہم سب کو اس کی طرف سے پریشان ہونے کی ضرورت نہ تھی۔

"تم کسی پولیس کار کو دیکھ کر گھبرا کیوں جاتے ہو؟" میری بیوی نے ڈرائیونگ کے دوران پوچھا۔ "کیا تم نے ٹیکسی وغیرہ میں کوئی چکر چلایا ہے؟"

میں کیا کہتا۔ صرف ہنس دیا تھا۔ دراصل میں پولیس سے مڈبھیڑ سے واقعی خوف زدہ تھا۔

میں نے ایک شیمپین کی بوتل خریدی اور شا کی حویلی میں گھس پڑا۔ مجھے وہاں پھر ہیگن سے ملاقات ہوئی۔ وہی پرسکون پراعتماد بٹلر میرے سامنے تھا۔ میں نے اس سے مورس کی کال کا ذکر کیا۔

اس نے کہا...... "مسٹر ہیلسن ہمیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم نے یورپ کی ٹرپ جان بوجھ کر بنائی

تھی تا کہ اس مدرس سے دور رہا جاسکے۔"

اور یہ اس کی بہن کسی نامعقول آدمی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ ہم یہاں صرف چار کی تعداد میں تھے یعنی مسٹر اور مسز شامیں اور موریس...... جو یہاں عرصے سے دھنسا ہوا تھا۔ اب ہم گھر کو بند کرسکتے ہیں۔ موریس کو اب یہاں سے جانا ہی ہوگا۔ جلد ہی خزاں کے بعد ہم سب پھر یکجا ہوں گے۔"

میں نے وہاں ہال میں کچھ بندھے ہوئے سامان کو رکھا دیکھا تو میں نے پوچھا۔ "شاید میں وقت پر آیا ہوں۔ تم لوگ جانے ہی والے تھے۔" میں نے سامان کی سمت اشارہ کیا۔ دو عدد بڑے ٹرنک تھے اور کئی عدد عورتوں والے سوٹ کیس رک کر میں نے کہا۔ "میں شیمپین کی ایک بوتل لایا ہوں اس شا کو دینا چاہتا ہوں۔"

ہیگن نے نفی میں سر ہلایا...... "مسٹر ہینسن یہ مناسب نہ ہوگا۔ ہم نے موریس کو یقین دلادیا ہے کہ اس کی بہن بھاگ گئی ہے۔ یہ کوئی اچھی بات نہ ہوگی اگر کوئی پرانا دوست اس وقت اسے یہاں نظر آیا۔"

مجھے اس کی بات میں کچھ وزن محسوس ہوا۔ میں نے بوتل میں رکھ دی اور بولا۔ "میری طرف سے مسٹر شا کو سلام کہنا۔"

میں لاس اینجلز بندرگاہ کے ڈاک پر کھڑا تھا اور اس بحری جہاز کو دیکھ رہا تھا جو ہوائی کے سفر پر روانہ ہو رہا تھا۔ بکنگ سے یہ معلوم کرنا مشکل ثابت نہیں ہوا تھا کہ اس میں مسٹر اور مسز ہیگن سفر کررہے ہیں۔ میں نے ان کی ایک جھلک ریلنگ پر دیکھی بھی تھی۔ تاہم میں نے احتیاط کی تھی کہ وہ مجھے نہ دیکھ سکیں۔

چارلس موریس بھی وہاں تھا۔ وہ بڑی گرم جوشی سے اپنے نئے بہنوئی اور بہن کو ہاتھ ہلا ہلا کر رخصت کرنے میں لگا ہوا تھا۔ اب جبکہ ولیم شا مرچکا تھا اور اس کی لاش کو اس کے بہترین بیس عدد دوستوں کی مدد سے ٹھکانے لگایا جاچکا تھا۔ انہوں نے بڑی کامیابی حاصل کرلی تھی۔ گریس ہیگن اور چارلس دونوں کی عمدگی سے کفالت کرسکتی تھی۔ کیونکہ ان دونوں میں سے کوئی بھی غریب شا کی طرح فیاض اور خراج نہ تھا۔ گریس کے گلے کا نیکلس دمک رہا تھا۔ سورج کی روشنی میں ہیگن کے دانت چمک رہے تھے۔ وہ گریس کے گرد ہاتھ کا حصار بنائے کھڑا تھا۔

میں وہاں سے ہٹا۔ پھر میں نے چند ٹیلی گرام بندرگاہ کی پولیس کو روانہ کیے۔ انہیں میں نے نام پتا بتائے بغیر اطلاع دی کہ ہیگن کے کمرے میں انہیں تین عدد باسکوں میں سے کیا کچھ مل سکتا ہے۔ ان ٹوکریوں کو میں نے اپنے ایک قصائی دوست کی دکان کے آئس باکس میں رکھوادیا تھا۔ اس دوران میں نے بڑی سر مغزنی کی تھی کہ میں کس طرح اس معاملے سے بحسن و خوبی الگ ہوسکتا ہوں۔

بے شک ہیگن نے قتل کا منصوبہ عمدگی سے بنایا تھا۔ اس نے شا کی لاش کو غائب کرنے کی عمدہ ترکیب سوچی تھی۔ وہ ایک بہت ہوشیار عملی ذہن کا بٹلر تھا۔ البتہ ہیگن سے ایک چوک ضرور ہوئی تھی؛ مگر یہ چوک تو ہونی ہی تھی۔ وہ تقریباً مجبور تھا۔ اس حویلی میں تین مرد اور ایک عورت رہ رہے تھے اور...... عورت کے بارے میں خیال تھا کہ وہ مرچکی ہے۔ پھر بھی اس لگیج میں جو وہ سفر پر لے جارہا تھا۔ یورپ کے سفر پر اس میں کچھ لگیج کسی عورت کا بھی تھا۔ (اور یہ تو سامنے کی غلطی تھی کہ اس نے اپنا ریزروشن یورپ جانے والے جہاز میں نہیں بلکہ اس کے مخالف جانے والے جہاز میں کرلیا تھا۔)

لگیج تو میری نگاہ میں اتفاق سے آگیا تھا' مگر اس کے بعد میرے شبہات پائے تصدیق کو پہنچ گئے تھے تو سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا کہ اس جیسا لائق بٹلر اپنے آقا کے ساتھ یورپ جاتے ہوئے کسی عورت کا سامان بھی ساتھ لے جائے گا۔

ختم شد......!!

☆☆☆



نئی کہانی کا جنم

ایک ایسی کہانی جس کا اختتام بہت سی برائیوں کو بے نقاب کردیتا ہے۔ "جن" کو کہانی کی صورت میں پیش کرنا تو بس" عائشہ انور کے جادو اثر قلم کا ہی کمال ہے۔ جو معاشرے کے مکروہ چہروں کو بے نقاب کردیتا ہے۔ پڑھئے اور سوچئے۔۔۔؟

عائشہ انور

برائیوں کی کوکھ سے جنم لینے والی ایک اچھائیوں بھری کہانی

کراچی میں قتل و غارت گری کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں' اس لیے اورنگی ٹاؤن کی پہاڑیوں کے دامن میں ایک بوری بند لاش ملی تو کسی حیرت و استعجاب کا اظہار نہیں کیا گیا۔ لاش پر صبح سویرے ڈیوٹی پر جانے والے ایک مل مزدور کی نظر پڑی تھی۔ وہ بوری کے پاس سے گزر گیا تھا' مگر پھر پلٹ کر اس کے قریب آیا۔ اسے کچھ شبہ ہوا تھا۔ اس نے اس کے قریب جا کر ذرا غور سے دیکھا تو بوری کے ایک سوراخ سے ایک انسانی انگلی نکلی ہوئی نظر آئی اور اس کا شبہ یقین میں بدل گیا۔ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی۔ اگر وہ یہاں رکا...... اور اس بوری بند لاش کے بارے میں کسی کو بتایا تو آج پھر لیٹ ہوجائے گا۔ اگر آج بھی لیٹ ہوگیا تو آدھے دن کی دیہاڑی کٹ جائے گی۔ دو دن پہلے بھی لیٹ پہنچا تھا۔ اس کے کارخانے کا اصول تھا کہ تیسرے دن لیٹ پہنچنے والے مزدوروں کے آدھے دن کی دیہاڑی کاٹ دی جاتی تھی۔ اس لیے وہ وہاں رکا نہیں۔ وقت پر اپنی فیکٹری پہنچ گیا مگر وہ بوری بند

تھی تاکہ اس مدرس سے دور رہا جا سکے۔"

اور یہ اس کی بہن کسی نامعقول آدمی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ ہم یہاں صرف چار کی تعداد میں تھے یعنی مسٹر اور مسز شا میں اور مورس...... جو یہاں عرصے سے دھنسا ہوا تھا۔ اب ہم گھر کو بند کر سکتے ہیں۔ مورس کو اب یہاں سے جانا ہی ہوگا۔ جلد ہی خزاں کے بعد ہم سب پھر یکجا ہوں گے۔"

میں نے وہاں ہال میں کچھ بندھے ہوئے سامان کو رکھا دیکھا تو میں نے پوچھا۔ "شاید میں وقت پر آیا ہوں۔ تم لوگ جانے ہی والے تھے۔" میں نے سامان کی سمت اشارہ کیا۔ دو عدد بڑے ٹرنک تھے اور کئی عدد عورتوں والے سوٹ کیس رک کر میں نے کہا۔ "میں شیمپین کی ایک بوتل لایا ہوں اس شا کو دینا چاہتا ہوں۔"

ہیگن نے نفی میں سر ہلایا...... "مسٹر ٹمسن یہ مناسب نہ ہوگا۔ ہم نے مورس کو یقین دلا دیا ہے کہ اس کی بہن بھاگ گئی ہے۔ یہ کوئی اچھی بات نہ ہوگی اگر کوئی پرانا دوست اس وقت اسے یہاں نظر آیا۔"

مجھے اس کی بات میں کچھ وزن محسوس ہوا۔ میں نے بوتل میں رکھ دی اور بولا۔ "میری طرف سے مسٹر شا کو سلام کہنا۔

میں لاس اینجلز بندرگاہ کے ڈاک پر کھڑا تھا اور اس بحری جہاز کو دیکھ رہا تھا جو ہوائی کے سفر پر روانہ ہو رہا تھا۔ بکنگ سے یہ معلوم کرنا مشکل ثابت نہیں ہوا تھا کہ اس میں مسٹر اور مسز ہیگن سفر کر رہے ہیں۔ میں نے ان کی ایک جھلک ریلنگ پر دیکھی بھی تھی۔ تاہم میں نے احتیاط کی تھی کہ وہ مجھے نہ دیکھ سکیں۔

چارلس مورس بھی وہاں تھا۔ وہ بڑی گرم جوشی سے اپنے نئے بہنوئی اور بہن کو ہاتھ ہلا ہلا کر رخصت کرنے میں لگا ہوا تھا۔ اب جبکہ ولیم شا مر چکا تھا اور اس کی لاش کو اس کے بہترین بیس عدد دوستوں کی مدد سے ٹھکانے لگایا جا چکا تھا۔ انہوں نے بڑی کامیابی حاصل کرلی تھی۔ گریس ہیگن اور چارلس دونوں کی عمدگی سے کفالت کر سکتی تھی۔ کیونکہ ان دونوں میں سے کوئی بھی غریب شا کی طرح فیاض اور خراج نہ تھا۔ گریس کے گلے کا نیکلس دمک رہا تھا۔ سورج کی روشنی میں ہیگن کے دانت چمک رہے تھے۔ وہ گریس کے گرد ہاتھ کا حصار بنائے کھڑا تھا۔

میں وہاں سے ہٹا۔ پھر میں نے چند ٹیلی گرام بندرگاہ کی پولیس کو روانہ کیے۔ انہیں میں نے نام پتا بتائے بغیر اطلاع دی کہ ہیگن کے کمرے میں انہیں تین عدد باسکوں میں سے کیا کچھ مل سکتا ہے۔ ان ٹوکریوں کو میں نے اپنے ایک قصائی دوست کی دکان کے آئس باکس میں رکھوا دیا تھا۔ اس دوران میں نے بڑی سر مغزنی کی تھی کہ میں کس طرح اس معاملے سے بحسن و خوبی الگ ہو سکتا ہوں۔

بے شک ہیگن نے قتل کا منصوبہ عمدگی سے بنایا تھا۔ اس نے شا کی لاش کو غائب کرنے کی عمدہ ترکیب سوچی تھی۔ وہ ایک بہت ہوشیار عملی ذہن کا بٹلر تھا۔ البتہ ہیگن سے ایک چوک ضرور ہوئی تھی، مگر یہ چوک تو ہونی ہی تھی۔ وہ تقریباً مجبور تھا۔ اس حویلی میں تین مرد اور ایک عورت رہ رہے تھے اور...... عورت کے بارے میں خیال تھا کہ وہ مر چکی ہے۔ پھر بھی اس لگیج میں جو وہ سفر پر لے جا رہا تھا۔ یورپ کے سفر پر اس میں کچھ لگیج کسی عورت کا بھی تھا۔ (اور یہ تو سامنے کی غلطی تھی کہ اس نے اپنا ریزرویشن یورپ جانے والے جہاز میں نہیں بلکہ اس کے مخالف جانے والے جہاز میں کرلیا تھا۔)

لگیج تو میری نگاہ میں اتفاق سے آ گیا تھا، مگر اس کے بعد میرے شبہات پائے تصدیق کو پہنچ گئے تھے تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ اس جیسا لائق بٹلر اپنے آقا کے ساتھ یورپ جاتے ہوئے کسی عورت کا سامان بھی ساتھ لے جائے گا۔

ختم شد......!!

☆☆☆



نئی کہانی کا جنم

ایک ایسی کہانی جس کا اختتام بہت سی برائیوں کو بے نقاب کردیتا ہے۔ "خبر" کو کہانی کی صورت میں پیش کرنا تو بس" عائشہ انور کے جادو اثر قلم کا ہی کمال ہے۔ جو معاشرے کے مکروہ چہروں کو بے نقاب کردیتا ہے۔ پڑھئے اور سوچئے...؟

عائشہ انور

برائیوں کی کوکھ سے جنم لینے والی ایک اچھائیوں بھری کہانی

کراچی میں قتل و غارت گری کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں، اس لیے اورنگی ٹاؤن کی پہاڑیوں کے دامن میں ایک بوری بند لاش ملی تو کسی حیرت و استعجاب کا اظہار نہیں کیا گیا۔ لاش پر صبح سویرے ڈیوٹی پر جانے والے ایک مل مزدور کی نظر پڑی تھی۔ وہ بوری کے پاس سے گزر گیا تھا، مگر پھر پلٹ کر اس کے قریب آیا۔ اسے کچھ شبہ ہوا تھا۔ اس نے اس کے قریب جا کر ذرا غور سے دیکھا تو بوری کے ایک سوراخ سے ایک انسانی انگلی نکلی ہوئی نظر آئی اور اس کا شبہ یقین میں بدل گیا۔ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی۔ اگر وہ یہاں رکا...... اور اس بوری بند لاش کے بارے میں کسی کو بتایا تو آج پھر لیٹ ہو جائے گا۔ اگر آج بھی لیٹ ہو گیا تو آدھے دن کی دیہاڑی کٹ جائے گی۔ دو دن پہلے بھی لیٹ پہنچا تھا۔ اس کے کارخانے کا اصول تھا کہ تیسرے دن لیٹ پہنچنے والے مزدوروں کے آدھے دن کی دیہاڑی کاٹ دی جاتی تھی۔ اس لیے وہ وہاں رکا نہیں۔ وقت پر اپنی فیکٹری پہنچ گیا مگر وہ بوری بند

لاش اس کے اعصاب پر سوار تھی۔ اس کی اطلاع وہ کس کو دے......؟ کیسے دے......؟ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس سلسلے میں سامنے آئے۔ اسے معلوم تھا کہ پولیس کے ساتھ تعاون کرنا ہر شہری کا فرض ہے لیکن اس حقیقت سے بھی آگاہ تھا کہ پولیس ایسے لوگوں کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کرتی۔ سب سے پہلے انہی کی گردن پکڑتی ہے۔ کام کے دوران سوچتے سوچتے اسے فضلو کا خیال آ گیا۔ فضلو اس کا دوست تھا اور اس کے محلے ہی میں رہتا تھا۔ آج کل بیکار تھا۔ اس نے اس کے موبائل پر رابطہ کیا۔ ”یار فضلو! تم سے ایک کام ہے......“

”فی الحال تو میں تمہارا کوئی کام نہیں کر سکتا...... میں اس وقت بہت مصروف ہوں۔“

”یہ تو بڑی اچھی خبر ہے تم مصروف ہو گئے پھر کیا کہیں کوئی نوکری کر لی ہے؟“

”ارے نہیں یار!“ فضلو کے لہجے میں پیچھا چھڑانے والی جھلک تھی۔ ”یہاں اپنے علاقے میں ایک بوری بند لاش ملی ہے۔ جس بندے نے اس کی اطلاع پولیس کو دی تھی، پولیس نے اس کو دھر لیا ہے، ہم لوگ اسے پولیس کے چنگل سے بچانے کی تدبیر کر رہے ہیں۔“

”چلو...... میں تم سے پھر بات کروں گا۔ ڈیوٹی سے واپس آنے کے بعد۔“ ٹیلی فونک رابطہ منقطع کرنے کے بعد شمش الحق نے اطمینان کا سانس لیا۔ دراصل اس نے اس لاش کے بارے میں جاننے کے لیے فضلو سے رابطہ کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اب تک یقیناً اس لاش کے بارے میں دوسروں کو بھی پتا چل گیا ہوگا۔ وہ کسی حیلے بہانے سے یہ بات پوچھنا چاہتا تھا مگر فضلو نے خود ہی صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ وہ دل ہی دل میں اپنی دور اندیشی پر بھی خوش ہو رہا تھا۔ اگر اس لاش کی اطلاع دینے والا وہ ہوتا تو اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جاتا، پولیس سب سے پہلے اس کو گرفتار کر لیتی۔

وہ شام کو گھر گیا تو سب سے پہلے فضلو کو تلاش کیا۔ وہ اپنے گھر پر ہی مل گیا۔ بہت تھکا ہوا تھا اس وقت آرام کر رہا تھا۔ شمس الحق کو دیکھ کر بولا۔ ”ہاں اب بتاؤ تمہارا کیا کام ہے؟“

”ارے یار! وہ تو اس وقت کا کام تھا، تم مصروف تھے تو کسی اور سے کرا لیا۔ مگر یہ لاش کا کیا چکر ہے...... بقول فلمی شاعر...... میرے انگنے میں تمہارا کیا کام ہے......؟ مطلب یہ کہ ہمارے اس پرسکون علاقے میں کوئی لاش کہاں سے آ گئی......؟“

”یار شمشو! کسی لاش کی دستیابی کا مسئلہ ایسا نہیں کہ اس کے بارے میں اس طرح بات کی جائے جس طرح تو کر رہا ہے......“ فضلو بہت سنجیدہ تھا۔ شمسو کو بھی سنجیدہ ہونا پڑا۔

”ہاں...... تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ مسئلہ ہنسی مذاق کا نہیں۔ خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ لاش کس کی تھی......؟ اس بارے میں کچھ معلوم ہے...... وہ کون تھا جس کو پولیس نے شک کی بنا پر گرفتار کر لیا تھا......؟ اس کی رہائی ہوئی یا نہیں......؟“

”ارے یار...... ایک ہی سانس میں تو نے اتنے سوال پوچھ ڈالے۔“ فضلو کا موڈ اب کچھ بہتر ہو گیا تھا۔ اس نے ذرا توقف کے بعد کہا۔ ”وہ جنہوں نے لاش دیکھ کر پولیس کو اطلاع دی تھی، اور پولیس سے تعاون کی سزا انہیں یہ دی گئی تھی کہ انہی کو پولیس نے گرفتار کر لیا۔ وہ میرے تایا کے سسرالی عزیز ہیں، عبدالعزیز ان کا نام ہے۔ ان کی نظر ایک بوری پر پڑی، جو مشکوک حالت میں پہاڑی کے دامن میں پڑی تھی۔ انہوں نے ایک اچھے شہری ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے تھانے فون کر دیا اور ان کی سادگی ملاحظہ کرو، پولیس نے ان کا نام پتا پوچھا تو بتا دیا اور جب تھانے سے لوگ آئے تو ان کی رہنمائی بھی کی۔ ان کی رہائی ابھی تک نہیں ہوئی ہے مگر بھاگ دوڑ کے نتیجے میں

اتنا ہوا ہے کہ جیسے ہی قاتل یا قاتلوں کے سلسلے میں کچھ معلوم ہوگا انہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ لاش کس کی ہے؟ اس بارے میں تو ابھی کچھ معلوم نہیں ہوا ہے۔ البتہ مقتول ایک بیس بائیس سالہ خوبصورت نوجوان ہے۔ جسے تشدد کے بعد گولی مار کر ہلاک کیا گیا ہے۔ پولیس نے ضروری کارروائی کے بعد لاش ایدھی کے سرد خانے میں رکھوادی ہے کہ اس کے وارثوں کا پتا چلنے کے بعد میت ان کے حوالے کر دی جائے گی اور تفتیش کا سلسلہ آگے بڑھے گا۔“

شمش الحق نے تعریفی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ابے یار! اتنی ساری باتیں تجھے کیسے معلوم ہو گئیں؟ جب تک وہ لاش بوری میں بند یہاں موجود تھی، اس کے بارے میں تو مجھے یا یہاں کے دوسرے رہائشیوں کا باخبر ہونا، تعجب کی بات نہیں۔ مگر یہ جو تو تھانے کی حدود اور پولیس کی کارروائی کے بارے میں بتا رہا ہے یہ تو...... یہ تو...... میرا مطلب ہے یہ تو تعجب کی بات ہے نا......؟ یہ خبر تجھے کہاں سے ملی کہ ضروری کارروائی کے بعد لاش ایدھی کے سرد خانے میں رکھوادی گئی ہے......؟“

فضلو جس کا اصلی نام فضل الٰہی ہے مسکرایا...... شمش الحق کی تعریف پر اسے خوشی ہوئی پھر اس نے کہا۔ ”جس وقت موبائل پر تمہاری کال آئی تھی۔ میں اور میرے دوسرے عزیز رشتہ دار بہت پریشان تھے عبدالعزیز صاحب کے بارے میں کہ پولیس نے خواہ مخواہ انہیں گرفتار کر لیا ہے۔ ہماری پریشانی کو دیکھ کر ایک نیک دل پولیس والے نے ہم سے کہا۔ ”ہم انہیں محض شک کی بنا پر گرفتار کر رہے ہیں۔ اگر آپ لوگوں کا کوئی جاننے والا کسی تھانے میں ہو تو اس سے کہیے، اس کی ضمانت پر ہم انہیں چھوڑ بھی سکتے ہیں اور نہ بھی چھوڑیں تو ان پر کوئی سختی، کوئی تشدد وغیرہ نہیں کریں گے۔ تمہاری کال آنے کے بعد ایک دم مجھے یاد آیا کہ تمہارے ایک رشتے کے ماموں بھی تو کسی تھانے میں تعینات ہیں۔“

”ارشاد ماموں......“

”ہاں یار وہی......“ بس ہم ان کے گھر پہنچ گئے۔ ان سے ملے صورت حال بتائی۔ جس پر سب سے اچھی بات انہوں نے یہ بتائی کہ وہ اورنگی تھانے ہی سے وابستہ ہیں۔ پھر انہوں نے ہمیں یقین دلایا کہ عبدالعزیز صاحب کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ پولیس کے اپنے کچھ اصول ہیں۔ شک کی بنیاد پر وہ کسی کو بھی گرفتار کر سکتی ہے۔

اچھا کیا آپ لوگوں نے عبدالعزیز صاحب کے بارے میں مجھے بتا دیا۔ میں انشاء اللہ ان پر کوئی آنچ آنے نہیں دوں گا اور پھر انہوں نے ہم سے واقعی تعاون کیا۔ ہم شام کو ان کے پاس تھانے بھی گئے تھے۔ انہوں نے ہمیں اطمینان دلایا کہ میں نے ایس ایچ او کو ساری باتیں سمجھا دی ہیں کہ عبدالعزیز صاحب ایک ذمہ دار شہری ہیں، اس لیے جب تک اس کیس کے بارے میں پیش رفت نہ ہو جائے، ان پر کوئی سختی نہیں کی جائے۔ ورنہ آئندہ کوئی شہری پولیس سے تعاون نہیں کرے گا۔“ فضلو ذرا رکا پھر بولا۔ ”ان ہی کی زبانی مجھے معلوم ہوا ہے کہ مقتول کی لاش ضروری کارروائی کے بعد ایدھی کے سرد خانے میں رکھوا دی گئی ہے۔“

”ارے یار! تو تو بڑے کام کا آدمی ہو گیا ہے۔“ شمسو نے ایک بار پھر اس کی تعریف کی۔ ”اگر تو میرے ماموں سے نہ ملتا اور انہیں صورت حال سے آگاہ نہیں کرتا تو پولیس نے جس طرح شک کی بنیاد پر عبدالعزیز صاحب کو گرفتار کیا ہے اس طرح ان پر سختی کر کے کچھ اگلوانے کی کوشش بھی کر سکتی تھی۔“

”ابے یار! پڑھے لکھے ہونے کا کچھ تو فائدہ ہوتا ہے۔ آخر میٹرک پاس کیا ہے میں نے۔“

”ہاں...... اس معاملے میں تو ہم سے بہتر ہے پر......“

”پر کیا......؟“

”پر تیرے اس پڑھے لکھے ہونے کا فائدہ کیا، جبکہ تجھے

کوئی نوکری نہیں مل رہی ہے' پڑھا لکھا نہ ہوتا تو ہماری طرح کوئی ہنر سیکھ کر محنت مزدوری تو کرسکتا تھا۔"

شمس الحق کو جہاں اس بات کی خوشی تھی کہ اس نے پولیس سے تعاون کرنے کی نیکی نہ کرکے اپنے آپ کو دریا میں غرق کرنے سے بچالیا وہاں بے چارے عبدالعزیز صاحب کے بارے میں فکر بھی تھی اور وہ دل سے یہ چاہتا تھا کہ اس غریب کو جلد از جلد باعزت رہائی مل جائے۔

دوسرے روز اپنی ڈیوٹی سے واپس آکر وہ سیدھے اپنے ماموں کے پاس پہنچ گیا۔ ان سے رسمی باتوں کے بعد پوچھا۔ "ماموں! اس لاش کے بارے میں کوئی اتہ پتہ چلا۔ جو ہمارے علاقے میں بوری سے برآمد ہوئی تھی......؟"

ہاں بھئی! پتا چل گیا...... اس کے لواحقین نے قریبی تھانے میں اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی تھی...... انہیں بتایا گیا۔ ایدھی سرد خانے میں کچھ انجانے لوگوں کی لاشیں موجود ہیں۔ وہاں جاکر دیکھ لیں۔ خدانخواستہ ان میں تو آپ کا گمشدہ بندہ نہیں......؟

ان بدنصیبوں کو وہاں اپنا گمشدہ عزیز مل گیا۔ وہی جو ہمارے علاقے میں بوری میں بند کرکے پھینک دیا گیا تھا۔ وہ سہراب گوٹھ کا رہائشی ایک پٹھان لڑکا تھا۔" ماموں ذرا رک کے پھر اپنی بات آگے بڑھائی۔ "پولیس نے اپنی کارروائی شروع کردی ہے۔ یعنی اس کی لاش اورنگی ٹاؤن میں کیوں پائی گئی......؟ مگر......"

مگر کہہ کر وہ ایک بار پھر رک کے پھر بولے۔ "مگر اب یہ کیس اورنگی ٹاؤن کے تھانے سے شاید گلشن تھانے منتقل ہوجائے کہ مقتول کا تعلق سہراب گوٹھ سے تھا۔"

شمس الحق کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ کس تھانے سے قتل کے اس کیس کی کارروائی ہوگی۔ اسے تو اس بات کی خواہش تھی کہ عبدالعزیز صاحب جتنی جلدی ممکن ہوسکے رہا ہوجائیں۔ اس نے اپنے ماموں سے کہا۔ "ماموں! اگر یہ کیس گلشن تھانے منتقل ہوگیا تو کیا عبدالعزیز صاحب کی رہائی میں دیر لگ جائے گی......؟"

"کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ البتہ اس بات کا امکان ہے کہ اب اس قتل کی وجہ اور قاتل یا قاتلوں کے سراغ ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"

شمشو کی فضلو سے ملاقات ہوئی تو اس نے اپنے ماموں سے معلوم ہونے والی باتوں کا ذکر کیا اور کہا۔ "ماموں کا کہنا ہے عبدالعزیز صاحب انشاء اللہ جلد از جلد رہا کردیے جائیں گے۔"

"ہاں یار......! ہم سب بھی یہی چاہتے ہیں۔" فضلو بولا۔ پھر ذرا رک کر فکرمند انداز میں کہا۔ "مگر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی اگر مرنے والا پٹھان تھا تو اس کی لاش ہمارے علاقے میں کیوں موجود تھی؟ جبکہ وہ یہاں کا رہائشی بھی نہیں تھا۔"

"ہاں' یہ بات سوچنے کی ہے۔ یار فضلو! تو تو پڑھا لکھا ہے۔ تیری سمجھ میں اس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے......؟"

"میرا تو خیال ہے۔" فضل الٰہی نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ہمارے علاقے میں ایک پٹھان لڑکے کو مار کر اور بوری میں بند کرکے پھینکنے کا یہ مطلب ہوسکتا ہے کہ کوئی ہم لوگوں کے خلاف سازش کررہا ہے' پٹھان بھائیوں کو ہم سے لڑوانے کی کوشش کررہا ہے۔ یا پھر......"

"یا پھر کیا......؟"

"یا پھر کوئی اور بھی بات ہوسکتی ہے۔ پولیس کی چھان بین کے بعد وہ بات سامنے آجائے گی۔"

اور ایسا ہی ہوا...... پولیس کو اطلاع ملی کہ گل شیر خان آخری بار اپنے دوست سردار خان کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ شام کو دونوں ساتھ ہی ایک ویگن پر سوار ہوئے تھے۔ پولیس نے سردار خان تک پہنچنے میں اپنی پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ اس کے گھر سے معلوم ہوا وہ تو کسی کام کے سلسلے میں پشاور چلا گیا ہے۔ اس کی روانگی ذرا دیر پہلے ہوئی ہے......

پولیس پشاور جانے والے کوچوں کے اڈے پر پہنچی تو پشاور جانے والی ایک کوچ میں سردار خان مل گیا۔ کوچ بس روانہ ہی ہونے والی تھی کہ پولیس نے سردار خان کو جالیا۔

عام مجرموں کی طرح پہلے تو سردار خان نے بھی بڑا پینترہ بدلا۔ "یہ پولیس کی بڑی زیادتی ہے کہ جس کے گلے میں پھندہ فٹ ہوجائے اسے سولی پر لٹکادو۔ میں گل شیر خان کا دوست ہوں' اسے کیوں قتل کروں گا؟ اگر وہ میرے ساتھ تھا یا نہیں اس کے ساتھ تھا تو یہ کوئی انہونی بات نہیں' جرم نہیں' قصور نہیں' ہم دونوں اکثر ایک دوسرے کے ساتھ گھومتے پھرتے تھے۔ کیا دوست ایک ساتھ گھومتے پھرتے نہیں؟"

سردار خان بھی مرنے والے گل شیر خان کی طرح پختون نوجوان تھا' اور بڑی جوانمردی کے ساتھ پولیس سے بات کررہا تھا مگر پولیس نے جب سختی کی...... تھانے کے ڈرائنگ روم میں لے جاکر اچھی طرح پھینٹی لگائی تو اس کے کس بل ڈھیلے ہوگئے اور اس نے اعتراف کرلیا کہ اس نے اپنے دوست گل شیر خان کو قتل کیا ہے......"

اب عبدالعزیز صاحب باعزت رہا کردیے گئے تھے۔ فضلو اور شمشو کے ہمراہ انہوں نے ماموں کے پاس جاکر ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔ "اگر آپ کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو شاید مجھے تشدد کا سامنا کرنا پڑتا۔"

"میرا نہیں اللہ کا شکر ادا کیجیے۔ ویسے آپ کی سادگی اور شرافت کی وجہ سے پولیس کو بھی یقین تھا کہ ایسا شریف آدمی قتل کا مرتکب نہیں ہوسکتا۔" پھر انہیں ماموں ہی کی زبانی معلوم ہوا۔ واقعہ قتل چونکہ ہمارے علاقے میں وقوع پذیر ہوا تھا اس لیے اس کیس کو ہمارے تھانے میں رہنے دیا گیا ہے۔ البتہ گلشن تھانے والے بھی ہم سے تعاون کررہے ہیں۔"

"ماموں......!" فضلو نے کہا۔ "ایک دوست نے دوسرے دوست کو کیوں قتل کردیا؟ کیا اس کے بارے میں آپ لوگوں کو اس قاتل...... کیا نام ہے اس کا......؟"

"سردار خان......" شمشو پٹ سے بول پڑا۔

"ہاں...... سردار خان نے اس بارے میں کچھ بتایا......؟ کتنی کمینی حرکت ہے یہ۔"

"واقعی دوست کے ہاتھوں دوست کے قتل کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے ایسا جرم' ایسی برائی آدمی اس وقت کرتا ہے' جب اس کا دین دھرم پیسہ ہوتا ہے' دولت ہوتی ہے۔ یہ روپیہ پیسہ بڑی کتی شے ہے۔ اسی کی وجہ سے بڑے بڑے جرائم جنم لیتے ہیں۔ پٹھان ملزم سردار خان نے قتل کی وجہ یہ بتائی ہے کہ لین دین کے معاملے میں دونوں میں شکر رنجی پیدا ہوگئی تھی۔ آپ لوگوں کو یہ جان کر یقیناً دکھ ہوگا کہ یہ دونوں دوست مل کر ڈاکے ڈالتے تھے...... اور مسروقہ مال مل بانٹ کر کھاتے تھے۔ ایک ڈاکے میں ان کے ہاتھ ڈھیر سارے قیمتی زیورات لگے جو موقع واردات سے سردار خان اپنے ساتھ لے گیا تھا اور اسے کہیں چھپا دیا گیا تھا اور میں جب گل شیر خان نے ان زیورات کی تقسیم کا تقاضا کیا تو وہ ٹال مٹول کرنے لگا۔ آخر تنگ آکر ایک دن گل شیر خان نے سردار خان کو دھمکی دی۔ "اگر تم نے میرا حصہ نہیں دیا تو میں پولیس کو بتادوں گا کہ زیورات کس کے پاس ہیں۔"

اس کے بعد سردار خان کو اس سے ڈر لگنے لگا کہ کہیں سچ مچ پولیس کو بتا نہ دے۔ اس لیے وہ اس کے قتل کے منصوبے بنانے لگا اور ایک دن پینے پلانے کا بہانہ کرکے اسے اپنے ساتھ اورنگی ٹاؤن لے گیا اور اپنے دوست کی مدد سے پہلے اسے شراب پلائی اور پھر تشدد کے بعد اسے قتل کردیا۔" ماموں ذرا رکے تھے کہ فضلو پوچھ بیٹھا۔

"اس مردود نے یہ نہیں بتایا کہ اس واردات کے لیے اس نے اورنگی کا کیوں انتخاب کیا تھا؟ سہراب گوٹھ کا اتنا بڑا علاقہ تھا' وہ یہ قتل وہاں بھی کرسکتا تھا۔"

ہاں تفتیشی عملے نے اس سے یہ سوال بھی پوچھا تھا۔

جس پر اس نے بتایا۔ ”میرا خیال یہ تھا کہ بوری بند لاش کی دستیابی کے بعد یہی سمجھا جائے گا کہ یہ قتل اور گی کے کچھ تعصب پسند لوگوں نے کیا ہے۔“

”اس نے اپنے جن ساتھیوں کا نام بتایا ہے' انہیں گرفتار کیا گیا؟“ اب کی بار عبدالعزیز صاحب نے سوال کیا۔

”جی نہیں...... ابھی تک وہ دستیاب نہیں ہوئے ہیں۔“

کئی دنوں کے بعد شہباز خان اور رستم پٹھان کو پولیس نے گرفتار کرلیا اور گرفتاری کی وجہ انہیں بتائی کہ تم لوگوں نے سردار خان کے ساتھ مل کر گل شیر خان کو قتل کیا ہے۔“

”یہ سراسر جھوٹ ہے' غلط ہے' ہم پر بہتان ہے کہ ہم گل شیر خان کے قتل میں سردار خان کے شریک تھے۔ البتہ حقیقت یہ ہے کہ گل شیر خان سے ہماری ایک بار کسی بات پر لڑائی ہوگئی تھی اور اب تک اس سے بول چال بند تھی۔ سردار خان اسی بات کا فائدہ اٹھا کر ہمیں اپنے اس جرم میں شامل کررہا ہے۔ ہم بے قصور ہیں۔ اس سے کہیے وہ ہماری موجودگی کا کوئی ٹھوس ثبوت پیش کرے۔ بہرحال پولیس نے سردار خان سے اس کے مبینہ دونوں ساتھیوں کی واردات کے وقت ثبوت فراہم کرنے کو کہا تو اس نے بڑی کمزور دلیل دی۔ ”میں تو یہاں سے گل شیر خان کے ساتھ خالی ہاتھ گیا تھا۔ آلہ قتل اور بوری وغیرہ کے ساتھ وہ دونوں پہلے سے موقع واردات پر موجود تھے۔ مگر پولیس نے اس بات کو کوئی زیادہ اہمیت نہیں دی۔ آلہ قتل اور بوری وغیرہ کا بندوبست پولیس کے خیال میں وہ پہلے سے بھی کرسکتا تھا۔ البتہ جب تفتیشی عملے نے شہباز اور رستم کے بارے میں چھان بین کی تو معلوم ہوا وہ واردات سے دو دن پہلے سے پشاور گئے ہوئے تھے' وہاں ان کی موجودگی کا ثبوت مل گیا تھا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس قتل کے بعد تیسرے دن وہ کراچی پہنچے تھے۔ یعنی وہ بے قصور ہیں۔ سردار خان نے یا تو پولیس کو چکر دینے کے سلسلے میں ان کا نام بتایا تھا۔ یا پھر اس کی بھی ان دونوں سے کسی وجہ سے دشمنی تھی اس لیے ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے کے مصداق ان دونوں بے گناہ پختونوں کو بھی مصیبت میں مبتلا کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ ان دونوں کے بے گناہی کا ثبوت ملنے کے بعد انہیں رہا کردیا گیا اور سردار خان کو جیل بھجوا دیا گیا۔

ان ساری کارروائیوں کے بعد ایک دن ماموں نے جب اپنے بھانجے شمش الحق اور اس کے دوست فضل الٰہی کو اس بات کی اطلاع دی کہ اس قتل کیس کا ڈراپ سین ہوگیا ہے' تو دونوں بہت خوش ہوئے اور کہا' ”چلیے کہانی ختم ہوگئی۔“

”ہاں' یہ کہانی تو ختم ہوگئی۔“ ماموں بولے۔ ”مگر اس کہانی سے ایک نئی کہانی شروع ہوگئی ہے۔“

”کیا مطلب......!“

”مطلب یہ ہے بیٹے! کہ اس کیس کی چھان بین کے سلسلے میں یہ بات سامنے آئی کہ ڈکیتی اور قتل کے کیسوں میں مطلوب بہت سے ملزموں کا تعلق سہراب گوٹھ سے ہے۔ افغان مہاجرین' جن میں سے بہتوں نے پاکستانی شناختی کارڈ بنوا رکھے ہیں' بظاہر تو قانونی کام دھندے کرتے نظر آتے ہیں مگر ان میں سے بیشتر درپردہ لوٹ مار ڈکیتی اور اغوا برائے تاوان کا کام کرتے ہیں۔ اس قتل کیس کے سلسلے میں ہمیں کچھ بہت ہی اہم معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس کے بہت مثبت نتائج سامنے آئیں گے۔“

”یعنی ایک مجرم نے دنیا سے جاتے جاتے بہت سے مجرموں کی نشاندہی کردی ہے۔“ فضلو بولا۔

”ہاں' کبھی کبھی برائیوں کی کوکھ سے اچھائیاں بھی جنم لیتی ہیں۔“

☆☆☆

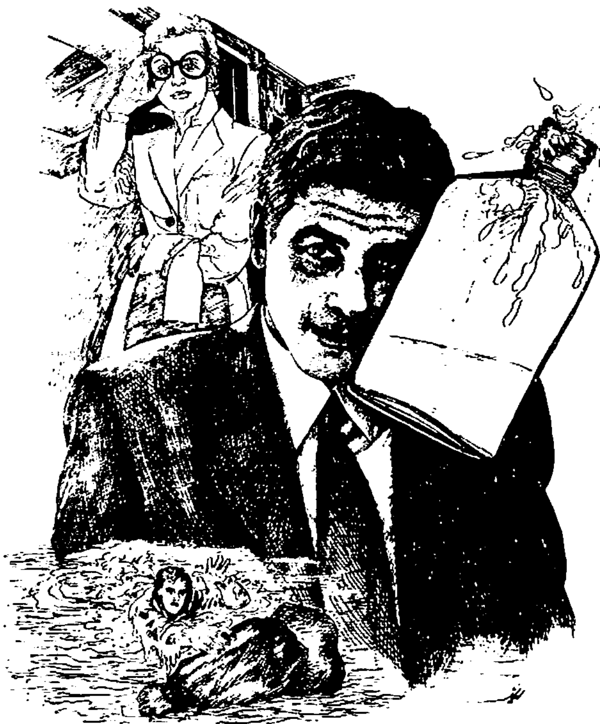
● ● ●



دیدہ ور

الف صدیقی

سائنسی موضوع پر اس جنوں صفت ولولہ انگیز سے بھرپور سلسلہ وار کہانی



الف صدیقی

دیدہ ور

سائنسی موضوع پر اسرار جذبی صفت ولولہ انگیزی سے بھرپور سلسلہ وار کہانی

ڈاکٹر نے جراثیم کی بھاری تعداد کو کنٹینرز میں سے نکال کر محفوظ کیا اور باقی جراثیم کو قاتل جراثیم کی مدد سے ہلاک کردیا۔

دیگر ضروری کام انجام دینے کے بعد وہ بالاخر سونے کے لیے چلا گیا۔ اب صبح بالکل قریب تھی اور ڈاکٹر کو تھوڑے سے آرام کی ضرورت تھی۔

اگلے دن جب ڈاکٹر ناشتے کی میز پر بیٹھا ہوا تھا تو اس وقت وہ اپنے آپ کو دنیا کا آسودہ ترین انسان محسوس کر رہا تھا۔ اس نے وہ اہم ترین ہتھیار حاصل کرلیا تھا جس کی مدد سے وہ دنیا کی تسخیر کے عظیم کام کا آغاز کرسکتا تھا۔ اس کے تمام تجربات مکمل ہو گئے تھے۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے بہ آسانی دو بالغ افراد بھی دستیاب ہو گئے جن پر اس نے اپنی ایجاد کو کامیابی کے ساتھ آزمایا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ بعض اوقات اتنے غیر متوقع واقعات درپیش آجاتے ہیں کہ مختلف کڑیوں کی ایک پوری زنجیر بنتی چلی جاتی ہے۔ اگر وہ اتفاق سے اس دن سارا ویلڈن کا پرس نہ دیکھ لیتا تو شاید آج حالات مختلف ہوتے۔ اسے اپنے تجربے کے لیے زندہ اور بالغ انسانوں کی تلاش میں نہ جانے کیا کیا کرنا پڑتا۔ پھر ان انسانوں کو رہائش گاہ تک لانا انہیں زیر زمین حیاتیاتی لیبارٹری میں پہنچانا ان ساری چیزوں کے لیے نہ جانے کون کون سے مراحل سے گزرنا پڑتا۔ ڈاکٹر خوش تھا کہ قدرت نے اس کی مدد کی۔ سارا ویلڈن نے اس کے لیے کامیابیوں کا دروازہ کھول دیا۔ وہ خفیہ نسلی تحریک کو تباہ کرنے کے ساتھ ساتھ جو کہ اس کے لئے ایک معمولی کام تھا۔ اپنے تجربے کے لیے انسانوں کو بھی حاصل کرسکا۔

یہ تھا گزشتہ قسط کا خلاصہ
اب آگے پڑھیے

ڈاکٹر کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اچانک اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کاش وہ اپنی اس خوشی میں کسی اور کو بھی شریک کر سکے۔ لیکن نہیں۔ فی الحال اس کے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ اپنی اس ایجاد کو اس وقت تک بالکل خفیہ رکھنا چاہتا تھا۔ جب تک کہ وہ بڑے پیمانے پر اس کا تجربہ نہ کر لے یا اس سلسلے میں کوئی باقاعدہ منصوبہ نہ بنا لے۔ اسے بہت محتاط رویے کا مظاہرہ کرنا تھا۔ اس نے اپنی اس خواہش کو جھٹک دیا۔

اگلے چند دن تک وہ بہت مصروف رہا۔ اب اس کے پاس تین اشیاء موجود تھیں اور تینوں کی کارکردگی اور اثر انگیزی کی کامیابی کے ساتھ آزمائش کی جا چکی تھی۔ انسانی گوشت خور جراثیم قاتل جراثیم اور ویکسین۔ اس نے ایک شیطانی قوت دریافت کے ساتھ ساتھ اس کا بھرپور اور قطعی توڑ بھی دریافت کر لیا تھا تاکہ کہیں اس کی ایجاد خود اس کے اپنے لیے ہی وبال اور تباہی کا باعث نہ بن جائے۔ اسے ان تینوں چیزوں کو مناسب مقدار میں محفوظ رکھنے اور ان کے بارے میں مکمل ریکارڈ تیار کرنے کا اہم کام کرنا تھا۔ وہ چند روز تک اسی کام میں لگا رہا۔ ڈوآن کی طرح یانگ کی ہڈیاں بھی خاک ہو کر ختم ہو گئی تھیں۔ یانگ کے زندہ یا مردہ وجود کا اب ایک ذرہ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ ڈاکٹر کی خود اعتمادی میں زبردست اضافہ ہو چکا تھا

اب وہ کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھا جب وہ اپنی اس ہیبت ناک ایجاد کا کسی طور پر برملا مظاہرہ کر کے ساری دنیا میں خوف و دہشت کی لہر پھیلا دے اور اس کے بعد اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائے۔ لیکن وہ اس کام میں کوئی جلدی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جذباتی ہیجان اور عجلت میں اٹھائے گئے قدم اکثر اوقات فائدے کے بجائے زبردست نقصانات کا باعث بن جاتے ہیں اور اتنی زبردست چیز ایجاد کرنے کے بعد وہ اپنی کامیابی کو ناکامی سے تبدیل کرنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ اسے کسی ایسے مناسب موقع کا انتظار تھا جب اس کے اس مظاہرے سے بیش ترین فائدہ حاصل ہو

کئی ماہ کا عرصہ گزر گیا اور ڈاکٹر صبر و سکون سے اپنے روز مرہ کے کاموں میں مصروف رہا۔ اس نے ہلاکت انگیز محلول کی تیاری کے سلسلے میں کئی مختلف تجربات کیے اور ان میں سے بعض کامیاب بھی رہے لیکن یہ جزوی کامیابی تھی اسے ایسا محلول چاہیے تھا جو ہر قسم کے جسم پر ہر قسم کے خون پر یکساں طور پر اثر کرتا ہو۔ تاہم وہ کامیابی کے بہت قریب پہنچ چکا تھا اور اسے یقین تھا کہ اگلے دو ایک ماہ میں وہ اس محلول کی تیاری میں کامیابی حاصل کر لے گا۔

اس دوران ڈاکٹر نے تنظیم کے کاموں کی رہنمائی کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ سارے کام خوش اسلوبی سے جاری تھے کئی اور شہروں میں بھی تنظیم کے کارندے سرگرم عمل ہو گئے تھے اور انہوں نے نمایاں کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ اس دوران تنظیم کے لوگوں نے بہت بھاری معاوضہ لے کر کینیڈا کے شہر ٹورانٹو میں دو سیاسی شخصیتوں کو قتل کیا۔ روم کے ایک بہت بڑے تاجر کا ہیروں کا خزانہ لوٹا اور ایک افریقی ملک میں وہاں کی حکومت کے اشارے پر حزب اختلاف کے کئی لیڈروں کو اغوا کیا۔ سارے کاموں کی بنیادی منصوبہ بندی ڈاکٹر خود کرتا تھا اور اس پر عملدرآمد کے طریقے تیار کرنا جیمس اور دوسرے لوگوں کا کام تھا۔

اس دن ڈاکٹر کو اسمتھ کا فون ملا۔ وہ ملاقات کے لیے آنا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے پرانے مکان میں ملنے کا وقت دیا۔ اسمتھ اس وقت بہت خوش نظر آ رہا تھا

کیا بات ہے۔ ڈاکٹر نے اس سے پوچھا۔ تم کچھ زیادہ ہی خوش نظر آ رہے ہو۔

ہاں باس اسمتھ نے کہا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ہمیں کل انگر کا پیغام ملا ہے وہ واپس آ رہا ہے

ہاں۔ اچھا ڈاکٹر نے کہا۔ اسے باہر رہتے ہوئے ایک سال کا عرصہ تو ہو ہی گیا ہے

ہاں باس اسمتھ نے جواب دیا۔ جیسا کہ تمہیں معلوم ہے میکسیکو سے وہ برازیل چلا گیا تھا اور اس نے وہیں کی شہریت اختیار کر لی تھی۔ اس نے اپنا نیا نام روسیریو رکھ لیا تھا۔ وہ روسیریو کے نام سے ہی برازیل میں رہتا رہا اور اس نے وہاں کا پاسپورٹ بھی حاصل کر لیا۔ اس نے بہت لمبی سی داڑھی رکھ لی ہے اور اپنا حلیہ بالکل ہی بدل لیا ہے۔ اب وہ ہسپانوی لہجے میں انگریزی بولتا ہے اور انگریزی میں فراوانی سے ہسپانوی الفاظ ملاتا جاتا ہے اسمتھ ہنسا اس کے پیغام سے معلوم ہوا ہے کہ وہ بالکل ہی بدل گیا ہے۔

اسے بدل جانا چاہیے ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا

باس اب ہم اسے کیا کہیں گے۔ اسمتھ نے پوچھا۔ انگر یا روسیریو۔

اسے انگر کوئی نہیں کہے گا ڈاکٹر نے کہا۔ انگر کا اب کوئی وجود نہیں ہے اب صرف روسیریو ہے۔ تمام لوگ اسے روسیریو ہی کہیں گے اور یہاں آنے کے بعد بھی وہ تقریباً "دو ماہ کے عرصہ تک کسی عملی کارروائی میں حصہ نہیں لے گا

ٹھیک ہے باس اسمتھ نے کہا تو پھر انگر اوہ میرا مطلب ہے روسیریو روسیریو کی آمد پر میں تمہیں اطلاع دے دوں گا۔ کیا تم اس سے ملنا پسند کرو گے۔

ضرور ڈاکٹر نے کہا۔ اس سے آخری ملاقات کو تقریباً ایک سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس نے یہ مدت لاطینی امریکہ کے کئی ملکوں میں گزاری ہے۔ میں اس کی زبانی ان ملکوں کے سیاسی سماجی اور معاشی حالات جاننا چاہوں گا۔ روسیریو ایک ذہین آدمی ہے وہ جس ملک میں بھی رہا ہوگا اس نے وہاں کے اندرونی حالات پر ضرور نظر رکھی ہوگی۔ وہ یقیناً اچھی خاصی معلومات کا خزانہ اپنے ساتھ لے کر آیا ہوگا۔

اچھی بات ہے باس اسمتھ نے کہا۔ جب انگر......

اوہ......معافی چاہتا ہوں۔ میرا مطلب ہے روسیریو جب آ جائے گا تو میں تمہیں اس کے بارے میں مطلع کر دوں گا

اس کے بعد اسمتھ وہاں سے رخصت ہو گیا

☆☆

صبح کا وقت تھا اور ڈاکٹر آؤٹ ڈور مریضوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ نرس شیلا حسب معمول اس کی مدد کر رہی تھی۔ مریض آ رہے تھے اور ڈاکٹر ہر مریض کو اس کی آمد پر پہلے ہی غور سے دیکھ لیتا تھا۔ اس کے جسم کے سارے اندرونی اعضا کا سرسری نظر سے جائزہ لے لیتا اور جہاں اسے خرابی نظر آتی بعد میں میز پر لٹا کر اس جگہ کا اچھی طرح جائزہ لے لیتا اور علاج اور دوائیں تجویز کر دیتا۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔

ایک مریض رخصت ہوا تو شیلا نے دوسرے مریض کو اندر بلایا۔

مسٹر بین بیاؤ شیلا نے ڈاکٹر سے کہا۔ وہ ہر مریض کا نام ڈاکٹر کو اسی طرح بتاتی تھی۔

ڈاکٹر نے آہستہ سے گردن ہلا دی۔

بین بیاؤ نے اندر داخل ہو کر ڈاکٹر سے گڈ مارننگ کہا اور ڈاکٹر نے خوشدلی سے اس کے سلام کا جواب دیا اور ایک سرسری نظر اس کے جسم پر ڈالی۔ اس کا مطلب اسکے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ اس کی بیماری کی نوعیت کے بارے میں جان سکے۔

اچانک ایک چیز پر ڈاکٹر کی دوربیں اور دردوں بیں نظریں جم کر رہ گئیں۔ یہ بظاہر ایک خوبصورت سا سگریٹ کیس تھا جو کہ بین بیاؤ کی پتلون کی جیب میں رکھا ہوا تھا۔ اس سگریٹ کیس کے ساتھ ہی سگریٹ لائٹر بھی تھا۔ یہ کوئی خاص بات نہیں۔ اس طرح کے سگریٹ کیس بہت عام تھے اور کسی بھی دکان سے سیکڑوں کی تعداد میں خریدے جا سکتے تھے۔ لیکن یہ محض لائٹر والا ایک سگریٹ کیس نہیں تھا۔

اس سگریٹ کیس میں ایک طرف ایک بالکل چھوٹا سا خانہ موجود تھا۔ اس خانے میں ایک مائیکرو فلم رکھی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کی دوربیں نگاہوں نے مائیکرو فلم کو دیکھا اور

پہلی ہی نظر میں اسے اندازہ ہوگیا کہ اس فلم کا تعلق فوجی رازوں سے ہے۔

ڈاکٹر نے بین یباؤ کو معائنے کی میز پر لٹا دیا اور اس کا تفصیلی معائنہ کرنے کی آڑ میں جلدی جلدی فلم کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

ڈاکٹر کو تمام تر تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے جلد ہی اس مائیکرو فلم کی نوعیت کو جان لیا

یہ ایک انتہائی خفیہ سرکاری فائل کے چند اہم ترین صفحات کی مائیکرو فلم تھی اس فائل کا تعلق امریکہ اور فرانس کے درمیان ہونے والے ایک خفیہ معاہدے سے تھا۔ جس کی رو سے بعض جدید ترین قسم کے ایٹمی ہتھیار فرانس کی سرزمین پر مختلف جگہوں پر پوشیدہ طور پر نصب کیے جانے تھے۔ اس فائل میں ان مقامات کی نشاندہی کی گئی تھی۔ جہاں ان ہتھیاروں کو خفیہ طور پر نصب کیا جانا تھا۔ نیز ہتھیاروں کے بارے میں پوری تفصیلات بھی فراہم کی گئی تھیں ڈاکٹر نے تمام باتوں کو جلد جلد ذہن نشین کرلیا۔ اس کے بعد وہ بین یباؤ کی بیماری کے بارے میں معلوم کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے معائنہ ختم کرلیا اور بین سے کہا کہ وہ اٹھ کر نیچے آجائے اور کرسی پر بیٹھ جائے

کوئی سابقہ میڈیکل ریکارڈ۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔ کیونکہ شیلا نے اس مریض کی آمد پر کوئی میڈیکل ریکارڈ ڈاکٹر کے سامنے پیش نہیں کیا تھا۔ جب کہ مریض کی آمد کے ساتھ ہی شیلا اس کا سابق میڈیکل ریکارڈ جو مریض اپنے ساتھ لاتا تھا۔ ڈاکٹر کے سامنے پیش کردیتی تھی۔ بعض مریض ایسے بھی ہوتے تھے جو کوئی میڈیکل ریکارڈ ساتھ نہیں لاتے تھے۔ بین بھی ایسے ہی مریضوں میں سے ایک تھا۔

بات یہ ہے ڈاکٹر کہ مجھے گزشتہ کافی عرصے سے کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں پڑی ہے بین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میری صحت ہمیشہ بہت اچھی رہی ہے۔ بس گزشتہ چند دلوں سے یہ تکلیف ہوگئی ہے۔

تم کیا کام کرتے ہو۔ ڈاکٹر نے بین سے پوچھا

میں دراصل واشنگٹن میں رہتا ہوں ڈاکٹر۔ بین نے جواب دیا۔ اور وہاں میں فرانسیسی سفارت خانے میں ملازم ہوں۔ ان دنوں میں چھٹیوں میں لاس اینجلز آیا ہوا ہوں۔

اگر مجھے یہ نہیں معلوم ہوگا کہ تم لاس اینجلز میں کب تک قیام کا ارادہ رکھتے ہو تو میرے لئے تمہارا علاج کرنا مشکل ہوجائے گا ڈاکٹر نے کہا۔

اوہ۔ یہ کون سی راز کی بات ہے ڈاکٹر بین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں پندرہ دن تک لاس اینجلز میں ہی ہوں۔ اس دوران میں تمہاری دوائیں استعمال کرسکتا ہوں۔ اس کے بعد جب میں واشنگٹن واپس چلا جاؤں گا تو وہاں بھی علاج جاری رکھ سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میں فون پر تم سے مشورہ لے سکتا ہوں اور اپنا حال بیان کرسکتا ہوں۔

شاید اس کی ضرورت پیش نہ آئے ڈاکٹر نے کہا۔ میں تمہیں دوائیں دے کر چھ ماہ کے بعد دوبارہ معائنے کے لیے بلاؤں گا ڈاکٹر کا ذہن تیزی سے کام کررہا تھا۔

اوہ۔ بہت بہت شکریہ ڈاکٹر بین نے کہا۔

لیکن اس کے لیے تمہیں ابھی اور اسی وقت اسپتال میں داخل ہونا پڑے گا ڈاکٹر نے بین سے کہا۔ بعض ضروری قسم کے ٹیسٹ فوری طور پر کرنے ہیں۔ ان کے لیے تمہیں شام تک رکنا ہوگا۔

اوہ بین کسی سوچ میں پڑ گیا۔ میرا خیال ہے ڈاکٹر کہ میں کل آکر یہ ٹیسٹ کیوں نہ کرالوں۔

ڈاکٹر نے بین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ اور ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔

بین میرا ایک اصول ہے اور وہ یہ کہ میں اپنے مریضوں کو خوفزدہ نہیں کرتا ڈاکٹر نے کہا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں ان کو خوش فہمی میں مبتلا رکھنا پسند نہیں کرتا۔ تمہاری بیماری کی نوعیت معمولی نہیں ہے۔ تم میرے پاس اگرچہ بہت دیر سے آئے ہو تاہم میں تمہارے لیے کچھ نہ کچھ

کرسکتا ہوں۔ بشرطیکہ مزید ایک لمحہ ضائع کیے بغیر تمہارا علاج شروع کردیا جائے۔

بین ڈاکٹر کی بات سن کر گھبرا گیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ڈاکٹر آرتھر فلپ کوئی معمولی درجے کا ڈاکٹر نہیں ہے۔ وہ ملک کے اعلیٰ ترین ڈاکٹروں میں سے ایک ہے اور بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے۔ اس کی کہی ہوئی کوئی بات بھی بے وزن نہیں ہوسکتی تھی۔

کیا میں اپنی بیماری کی نوعیت کے بارے میں جان سکتا ہوں ڈاکٹر۔ بین نے گھبرا کر پوچھا۔

ابھی نہیں ڈاکٹر نے سنجیدگی سے کہا۔ میں حتمی نتیجے پر پہنچے بغیر کوئی بات نہیں کہتا اور حتمی نتیجے پر پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ تمہارے ٹیسٹ کیے جائیں۔ فوری طور پر اگر تم اپنا واقعی ٹھیک ٹھیک علاج کرانے میں دلچسپی رکھتے ہو تو فوراً داخل ہوجاؤ۔ ورنہ تمہاری مرضی۔ اس صورت میں تمہارے لیے کوئی دوا یا علاج تجویز نہیں کرسکوں گا۔

نہیں نہیں ڈاکٹر بین نے جلدی سے کہا۔ میں بڑی مشکل سے تو تم سے اپائنٹ منٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکا ہوں۔ میں اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ میں تیار ہوں۔ تم مجھے فوراً داخل کرلو اور جو ضروری ٹیسٹ ہیں وہ کرڈالو۔

ٹھیک ہے ڈاکٹر نے کہا۔ مجھے خود تمہارے ساتھ چلنا پڑے گا۔

شیلا حیران تھی کہ آج ڈاکٹر کو کیا ہوگیا ہے۔ اس نے کبھی کسی مریض کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ نہیں کیا تھا۔ اول تو ڈاکٹر بہت کم کسی مریض کا ٹیسٹ کرواتا تھا اور اگر ٹیسٹ کرواتا بھی تھا تو اس میں اس نے اتنی عجلت اور اصرار کا مظاہرہ کبھی نہیں کیا تھا۔ شیلا برسوں سے ڈاکٹر کے ساتھ کام کررہی تھی اور اس عرصے کے دوران بہت سی بیماریوں اور ان کے طریقہ ہائے علاج کے بارے میں بہت کچھ جان گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس بھلے چنگے آدمی کو جو دیکھنے میں پوری طرح تندرست و توانا نظر آرہا تھا اور جس کے گالوں سے جیسے خون ٹپک رہا تھا۔ ایسی کون سی مہلک بیماری لاحق ہوگئی تھی کہ ڈاکٹر کو اس کے ٹیسٹ میں ایک دن کی تاخیر بھی گوارا نہیں تھی۔ ممکن ہے کوئی شدید قسم کی پیچیدگی ہو شیلا نے سوچا۔ ڈاکٹر آرتھر فلپ جیسا ماہر اور بڑا ڈاکٹر کوئی بے وقوفوں کی سی حرکتیں تو نہیں کرسکتا۔

ابھی باہر اور کتنے مریض باقی ہیں.. ڈاکٹر نے شیلا سے پوچھا۔

شیلا نے اپنے ہاتھ میں موجود فہرست پر نظر ڈالی اور بولی۔ پانچ۔

ٹھیک ہے ڈاکٹر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ان سے کہہ دو کہ انہیں کچھ دیر انتظار کرنا ہوگا۔ میں ایک ایمرجنسی کیس میں مشغول ہوگیا ہوں۔

بہتر ہے شیلا نے کہا۔ میں انہیں بتا دیتی ہوں۔

آؤ میرے ساتھ ڈاکٹر نے بین سے کہا اور اپنی نشست سے اٹھ گیا۔ بین بھی کھڑا ہوگیا۔

شیلا ایک بار پھر حیرت میں ڈوب گئی۔ ڈاکٹر آرتھر ایک مریض کو اپنے ساتھ کسی ٹیسٹ کے لیے لے جارہا تھا۔ ایسا آج تک کبھی نہیں ہوا تھا۔ انتہائی سنگین صورت حال میں بھی ڈاکٹر کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ انٹرکام پر متعلقہ شعبے سے آدمیوں کو طلب کرکے مریض کو ان کے حوالے کرسکتا تھا اور ساتھ ہی تحریری ہدایات بھی دے سکتا تھا۔ یہی مروجہ طریقہ کار بھی تھا جس پر برابر عمل ہوتا تھا۔ لیکن آج ڈاکٹر ایک مریض کو خود ساتھ لے کر اسپتال کے کسی شعبے میں جارہا تھا۔ شیلا کو نہیں معلوم تھا کہ مریض کا کون سا ٹیسٹ ہونا ہے اور اس کے لیے اسے کس شعبے میں جانا ہوگا۔ وہ باہر نکل گئی اور اس نے وہاں موجود باقی پانچ مریضوں کو بتادیا کہ ایک ایمرجنسی کیس کے باعث ڈاکٹر مصروف ہوگیا ہے اور تھوڑی دیر کے بعد آئے گا۔

ڈاکٹر بین یباؤ کو اپنے ساتھ لیے ہوئے ایمرجنسی وارڈ میں آگیا۔ اس وارڈ میں موجود آرایم او اور دوسرے عملے

کے لیے ڈاکٹر کی اس وقت کی آمد بالکل غیر متوقع تھی۔ کیونکہ ان کے پاس اس وقت کوئی ایسا کیس موجود نہیں تھا جس کے لیے ڈاکٹر آرتھر کی ضرورت ہوتی۔

آر ایم او اور عملے کے سینئر ارکان فوراً ہی اپنے اپنے ضروری آلات سنبھالے ہوئے ڈاکٹر کے ساتھ ہو لیے

سارے لوگوں کی ضرورت نہیں ڈاکٹر نے اسٹاف سے کہا۔ بس مسٹر گریس میرے ساتھ چلی آئیں اس نے ایک نوجوان نرس کی طرف اشارہ کیا۔

میں موجود ہوں ڈاکٹر مسٹر گریس نے جلدی سے آگے بڑھ کر کہا۔

کمرہ نمبر پانچ تو خالی ہے نا۔ ڈاکٹر نے مسٹر گریس سے پوچھا۔

ہم اس کمرے کو کبھی آدھے گھنٹے سے زیادہ انگیج نہیں رکھتے آر ایم او نے کہا۔

مریض کو اسی کمرے میں لے چلو ڈاکٹر نے نرس سے کہا اور خود وہیں رک گیا۔ اسے آرام سے بستر پر لٹا دو۔

کمرہ نمبر پانچ وہ کمرہ تھا جہاں حادثات یا کسی اچانک ہی بیماری کے لوگوں کو لایا جاتا تھا اور یہاں وہ تمام ساز و سامان موجود تھا۔ جو کسی مریض کی جان بچانے کے لیے فوری طور پر ضروری ہوتا تھا۔ یہاں پر مریض کو تھوڑی دیر تک رکھتے اور اس کی حالت کا جائزہ لینے کے بعد پھر اسے مزید علاج کے لیے دوسرے یونٹ میں بھیج دیا جاتا تھا۔ یہ ایک قسم کا کمرہ معائنہ تھا۔

گریس بین کو لیے ہوئے کمرہ نمبر پانچ میں داخل ہو گئی اور اس سے کہا کہ وہ بستر لیٹ جائے۔ ڈاکٹر نے نرس کو یہ ہدایت نہیں دی کہ مریض کو اسپتال کے کپڑے پہنائے جائیں۔ اس لیے نرس نے اس سے کپڑے تبدیل کرنے کے لیے نہیں کہا۔ بین صرف اپنے جوتے اتار کر بستر پر لیٹ گیا۔

کیا یہ کوئی بہت سیریس کیس ہے ڈاکٹر۔ آر ایم او نے ڈاکٹر آرتھر سے پوچھا۔

بہت سیریس ڈاکٹر آرتھر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور ایک دوسری نرس کو پیتھڈرین کا ایک انجکشن تیار کر کے لانے کی ہدایت کی۔ نرس فوراً وہاں سے ایک قریبی کمرے میں چلی گئی۔

اس مریض کو فی الحال صرف سونے کی ضرورت ہے ڈاکٹر نے آر ایم او سے کہا۔ لیکن اسے یہ بات نہیں معلوم ہے۔ میں اسے انجکشن لگا دوں گا اور وہ فوراً سو جائے گا۔ اس کے بعد تم اسے کسی دوسرے کمرے میں منتقل کر دینا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ کم از کم دو گھنٹے تک گہری نیند سوتا رہے

ٹھیک ہے ڈاکٹر آر ایم او نے کہا۔ کیا اس مریض کا داخلہ کارڈ بن گیا ہے۔

اس کی ضرورت نہیں ڈاکٹر نے کہا۔ ویسے میں تمہیں بتا دوں کہ اس کا نام بین یاؤ ہے۔ تم بس وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں اور باقی ساری باتیں بھول جاؤ۔

اس اثناء میں نرس انجکشن تیار کر کے لے آئی۔ ڈاکٹر نے کڈنی ٹرے اپنے ہاتھ میں لے لی جس میں دوا سے بھری ہوئی سرنج اور روئی وغیرہ رکھی ہوئی تھی اور وہ کمرہ نمبر پانچ میں داخل ہو گیا۔ بین بستر پر لیٹا ہوا تھا اور گریس اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ بین کمرہ نمبر پانچ کے ساز و سامان سے بڑا متاثر نظر آ رہا تھا۔

یہ کمرہ تو کوئی سائنسی میوزیم معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر بین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس میں جدید ترین ساز و سامان موجود ہے ڈاکٹر نے کہا اور بین کے بازو میں انجکشن لگا دیا۔

میں تمہارے اوپر اس انجکشن کے ردعمل کا مشاہدہ کروں گا ڈاکٹر نے کہا۔ تم اپنے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دو اور بالکل آرام سے لیٹ جاؤ۔

☆☆

بین نے ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کیا اور ڈاکٹر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس نے گریس کو بھی باہر بلا لیا

تم دس منٹ بعد مجھے مطلع کرنا کہ اس کی کیا کیفیت ہے ڈاکٹر نے گریس سے کہا اور واپس اپنے کمرے میں چلا آیا۔ دس منٹ کے اندر اس نے ایک اور مریض کو دیکھ لیا۔ اس کے بعد فون کی گھنٹی بجی۔ گریس نے اسے مطلع کیا کہ مریض سو چکا ہے۔ ڈاکٹر نے اس کا شکریہ ادا کر کے فون بند کر دیا۔

آدھے گھنٹے کے اندر اندر اس نے بقیہ چار مریضوں کو بھی نمٹا دیا اور اسکے بعد شیلا سے کہا کہ وہ تھوڑی دیر مصروف رہے گا۔ اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے اور کوئی فون کال بھی نہ دی جائے۔ شیلا باہر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ڈاکٹر نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے لاک کر دیا اور لاس انجلز کے پولیس چیف ولیم ہمفرے کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ وہ سب کچھ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کر رہا تھا۔

میں ڈاکٹر آرتھر فلپ بول رہا ہوں سلسلہ ملنے پر اس نے کہا۔ میں ولیم ہمفرے سے ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔

چند سیکنڈ کے بعد ولیم ہمفرے لائن پر تھا۔

میرے لیے ڈاکٹر آرتھر فلپ سے بات کرنا اعزاز کا باعث ہے پولیس چیف نے کہا۔ میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں ڈاکٹر۔

مسٹر ہمفرے ڈاکٹر نے کہا۔ کیا تم فوری طور پر یہ معلوم کر سکتے ہو کہ واشنگٹن میں فرانسیسی سفارت خانے میں بین یاؤ نامی کوئی شخص کام کرتا ہے۔

موجودہ کمپیوٹرائزڈ سسٹم کے تحت یہ معلوم کرنا چند منٹ کا کام ہے ہمفرے نے کہا۔ اگر تم لائن ہولڈ رکھو تو میں تمہیں ابھی بتاتا ہوں۔

ٹھیک ہے میں انتظار کر رہا ہوں ڈاکٹر نے کہا اور دوسری طرف لائن پر خاموشی طاری ہو گئی۔

چند منٹ کے بعد ڈاکٹر نے ہمفرے کی دوبارہ آواز سنی فرانسیسی سفارت خانے میں اس نام کا ایک ملازم موجود ہے ہمفرے نے ڈاکٹر کو اطلاع دی۔ لیکن وہ ان دنوں واشنگٹن میں نہیں ہے وہ چھٹی پر کہیں باہر گیا ہوا ہے۔

بالکل ٹھیک ڈاکٹر نے کہا۔ اب میں ایک اہم مسئلے کی طرف آتا ہوں۔ لیکن بات یہ ہے چیف کہ اس معاملے کا تعلق ملکی سلامتی سے ہے اور میں فون پر اس کے بارے میں بات کرنا مناسب نہیں سمجھتا کیا تمہارے لیے یہ ممکن ہے کہ تم تکلیف کرو اور ذرا دیر کے لیے میرے پاس آ جاؤ

میں اب سے آدھے گھنٹے کے بعد تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔ ڈاکٹر پولیس چیف نے ڈاکٹر کو بتایا۔

میں تمہارا انتظار کروں گا ڈاکٹر نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کام کر رہا تھا۔ اس نے اپنے ذہن میں ایک پوری کہانی ترتیب دے لی تھی۔ اسے ملکی سلامتی وغیرہ کے مسائل سے نہ تو کوئی دلچسپی تھی اور نہ وہ ان میں ہاتھ ڈالنا پسند کرتا تھا۔ اس کے تو اپنے علیحدہ پروگرام تھے۔ وہ چاہتا تو بین یاؤ کو بلیک میل بھی کر سکتا تھا۔ لیکن وہ بین جیسے چھوٹے موٹے اور معمولی درجے کے لوگوں سے الجھنا اب اپنے لیے کسر شان سمجھتا تھا۔

آدھے گھنٹے کے بعد پولیس چیف ولیم ہمفرے سادہ کپڑوں میں ملبوس ڈاکٹر آرتھر فلپ کے کمرے میں موجود تھا

میں نے ایک ایسی خلاف قانون حرکت کی ہے چیف کہ تم چاہو تو میرے خلاف مقدمہ درج کر سکتے ہو ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں تمہیں سچ بتا رہا ہوں میرے خلاف پورا میڈیکو لیگل کیس بن رہا ہے۔

ولیم ہمفرے کچھ سمجھ نہ سکا۔ وہ سنجیدہ ہو گیا۔

کیا کسی مریض کے ساتھ کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ اس نے کہا۔ قانون بہر حال اگر مریض کا تحفظ کرتا ہے تو ڈاکٹر کے ساتھ بھی دشمنی نہیں کرتا۔ کیس کا انحصار تو غلطی کی نوعیت پر ہوگا۔ ڈاکٹر مجھے بتاؤ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔

اس قسم کی کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے۔ جیسی تم سمجھ رہے ہو ڈاکٹر نے کہا۔ ہم لوگ مریضوں کے بارے میں رتی برابر بھی لاپروائی نہیں برتتے۔ بات یہ ہے پولیس چیف کہ یہ سارا فساد ایک نامعلوم فون کال کا ہے۔ ہوا یوں کہ آج صبح مجھے ایک نامعلوم فون کال ملی۔ فون کرنے والے نے اپنا نام نہیں بتایا۔ شاید وہ کسی پبلک فون بوتھ سے فون کر رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ آج آؤٹ ڈور مریضوں میں سے بین لیاؤ نامی ایک شخص میرے پاس آرہا ہے جو امریکہ میں فرانسیسی سفارت خانے میں ملازم ہے اور اس نے وہاں سے ایک نہایت اہم فائل کی مائیکروفلم تیار کر کے اڑالی ہے اس فائل کا تعلق امریکہ اور فرانس کے درمیان بعض خفیہ دفاعی امور سے ہے فون کرنے والے نے بتایا کہ بین لیاؤ دراصل ایک غیر ملکی طاقت کا ایجنٹ ہے اور اس سے پہلے بھی کئی اہم راز فروخت کر چکا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ یہ مائیکروفلم بین کے پاس اس کے سگریٹ لائٹر میں موجود ہے اور آج ہی وہ اسے دوسرے شخص کے حوالے کر کے رقم وصول کر لے گا۔ میں نے اس شخص سے کہا کہ اس قسم کے معاملات سے میرا کیا تعلق۔ اسے چاہیے کہ وہ پولیس کو مطلع کرے۔ لیکن وہ کہنے لگا کہ وہ ایک بدنام زمانہ جرائم پیشہ آدمی ہے اور پولیس کے بہت سے لوگ اس سے بخوبی واقف ہیں اور اس کی آواز تک پہچانتے ہیں۔ لہٰذا وہ پولیس کو فون کر کے اپنے لیے مشکلات نہیں پیدا کرنا چاہتا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ جرائم پیشہ تو ضرور ہے لیکن ملک کی سلامتی کو بے حد عزیز رکھتا ہے اور یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ ملک کے دفاعی راز مخالف قوتوں کے ہاتھوں میں پہنچ جائیں۔ اس نے مجھ سے کہا کہ ایک قانون پسند اور محب وطن شہری ہونے کی حیثیت سے میں خود اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھاؤں۔ اس کے فوراً بعد اس نے فون بند کر دیا۔ میں ابھی پورے طور پر سوچ بھی نہیں پایا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے کہ میری چیف نرس شیلا نے بین لیاؤ کو اندر بلایا۔ اس کی باری آچکی تھی۔ اب تم بتاؤ چیف کہ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے تھا۔

ہملرے سوچ میں پڑ گیا۔ قدرے توقف کے بعد اس نے کہا۔ ظاہر ہے کہ جب بین لیاؤ تمہارے کمرے کے اندر آچکا تھا تو تم پولیس کو فون نہیں کر سکتے تھے۔ اس میں کافی دشواری تھی۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں اس نامعلوم فون کال کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تمہیں بین لیاؤ کو روکنا چاہیے تھا۔ کسی بھی طرح۔

اور میں نے بالکل یہی کیا ہے۔ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ فون کرنے والا سچا ہے یا جھوٹا۔ تاہم اس معاملے کا تعلق ملکی سلامتی سے ہے اور جب مسئلہ ملکی سلامتی کا ہو چیف تو پھر تھوڑی بہت قانونی خلاف ورزی میں بھی کوئی ہرج نہیں۔ اس کا خطرہ تو بہر حال مول لینا ہی پڑتا ہے۔

میں تم سے بالکل متفق ہوں۔ ڈاکٹر ہملرے نے کہا۔ ملکی سلامتی ہر شے پر مقدم ہے۔ تو پھر تم نے اسے س طرح روکا اور اس وقت وہ کہاں ہے۔

میں نے اپنے پیشے کے اصولوں سے تھوڑا سا انحراف کیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ اسے کوئی خاص بیماری نہیں تھی لیکن میں نے اسے ڈرایا کہ وہ کسی سنگین بیماری میں مبتلا ہے اور اسے بعض ضروری ٹیسٹوں کے لیے فوری طور پر اسپتال میں داخل ہونا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس نے میری بات کو سچ جانا اور خوفزدہ ہو کر اسپتال میں داخل ہونے کو تیار ہو گیا۔ میں نے اسے پینتھوڈرین کا انجکشن دے کر سلا دیا اور میرا خیال ہے کہ اسے بیدار ہونے میں ابھی گھنٹے کی دیر ہے

ونڈرفل ڈاکٹر آرتھر فلپ ہملرے نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ تم نے واقعی دانائی کا ثبوت دیا ہے۔ تم نے کمال کر دیا ہے۔

میں اس کے علاوہ اور کیا کر سکتا تھا۔ چیف ڈاکٹر نے کہا۔ میرے پاس اس کا موقع نہیں تھا کہ میں فون کر کے پولیس کو بلاتا اور اسے روکنے کی اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں تھی۔ لیکن چیف اگر یہ بات غلط نکلی۔ فرض کرو

کہ کسی بے ہودہ شخص نے میرے ساتھ مذاق کیا ہو۔

کوئی مضائقہ نہیں ڈاکٹر ہملرے نے کہا۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن تم نے جو کچھ کیا ہے وہ ایک محب وطن شہری کی حیثیت سے کیا ہے۔ تم پر کوئی آنچ نہیں آسکتی۔ اگر اس کے پاس سے کچھ بھی برآمد نہ ہوا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم اس سے کہہ سکتے ہو کہ تمہیں جس بیماری کا شبہ تھا وہ اس بیماری کا شکار نہیں ہے۔ تم کوئی بھی ٹیسٹ کر کے اسے ایک اطمینان بخش رپورٹ دے سکتے ہو۔

شاید ڈاکٹر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ بہر حال اتنا تو ضرور ہے کہ میں نے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔

تم نے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا ڈاکٹر ہملرے نے کہا۔ کسی مریض کو پینتھوڈرین کا انجکشن دے کر سلا دینا کوئی میڈیکولیگل کیس نہیں بنتا۔

صرف اس صورت میں جب مریض کو سلانے کی واقعی ضرورت ہو ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں چاہتا ہوں کہ اس کے بیدار ہونے سے پہلے ہی اس کی تلاشی لے لی جائے ہملرے نے کہا۔ تاکہ اگر اس کے پاس سے کچھ بھی برآمد نہ ہو تو تمہیں بعد میں غیر ضروری الجھنوں کا شکار نہ ہونا پڑے۔

بالکل ٹھیک ہے ڈاکٹر نے کہا۔

اگر اس کے سگریٹ کیس میں فلم موجود ہوگی تو وہ بہت ہوشیاری اور چالاکی سے چھپائی گئی ہوگی ہملرے نے کہا میں فون کر کے اپنے ایک ایکسپرٹ کو بلانا چاہتا ہوں۔

ضرور بلالو ڈاکٹر نے کہا اور ہملرے فون کرنے لگا۔

کچھ دیر کے بعد ڈاکٹر آرتھر ولیم ہملرے اور پیٹر نامی ایک ایکسپرٹ ایمرجنسی وارڈ میں اس کمرے میں موجود تھے جہاں بین کو پہنچا دیا گیا تھا۔ بین اس وقت گہری نیند میں سو رہا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اس کا لباس تبدیل نہیں کرایا گیا تھا۔ اور وہ اپنے ہی کپڑوں میں تھا۔

اگر ہم اسے ہاتھ لگائیں گے تو یہ جاگ تو نہیں جائے گا ہملرے نے پوچھا۔

اس کا امکان نہیں ہے ڈاکٹر نے جواب دیا۔

ہملرے نے سب سے پہلے بین کے جسم کو ٹٹول کر دیکھا اور اس کی جیب میں رکھا ہوا سگریٹ کیس نکال لیا۔

سگریٹ کیس تو موجود ہے ہملرے نے آہستہ سے کہا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کے اندر کیا ہے اور اس نے سگریٹ کیس پیٹر کے حوالے کر دیا۔

ڈاکٹر کو معلوم تھا کہ فلم اپنی جگہ پر موجود ہے۔ وہ اپنی دوربیں اور دوروں بیں نگاہوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا

پیٹر نے اپنے چھوٹے سے بریف کیس سے چند اوزار نکالے اور دیکھتے ہی دیکھتے سگریٹ کیس کے انجر پنجر ڈھیلے کر دیے ایک چھوٹی سی ڈبیہ میں رکھی ہوئی فلم اس کے اندر سے برآمد ہوئی۔ پیٹر نے فلم ہملرے کے حوالے کر دی۔ ہملرے کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

مجھے لگتا ہے کہ ہم بالکل ٹھیک خطوط پر جا رہے ہیں ہملرے نے کہا۔ ہم ابھی اس فلم کو چلا کر دیکھیں گے۔ پیٹر اپنے ساتھ سارا ضروری سامان لے آیا ہے۔

چونکہ یہ معاملہ ملکی دفاع سے تعلق رکھتا ہے چیف اس لیے میں اس فلم کو دیکھنے والوں میں شامل نہیں ہوں گا ڈاکٹر نے کہا۔ تم ایک علاحدہ کمرے میں تنہا اسے دیکھ سکتے ہو۔

میں تمہارے احساس ذمہ داری کو بےحد سراہتا ہوں ڈاکٹر ہملرے نے کہا۔ اور اگر تم اسے دیکھ بھی لیتے تو اس میں کوئی ہرج نہیں تھا۔

میں اسے مناسب نہیں سمجھتا چیف ڈاکٹر نے کہا۔ سرکاری راز سرکاری راز ہی رہنا چاہیے ڈاکٹر مسکرایا چیف بے چارے کو کیا معلوم تھا کہ ڈاکٹر تو پہلے ہی فلم کے ایک ایک لفظ کو پڑھ چکا ہے۔

ڈاکٹر نے ہملرے کو ایک علاحدہ کمرہ مہیا کر دیا۔ جہاں وہ فلم لے کر چلا گیا۔ ڈاکٹر خود بین کے کمرے میں موجود رہا۔ پیٹر بھی اس کے ساتھ تھا۔

کوئی پندرہ منٹ کے بعد ہی ہملرے واپس آ گیا۔ وہ

بہت سنجیدہ تھا۔

اس نامعلوم فون کال کا ایک ایک لفظ درست تھا۔ ڈاکٹر ہملرے نے آہستہ سے کہا۔ اس فلم میں سب کچھ وہی ہے جیسا کہ بتانے والے نے بتایا ہے۔

شکریہ ڈاکٹر نے کہا۔ مجھے خوشی ہے کہ میری کوشش رائیگاں نہیں گئی۔

میرے ساتھ آؤ ڈاکٹر ہملرے نے کہا۔ پیٹر اس کمرے میں رہ کر بین پر نظر رکھے گا۔ نہ جانے کس وقت یہ بیدار ہو جائے۔ اس کو اب یہاں سے جانا نہیں چاہیے

ڈاکٹر اور ہملرے وہاں سے نکل کر ایک دوسرے کمرے میں آ گئے۔

یہ اب سی آئی اے کا کیس ہے۔ ڈاکٹر آرتھر فلپ ہملرے نے ڈاکٹر سے آہستہ سے کہا۔ بین کے بیدار ہونے کے فوراً بعد میں اپنی تفصیلی رپورٹ اور فلم کے ساتھ اسے سی آئی اے کے حوالے کر دوں گا۔ میری پوری رپورٹ میں تمہارا ذکر ایک مرکزی کردار کے طور پر ہوگا۔ اگر تم نے احساس ذمہ داری کا مظاہرہ نہ کیا ہوتا تو یہ خطرناک ایجنٹ اپنا کام کر جاتا۔ میں اپنی رپورٹ میں تمہیں زبردست الفاظ میں خراج تحسین پیش کرنا چاہتا ہوں۔

یہی اصل نکتہ تھا۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لیے ڈاکٹر نے اس کیس میں پولیس کو طلب کر لیا تھا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی کسی معاملے میں پولیس کو زحمت نہیں دی تھی اور زیادہ تر معاملات تو تھے ہی ایسے جن میں وہ پولیس کے پاس جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن یہ موقع اسے اتفاق سے مل گیا تھا اور وہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ ایک سے شدہ محب وطن اور قانون پسند شہری کی حیثیت سے اس کا ذکر سرکاری فائلوں میں موجود ہو۔ کسی کارنامے کے ساتھ تاکہ آئندہ کسی وقت اگر اتفاق سے کوئی گڑبڑ ہو جائے تو ڈاکٹر کی ذات کو ہر قسم کے شک و شبے سے بالاتر سمجھا جائے اور پولیس کے ریکارڈ پر یہ بات موجود رہے کہ ڈاکٹر نے حب الوطنی کا زبردست مظاہرہ کیا ہے۔

تمہاری مرضی ہے چیف ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں نے تو اپنے پورے میڈیکل کیریر کے لیے اچھا خاصا خطرہ مول لے لیا تھا۔

تم نے اپنی حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے بہترین کارنامہ سرانجام دیا ہے چیف نے کہا۔ اب یہ شخص ہماری تحویل میں ہے۔ تمہیں اب اس کے سلسلے میں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ہم اس کے بیدار ہونے سے پہلے ہی اس کی پورے طور پر تلاشی لے لیں گے۔ شاید اس کے پاس سے کوئی اور کام کی چیز نکل آئے۔

میری طرف سے اجازت ہے ڈاکٹر نے کہا۔ اب وہ تمہارا کیس ہے جو چاہو کرو۔

ڈاکٹر وہاں سے چلا آیا۔ اس نے ڈیوٹی پر موجود آر ایم او کو بتا دیا کہ بین کے ہوش میں آنے کے بعد پولیس چیف ولیم ہملرے اسے اپنے ساتھ لے جائے گا۔

کیا یہ کوئی مجرم ہے۔ آر ایم او نے حیرت سے ڈاکٹر سے پوچھا۔

ہاں ڈاکٹر نے جواب دیا۔ لیکن اس کے بارے میں زیادہ چرچا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ خبر اسپتال کی چار دیواری سے باہر نہیں جانی چاہیے۔

ہوش میں آنے کے بعد بین کو گرفتار کر لیا گیا اور پولیس اسٹیشن پہنچا دیا گیا۔ ابتدائی پوچھ گچھ کے بعد اسے سی آئی اے کے حوالے کر دیا گیا۔

کسی اخبار میں بین یساؤ نامی شخص کی گرفتاری کی خبر نہیں شائع ہوئی۔ پولیس کے ذرائع نے اس معاملے میں زبردست رازداری سے کام لیا تھا اور خود ڈاکٹر آرتھر کو بھی مشورہ دیا تھا کہ وہ کسی سے اس کے بارے میں ذکر نہ کرے۔

اس واقعے کے چند روز کے بعد ڈاکٹر کو سی آئی اے کے ایک بہت بڑے اور با اختیار افسر وارگن کا فون موصول ہوا۔ اس نے فون پر اپنا تعارف کرانے کے بعد کہا۔ میں تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے ذاتی طور پر تمہارے پاس آنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر آرتھر فلپ

مجھے تمہارا خیر مقدم کر کے بڑی خوشی ہوگی وارگن ڈاکٹر نے کہا۔

ڈاکٹر اور وارگن کے درمیان ملاقات کا وقت اور دن مقرر ہو گیا۔ ڈاکٹر نے اپنی رہائش گاہ پر وارگن کو بلانے کے بجائے اسپتال میں اپنے کمرے میں ہی بلانا مناسب سمجھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی پولیس یا خفیہ پولیس کا آدمی اس گھر میں داخل ہو

ڈاکٹر نے جب وارگن کو دیکھا تو چند لمحوں کے لیے اسے گھبراہٹ سی محسوس ہوئی۔ وارگن پختہ عمر کا ایک آدمی تھا۔ اس کی آنکھوں میں اس قدر گہرائی تھی کہ انسان زیادہ دیر تک اس کی طرف دیکھ نہیں سکتا تھا۔ کس قیامت کی آنکھیں تھیں اس شخص کی۔ متجسس متلاشی کسی پر یقین نہ کرنے والی۔

وارگن نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کرنے کے بعد اس سے درخواست کی کہ وہ نامعلوم فون کال کے بارے میں اسے تفصیل سے بتائے۔ ڈاکٹر کو اس چیز کی توقع تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ایک انتہائی سنگین معاملہ ہے اور سی آئی اے والے اس کی مکمل چھان بین میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے اس نے لفظ بہ لفظ وہی داستان وارگن کو سنا دی جو اس سے پہلے وہ ہملرے کو سنا چکا تھا۔ اس نے اس داستان کی ساری تفصیلات کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھا تھا۔

کاش ہمیں کسی طرح سے پتا چل جاتا کہ فون کرنے والا کون شخص تھا وارگن نے کہا۔ ویسے میں تمہیں اعتماد میں لے کر یہ بتا دوں ڈاکٹر آرتھر فلپ کہ بین یساؤ کوئی مضبوط آدمی ثابت نہیں ہوا۔ اس نے دوسرے ہی دن ہتھیار ڈال دیے اور ہمیں سب کچھ بتا دیا۔ ہم واشنگٹن اور لاس انجلز میں اس کے ٹھکانوں پر چھاپے مار کر بہت سا ساز و سامان اور جدید ترین آلات برآمد کر چکے ہیں۔ اس نے قبول لیا ہے کہ وہ عرصے سے ایک غیر ملکی طاقت کے لیے جاسوسی کرتا رہا تھا اور فرانسیسی سفارت خانے سے اہم اطلاعات چرا کر فروخت کرتا رہا تھا۔ وہ یہ سارا کام پیسے کی خاطر کرتا تھا۔ ہم نے اس کی نشاندہی پر دو اور آدمیوں کو بھی گرفتار کیا ہے۔ ان ساری کامیابیوں کا سہرا تمہارے سر ہے۔ انتظامیہ اس سلسلے میں تمہاری بے حد شکر گزار ہے

وارگن نے اپنی تیز آنکھوں سے ڈاکٹر کو گھورا ڈاکٹر کو یوں لگا گویا وارگن کی برچھی جیسی نظریں اس کے دل میں اتری جا رہی ہیں۔ اسے گھبراہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ نہ جانے کیوں وہ وارگن سے کچھ خوفزدہ سا لگ رہا تھا۔ گو کہ وارگن بہت ہی عزت احترام اور نرمی کے ساتھ اس سے گفتگو کر رہا تھا۔ تاہم اس کے رویے میں کوئی ایسی بات تھی جو ڈاکٹر کے لیے ناقابل فہم تھی۔ وارگن کی تیز نگاہوں سے جھلکتی ہوئی بے یقینی یا شاید گہرا تجسس پتا نہیں کیا بات تھی۔ لیکن کوئی نہ کوئی بات تھی ضرور۔

بات یہ ہے ڈاکٹر آرتھر فلپ کہ عالمی کشیدگی بڑھ رہی ہے وارگن نے کہا۔ سرد جنگ کی شدت میں اضافہ ہو رہا ہے اگرچہ دونوں سپر پاور کی جانب سے پر امن بقائے باہمی اور تخفیف اسلحہ پر برابر زور دیا جا رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ دونوں اپنی اپنی جنگی قوت میں بھی اضافہ کیے جا رہی ہیں۔ دنیا کے کئی ممالک میں دونوں سپر پاورز کے مفادات کا ٹکراؤ ہو رہا ہے۔ چھوٹی موٹی جنگیں تو دوسری عالمی جنگ کے بعد ہی سے جاری ہیں۔ ان میں سے کوئی جنگ بھی بڑھ کر پھیل بھی سکتی ہے۔ ہمیں پورے طور پر چوکس اور باخبر رہنا ہے اور اپنے اتحادیوں کے مفادات کی بھی نگرانی کرنی ہے۔

وارگن کچھ دیر تک سیاسی گفتگو کرنے کے بعد رخصت ہو گیا اور ڈاکٹر سوچ میں پڑ گیا۔

وہ کیوں آیا تھا۔ ڈاکٹر نے سوچا۔ کیا وہ صرف میرا شکریہ ادا کرنے آیا تھا یا اس کا کوئی اور مقصد بھی تھا۔ اس نے نامعلوم فون کال کی ساری گفتگو دوبارہ سے سننے پر کیوں اصرار کیا۔ جب کہ میں ہملرے کو اس ساری گفتگو

کے بارے میں سب کچھ بتا چکا تھا اور پھر جب جین یساؤ نے سب کچھ قبول کر ہی لیا ہے تو اس بارے میں مجھ سے گفتگو کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

لیکن ڈاکٹر نے جلد ہی سارے شبہات کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ ظاہر ہے کہ اس سارے معاملے سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ جین یساؤ کو اس نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا اور وہ دونوں ایک دوسرے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ جین اس کے بارے میں پولیس کو کیا بتا سکتا تھا۔

وارگن نے صرف اپنا فرض ادا کیا ہے ڈاکٹر نے سوچا۔ مجھ جیسے معزز آدمی نے پولیس کے ساتھ ایک نہایت اہم معاملے میں تعاون کیا ہے تو پولیس کے اعلیٰ افسروں کا فرض تھا کہ وہ میرا شکریہ ادا کرتے۔ اس میں کون سی غیر معمولی بات ہے۔ ڈاکٹر نے اپنے آپ کو تسلی دے کر مطمئن کر لیا۔

اس کے چند ہی روز بعد اسمتھ نے فون کر کے ڈاکٹر سے ملاقات کی اور اسے بتایا کہ روسیریو یعنی انگر واپس آ گیا ہے۔

بڑی خوشی کی بات ہے ڈاکٹر نے کہا۔ میں کل رات کو آؤں گا۔ باقی لوگوں سے ملے ہوئے بھی کافی دن ہو گئے ہیں۔

سب لوگ تم سے ملنے اور باتیں کرنے کے خواہش مند رہتے ہیں باس اسمتھ نے کہا۔ جس دن تم آتے ہو وہ ہم سب لوگوں کے لیے ایک بہت اہم دن ہوتا ہے۔ ہم اس دن کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔

میں کل رات کا کھانا تم لوگوں کے ساتھ کھاؤں گا ڈاکٹر نے خوشگوار موڈ میں کہا۔ روسیریو کی واپسی کی خوشی میں۔

اگلی رات کو جب ڈاکٹر ہیڈ کوارٹر پہنچا تو دور ہی سے اس کی دور بین اور دوررس نظروں نے دیکھ لیا کہ اندرونی کمرے میں ایک بڑی سی ڈائننگ ٹیبل لگا دی گئی ہے اور اس ٹیبل پر اس قدر افراط کے ساتھ انواع و اقسام کے کھانے اور شرابیں موجود تھیں کہ بڑی بڑی دعوتوں میں اتنا اہتمام نہیں ہوتا تھا۔

یہ میں ہوں۔ میں ڈاکٹر نے بڑے تکبر کے ساتھ سوچا۔ یہ سب کچھ میرے لیے ہے۔ میں ان لوگوں کا آقا ہوں۔ یہ غلاموں کی طرح میرے لیے کام کرتے ہیں۔ یہ اپنی زندگیوں کے لیے میرے محتاج ہیں۔ ان کا مقدر میری خواہشات کے ساتھ وابستہ ہے۔

ڈاکٹر نے انگر عرف روسیریو کو بھی باہر ہی سے دیکھ لیا تھا۔ وہ واقعی بالکل بدل گیا تھا۔ اس کے چہرے پر قرون وسطیٰ کے پادریوں کی طرح ایک لمبی سی داڑھی تھی۔ سر پر بہت لمبے لمبے بال تھے۔ جنہیں رنگوا کر ان کا اصلی رنگ تبدیل کر دیا تھا۔ اس کا لباس بھی بالکل مختلف نوعیت کا تھا

سارے لوگوں نے ڈاکٹر کا خیر مقدم کیا۔ وہ سب بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ خاص طور پر انگر عرف روسیریو تو بہت ہی خوش تھا۔

تمہیں اب نئے سرے سے اپنی زندگی شروع کرنی ہے۔ روسیریو ڈاکٹر نے انگر سے کہا۔

مجھے اس کا احساس ہے باس انگر عرف روسیریو نے کہا۔ میں اسکے لیے پوری طرح تیار ہوں۔

اس ایک سال کے عرصے میں حالات بہت بدل چکے ہیں ڈاکٹر نے کہا۔ تمہیں باقی ساتھیوں کی زبانی معلوم ہو چکا ہوگا۔ ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں۔ ہماری دولت میں کس قدر اضافہ ہو چکا ہے اور میرے خواب بلکہ ہمارے خواب...... ہم ان کی تعبیر کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ برابر بڑھ رہے ہیں۔

ڈاکٹر کے لہجے میں بڑی گہری خود اعتمادی تھی۔

مجھے ان لوگوں کی زبانی سب کچھ معلوم ہو چکا ہے باس روسیریو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ نئے منصوبوں کے بارے میں نئے پروگراموں کے بارے میں اور ان ساری اہم باتوں کے بارے میں جو میری عدم موجودگی میں یہاں رونما ہوئیں۔

ہم نے روسیریو کو بتا دیا ہے کہ ہم حتمی طور پر کس مقصد کی جانب پیش قدمی کر رہے ہیں جیمس نے کہا۔ اور اس بات کو جان لینے کے بعد روسیریو کے نقطہ نظر میں بڑی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔

ہاں باس انگر عرف روسیریو نے کہا۔ ہم کب تک پولیس اور انتظامیہ سے چھپ چھپ کر ڈر ڈر کر احتیاط اور خوف کا مظاہرہ کرتے ہوئے کام کریں گے۔ ہمیں تو واقعی اقتدار کا مالک ہونا چاہیے۔

ہم اسی جانب پیش قدمی کر رہے ہیں ڈاکٹر نے مستحکم لہجے میں کہا۔ اور کامیابی کی منزل اب ہم سے بہت زیادہ دور نہیں ہے۔

میں اس وقت کا بڑی بے چینی سے منتظر ہوں باس انگر عرف روسیریو نے کہا۔

میں تم سے میکسیکو برازیل اور لاطینی امریکہ کے اندرونی حالات کے بارے میں سننا چاہتا ہوں ڈاکٹر نے کہا اور روسیریو اسے کئی گھنٹے تک ان ممالک کے اندرونی حالات اور وہاں تنظیم کے کام کرنے کے امکانات کے بارے میں بتاتا رہا۔ ڈاکٹر غور سے اس کی باتیں سنتا رہا اور یہ سوچتا رہا کہ کہاں کہاں کے وسائل سے کس انداز میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

کئی ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ اس دوران ڈاکٹر کی جیک سے بھی ملاقات ہوئی۔ جیک پوری تندہی کے ساتھ اپنے کام میں لگا ہوا تھا اور اسے یقین تھا کہ ڈاکٹر جوزف کی سربراہی اور رہنمائی میں وہ شاید آئندہ سال تک اپنا مقصد حاصل کر لے گا اور انسانی ذہن کو کنٹرول کرنے کا سو فیصدی کامیاب طریقہ دریافت کر لے گا ڈاکٹر اس دن کا منتظر تھا۔

تنظیم کے کام حسب معمول جاری تھے۔ ڈاکٹر کی دور رس منصوبہ بندی اور رہنمائی کے نتیجے میں تنظیم کو کامیابیوں پر کامیابیاں حاصل ہو رہی تھیں۔ انگر عرف روسیریو ابھی زیادہ فعال نہیں ہوا تھا۔

ڈاکٹر روزانہ رات کو اپنی حیاتیاتی لیبارٹری میں جاتا تھا اور کافی وقت وہاں صرف کرتا تھا۔ نئے زہریلے محلول کی تیاری کا کام تقریباً" ختم ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر اس نئے محلول کا کئی قسم کے جانوروں کے جسموں پر تجربہ کر چکا تھا۔ لیکن اب اسے ایک انسانی جسم کی تلاش تھی۔ وہ حتمی تجربہ ایک ایسے انسانی جسم پر کرنا چاہتا تھا جو ذیابیطس کا مریض ہو

یوں تو ڈاکٹر اپنے اس نئے محلول کا کسی بھی شخص پر بہ آسانی تجربہ کر سکتا تھا۔ جس سے وہ واقف ہو اور جس کے بارے میں بعد میں اسے پتا چل سکے کہ وہ شخص زندہ رہا یا مر گیا۔ لیکن محض اتنا کافی نہیں تھا۔ ڈاکٹر کے لیے ضروری تھا کہ جس شخص پر وہ تجربہ کرے اس کی صحت کے بارے میں وہ پوری معلومات رکھتا ہو اور خاص طور سے اسے یہ تو ضرور معلوم ہو کہ وہ شخص ذیابیطس کا مریض تو نہیں ہے۔

تب ہی وہ اپنی نئی ایجاد کا صحیح طور پر تجربہ کر سکتا تھا۔ ڈاکٹر کو ایک ایسے ہی شخص کی تلاش تھی۔ یوں تو اس کے پاس آنے والے مریضوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی اور پھر اسپتال میں بھی بہت سے مریض تھے لیکن اسے صرف ایک مریض نہیں چاہیے تھا۔ اسے ایک ایسا انسان چاہیے تھا جو ذیابیطس کا مریض ہو۔ وہ ادھر ادھر ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ لیکن ابھی تک کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔

اس دن وہ جب شام کے وقت اپنے گھر واپس آیا تو میکسویل اس کا منتظر تھا۔ آج میکسویل کو اس کے ڈرائنگ روم کی صفائی کرنی تھی۔ میکسویل کے ہاتھ میں رومال تھا اور وہ بار بار اپنی ناک اور آنکھوں سے پانی پونچھ رہا تھا۔

کیا ہوا ہے تمہیں۔ ڈاکٹر نے میکسویل کو دیکھتے ہی پوچھا

مجھے زکام ہو گیا ہے میکسویل نے کہا لیکن معمولی سا زکام ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں اپنا کام کر لوں گا۔

لیکن ڈاکٹر اپنے گھر کو زکام کے جراثیم سے آلودہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ وائرس کی بیماریوں سے بہت گھبراتا تھا

نہیں نہیں ڈاکٹر نے میکسویل کو منع کرتے ہوئے کہا۔ زکام کی طرف سے کبھی لاپروائی نہیں برتنی چاہیے۔ یہ بگڑ

جائے تو اس سے بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔ تم یوں کرو ابھی روزا کے پاس چلے جاؤ۔ میں تمہارے لیے کئی ٹیسٹ لکھ کر دیتا ہوں۔ تم وہ سارے ٹیسٹ کروالو کل میں رپورٹیں دیکھ کر تمہارے لیے دوا تجویز کردوں گا اور اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر کے ذہن میں ایک نیا خیال آیا۔

لیکن ڈاکٹر یہ تو معمولی سا زکام ہے میکسویل نے کہا۔ خود بخود ٹھیک ہوجائے گا۔

نہیں میکسویل ڈاکٹر نے زور دیتے ہوئے کہا۔ میں تم سے جس طرح کہہ رہا ہوں اسی طرح کرو تمہیں اسی وقت روزا کے پاس جانا ہے۔ میں لکھ کر دیتا ہوں وہ سارے کام کا بندوبست کردے گی اور کل دن میں میرے پاس اسپتال میں آجانا میں تمہیں اچھی طرح دیکھ لوں گا

ڈاکٹر نے ایک پرچے پر میکسویل کے لیے کئی ٹیسٹ لکھ دیئے۔ جن میں خون اور پیشاب کے ٹیسٹ بھی شامل تھے اور اسے اسپتال بھیج دیا۔ اس نے میکسویل سے کہہ دیا کہ ٹیسٹ کے بعد وہ اپنے گھر چلا جائے اور آرام کرے۔ اسے اب دوبارہ آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ڈرائنگ روم کی صفائی کا کام وہ کل بھی کرسکتا ہے۔

میکسویل ڈاکٹر کا شکریہ ادا کرکے وہاں سے چلا گیا۔ وہ ڈاکٹر کی رحمدلی شفقت اور محبت آمیز رویے سے بے حد متاثر تھا اور اس بات پر بہت خوش تھا کہ اسے ڈاکٹر آرتھر فلپ جیسے انسان دوست اور نیک طینت آدمی کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل رہا ہے۔

وہ سیدھا روزا کے پاس پہنچا اور اسے ڈاکٹر کا پرچہ دے دیا۔

افوہ روزا نے پرچہ دیکھ کر کہا۔ تمہیں کیا کیا بیماریاں لاحق ہوگئی ہیں۔ وہ ہنسنے لگی۔

مجھے کوئی بیماری نہیں ہے میکسویل نے کہا۔ بس معمولی سا زکام ہے لیکن ڈاکٹر آرتھر فلپ نے مجھے زبردستی یہاں بھیج دیا۔

ڈاکٹر ایک بہت ہی مہربان اور عمدہ شخص ہے روزا نے کہا۔ وہ انسانوں سے محبت کرتا ہے۔ انسانوں کی خدمت ہی ڈاکٹر کا اصل نصب العین ہے۔ چلو میرے ساتھ میں تمہارے سارے ٹیسٹ کرادوں۔

دوسرے دن ڈاکٹر نے اسپتال پہنچنے کے بعد سب سے پہلے میکسویل کی رپورٹیں طلب کیں جو اسے فوراً فراہم کردی گئیں۔ رپورٹوں کے مطابق میکسویل ویسے تو ہر لحاظ سے تندرست تھا لیکن اس کے خون میں شکر کی مقدار بڑھی ہوئی تھی۔ وہ ذیابیطس کا مریض تھا۔ لیکن ابھی تک خود بھی اس بات سے ناواقف تھا۔ ڈاکٹر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اسے ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی۔

جب وہ اپنے سارے ہی آؤٹ ڈور مریضوں کو دیکھ چکا تو شیلا نے اسے بتایا کہ میکسویل آگیا ہے اور ڈاکٹر کا انتظار کررہا ہے۔

اسے اندر بھیج دو ڈاکٹر نے کہا۔

میکسویل اندر آگیا اس کی طبیعت کل کے مقابلے میں آج زیادہ بہتر تھی۔

میرا نزلہ تو خود بخود کم ہوگیا ہے ڈاکٹر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

یہ اچھی بات ہے ڈاکٹر نے کہا۔ تاہم تمہیں دوا کی ضرورت ہے۔ تمہیں معلوم نہیں ہے لیکن تم ذیابیطس کے مریض ہو۔ تمہیں مسلسل علاج کی ضرورت ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔

اور وہ میکسویل کا معائنہ کرنے لگا۔ معمولی سا زکام کافی حد تک ٹھیک ہوچکا تھا

تمہارا نزلہ پہلے سے کافی بہتر ہے ڈاکٹر نے میکسویل سے کہا۔ تاہم میں تمہارے لیے دوا لکھے دیتا ہوں۔ تم ڈسپنسری سے جاکر لے لو اور اسکے بعد سے تمہیں ذیابیطس کا علاج کرانا ہوگا۔ میں اس کے لیے الگ سے دوائیں تجویز کروں گا اور ہاں آج کام پر ذرا جلدی آجانا۔ تم چھٹی کرنے کا ارادہ تو نہیں رکھتے۔

ہرگز نہیں ڈاکٹر میکسویل نے جلدی سے جواب دیا۔

میں خود کو پوری طرح چاق و چوبند محسوس کرتا ہوں۔ میں شام کو جلد واپس آجاؤں گا۔

اس کے بعد میکسویل وہاں سے رخصت ہوگیا۔ ڈاکٹر کے ہونٹوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ اس نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی میکسویل کو جلدی بلایا تھا۔

میکسویل حسب وعدہ جلدی آگیا۔ ڈاکٹر اس وقت اپنی رہائش گاہ میں ہی موجود تھا میکسویل نے بیرونی برآمدے میں رکھے ہوئے فون کے ذریعے ڈاکٹر کو مطلع کیا کہ وہ آگیا ہے۔ ڈاکٹر نے دروازہ کھول کر میکسویل کو اندر بلالیا۔ ڈاکٹر اپنا کام پہلے ہی مکمل کرچکا تھا۔

کیسی طبیعت ہے تمہاری۔ ڈاکٹر نے میکسویل سے پوچھا۔

میں بالکل ٹھیک ہوں ڈاکٹر میکسویل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

دراصل آج تمہیں کچھ زیادہ ہی رکنا پڑے گا میکسویل ڈاکٹر نے کہا۔ اسی لیے میں نے تمہیں ذرا جلدی بلایا ہے۔ میں دراصل ڈرائنگ روم میں صوفوں کرسیوں اور میزوں کی ترتیب میں کچھ تبدیلی کرنا چاہتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر نے اپنی جیب میں سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکالا۔ آج بہت مدت کے بعد اس نے سگریٹ کو ہاتھ لگایا تھا۔ محلول کے ایک بار نا کام ہوجانے کے بعد اس نے اسے دوبارہ استعمال ہی نہیں کیا تھا اور ویسے اس کی کوئی خاص ضرورت بھی پیش نہیں آئی تھی۔ گزشتہ عرصہ اس نے انتہائی مصروفیت کے عالم میں گزارا تھا اور اپنی خورد حیاتیاتی ایجادوں میں محو رہا تھا۔ اس کے بعد ہی وہ نئے سرے سے محلول کی تیاری پر توجہ دے سکا تھا

تم جس طرح مجھے بتاؤ گے ڈاکٹر میں اسی طرح چیزوں کو ترتیب دے دوں گا میکسویل نے کہا۔

میکسویل کو حیرت تھی کہ ڈاکٹر نے سگریٹ کب سے پینا شروع کردیا۔ اس نے آج تک ڈاکٹر کو سگریٹ پیتے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے دل میں سوچا کہ شاید ڈاکٹر گھر میں کبھی کبھار سگریٹ پی لیتا ہو۔ اس کی ہمت نہیں پڑی کہ ڈاکٹر سے اس بارے میں کوئی سوال کرتا۔

ڈاکٹر میکسویل کے بالکل قریب چلا گیا اور اس نے سگریٹ منہ میں دبا کر لائٹر کا زاویہ درست کرکے اس کا بٹن دبا دیا۔ شعلہ اور محلول ایک ساتھ خارج ہوئے اور ڈاکٹر نے محلول کی ہلکی ہلکی بو محسوس کی۔ یہ بو سابقہ بو سے بالکل مختلف تھی اور یہ اتنی ہلکی بو تھی کہ ڈاکٹر کے علاوہ اور کوئی آدمی تو اسے محسوس بھی نہیں کرسکتا تھا۔

ڈاکٹر نے آہستہ سے سگریٹ کا کش لیا۔ پھر وہ میکسویل کو بتانے لگا کہ کون سی چیز کس جگہ پر رکھنی ہے۔ اس نے اشیاء کی ترتیب میں زیادہ سے زیادہ تبدیلیاں چاہیں تاکہ میکسویل کو اپنا کام ختم کرنے میں زیادہ وقت لگے۔

جب تم ڈرائنگ روم کی چیزوں کی ترتیب بدل چکو گے تو پھر اس کے بعد میں تمہیں اور کام بتاؤں گا ڈاکٹر نے کہا۔

ٹھیک ہے ڈاکٹر میکسویل نے کہا۔ میں سارا کام سمجھ گیا ہوں۔ جب یہ کام ختم کرلوں گا تو پھر تم مجھے بتادینا کہ اور کیا کرنا ہے میکسویل نے آہستہ سے اپنی گردن کھجائی۔

ڈاکٹر ڈرائنگ روم سے چلا آیا۔ اندر بیٹھ کر ایک کتاب پڑھنے لگا۔ میکسویل اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ اس بچارے کے فرشتوں کو بھی یہ بات نہیں معلوم تھی کہ جس شخص کو وہ فرشتہ سیرت اور نیکی اور مہربانی کا پیکر سمجھ رہا تھا۔ وہ ایک شیطان صفت اور درندہ صفت آدمی ہے اور نہ جانے کتنے بے گناہ انسانوں کو اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھا چکا ہے اور اب وہ اس کو بھی ہلاکت کا نشانہ بنا چکا ہے۔

ڈاکٹر اپنے مطالعے میں مصروف رہا اور میکسویل اپنے کام میں۔ پورا ایک گھنٹہ گزرنے کے بعد ڈاکٹر نے پانی گرم کرکے کافی تیار کی۔ دو پیالیوں میں کافی لے کر وہ ڈرائنگ روم میں آگیا۔ میکسویل ابھی تک کام میں لگا ہوا تھا۔

تھوڑا سا ستالو میکسویل ڈاکٹر نے کہا۔ میں نے کافی تیار کرلی ہے۔ آؤ بیٹھ کر پی لو۔

بہت بہت شکریہ ڈاکٹر میکسویل نے کہا۔ مجھے واقعی اس کی شدید ضرورت تھی

میں نے تمہاری کافی میں شکر نہیں ڈالی ہے ڈاکٹر نے کہا۔ اس کے بجائے سکرین کی گولیاں ڈالی ہیں۔ تمہیں اب شکر سے پرہیز کرنا چاہیے

مجھے تو کبھی اس بات کا احساس نہیں ہوا ڈاکٹر کہ میں شکر کا مریض ہوں میکسویل نے کہا۔ اور اب میں سوچتا ہوں کہ یہ تو میرے لیے عمر بھر کا عذاب بن گیا ہے۔ جہاں تک میں نے سنا ہے ذیابیطس کا ابھی تک کوئی علاج دریافت نہیں ہوا

یہ صحیح ہے کہ ذیابیطس کا ابھی تک کوئی علاج ایسا موجود نہیں ہے جس سے یہ بیماری ہمیشہ کے لیے دور ہو جائے ڈاکٹر نے سنجیدگی سے کہا۔ لیکن اس کو کنٹرول کرنے کے نہایت موثر ذرائع موجود ہیں اور اس لحاظ سے اب یہ ایسی بیماری نہیں رہی کہ اس کے سلسلے میں زیادہ پریشان ہوا جائے اور تمہیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں جو موجود ہوں۔ یہ اتنا بڑا اور شاندار اسپتال جو موجود ہے۔ وہ تو شکر کرو کہ میرے کہنے پر تمہارے ٹیسٹ ہو گئے اور بر وقت اس بیماری کا پتا چل گیا ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ایک طویل مدت تک تمہیں اس کا علم بھی نہ ہو پاتا

اب مجھے کیا کیا احتیاطی تدابیر اختیار کرنی ہوں گی۔ میکسویل نے پوچھا

میں کل تمہارے لیے دواؤں اور غذاؤں کا ایک پورا چارٹ بناؤں گا ڈاکٹر نے کہا۔ کل میں تمہارا خون اور پیشاب دوبارہ ٹیسٹ کراؤں گا فی الحال تم شکر اور میٹھی چیزوں سے پرہیز کرو

میکسویل ڈاکٹر کی ان باتوں سے بے حد متاثر ہوا۔ سوچ رہا تھا کہ وہ کتنا خوش قسمت ہے کہ اسے ڈاکٹر آرتھر فلپ جیسے سیر چشم اور وسیع القلب انسان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ جو اپنے ملازمین کے ساتھ اتنا اچھا رویہ رکھتا ہے

میرا خیال ہے کہ مجھے آدھا گھنٹہ اور لگے گا۔ میکسویل نے اپنی کافی ختم کر کے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد تم مجھے دوسرا کام بتا دینا

ٹھیک ہے ڈاکٹر نے کہا۔ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا اور وہ پھر اندر چلا گیا

آدھے گھنٹے کے بعد ڈرائنگ روم میں واپس آ کر ڈاکٹر نے میکسویل کو جو مزید کام بتائے ان کو پورا کرنے کے لیے تقریباً" ایک گھنٹے کا مزید وقت درکار تھا۔ میکسویل خاموشی سے اپنے کام میں لگ گیا۔ ڈاکٹر بھی اپنی کتاب لے کر ڈرائنگ روم میں ہی آ بیٹھا اور خاموشی سے پڑھنے لگا

تقریباً" پینتالیس منٹ گزر گئے ڈاکٹر بیچ بیچ میں چور نظروں سے میکسویل کو دیکھتا جا رہا تھا

میکسویل کے ہاتھ میں ایک بڑی سی پینٹنگ تھی جسے وہ ایک ڈسٹر سے بہت آہستہ آہستہ اور احتیاط سے صاف کر رہا تھا۔ اچانک میکسویل کا ہاتھ کانپا اور پینٹنگ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی۔ میکسویل نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی لیکن وہ خود بھی نیچے گر گیا۔ وہ بڑی بے چینی کے عالم میں اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے سینے کو مسلنے لگا

ڈاکٹر تیزی سے میکسویل کی طرف لپکا اور اس نے اسے سیدھا سیدھا قالین پر لٹا دیا۔ اس کے بعد اس نے اس کی نبض ٹٹولی۔ میکسویل کی نبض بہت مدھم تھی اور اس کی سانس بھی رک رک کر آ رہی تھی۔ ڈاکٹر تیزی سے اسے مصنوعی تنفس دلانے کی کوشش کرنے لگا

ڈاکٹر کی ان ساری کوششوں کا مقصد یہ تھا کہ وہ یہ معلوم کر سکے کہ اس کے ہلاکت آفریں محلول کے استعمال کی صورت میں بروقت ابتدائی طبی امداد مل جانے پر کیا مریض کی جان بچائی جا سکتی ہے

میکسویل کی سانس اکھڑ رہی تھی۔ اس کے دل کی حرکت بند ہوتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر نے اپنی تمام ماہرانہ تدابیر کو آزما لیا۔ لیکن ایک منٹ کے اندر اندر اسے اندازہ ہو گیا کہ میکسویل مر چکا ہے

تب اس نے میکسویل کو اسی طرح چھوڑا اور جلدی سے فون کی طرف لپکا۔ چند منٹ کے اندر اندر ایمبولینس آ گئی اور میکسویل کو اسٹریچر پر لٹا کر اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں پہنچا دیا گیا۔ ڈاکٹر خود بھی اس کی ساتھ موجود تھا

کئی ڈاکٹروں نے جن میں ایک ماہر امراض قلب بھی شامل تھا۔ ڈاکٹر آرتھر فلپ کی قیادت میں میکسویل کا اچھی طرح معائنہ کیا اور متفقہ طور پر اس نتیجے پر پہنچے کہ موت اچانک دل ڈوب جانے سے واقع ہوئی ہے

مجھے اس المناک واقعے کا بہت افسوس ہے ڈاکٹر نے کہا۔ وہ جب میرے پاس آیا تھا تو بھلا چنگا تھا۔ تقریباً" پونے دو گھنٹے تک کام کرتا رہا اور اس دوران اس نے کسی قسم کی کوئی شکایت نہیں کی۔ اور پھر وہ اچانک گر پڑا۔ میں نے مصنوعی تنفس کے ذریعے اسے سنبھالا دینے کی بہت کوشش کی۔ مگر افسوس

سوائے افسوس کے اب کیا کیا جا سکتا ہے ماہر امراض قلب نے کہا۔ عموماً" اس قسم کے کیسوں میں کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا موت واقع ہو جاتی ہے

ڈاکٹر دل ہی دل میں بہت خوش تھا اس کا تیار کردہ خوفناک محلول بالکل کامیاب ثابت ہوا تھا۔ اس نے ذیابیطس کے مریض پر بھی بالکل اسی طرح اثر کیا تھا۔ ڈاکٹر کو یوں لگ رہا تھا گویا ایک کھوئی ہوئی دولت اس کے ہاتھ آ گئی ہو۔ اس کا گم شدہ ہتھیار اسے واپس مل گیا تھا۔ اب آگے کے منصوبوں کے لیے اسے راہ صاف نظر آ رہی تھی۔ صرف مناسب وقت اور حالات کا انتظار تھا

عالمی کشیدگی میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ دونوں سپر پاورز کے درمیان سرد جنگ کا دائرہ وسیع تر ہوتا جا رہا تھا اور دونوں مخالف بلاک اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ مضبوط بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ عالمی کشیدگی اور سرد جنگ کی اسی فضا میں اگلے ماہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا اجلاس واشنگٹن میں منعقد ہونے والا تھا۔ اجلاس کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں

انہی دنوں ڈاکٹر نے اخبار میں خبر پڑھی کہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس سے پہلے امریکہ اور مغربی یورپ کے بعض ممالک کے مندوبین کی ایک میٹنگ براکن کے مقام پر منعقد ہو گی۔ اس میٹنگ میں ان قرار دادوں کے مسودے تیار کیے جائیں گے اور ان تجاویز کا جائزہ لیا جائے گا جو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں منظوری کے لیے پیش کی جائیں گی

براکن ڈاکٹر کے ذہن نے سوچنا شروع کر دیا۔ وہ براکن کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ لیکن اسے اتنا ضرور معلوم تھا کہ براکن ایک چھوٹا سا پرفضا مقام ہے۔ جہاں کی مقامی آبادی بہت مختصر ہے۔ ڈاکٹر نے کتابوں کی مدد سے براکن کے بارے میں چند ہی گھنٹوں میں سب کچھ معلوم کر لیا

براکن پہاڑیوں کے درمیان گھرا ہوا ایک بہت خوبصورت اور پرفضا مقام ہے۔ اس نہایت مختصر سے قصبے کی آبادی کوئی پندرہ ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ یہ چونکہ کوئی ساحلی مقام نہیں تھا اس لیے یہاں باہر کے لوگ بہت ہی کم آتے تھے اور سیاحوں کے لیے براکن میں کوئی غیر معمولی کشش نہیں تھی۔ براکن کی خصوصیت یہ تھی کہ پہاڑیوں کے درمیان گھرا ہونے کے باعث یہاں کی فضا آلودگی سے پاک اور صاف ستھری تھی۔ براکن میں کئی اچھے ہوٹل اور ریسٹ ہاؤس بھی موجود تھے جہاں باہر سے آنے والے لوگ قیام کر سکتے تھے۔ گو کہ ان کی تعداد بہت کم ہوتی تھیں۔ اکثر سائنس والوں کی ٹیمیں مختلف سائنسی تحقیقات کے سلسلے میں براکن آتی رہتی تھیں۔ حیاتیاتی ماحول کی تحقیقات کے لیے براکن کو ایک عمدہ جگہ سمجھا جاتا تھا

ڈاکٹر نے جب سے یہ خبر پڑھی تھی کہ امریکہ اور بعض مغربی ممالک کے مندوبین کی ایک میٹنگ براکن میں

ہونے والی ہے تب سے اس کا دماغ ایک شیطانی منصوبے کے تانے بانے بننے میں معروف تھا۔ جس مناسب موقع کا اسے انتظار تھا۔ وہ شاید آنے والا تھا۔ وہ براگن کی مجوزہ کانفرنس کے بارے میں اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کر رہا تھا اور اس اثناء میں اس نے براگن کے موسم آب و ہوا وہاں کے لوگوں ان کی معروفیات اور روزگار اور وہاں کی آبادی کے مختلف درجوں کے بارے میں تمام تر تفصیلی معلومات حاصل کر لی تھیں

ڈاکٹر ایک ایسا تجربہ کرنے کا پروگرام بنا رہا تھا جو اس کی ساری زندگی کے اب تک کے تجربات میں سب سے زیادہ خوف ناک ہلاکت انگیز اور انتہائی دوررس نتائج کا حامل ہوتا۔ اس کے پاس وہ ساری چیزیں موجود تھیں جو اس تجربے کے لیے درکار تھیں۔ اور جو موقع اسے مل رہا تھا۔ وہ بھی بہترین تھا۔ شاید اس سے اچھا موقع اسے دوبارہ نہیں مل سکتا تھا۔ شدید عالمی کشیدگی اور سرد جنگ کا زمانہ تھا۔ سپر پاورز کے درمیان تلخی بڑھ رہی تھی۔ دونوں سپر پاورز ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے مواقع کی تلاش میں رہتی تھیں اور ان سے پورا پورا فائدہ اٹھاتی تھیں اور ایسے ہی ایک موقع سے ڈاکٹر آرتھر فلپ بھی فائدہ اٹھانا چاہتا تھا

ڈاکٹر نے کئی دن تک متواتر اپنے منصوبے کے کئی پہلوؤں کا جائزہ لیا۔ اس نے اس کے مضمرات اس کے اثرات اس کے قومی اور بین الاقوامی نتائج پر ہر ہر پہلو سے غور کیا اور بالآخر اس نے یہی فیصلہ کیا کہ اس وقت گرم لوہے پر ضرب لگانے کی ضرورت ہے

اچانک ڈاکٹر کے دل میں اس بات کی شدید خواہش پیدا ہوئی کہ اس کے اس محیر العقول تجربے کے موقعے پر کوئی اس کے ساتھ موجود ہو۔ کوئی ایسا شخص جو اس کی مسرت اور کامیابی میں اس کا حصہ دار بن سکے۔ جو اس کی طاقت اس کی غیر معمولی ذہانت اور اس کی عجیب و غریب قوتوں کا اعتراف کر سکے اور انہیں خراج تحسین پیش کر سکے۔ جو اس تماشے کو بچشم خود دیکھنے والوں میں شریک ہو جو ڈاکٹر برپا کرنے والا تھا۔ لیکن اس سلسلے میں راز داری شرط اولین تھی

ایسا شخص کون ہو سکتا تھا۔

ظاہر ہے کہ ایسا شخص تنظیم کی ہائی کمان کے اراکین میں سے کوئی ہو سکتا تھا۔ ہائی کمان میں کئی لوگ موجود تھے اور ڈاکٹر کو ان میں سے کسی ایک کا ہی انتخاب کرنا تھا

وہ ہائی کمان سے تعلق رکھنے والے ہر ہر فرد کے بارے میں غور کرنے لگا۔ وہ ان میں سے سبھی پر اعتماد کرتا تھا۔ ان میں سے کسی ایک کی بھی وفاداری مشکوک نہیں تھی۔ سب کے سب تنظیم کے نام پر جان دینے والے لوگ تھے۔ اور سب کو ڈاکٹر کی قربت حاصل تھی۔ اس کے لیے ان میں سے کسی ایک کو الگ کرنا مشکل تھا۔ تاہم کسی ایک کا انتخاب تو بہر حال اسے کرنا ہی تھا اور کافی سوچ بچار کے بعد اس نے اسمتھ کا انتخاب کیا

اسمتھ ایک ایسا شخص تھا جو ایک طویل عرصے تک تنظیم اور اس کے باس یعنی ڈاکٹر کے درمیان رابطے کا کام انجام دیتا رہا تھا۔ اس نے یہ کام بڑی دیانت داری اور ایمانداری سے انجام دیا تھا۔ کسی کو اس سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اسمتھ ہی وہ شخص تھا جو ابتدا ہی سے ڈاکٹر کی اصل شخصیت سے واقف تھا

لیکن اس نے کسی کو بھی اپنے قریب ترین ساتھیوں کو بھی کبھی ڈاکٹر کی اصلیت کے بارے میں نہیں بتایا۔ یہ تو محض ایک اتفاق تھا کہ ایک دن جیمس وغیرہ اچانک ڈاکٹر کی شخصیت سے واقف ہو گئے۔ اس میں اسمتھ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ پھر اسمتھ ایک طویل عرصے تک ڈاکٹر کے خاص الخاص آدمی کی حیثیت سے تنظیم میں کام کرتا رہا تھا اور آج بھی اسے خصوصی حیثیت حاصل تھی

ڈاکٹر نے فیصلہ کیا کہ وہ اسمتھ کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔ لیکن وہ ابھی اسمتھ سے اس بارے میں کوئی بات نہیں

کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ براگن کانفرنس کی کوئی حتمی تاریخ ابھی تک طے نہیں ہوئی تھی۔ لیکن کانفرنس کو بہر حال اگلے ماہ کی ابتدائی تاریخوں میں ہی منعقد ہونا تھا۔ کیونکہ جنرل اسمبلی کے اجلاس سے پہلے پہلے تمام قرار دادوں کے مسودوں کو آخری شکل دے دی جانی تھی۔ ابھی اگلا مہینہ شروع ہونے میں پندرہ دن باقی تھے

ڈاکٹر ہر روز پابندی سے اخبارات کا مطالعہ کر رہا تھا۔ خاص طور سے براگن کانفرنس کے حوالے سے چھپنے والی کوئی خبر اس کی نظر سے چھپی نہیں رہتی تھی

بالآخر اس نے ایک دن اخبار میں پڑھ ہی لیا کہ براگن کانفرنس کی تاریخ مقرر ہو گئی ہے۔ یہ کانفرنس اگلے ماہ کی پانچ تاریخ کو شروع ہو کر نو تاریخ تک جاری رہنی تھی۔ اور ان پانچ دنوں کے دوران تمام مندوبین کے درمیان قرار دادوں کے مسودوں پر اتفاق رائے قرار پا جانا تھا

آج پچیس تاریخ تھی گویا براگن کانفرنس شروع ہونے میں ابھی نو دن باقی تھے۔ ڈاکٹر نے سوچا کہ چار دن بعد وہ فون کر کے اسمتھ کو بلائے گا اور اس سے بات کرے گا۔ لیکن چار دن بعد خود اسمتھ کا فون آ گیا اور اس نے بتایا کہ وہ ڈاکٹر سے ملاقات کا خواہشمند ہے

ٹھیک ہے ڈاکٹر نے کہا۔ تم میرے پرانے گھر پر آ جاؤ اور ڈاکٹر نے اسے رات کا وقت دے دیا

میں آ جاؤں گا اسمتھ نے کہا اور فون بند کر دیا

مقررہ وقت پر ڈاکٹر اپنے پرانے مکان پر پہنچ گیا۔ اسمتھ بھی فوراً ہی آ گیا۔ ڈاکٹر نے سوچا وہ پہلے اسمتھ کی بات سن لے۔ اس کے بعد وہ اس سے براگن کے پروگرام کے بارے میں بات کرے گا

تم مجھ سے کس لیے ملنا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔ کیا کوئی خاص بات ہے۔

ہاں باس اسمتھ نے جواب دیا۔ ایک بڑی خاص اور دلچسپ بات ہے۔ ہماری ایک پرانی دوست نے پھر ہمیں دعوت ملاقات دی ہے

کون پامیلا۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔ کیا اس کے سر سے ابھی تک جونی کے عشق کا بھوت اترا نہیں۔

میں پامیلا کی بات نہیں کر رہا ہوں باس اسمتھ نے کہا۔ پامیلا تو بڑی کامیابی کے ساتھ جیمس کی زیر نگرانی کام کر رہی ہے اور کئی نئی لڑکیوں کو تربیت بھی دے رہی ہے۔ اس کا کام جیسا کہ تمہیں معلوم ہے کالجوں اور تعلیمی اداروں کے طلباء و طالبات میں منشیات کے شوق کو فروغ دینا اور انہیں منشیات بہم پہنچانا ہے۔ بہر حال میں پامیلا کا ذکر نہیں کر رہا تھا۔ میں گارشیا کے بارے میں کچھ کہہ رہا تھا۔

گارشیا۔ ڈاکٹر نے بھنوئیں سکیڑ کر کہا۔ اوہ۔ میں تو اس کو تقریباً" بھول ہی چکا تھا۔ کیا اس نے پھر سے کام کرنا شروع کر دیا ہے۔

یہ تو کہنا مشکل ہے باس کہ اس نے دوبارہ کام کرنا شروع کر دیا ہے یا نہیں۔ تاہم ایف بی آئی کا کوئی ایجنٹ ایک سال تک تو چھٹی پر نہیں رہ سکتا

گارشیا کو کہاں دیکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر نے پوچھا

ہماری اطلاعات کے مطابق پرسوں وہ براگن میں موجود تھی جو ایک چھوٹا سا پہاڑی قصبہ ہے اسمتھ نے کہا۔ تم نے شاید اس کا نام بھی نہ سنا ہو

میں نے اس کا نام سنا اور پڑھا ہے ڈاکٹر نے کہا۔ وہ اس اچانک حسن اتفاق پر دل ہی دل میں خوش تھا۔ حالات خود بخود اس کی موافقت کی راہ اختیار کرتے جا رہے تھے اور اب اسے شاید اسمتھ کو کچھ سمجھانے کی ضرورت بھی نہ پڑے۔ براگن جانے کا جواز خود بخود پیدا ہو رہا تھا

کیا تمہیں یہ بات نہیں معلوم کہ براگن میں آئندہ ماہ کی پانچ تاریخ سے اقوام متحدہ میں مغربی ممالک کے بعض مندوبین کی ایک اہم کانفرنس شروع ہونے والی ہے۔ ڈاکٹر نے اسمتھ کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ براگن کی اس مجوزہ کانفرنس کے بارے میں پچھلے تین ہفتوں سے

اخبارات میں خبریں آ رہی ہیں

مجھے افسوس ہے باس اسمتھ نے ایک دم گڑبڑا کر کہا۔ دراصل ہم میں سے کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ اس قسم کی کانفرنسیں تو.... میرا مطلب ہے.... آئے دن ہوتی ہی رہتی ہیں

لیکن جب تمہیں اس بات کا علم ہوا کہ گارشیا کو براکن میں دیکھا گیا ہے۔ تو اس وقت بھی تم میں سے کسی کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ براکن کو اس وقت ایک خصوصی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔

اسمتھ سخت محجوب نظر آ رہا تھا اور ساتھ ہی اسے اس بات کا شدید احساس ہو رہا تھا کہ بصیرت اور دور اندیشی کے اعتبار سے اس کا باس دوسرے لوگوں سے کس قدر بلند ہے۔ ان میں سے کسی نے اس نکتے کی طرف توجہ نہیں دی تھی سچ تو یہ ہے کہ ان میں سے کسی نے اخبارات میں براکن کانفرنس کے بارے میں کسی خبر کو پڑھا ہی نہیں تھا۔ لیکن باس کی نظروں سے کوئی چیز چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ ساری ضروری باتوں کا علم رکھتا تھا

سچ تو یہ ہے باس کہ ہم میں سے کسی نے بھی براکن کانفرنس کے بارے میں کچھ نہیں پڑھا اسمتھ نے منہ لٹکا کر آہستہ سے کہا

براکن میں کئی ممالک کے اعلیٰ ترین مندوبین جمع ہو رہے ہیں ڈاکٹر نے کہا۔ ظاہر ہے کہ اس موقع پر اس چھوٹے سے قصبے میں سیکیورٹی کے کچھ نہ کچھ خصوصی انتظامات بھی کیے جائیں گے۔ براکن ایک چھوٹی سی معمولی سی غیر اہم سی جگہ ہے۔ وہ نہ تو منشیات کا بڑا مرکز ہے اور نہ اسمگلروں کا گڑھ نہ ہی وہ کوئی مشہور تفریحی مقام ہے۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گارشیا وہاں کیا کر رہی تھی۔

اسمتھ اس غیر متوقع سوال پر الجھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے

گارشیا کی وہاں موجودگی کی اطلاع تم لوگوں کو کس نے دی۔ ڈاکٹر نے قدرے توقف کے بعد پوچھا

تنظیم کے ایک آدمی رالف نے اسمتھ نے جواب دیا۔ وہ اپنی ماں کے انتقال پر براکن گیا ہوا تھا۔ اس کی ماں براکن ہی میں رہتی تھی۔ رالف نے وہاں گارشیا کو دیکھا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ گارشیا وہاں کے پیراماؤنٹ ہوٹل میں مقیم ہے۔ جو براکن کا سب سے بڑا ہوٹل سمجھا جاتا ہے

تم اس بات کا مطلب سمجھے۔ ڈاکٹر نے تیز نظروں سے اسمتھ کو گھورتے ہوئے پوچھا

لیکن حقیقت یہ تھی کہ اسمتھ کچھ نہ سمجھ سکا تھا۔ وہ خاموشی سے ڈاکٹر کو دیکھتا رہا اور اس نے نفی میں گردن ہلا دی

اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گارشیا اب ایف بی آئی کے انسداد منشیات کے شعبے سے منسلک نہ رہی ہو ڈاکٹر نے کہا۔ یہ عین ممکن ہے کہ گزشتہ ایک سال کے دوران اس نے اپنی لائن تبدیل کر لی ہو۔ یا اس کی لائن تبدیل کرا دی گئی ہو اور اب اس کا تعلق سیاسی حفاظتی شعبے سے ہو اور وہ براکن میں اس لیے مقیم ہو کہ وہاں ہونے والی کانفرنس کے موقع پر حفاظتی اقدامات کی دیکھ بھال کر سکے یا خود بھی ان میں حصہ لے سکے۔ یہ عین ممکن ہے کہ گزشتہ ایک سال کے دوران اسے نئی لائن کی پوری تربیت دے دی گئی ہو

افوہ۔ کمال ہے باس اسمتھ نے فرط عقیدت سے سرشار ہو کر کہا۔ باس صرف اور صرف تمہارا دماغ ہی اتنی دور کی اور اتنی باریک باتیں سوچ سکتا ہے۔ ہم میں سے تو کسی کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی۔ اب میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ تمہاری بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے

اس کا تعلق کسی بھی شعبے سے ہو ڈاکٹر نے سنجیدگی سے کہا۔ موت اس کا مقدر ہے اور اس بار وہ ہمارے ہاتھوں سے بچ کر نہیں جا سکتی۔ کیا تم میرے ساتھ براکن چلنے کے لیے تیار ہو۔

اسمتھ اس اچانک سوال پر چونک پڑا اور ساتھ ہی

مسرت کی ایک لہر اس کے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ بھلا اس سے زیادہ اعزاز کی بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ باس اسے اپنے ساتھ کسی مہم پر لے جائے

کیوں نہیں باس۔ اسمتھ نے بے ساختہ کہا۔ ہم کب چلیں گے۔

اتنا بے تاب ہونے کی ضرورت نہیں ہے ڈاکٹر نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ہم کانفرنس شروع ہونے سے صرف ایک دن پہلے وہاں پہنچیں گے

لیکن باس کانفرنس میں ابھی کئی دن باقی ہیں اسمتھ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ فرض کرو کہ گارشیا کا تعلق حفاظتی عملے سے نہ ہو اور وہ کسی اور وجہ سے براکن میں مقیم ہو اور ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے یعنی کانفرنس شروع ہونے سے پہلے ہی وہاں سے روانہ ہو چکی ہو تو اس صورت میں وہ ایک بار پھر ہمارے ہاتھوں سے نکل جائے گی

حقیقت تو یہ تھی کہ ڈاکٹر کو فی الوقت گارشیا سے کوئی بھی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا تو منصوبہ ہی کچھ اور تھا۔ یہ محض ایک اتفاق تھا کہ عین اسی وقت گارشیا بھی براکن میں موجود تھی۔ لیکن اس کے وہاں رہنے یا نہ رہنے سے ڈاکٹر اپنے اصل منصوبے میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم اسمتھ کو مطمئن کرنے کی غرض سے اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گیا اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ ایسے وقت میں براکن پہنچے جب کانفرنس کے سارے مندوبین وہاں موجود ہوں۔ اس کی اصل غرض تو انہی مندوبین سے تھی۔ گارشیا سے نہیں

میں اس کا بندوبست کر لوں گا ڈاکٹر نے کچھ سوچ کر کہا۔ میں اپنے خصوصی ذرائع کی مدد سے یہ بات معلوم کر لوں گا کہ گارشیا براکن میں موجود ہے یا نہیں۔ ہم اس کی وہاں موجودگی کی صورت میں جائیں گے

لیکن باس ہمیں کانفرنس کے انعقاد کا کیوں انتظار کرنا ہے۔ اسمتھ نے الجھتے ہوئے پوچھا۔ ہمارا اس کانفرنس سے کیا تعلق۔

اس بات کی وضاحت میں اس وقت نہیں کرنا چاہتا ڈاکٹر نے زچ ہو کر کہا۔ اسمتھ کے اس نہایت معقول سوال کا کوئی فوری جواب اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ اس نے جب اسمتھ سے گفتگو کرنے کے بارے میں سوچا تھا تو یہ بات طے کر لی تھی کہ اپنے اصل منصوبے کا انکشاف وہ اسمتھ پر صرف اسی وقت کرے گا جب براکن پہنچنے کے بعد وہ اس منصوبے پر عمل کا آغاز کر دے گا۔ اس سے پہلے نہیں لیکن اتفاق ایسا ہو گیا تھا کہ براکن جانے کی ایک اور وجہ نکل آئی تھی اور یہ وجہ اسمتھ کے حوالے سے نکلی تھی۔ چنانچہ اب بظاہر صورت یوں بن گئی تھی کہ ڈاکٹر گویا صرف گارشیا کے معاملے میں براکن جانا چاہتا تھا

ٹھیک ہے باس اسمتھ نے کہا۔ تم جو کچھ بھی سوچتے ہو درست ہی سوچتے ہو۔ تمہارے ذہن میں کوئی نہ کوئی وجہ موجود ہوگی

ہاں اسمتھ ڈاکٹر نے کہا۔ میرے ذہن میں ایک وجہ موجود ہے۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ فی الحال اس وجہ کا انکشاف کرنا مناسب نہیں ہوگا

اچھی بات ہے باس اسمتھ نے کہا۔ پھر میں کب چلنے کے لیے تیار رہوں اور دوسرے ساتھیوں کو اس بارے میں کیا بتاؤں۔

ہم اگلے ماہ کی چار تاریخ کو یہاں سے روانہ ہو جائیں گے ڈاکٹر نے کہا۔ ہمیں چار تاریخ کی شام تک براکن پہنچ جانا چاہیے۔ باقی ساتھیوں سے تم یہ کہہ سکتے ہو کہ ہم گارشیا کو ختم کرنے کے لیے براکن جا رہے ہیں۔ اس میں چھپانے کی کیا بات ہے

چھپانے کی تو کوئی بات نہیں ہے باس اسمتھ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ لیکن ان لوگوں کے ذہنوں میں بھی یہی سوال ابھرے گا کہ آخر ہم اتنی تاخیر سے کیوں جا رہے ہیں۔ فوری طور پر براکن پہنچ کر اپنا کام کیوں نہیں کر ڈالتے

تم ان لوگوں سے کہہ سکتے ہو کہ باس نے کسی مصلحت کے تحت یہ فیصلہ کیا ہے ڈاکٹر نے مختصر سا جواب دیا۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا۔ کیونکہ جو کچھ وہ براہکن میں کرنے والا تھا۔ اس کی خبر بعد میں ان لوگوں تک تو پہنچنی ہی تھی

اسمتھ رخصت ہو گیا اور ڈاکٹر بھی اپنی اسپتال کی رہائش گاہ میں واپس آ گیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ کانفرنس کے آغاز تک گارشیا براہکن میں موجود رہے گی یا نہیں اور نہ ہی اسے اس بات سے کوئی دلچسپی تھی۔ اس کے پورے منصوبے میں گارشیا کہیں موجود نہیں تھی۔ وہ تو اچانک ہی بیچ میں کود پڑی تھی۔ ڈاکٹر کے پاس اپنی تنظیم کے لوگوں کے علاوہ کوئی ایسا ذریعہ موجود نہیں تھا جس کی مدد سے وہ براہکن میں گارشیا کی موجودگی کے بارے میں جان سکے اور وہ جاننا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ اگر براہکن پہنچنے کے بعد اسے اپنی دوربیں اور دروں بیں نظروں کی مدد سے یہ معلوم ہو گیا کہ گارشیا یہاں موجود نہیں ہے۔ تو وہ اسمتھ سے کہہ دے گا کہ اس کے خصوصی ذرائع نے اسے اطلاع دی ہے وہ اس کی آمد سے صرف آدھا گھنٹہ پہلے گارشیا براہکن سے چلی گئی ہے اور پھر وہ اپنے اصل منصوبے کے بارے میں اسمتھ کو اس وقت بتائے گا جب وہ اس پر باقاعدہ عمل شروع کر دے گا

...y...y٠

...y...چار تاریخ کی شام تک تقریباً" سارے ہی مندوبین براہکن پہنچ چکے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے مددگار ذاتی عملے کے لوگ اور سیکریٹری وغیرہ بھی تھے جن کی کل تعداد ملا کر پچاس ساٹھ کے قریب ہو جاتی تھی۔ مندوبین کی رہائش کے لیے پیراماؤنٹ ہوٹل میں بندوبست کیا گیا تھا اور کانفرنس ایک سرکاری عمارت میں ہونے والی تھی۔ جس کا نام پیٹرک ہال تھا۔ یہ ہال قصبے کے ایک شخص کے نام سے موسوم تھا۔ جسے مرے ہوئے نصف صدی سے زیادہ کی مدت گزر چکی تھی۔ لیکن جس نے اپنی ساری عمر قصبے کے لوگوں کے لیے رفاہی کام کرتے ہوئے بسر کی تھی

اسی شام ڈاکٹر آرتھر اور اسمتھ بھی براہکن پہنچ گئے۔ وہ دونوں سیاحوں کے بھیس میں وہاں پہنچے تھے۔ ان کے حلیے اس قدر بدلے ہوئے تھے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو بھی صرف اس طرح پہچان سکتے تھے کیونکہ وہ ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ اسمتھ تو سیاہ فام تھا ہی ڈاکٹر اپنے سارے جسم پر بھی اس طرح سیاہی چڑھا چکا تھا کہ وہ کسی مخلوط جوڑے کی اولاد معلوم ہوتا تھا۔ نہ بالکل سیاہ اور نہ بالکل سفید بلکہ سانولا اور اس لحاظ سے وہ دونوں سیاہ فاموں کے زمرے میں آتے تھے

ڈاکٹر اور اسمتھ دونوں ساتھ ساتھ براہکن پہنچے تھے۔ لاس اینجلز کے اڈے سے وہ دونوں ایک ساتھ ہی روانہ ہوئے تھے۔ لیکن انہوں نے احتیاطاً" پرواز کے دوران ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ براہکن پہنچتے ہی ڈاکٹر نے پہلے اسمتھ سے بات کی تھی۔ کیونکہ اسمتھ کے لیے یقین کے ساتھ ڈاکٹر کو پہچاننا مشکل تھا۔ جب دونوں کا ایک دوسرے سے باقاعدہ رابطہ قائم ہو گیا تو اسمتھ نے ڈاکٹر کی توقع کے عین مطابق سب سے پہلا سوال گارشیا کی موجودگی کے بارے میں پوچھا

میری روانگی کے وقت تک کی اطلاعات کے مطابق وہ براہکن میں موجود تھی ڈاکٹر نے اسمتھ کو بتایا۔ یہ بالکل جھوٹ تھا۔ کیونکہ فی الحقیقت ڈاکٹر گارشیا کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا

اگر وہ اس وقت تک یہاں موجود تھی تو اسے اب بھی یہیں ہونا چاہیے اسمتھ نے کہا

اس کی اطلاع بھی کچھ دیر بعد مل جائے گی ڈاکٹر نے کہا۔ ہم سب سے پہلے پیراماؤنٹ ہوٹل چلیں گے۔ وہاں کمرہ حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس ہوٹل میں ہمیں جگہ ملنی مشکل ہے۔ شاید ہمیں کوئی دوسرا ہوٹل دیکھنا پڑے۔

وہ دونوں پیراماؤنٹ ہوٹل پہنچے اور ڈاکٹر کو اپنی دوربیں اور دروں بیں نگاہوں سے کام لینے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ نیچے ہوٹل کی لابی میں ہی گارشیا اسے نظر آ گئی۔ وہ نیلے رنگ کے چست جینز اور سفید بلاؤز میں ملبوس تھی۔ لابی میں کھڑے ہوئے ایک بھاری بھرکم آدمی سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھی۔ اسمتھ اور ڈاکٹر دونوں نے گارشیا کو دیکھ لیا۔ ڈاکٹر نے اطمینان کی سانس لی۔ اب اسے اسمتھ سے مزید جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں تھی

ڈاکٹر نے فوراً ہی گارشیا اور اس کے ساتھی کی تلاشی لے ڈالی۔ دونوں کی جیبوں میں بھرے ہوئے سروس ریوالور موجود تھے۔ ان کے پاس موجود شناختی کارڈوں کے مطابق ان دونوں کا تعلق ایف بی آئی کے سیاسی شعبے سے تھا

تو میں نے اندھیرے میں جو تیر چلایا تھا وہ نشانے پر ٹھیک ہی بیٹھا تھا ڈاکٹر نے سوچا۔ گارشیا نے اپنی لائن تبدیل کر لی ہے اور اب وہ ایف بی آئی کے سیاسی شعبے میں کام کر رہی ہے۔ خیر ہمارے لیے اس سے کیا فرق پڑتا ہے

کاؤنٹر پر پہنچنے کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ پیراماؤنٹ ہوٹل میں کوئی کمرہ خالی نہیں ہے۔ کانفرنس کے انعقاد کی وجہ سے سارے کمرے مندوبین اور ان کے لوگوں نے لے لیے ہیں

یہیں اور کسی ہوٹل میں کمرہ مل سکتا ہے۔ ڈاکٹر نے کاؤنٹر کلرک سے پوچھا

تمہیں ہوٹل مرتھہ میں بہ آسانی کمرہ مل جائے گا کاؤنٹر کلرک نے کہا۔ شاید تم لوگ صحافی ہو۔ کانفرنس کی خبریں حاصل کرنے کے لیے آئے ہو۔ کاؤنٹر کلرک کے دل میں یہ خیال ان دونوں کی گردنوں میں لٹکے ہوئے کیمروں کو دیکھ کر آیا تھا

ہاں ہم لوگ فری لانسنگ صحافی ہیں ڈاکٹر نے جلدی سے جواب دیا۔ کانفرنس کے سلسلے میں ہی براہکن آئے ہیں

پھر تمہیں آسانی رہے گی کاؤنٹر کلرک نے کہا۔ پیٹرک ہال جہاں کانفرنس ہو رہی ہے مرتھہ ہوٹل کے بالکل ہی قریب ہے

شکریہ ڈاکٹر نے کہا اور وہ دونوں مرتھہ ہوٹل کا پتا پوچھ کر وہاں سے روانہ ہو گئے

وہ یہاں موجود ہے باس ہوٹل سے باہر نکلتے ہی اسمتھ نے سرگوشی میں ڈاکٹر سے کہا

ہاں اسمتھ۔ ڈاکٹر نے کہا۔ وہ یہاں موجود ہے اور اس کی موت بھی یہاں موجود ہے۔ اس کی موت اس وقت میرے قبضے میں ہے اور اس کی ہی نہیں ہزاروں انسانوں کی موت اس وقت میرے قبضے میں ہے۔ میں جب چاہوں اس موت کو آزاد کر کے ان لوگوں کی زندگیوں کو ختم کر سکتا ہوں

اسمتھ ڈاکٹر کی باتوں کا صحیح مفہوم نہ سمجھ سکا۔ بلکہ فی الحقیقت وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ ڈاکٹر نہ جانے کون سی موت اور زندگی کی باتیں کر رہا تھا۔ تاہم اسمتھ نے بے سوچے سمجھے گردن ہلا دی۔ ڈاکٹر آہستہ سے مسکرایا

انہیں ہوٹل مرتھہ میں بہ آسانی کمرہ مل گیا۔ انہوں نے ہوٹل کے رجسٹر میں اپنا اندراج فری لانسنگ صحافیوں اور فوٹوگرافروں کی حیثیت سے کرایا۔ اپنے کمرے میں آ کر انہوں نے غسل کیا اور کپڑے تبدیل کیے۔ ان دونوں کے پاس سامان کے نام پر ایک ایک ہینڈ بیگ کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے پہلے ہی اسمتھ کو ہدایت دے دی تھی کہ ایک ہینڈ بیگ کے علاوہ اور کوئی سامان اپنے ساتھ نہ لائے۔ ڈاکٹر کے پاس جو ایک بڑا ہینڈ بیگ موجود تھا اس میں اس کی ضرورت کی تمام اشیا موجود تھیں۔ وہ کوئی بھی چیز لانا بھولا نہیں تھا

تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں نیچے آئے۔ اور ڈاکٹر نے ہوٹل کی وساطت سے ایک کرائے کی کار حاصل کر لی۔

اس کے بعد ان دونوں نے کار میں بیٹھ کر پورے برائکن کا ایک چکر لگایا تھا۔ پیٹرک ہال جس میں کل علی الصباح کانفرنس کا آغاز ہونے والا تھا۔ ہوٹل کے ساتھ ہی تھا۔ اس وقت وہاں سکیورٹی کے لوگ موجود تھے۔ ہال کے اندر جانے کی کسی کو اجازت نہیں تھی

قصبے کے واحد بازار میں کافی رونق تھی۔ صحافیوں اور اخباری نمائندوں کی اچھی خاصی تعداد برائکن آئی ہوئی تھی اور وہ لوگ کیمرے گردنوں میں ڈالے ادھر سے ادھر گھوم رہے تھے۔ ڈاکٹر اور اسمتھ بھی کافی دیر تک گھومتے رہے۔ انہوں نے کھانا بھی باہر ہی ایک ہوٹل میں کھایا تھا۔ اس کے بعد واپس اپنے ہوٹل میں آ گئے

ہوٹل میں واپس آنے کے بعد ڈاکٹر نے اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے ایک سرنج اور دوا کی شیشی نکالی۔ اسمتھ اس کی اس حرکت کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر سرنج میں دوا بھرنے لگا

ہم دونوں کو اس دوا کا ایک ایک انجکشن لگانا ہے ڈاکٹر نے کہا۔ یہ ہم لوگوں کو بہت سی مصیبتوں سے محفوظ رکھے گی

کیا یہاں کے موسمی حالات

یہی سمجھ لو ڈاکٹر نے اسمتھ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ یہاں کے موسم میں فی الحال تو کوئی خرابی نہیں ہے۔ لیکن عنقریب موسم بہت خراب ہونے والا ہے۔ ہمیں احتیاطی تدابیر اختیار کر لینی چاہیں

اسمتھ سخت الجھن کا شکار تھا۔ لیکن وہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ باس کی ناراضی کا خطرہ موجود تھا اور پھر باس وہاں جو کچھ کر رہا تھا وہ سوچ سمجھ کر کر رہا ہوگا۔ اس نے خاموشی سے اپنا بازو کھول کر آگے کر دیا۔ ڈاکٹر نے اس کے انجکشن لگا دیا۔ دوسرا انجکشن ڈاکٹر نے اپنے لگایا

دوسرے دن علی الصباح کانفرنس کے آغاز سے کافی پہلے ڈاکٹر اور اسمتھ پیٹرک ہال میں پہنچ گئے۔ ان دونوں کے پاس وزارت اطلاعات کے جاری کردہ باقاعدہ شناخت نامے موجود تھے۔ جن میں تصدیق کی گئی تھی کہ وہ پیشہ ور صحافی اور فوٹو گرافر ہیں۔ ڈاکٹر کی ہدایت پر یہ جعلی شناخت نامے پہلے ہی تیار کروائے گئے تھے۔ ان شناخت ناموں کی مدد سے وہ دونوں بآسانی پیٹرک ہال میں داخل ہو گئے۔ جہاں سیکیورٹی کے سخت انتظامات تھے۔ اس وقت ان دونوں کی گردنوں میں کیمرے لٹکے ہوئے تھے۔ سیکیورٹی کے لوگوں میں انہیں گاریشیا بھی نظر آئی۔ ڈاکٹر نے اس کی طرف قطعی کوئی توجہ نہیں دی۔ اسمتھ نے اس بات کو باس کی مصلحت اندیشی کا ہی ایک حصہ سمجھا

آخر مندوبین کی آمد کا وقت ہو گیا اور صحافیوں اور فوٹو گرافروں سے درخواست کی گئی کہ وہ از راہ کرم راستہ چھوڑ دیں اور ایک کنارے کھڑے ہو کر تصویریں اتاریں۔ نیز یہ کہ اس وقت سوالات پوچھنے سے گریز کریں۔ بعد میں مندوبین خود ہی اخباری نمائندوں سے ملاقات کریں گے

سارے صحافی اور فوٹو گرافر اپنے اپنے کیمرے سنبھال کر راستے کے دونوں طرف دو قطاروں میں کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر اور اسمتھ نے بھی اپنے اپنے کیمرے سنبھال لئے

اتنے میں مندوبین کی آمد شروع ہو گئی۔ راستے کے دونوں طرف کھڑے ہوئے فوٹو گرافروں کے کیمروں سے روشنی کے جھماکے ہونے لگے

ڈاکٹر نے اپنے خاص طور پر تیار کردہ کیمرے کا بٹن دبایا۔ روشنی کا ایک جھماکا ہوا اور اس کے ساتھ ہی انسانی گوشت خور جراثیم کی ایک بڑی تعداد کیمرے کے خفیہ سوراخ میں سے خارج ہو کر پہلے دوسرے اور تیسرے مندوب کے کپڑوں اور جسم پر گر پڑی

پورے برائکن میں کسی کو نہیں معلوم تھا کہ ایک جنونی اور قاتل انسان نے برائکن والوں کے لیے موت کو آزاد کر دیا ہے۔ ڈاکٹر نے کیمرے کا بٹن ایک بار پھر دبایا۔ انسانی گوشت خور جراثیم کی نظر نہ آنے والی دھار نے کچھ اور

مندوبین کو اپنی زد میں لے لیا

سارے مندوبین کانفرنس ہال کے اندر جا چکے تھے اور فی الحال صحافیوں اور فوٹو گرافروں کا کام ختم ہو چکا تھا۔ کانفرنس میں وقفہ لنچ کے وقت ہونا تھا۔ اس وقت تک یہاں رکنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ صحافی اور فوٹو گرافر وہاں سے روانہ ہونے لگے۔ انہیں اب دوبارہ یہاں لنچ کے وقفے میں آنا تھا اور حسب وعدہ مندوبین اس وقت ان سے کچھ باتیں بھی کرتے

آؤ اب ہم یہاں سے چلتے ہیں ڈاکٹر نے اسمتھ سے کہا اور دونوں وہاں سے روانہ ہو گئے۔ اسمتھ نے دیکھا کہ گاریشیا سیکیورٹی کے دوسرے لوگوں کے ساتھ وہاں موجود تھی۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ باس گاریشیا کی ہلاکت کے لیے کون سا طریقہ اختیار کرے گا۔ لیکن وہ اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پا رہا تھا کہ باس سے براہ راست یہ سوال پوچھ سکے

گاریشیا وہاں موجود ہے باس کانفرنس ہال سے نکلنے کے بعد اسمتھ نے بڑے محتاط انداز میں ڈاکٹر سے کہا

ہے نہیں تھی کہو تھی ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔ اسمتھ کو باس کی یہ ہنسی بڑی عجیب سی لگی۔ اس نے باس کو کبھی اس قدر پراسرار انداز میں ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ڈاکٹر کا مطلب بالکل نہیں سمجھ پایا اور سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگا

وہ اب ماضی کا حصہ بن چکی ہے اسمتھ ڈاکٹر نے جیسے خود سے باتیں کرتے ہوئے آہستہ آہستہ کہا۔ وہ ماضی کا حصہ بن چکی ہے۔ یہ سارے لوگ جو اس وقت یہاں موجود ہیں اور وہ بھی جو ابھی یہاں سے چلے گئے ہیں سب کے سب ماضی کا حصہ بن چکے ہیں

ماضی کا حصہ بن چکے ہیں۔ اسمتھ نے حیرت سے پوچھا۔ مگر کس طرح۔ یہ سب لوگ تو حال کا حصہ ہیں باس۔ یہ سب تو زندہ ہیں موجود ہیں۔ ہم انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

تم ابھی کچھ نہیں جانتے اسمتھ ڈاکٹر نے چلتے ہوئے دھیرے دھیرے کہا۔ تم کچھ نہیں جانتے مگر جان جاؤ گے۔ جلد ہی جان جاؤ گے

اسمتھ خاموش ہو گیا۔ وہ دونوں ہال سے نکل کر باہر بازار میں آ گئے۔ جہاں کافی رونق تھی۔ لوگ فٹ پاتھ پر چل رہے تھے۔ کیفوں اور ریستورانوں میں بڑی رونق تھی۔ ہر طرف زندگی کی چہل پہل نظر آ رہی تھی

ڈاکٹر ایک بڑے سے ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے سامنے رک گیا۔ خریداروں کا ایک ہجوم اندر داخل ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اپنے کیمرے کا رخ ہجوم کی طرف کیا اور بٹن دبا دیا انسانی گوشت خور جراثیم کی ایک دھار ہجوم میں داخل ہو گئی۔ کسی کو کچھ خبر نہ ہوئی اور موت نے اپنے پنجے کھول دیے۔ ہجوم میں سے ایک نوجوان عورت ڈاکٹر کو دیکھ کر مسکرائی۔ ڈاکٹر نے شکریے کے انداز میں اپنا سر خم کیا اور آگے بڑھ گیا۔ اسمتھ نے بھی بے سوچے سمجھے دانت نکال دیئے

اب ہم کسی کیفے میں چلیں گے ڈاکٹر نے اسمتھ سے کہا۔ ہمیں گرم کافی کی ضرورت ہے

مجھے تم سے بالکل اتفاق ہے باس اسمتھ نے کہا

وہ دونوں ایک کیفے میں داخل ہو گئے۔ ڈاکٹر کا کیمرہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ کیفے کے دروازے کے قریب ہی ایک میز کے گرد چار حسین و نوجوان لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے سامنے میز پر شیمپین کے گلاس رکھے ہوئے تھے

کیا میں تم لوگوں کی خوبصورتی کو کاغذ میں سمیٹ سکتا ہوں۔ ڈاکٹر نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے خوشدلی سے پوچھا

اوہ۔ ضرور ضرور ان میں سے ایک نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ اور ڈاکٹر نے کیمرے کا بٹن دبا دیا۔ روشنی کے جھماکے کے ساتھ ہی انسانی گوشت کھانے والے جراثیم کی ایک نظر نہ آنے والی لہر کیمرے کے خفیہ سوراخ

سے نکلی اور نوجوان لڑکیوں کے جسموں سے جا لپٹی ان کا گوشت کھانے کے لیے

....ڈاکٹر نے اسعد کے ساتھ ایک میز کے گرد بیٹھنے سے پہلے چار مختلف میزوں کے گرد بیٹھے ہوئے لوگوں کی تصویریں بنائیں۔ اس کے بعد وہ دونوں ایک دور افتادہ میز کے گرد بیٹھ گئے اور فوراً ہی ان کے آگے گرم گرم کافی آگئی

میری بات غور سے سنو اسعد ڈاکٹر نے اپنا منہ اسعد کے بالکل قریب لے جا کر آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ میں آج تمہارے سامنے اپنی قوت کا ایک ایسا حیرت انگیز مظاہرہ کر رہا ہوں جس کی تاریخ عالم میں کوئی مثال موجود نہیں ہے۔ براکمن کے قصبے کی آبادی تقریباً" دس ہزار ہے اور اس کے علاوہ اس وقت یہاں کچھ لوگ باہر سے بھی آئے ہوئے ہیں۔ میں نے ان سب لوگوں کو موت کے حوالے کر دیا ہے

کیا۔ اسعد نے خوفزدہ بھنچی ہوئی آواز میں کہا۔ تم نے کیا کیا ہاں۔

میں نے یہ کیا کہ اس قصبے میں موجود سارے انسانوں کو موت کے حوالے کر دیا ہے ڈاکٹر نے کہا۔ یہ میری زبردست قوت کا ایک ادنٰی سا مظاہرہ ہے۔ یہ کیڑے مکوڑوں کی طرح زندہ رہنے والے انسان..... اس نے اپنے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں پر ایک نفرت بھری نظر ڈالی۔ ان کی زندگی اور موت میرے قبضے میں ہے۔ یہ جئیں گے تو میری مرضی سے اور مریں گے تو میری مرضی سے میں یہاں تمہیں اپنے ساتھ اسی لیے لایا تھا کہ تمہیں اپنی قوت کا کرشمہ دکھاؤں۔ تم اس بات پر زندگی بھر فخر کرو گے کہ تم ہی وہ پہلے اور واحد انسان تھے جس نے میری طاقت کے اولین مظاہرے کا بچشم خود مشاہدہ کیا۔ تم سارا احوال اپنی آنکھوں سے دیکھو گے اور اسے مرتے دم تک یاد رکھو گے

مگر ہاں یہ لوگ تو زندہ ہیں اس نے اٹک اٹک کر کہا۔ اسکے دل کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ کیا تم نے کوئی خودکار ایٹمی ہتھیار یہاں نصب کر دیا ہے جو وقت مقررہ پر پھٹ جائے گا۔ مگر کیا ہم دونوں اس کی زد سے بچ رہیں گے۔

یں نے کوئی خودکار یا غیر خودکار ایٹمی ہتھیار یہاں پر نصب نہیں کیا ہے ڈاکٹر نے کہا۔ یہ تو بہت معمولی سی بات ہوتی کوئی بھی ایسا شخص یہ کام کر سکتا تھا۔ جسے ایٹمی ہتھیاروں تک رسائی حاصل ہوتی میں نے بالکل ہی دوسرا کام کیا ہے۔ اس کا نتیجہ برآمد ہونے میں دس پندرہ منٹ لگیں گے۔ کافی ختم کرو اور میرے ساتھ باہر چلو

ڈاکٹر کے لہجے میں اس قدر گہری سنجیدگی اور تحکمانہ انداز شامل تھا کہ اسعد کے اوسان خطا ہو گئے ۔ نہ جانے باس کیا کرنے والا تھا۔ دونوں نے جلدی جلدی کافی ختم کی اور کیفے سے باہر نکل آئے۔

☆☆☆☆

افتتاحی تقریر امریکی مندوب واٹرمین کو کرنی تھی اور مختلف بین الاقوامی مسائل کی جانب امریکی حکومت کے رویے کی وضاحت کرنی تھی۔ ان لوگوں کو ہال کے اندر داخل ہوئے تقریباً" پندرہ منٹ کا وقت گزر چکا تھا۔ اس دوران ان لوگوں نے اپنی نشستیں سنبھالیں اپنے کاغذات وغیرہ درست کیے اور اپنے معاونین کو ضروری ہدایتیں دیں اور پھر بالآخر کانفرنس کی کارروائی شروع ہوگئی

واٹرمین نے اپنی تقریر اپنا کان کھجاتے ہوئے شروع کی۔ اگرچہ اسے سب لوگوں کے سامنے تقریر کے دوران اس طرح اپنا کان کھجاتے رہنا بڑا برا معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن اسکے کان میں اس قدر شدت سے خارش ہو رہی تھی کہ وہ کان کو کھجائے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن مشکل یہ ہوگئی کہ جیسے جیسے وہ کان کھجاتا گیا ویسے ویسے خارش کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا اور اس کے لیے تقریر کرنا مشکل ہوگیا۔ وہ سخت پریشان تھا کہ یہ اچانک کیا عذاب نازل ہوگیا ہے۔ ایسی عجیب ر...۔ خارش تو اسے کبھی زندگی

میں نہیں ہوئی تھی۔ جواب کان کے علاوہ ناک رخساروں ہونٹوں اور گردن تک پھیلتی جا رہی تھی

اچانک اس نے محسوس کیا کہ ہال میں موجود کوئی بھی شخص اس کی تقریر کی جانب متوجہ نہیں ہے۔ بلکہ سب لوگ اپنے کھلے ہوئے جسموں کے حصوں کو بری طرح کھجلانے میں معروف ہیں ان کے ناخن تیزی سے اپنے جسموں کو چھیل رہے ہیں۔ واٹرمین یہ منظر دیکھ کر گھبرا سا گیا۔ وہ فوراً معذرت کر کے روسٹرم سے نیچے اتر آیا اور اس نے پروٹوکول آفیسر لانگ مین کو طلب کیا

لانگ مین بھی اپنی گردن کھجاتا ہوا آیا اور ہال کے اندر کا منظر دیکھ کر سخت دہشت زدہ ہوگیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ صرف وہ خود اور باہر موجود سیکیورٹی کے لوگ کھجلی کے شکار ہوگئے ہیں اور وہ ان لوگوں کے ساتھ اس اچانک صورت حال پر گفتگو کر رہا تھا۔ مگر یہاں ہال کے اندر سارے مندوبین ان کے نائبین اور ان کے ذاتی عملے کے لوگ اسی چیز کا شکار تھے

فوراً ڈاکٹروں کو طلب کرو امریکی مندوب نے پروٹوکول افیسر کو ہدایت کی۔ مجھے لگتا ہے یہ کوئی الرجی قسم کی چیز ہے جو اچانک پھیل گئی ہے۔ لیکن یہ متعدی معلوم ہوتی ہے۔ اس کا فوراً تدارک کرنا ضروری ہے

باہر موجود سارے لوگ مجھ سمیت اس وبا کا شکار ہوگئے ہیں پروٹوکول آفیسر نے کہا۔ میں سخت پریشان ہوں۔ میں ابھی ڈاکٹر والٹر کو فون کر کے بلاتا ہوں اور وہ فون کی طرف لپکا

قصبے میں ایک بڑا اسپتال تھا جس میں کئی ڈاکٹر تھے۔ اس کے علاوہ پرائیویٹ ڈاکٹروں کے بھی کئی کلینک تھے بڑے سرکاری ہسپتال کا نگراں ڈاکٹر والٹر تھا۔ اسے جس وقت پروٹوکول آفیسر کا فون ملا تو اس نے اس کی ساری بات غور سے سنی

اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے اس نے پروٹوکول آفیسر کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ غالباً" ان سب لوگوں کی غذا میں کوئی ایسی چیز اتفاق سے شامل ہوگئی ہے جس نے شدید ری ایکشن کیا ہے اور ان کے جسموں میں خارش پیدا کر دی ہے۔ میرے پاس کافی مقدار میں دوا موجود ہے جو اس قسم کی خارش کا سدباب کر سکتی ہے۔ میں دوا کے ساتھ ابھی آ رہا ہوں

☆☆

ڈاکٹر اور اسعد کیفے سے باہر نکلے۔ اسعد گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن اسے کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہر طرف ہنستے مسکراتے چہروں کا سیلاب رواں دواں تھا۔ ڈاکٹر سڑک پر رکا نہیں بلکہ سیدھا اس ڈیپارٹمنٹل اسٹور تک چلا آیا۔ جس کے سامنے ابھی کوئی بیس منٹ پہلے اس نے کچھ لوگوں کی تصاویر بنائی تھیں۔ وہ اسعد کے ساتھ ہی ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں داخل ہوگیا

اور تب پہلی بار اسعد کو کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا ڈیپارٹمنٹل اسٹور لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن وہ سب کے سب اپنے جسم کے کھلے ہوئے حصوں کو کھجا رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اس عجیب و غریب کھجلی کے بارے میں تبصرے کر رہے تھے اور بے تحاشہ کھجاتے چلے جا رہے تھے۔ آخر لوگوں نے اسٹور سے باہر نکلنا شروع کر دیا۔ لوگ گروہ در گروہ سڑک پر آ کر کھجانے لگے۔ ان میں عورتیں مرد بچے بوڑھے سب ہی شامل تھے۔ ڈاکٹر بھی اسعد کے ساتھ باہر آگیا

سڑک پر چلنے والوں نے حیرت سے یہ منظر دیکھا اور صورتحال دریافت کرنے کے لیے رک گئے

اس اسٹور کی فضا میں کوئی زہریلی چیز شامل ہوگئی ہے ایک موٹی سی عورت نے اپنے گھٹنے کو بری طرح کھجاتے ہوئے کہا۔ جتنے لوگ یہاں موجود تھے وہ سب کے سب خارش میں مبتلا ہوگئے ہیں

میں ابھی اسپتال فون کر کے ڈاکٹر والٹر کو اطلاع دیتا

ہوں ایک آدمی اسٹور کی طرف لپکا

لیکن اسٹور کے منیجر نے جو خود بھی بری طرح خارش کا شکار تھا۔ اسے بتایا کہ وہ اسپتال فون کر چکا ہے اور ڈاکٹر والٹر وہاں موجود نہیں ہے۔ البتہ اس کے دو نائبین یہاں پہنچنے والے ہیں۔ اسٹور کا منیجر اس اچانک افتاد سے سخت پریشان نظر آ رہا تھا

یہ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے باس۔ اسمتھ نے خوفزدہ لہجے میں ڈاکٹر سے آہستہ سے پوچھا۔ وہ دونوں الگ تھلگ ایک کونے میں کھڑے ہوئے تھے

یہ لوگ موت کی بیماری میں مبتلا ہو گئے ہیں ڈاکٹر نے اسمتھ کے کان میں کہا۔ اس کا کوئی علاج نہیں اور اس راز سے صرف میں واقف ہوں

کیا یہ سب کے سب مر جائیں گے باس۔ اسمتھ نے پوچھا

ابھی تو ابتدا ہے ڈاکٹر نے جواب دیا۔ تم دیکھتے جاؤ

اسٹور سے نکل کر بہت سے لوگ اپنے اپنے گھروں کو بھاگ رہے تھے۔ کچھ کا رخ اسپتال کی طرف تھا

جلدی جلدی اپنے گھروں میں جا کر پانی میں جراثیم کش دوائیں ملا کر نہاؤ ایک بوڑھا آدمی اپنی گردن کو رگڑتے ہوئے لوگوں کو مشورہ دے رہا تھا۔ ڈاکٹر اسمتھ کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور واپس کیفے کی طرف چل پڑا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے لوگ کیفے سے بھی نکل کر بھاگنے لگے وہ سب کے سب بری طرح کھجا رہے تھے اور بے چینی کے عالم میں بھاگ رہے تھے۔ زیادہ تر لوگوں کا رخ اسپتال کی طرف تھا۔ کچھ پرائیویٹ ڈاکٹروں کے پاس بھاگ رہے تھے۔ سارے بازار میں ایک ہلچل سی مچ گئی تھی۔ افراتفری کا عالم برپا ہو گیا تھا۔ اسمتھ پریشانی کے ساتھ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ بہت سے لوگ اپنے گھروں میں گھس رہے تھے

آؤ اب ہم کانفرنس ہال کی طرف چلتے ہیں ڈاکٹر نے اسمتھ سے کہا۔ اور اسمتھ خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑا

ہال کی عمارت کے اندر باہر کے کسی آدمی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ گیٹ بند کر دیا گیا تھا اور سیکیورٹی کے مسلح لوگ وہاں تعینات تھے۔ لیکن ان کی حالت عجیب و غریب تھی۔ وہ بری طرح اپنے جسموں کو کھجا رہے تھے

ڈاکٹر اور اسمتھ ایک طرف کھڑے ہو گئے اور اسی وقت انہوں نے ایک ایمبولینس کو آتے دیکھا۔ ایمبولینس میں چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور بہت سی دوائیں رکھی ہوئی تھیں۔ سیکیورٹی والوں نے گیٹ کھول دیا اور ایمبولنس اندر داخل ہو گئی

ڈاکٹر اپنی دوربین اور دروں بیں نظروں سے اندر کا منظر دیکھ سکتا تھا۔ لیکن وہ گفتگو نہیں سن سکتا تھا۔ جب کہ اسمتھ کچھ بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ صرف سوچ سکتا تھا

ڈاکٹر والٹر جب اپنے دواؤں کے ذخیرے کے ساتھ عمارت کے اندرونی حصے میں داخل ہوا تو جو منظر اس نے دیکھا وہ اس کی توقعات سے کہیں زیادہ سنگین اور تشویشناک تھا۔ کانفرنس کے تمام کے تمام شرکا و بری طرح اپنے جسموں کو کھرونچ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا گویا ان کے جسموں میں آگ لگ گئی ہو۔ ان میں سے کئی نے تو آداب و تہذیب کو بالائے طاق رکھ کر اپنی قمیصیں بھی اتار دی تھیں اور جو چیز ڈاکٹر والٹر کے لیے سب سے زیادہ تشویشناک تھی۔ وہ یہ کہ ان میں سے کئی ایک لوگوں کے جسموں سے کھجانے کے باعث خون بہنے لگا تھا۔ لیکن وہ پھر بھی کھجائے جا رہے تھے۔ اس وقت ڈاکٹر والٹر کو احساس ہوا کہ اس نے معاملے کو سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ اس نے تو اسے کسی ری ایکشن کے طور پر پیدا ہونے والی معمولی سی خارش سمجھا تھا لیکن صورت حال یوں نہیں تھی

ڈاکٹر والٹر نے جلدی جلدی لوگوں میں وہ دوائیں تقسیم کیں جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ لوگوں نے بے تابی کے ساتھ وہ دوائیں کھا لیں

آپ لوگ پریشان نہ ہوں ڈاکٹر والٹر نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ایک عارضی صورت حال ہے۔ یہ اجتماعی ری ایکشن کسی غذا کی خرابی کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے۔ امید ہے کہ اس دوا سے یہ ری ایکشن ختم ہو جائے گا لیکن ڈاکٹر والٹر کو خود اپنی آواز یقین اور اعتماد سے خالی محسوس ہو رہی تھی

اسی وقت کسی نے آ کر ڈاکٹر والٹر کو اطلاع دی کہ اسپتال سے اس کے لیے فون آیا ہے۔ ڈاکٹر والٹر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس کا نائب ڈاکٹر فون پر بول رہا تھا۔ وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔ اور اس نے جو کچھ بتایا اسے سن کر ڈاکٹر والٹر کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ریسیور اس کے ہاتھ میں لرزنے لگا

نائب ڈاکٹر نے بتایا کہ اسپتال میں مردوں عورتوں اور بچوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا ہے۔ یہ سب کے سب عجیب و غریب قسم کی خارش میں مبتلا ہیں۔ یہ اپنے جسموں کو بری طرح نوچ کھسوٹ رہے ہیں اور ان میں سے بعض نے تو اپنے آپ کو کھجا کھجا کر زخمی بھی کر لیا ہے

ہمیں باہر سے مدد منگانی پڑے گی ڈاکٹر والٹر نے فون پر اپنے نائب سے کہا۔ پورے قصبے میں بھی اتنی دوائیں موجود نہیں ہیں جو سارے مریضوں کے لیے کافی ہو سکیں۔ تم ان لوگوں کو وہی دوا دو جو میں اپنے ساتھ یہاں لایا ہوں۔ پرائیویٹ کلینکوں اور ڈرگ اسٹوروں سے اس دوا کی ساری مقدار حاصل کر لو۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں واپس آنے کی کوشش کرتا ہوں

ڈاکٹر والٹر نے جب ریسیور رکھا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اتنا تو وہ واضح طور پر سمجھ چکا تھا کہ یہ کوئی نہایت تیزی سے پھیلنے والی بیماری ہے۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک خوفناک وبا کی صورت اختیار کر لی ہے اور اگر اس کا فوری طور پر تدارک نہ کیا گیا تو قصبے کا ایک ایک فرد اس کی لپیٹ میں آ جائے گا

اسی وقت قصبے کا شیرف اور پولیس چیف کمرے کے اندر داخل ہوئے۔ وہ دونوں سخت متوحش نظر آ رہے تھے

یہ سب کیا ہو رہا ہے ڈاکٹر۔ پولیس چیف نے تشویشناک لہجے میں کہا۔ ہم لوگ ابھی باہر سے آ رہے ہیں۔ سارے قصبے میں غدر برپا ہے نہ جانے کتنے لوگ اس خارش میں مبتلا ہیں۔ سب کے سب اسپتال اور پرائیویٹ کلینکوں کی طرف بھاگ رہے ہیں میں نے بہت سے لوگوں کے جسموں سے خون نکلتے بھی دیکھا ہے

کچھ کرو ڈاکٹر۔ خدا کے لیے شیرف نے اپنی گردن کھجاتے ہوئے کہا۔ پھر وہ کھجاتا ہی چلا گیا

میں سان فرانسسکو میں صحت کے اعلیٰ افسروں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں ڈاکٹر والٹر نے کہا۔ اس قصبے میں ڈاکٹروں کی جو تعداد ہے وہ اس خوفناک صورت حال پر قابو پانے کے لیے بالکل ناکافی ہے اور پھر ہمارے پاس اتنی دوائیں بھی نہیں ہیں

اور یہ بھی کیا ضروری ہے کہ جو دوائیں تم دے رہے ہو ان سے فائدہ بھی ہو۔ پولیس چیف نے کہا

تم ٹھیک کہتے ہو ڈاکٹر والٹر نے کہا۔ میں اس بارے میں کس طرح پر یقین ہو سکتا ہوں۔ مجھے اپنی زندگی میں کبھی اس قسم کی صورت حال کا سامنا نہیں کرنا پڑا

ڈاکٹر والٹر نے جلدی جلدی سان فرانسسکو میں ریاستی محکمہ صحت کے سربراہ سے رابطہ قائم کر کے اسے مختصر ترین الفاظ میں صورت حال سے آگاہ کیا۔ محکمہ صحت کا سربراہ بھی یہ سب کچھ سن کر حواس باختہ ہو گیا اور اس نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ وہ فوری طور پر اس صورت حال سے نمٹنے کی تدابیر اختیار کر رہا ہے اور وہ اس کے جوابی فون کا انتظار کرے

ڈاکٹر نے شیرف اور پولیس چیف کو گفتگو سے آگاہ کیا اور وہ لوگ ایک بار پھر کانفرنس روم میں آ گئے۔ وہاں حالات بد سے بدتر ہو گئے تھے۔ زیادہ تر مندوبین اور دوسرے لوگوں کے جسموں میں اب جگہ جگہ سے کھال پھٹ گئی تھی زخموں سے خون بہہ رہا تھا اور وہ دیوانوں کی طرح اپنے جسموں کو کھجائے جا رہے تھے۔ کھجلی تھی کہ کسی

طرح ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی

ڈاکٹر والٹر کی دی ہوئی دواؤں نے ذرہ برابر بھی اثر نہیں کیا تھا

اور تب خوف کی ایک سرد لہر ڈاکٹر والٹر کے جسم میں دوڑ گئی۔ وہ گزشتہ چالیس سال طب کے پیشے سے وابستہ رہا تھا۔ اور اپنی عمر کا آخری حصہ اس چھوٹے سے پرسکون قصبے میں گزار رہا تھا۔ یہاں کے بیشتر ین افراد سے وہ ذاتی طور پر واقف تھا اور جہاں سارے ہی لوگ اس کی بہت زیادہ عزت کرتے تھے۔ وہ گزشتہ دس سال سے اس قصبے میں کام کر رہا تھا اور یہاں سے کہیں اور جانے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ ایک تجربہ کار اور ماہر ڈاکٹر تھا اور سنگین سے سنگین بیماریوں کا علاج کرنا جانتا تھا۔ لیکن جس صورت حال سے وہ اس وقت دوچار تھا۔ وہ بالکل منفرد تھی۔ اپنی ساری طبی زندگی میں اسے ایسے بھیانک حالات کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا

وہ دوبارہ کمرے میں گیا اور اس نے اسپتال فون کیا۔ اس کے نائب نے اسے اطلاع دی کہ اسپتال میں آنے والے لوگوں کی تعداد برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ دواؤں کا ذخیرہ تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ اس نے ڈرگ اسٹوروں اور پرائیویٹ کلینکوں سے بھی دوائیں منگوائی ہیں۔ لیکن ان کے پاس بھی محدود ذخیرہ ہی موجود ہے

میں نے سان فرانسسکو فون کیا ہے ڈاکٹر والٹر نے اپنے نائب کو اطلاع دی۔ وہ لوگ جلد ہی فون کر کے امدادی کارروائی کے بارے میں اطلاع دیں گے

اگر انہوں نے جلدی نہیں کی تو میں سمجھتا ہوں کہ ہم لوگ ایک ایسی تباہی سے دوچار ہو جائیں گے۔ جس کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا نائب ڈاکٹر نے کہا اور فون بند کر دیا

ڈاکٹر والٹر دوبارہ کانفرنس روم میں گیا اور اس وقت اسے پہلی بار اپنے ہاتھ پر کھجلی محسوس ہوئی

کانفرنس روم سے باہر کانفرنس ہال سے باہر دور سڑک پر کھڑا ہوا ڈاکٹر آرتھر فلپ سارے اندرونی مناظر کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ ڈاکٹر نے بھی اپنے جسم کو کھجانا شروع کر دیا ہے

ڈاکٹر آرتھر فلپ جانتا تھا کہ اس کے چھوڑے ہوئے انسانی گوشت خور جراثیم انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ بڑھ اور پھیل رہے ہیں۔ انہیں ان کی غذا نہایت وافر مقدار میں مل رہی ہے اور وہ ایک سے دو اور دو سے چار اور چار سے آٹھ کے حساب سے پھیلتے جا رہے ہیں۔ ان کی قوت اور توانائی میں اضافہ ہو رہا ہے اور وہ ایک جسم کے دوسرے جسم تک تیزی سے لپک رہے ہی۔ جھپٹ رہے ہیں۔ حملہ آور ہو رہے ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ اونچی اونچی پہاڑیوں سے گھرا ہوا یہ قصبہ کچھ ہی دیر میں جراثیم سے بھر جائے گا۔ لیکن اس کے اپنے اندازے کے مطابق پہاڑیوں سے گھرا ہونے کے باعث جراثیم قصبے کی حدود سے باہر نہیں نکل سکیں گے۔ لیکن وہ سارے قصبے کے لوگوں کو ہلاک کر ڈالیں گے

وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ محکمہ صحت کے حکام اور ڈاکٹر کون کون سی دوائیں استعمال کرتے ہیں۔ کیا کیا تدابیر اختیار کرتے ہیں اور ان تدابیر کا کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ جو کام اس وقت اس نے کیا تھا اسے وہ اپنی لیبارٹری میں نہیں انجام دے سکتا تھا۔ اس کے لیے بڑے پیمانے پر ایک تجربے کی ضرورت تھی۔ کھلی فضا میں عام انسانوں پر تجربہ اور ایک طویل انتظار کے بعد ڈاکٹر کو اس کا موقع مل گیا تھا۔ اب اسے حتمی طور پر یہ معلوم ہو جائے گا کہ کیا اس تباہی کو کنٹرول کرنے کے لیے مروجہ دواؤں میں سے کوئی دوا کارآمد ہو سکتی ہے۔ اپنی لیبارٹری میں وہ ان جراثیم پر تمام مروجہ دوائیں استعمال کر چکا تھا اور اس نے ان جراثیم کو ساری ہی رائج الوقت جراثیم کش دواؤں کا عادی بنا دیا تھا۔ وہ ان دواؤں کو بہ آسانی جھیل [illegible] تے تھے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ بڑے پیمانے پر ان [illegible] کے استعمال سے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں

ڈاکٹر نے ایک نظر کانفرنس روم کی طرف ڈالی۔ ڈاکٹر والٹر اپنی کلائی کو بری طرح کھرچ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کرب اور دہشت کے آثار تھے۔ ڈاکٹر آرتھر کے ہونٹوں پر ایک سفاکانہ مسکراہٹ نمودار ہو گئی

اسی وقت ڈاکٹر والٹر کو سان فرانسسکو سے کال موصول ہوئی محکمہ صحت کا افسر اعلیٰ اس سے گفتگو کر رہا تھا

پانچ ماہر ڈاکٹروں کی ایک ٹیم ضروری ساز و سامان اور دواؤں کے ذخیرے کے ساتھ بذریعہ جہاز براکلن پہنچنے والی ہے افسر اعلیٰ نے اطلاع دی۔ اس کے علاوہ دو ہیلی کاپٹر فضائی اسپرے کے لیے روانہ ہو چکے ہیں۔ لوگوں کو دلاسا دو اور اس کا خیال رکھو کہ براکلن سے کوئی شخص باہر نہ جانے پائے پولیس چیف اور شیرف کو یہ بات بتا دو۔ اس متعدی بیماری کے جراثیم یا وائرس براکلن کی حدود سے باہر نہ جانے پائیں

پولیس چیف شیرف اور خود میں بھی اس بیماری میں مبتلا ہو چکے ہیں ڈاکٹر والٹر نے کہا۔ ہم لوگ اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکیں گے۔ مناسب یہ ہوگا کہ تم خود براکلن کی ناکہ بندی کا بندوبست کر دو۔ تاکہ نہ کوئی شخص یہاں آ سکے اور نہ یہاں سے جا سکے۔ صورتحال بہت سنگین ہو گئی ہے۔ لوگوں کے جسموں میں زخم پھیل رہے ہیں۔ ہماری ساری دوائیں بے اثر ثابت ہو رہی ہیں۔ میں کچھ نہیں سمجھ پا رہا ہوں کہ یہ کس قسم کی وبائی بیماری ہے اور اس کی انتہا کیا ہوگی۔ قصبے کی آبادی کی بھاری اکثریت اس کا شکار ہو گئی ہے اور جو لوگ بچ رہے ہیں وہ بھی کچھ دیر میں اس کی زد میں آ جائیں گے

ہم نے واشنگٹن میں بھی حکام کو مطلع کر دیا ہے افسر اعلیٰ نے کہا۔ تم لوگ گھبراؤ مت ہم ساری ضروری کارروائیاں کر رہے ہیں

ڈاکٹر آرتھر فلپ نے ڈاکٹر والٹر کو فون پر بات کرتے ہوئے دیکھا اور اس نے اندازہ لگایا کہ وہ سان فرانسسکو میں حکام سے بات کر رہا ہوگا

آؤ اب آگے چلیں ڈاکٹر نے اسمتھ سے کہا۔ اسمتھ خاموشی سے ڈاکٹر کے ساتھ ہو لیا

ایک عجیب قیامت کا سماں تھا۔ قصبے کے بازار کی تمام دکانیں یونہی کھلی پڑی تھیں۔ اس میں نہ دکاندار تھے اور نہ گاہک تھے۔ لوگ سڑکوں پر ادھر سے ادھر بے تحاشہ بھاگتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ وہ اسپتال کی طرف پرائیویٹ کلینکوں کی طرف اور اپنے گھروں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ بہت سے لوگ خوف و دہشت کے عالم میں چیخ رہے تھے اور اپنے جسموں کو کھرونچ رہے تھے۔ کتنی ہی عورتیں شدید اذیت کے عالم میں چلا چلا کر رو رہی تھیں۔ انہیں کسی بات کا بھی ہوش نہیں تھا اور وہ نیم دیوانگی کے عالم میں بھاگ رہی تھیں۔ گھروں کے دروازے دھڑ دھڑ کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آ رہی تھیں

اسمتھ کا دماغ گھومنے لگا جو کچھ ہو رہا تھا۔ وہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا

آؤ ہم اسپتال کی طرف چلتے ہیں۔ ڈاکٹر نے اسمتھ سے کہا اور دونوں اسپتال کی طرف روانہ ہو گئے

قصبے کے زیادہ تر لوگ اپنے جسموں کو ناخنوں سے کھرونچتے ہوئے اسپتال کی طرف بھاگ رہے تھے۔ ڈاکٹر اور اسمتھ بھی ان میں شامل ہو گئے اور جب یہ اسپتال سے کافی دور تھے تب انہوں نے دیکھ لیا کہ سپتال کے سامنے ہزاروں انسانوں کا مجمع ہے۔ لوگ اندر گھسنے کے لیے دھکم پیل کر رہے ہیں۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں ہے۔ ایک نفسانفسی کا عالم ہے ہر شخص اسپتال کے اندر گھسنا چاہتا ہے۔ لیکن اسپتال کے صحن میں برآمدوں میں پہلے ہی اتنے لوگ بھرے ہوئے ہیں کہ اب کسی کے اندر گھسنے کی بمشکل ہی کوئی گنجائش موجود ہے

ڈرگ اسٹور اور پرائیویٹ کلینک دواؤں سے خالی ہو چکے تھے۔ پرائیویٹ ڈاکٹر بھی اس بیماری کا شکار ہو چکے تھے۔ اسپتال میں ڈاکٹر والٹر کے تمام نائبین اور

اسپتال کا سارا عملہ اس بیماری کا شکار ہو چکا تھا
ڈاکٹر مسرت آمیز نظروں سے یہ سارے مناظر دیکھ رہا تھا۔

جنگ کے خاتمے کے بعد ڈاکٹر نے یانگ کے ذریعہ ژوآن کو اپنے دام میں پھنسایا اور اس طرح ڈاکٹر مادام لی اور اس کے اس گروہ سے واقف ہو گیا جو ڈاکٹر کے لیے ایک چیلنج کی صورت میں سامنے آیا تھا چنانچہ ڈاکٹر نے ایک منظم پروگرام بنایا اور مادام لی کے گروہ کے ایک ایک آدمی کو چن چن کر ہلاک کر دیا البتہ یانگ اور ژوآن کو بے ہوشی کی حالت میں ڈاکٹر کی خفیہ تجربہ گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ ڈاکٹر نے سب سے پہلے یانگ کے بازو میں ایک انجکشن لگایا۔ وہ اس ویکسین کا انجکشن تھا جو انسانی گوشت خور جراثیم کی مزاحمت کرنے والی ویکسین تھی۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے دونوں کو خاص قسم کے بنے ہوئے شیشے کے کنٹینروں میں بند کر دیا۔ ان میں سانس لینے کا خصوصی انتظام موجود تھا۔ اب ڈاکٹر کو دونوں کے ہوش میں آنے کا انتظار تھا۔ یانگ اور ژوآن کو جب ہوش آیا تو انہوں نے اپنے آپ کو شیشے کے تابوت میں بند پایا دونوں نے نکلنے کی بڑی جدوجہد کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ ڈاکٹر نے انسانی گوشت خور جراثیم کی کافی بڑی تعداد کو پہلے یانگ کے کنٹینر میں داخل کیا اور خوردبین کے ذریعے ان کا جائزہ لینے لگا جراثیم یانگ کے جسم سے لپٹ گئے۔ وہ اس کا گوشت نہیں کھا رہے تھے۔ ویکسین نے یانگ کے گوشت کے اندر ایسی تاثیر پیدا کر دی تھی کہ جراثیم کے لیے وہ بالکل ہی ناقابل قبول بن گیا تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے جراثیم کی بہت معمولی مقدار کو ژوآن کے کنٹینر میں داخل کیا۔ جراثیم ژوآن کے جسم پر ٹوٹ پڑے اور اس کی کھال ادھیڑنی شروع کی ژوآن خوف و دہشت کے عالم میں بری طرح چیخنے لگا

یانگ بڑے غور سے یہ دل دہلا دینے والا منظر دیکھ رہا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ژوآن کے جسم پر سے گوشت کیوں ادھڑتا جا رہا ہے۔ وقت بالکل غیر محسوس طریقے سے گزرتا رہا اور جب ژوآن کے جسم کا سارا گوشت غائب ہو گیا۔ تو دہشت سے یانگ بے ہوش ہو گیا۔ ڈاکٹر نے یہ تمام مشاہدات اپنی ڈائری میں قلم بند کیے اور پھر یانگ کے کنٹینر میں قاتل جراثیم داخل کر دیے قاتل جراثیم نے چند لمحوں میں گوشت خور جراثیم کا صفایا کر دیا۔ ڈاکٹر نے یانگ کو کنٹینر سے نکالا اور ایک خالی کمرے میں قید کر دیا۔ ڈاکٹر یہ جاننا چاہتا تھا کہ ویکسین کا اثر کتنے عرصے تک قائم رہتا ہے اس طرح چھ ماہ تک ڈاکٹر یانگ کو اس تجربے سے گزارتا رہا۔ ٹھیک چھ ماہ بعد ویکسین کا اثر ختم ہو گیا اور گوشت خور جراثیم نے یانگ کے جسم کو کھانا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر اپنے اس تجربے سے بہت خوش تھا۔ ان ہی دنوں ڈاکٹر نے اخبار میں خبر پڑھی کہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس سے پہلے امریکہ اور مغربی یورپ کے بعض ممالک کے مندوبین کی ایک میٹنگ امریکہ کے ایک شہر براکن میں منعقد ہو رہی ہے
ڈاکٹر نے سوچا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ اپنے منصوبے پر عمل کرنا شروع کر دے۔ کانفرنس شروع ہونے سے ایک دن پہلے ڈاکٹر اسمتھ کے ساتھ براکن پہنچ گیا۔ دوسرے دن جب سارے مندوبین کانفرنس روم میں جمع ہو گئے تو ڈاکٹر نے پہلے اپنے اور اسمتھ کے ویکسین کا انجکشن لگایا اور پھر اپنی شیطانی کارروائی کی ابتدا کی۔ گوشت خور جراثیم نکلتے ہی تمام جانداروں پر ٹوٹ پڑے۔ ڈاکٹر جانتا تھا کہ یہ جراثیم تیز رفتاری کے ساتھ بڑھ اور پھیل رہے ہیں وہ ایک سے دو دو سے چار اور چار سے آٹھ کے حساب سے پھیلتے جا رہے ہیں۔ وہ ایک جسم سے دوسرے جسم تک تیزی سے لپک رہے ہیں اور حملہ آور ہو رہے ہیں یہاں تک کہ پورا شہر ان کی لپیٹ میں آ گیا

-یہ تھا گزشتہ قسط کا خلاصہ اب آپ آگے پڑھیے

ڈرگ اسٹور اور پرائیویٹ کلینک دواؤں سے خالی

ہو چکے تھے۔ پرائیویٹ ڈاکٹر بھی اس بیماری کا شکار ہو چکے تھے۔ اسپتال میں ڈاکٹر والٹر کے تمام ناٸبین اور اسپتال کا سارا عملہ اس بیماری کا شکار ہو چکا تھا
ڈاکٹر مسرت آمیز نظروں سے یہ سارے مناظر دیکھ رہا تھا

یہ سب کیا ہو رہا ہے باس۔ اسمتھ نے سہمے ہوئے لہجے میں ڈاکٹر سے آہستہ سے پوچھا
آؤ میں تمہیں بتاتا ہوں ڈاکٹر نے کہا اور اسمتھ کو ساتھ لیے ہوئے ایک طرف کو چل پڑا۔ اسپتال کی عمارت سے کچھ فاصلے پر ایک کیفے تھا جو اس وقت بالکل خالی پڑا ہوا تھا۔ ڈاکٹر اسمتھ کے ساتھ اس کیفے کے ایک کیبن میں جا کر بیٹھ گیا۔ انہیں سرو کرنے والا کوئی نہیں تھا
میں نے اس قصبے میں مہلک خارش کے جراثیم پھیلا دیے ہیں ڈاکٹر نے اسمتھ کو گھورتے ہوئے کہا۔ اس خارش کا کوئی علاج نہیں اور یہ ایک سے دوسرے کو تیزی سے لگنے والی خارش ہے۔ میں اس کے ابتدائی تجربات پہلے ہی کر چکا ہوں اور مجھے ان میں کامیابی ہوئی تھی۔ لیکن میں اس کا بڑے پیمانے پر تجربہ کرنا چاہتا تھا تا کہ یہ دیکھ سکوں کہ ایک پوری آبادی پر اس کے کیا اثرات ہوتے ہیں۔ اس کے لیے میں نے براکن کو منتخب کیا۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ یہاں کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ جانتے ہو کیوں۔ اس لیے کہ اس موقع پر اس تباہی کو امریکی بلاک کی مخالف قوتوں کی تخریبی سرگرمی سمجھا جائے گا اور کسی کا ذہن اس طرف نہیں منتقل ہو گا کہ یہ کام کسی امریکی سائنس دان کا ہے۔ کیوں ہے نا بات۔
ہاں ہاں باس اسمتھ نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ لیکن اب ان لوگوں کا کیا ہو گا۔
یہ سب لوگ زخمی ہو ہو کر بے ہوش ہو جائیں گے اور پھر مر جائیں گے ڈاکٹر نے اطمینان سے جواب دیا۔ انہیں کوئی نہیں بچا سکے گا
مگر .... میرا مطلب یہ ہے باس.... کہ ہمیں .... ہمیں اس سے کیا حاصل ہو گا۔ اسمتھ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا
یہ عالمی اقتدار کے حصول کی جانب ہمارا پہلا قدم ہو گا ڈاکٹر نے کہا۔ اس عجیب و غریب تباہی کی خبر ساری دنیا میں پھیل جائے گی۔ سارے ممالک کی حکومتوں کو معلوم ہو جائے گا کہ امریکہ کے ایک قصبے کی ساری آبادی کس طرح عجیب و غریب انداز میں موت کا شکار ہو گئی اور اس کے بعد ہم جس حکومت سے جو کچھ چاہیں گے حاصل کر لیں گے۔ اس دھمکی کے ساتھ کہ اگر ہماری بات نہیں مانی گئی تو ہم پورے کے پورے شہروں کو صوبوں کو اسی طرح تباہ و برباد کر دیں گے۔ بھلا کون سی حکومت ایسی ہو گی جو ہماری اس خوفناک دھمکی کے آگے گھٹنے نہیں ٹیک دے گی
تم ٹھیک کہتے ہو باس اسمتھ نے آہستہ سے کہا۔ لیکن میں اور تم اس بیماری سے اب تک کس طرح بچے ہوئے ہیں۔
بہت عمدہ سوال ہے ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں کوئی کام کچا یا ادھورا نہیں کرتا۔ میں نے یہ تجربہ اپنے ابتدائی تجربات کے پورے ایک سال کے بعد کیا ہے۔ تمہیں یاد ہو گا کہ رات کو میں نے اپنے اور تمہارے ایک ایک انجکشن لگایا تھا۔ وہ اس بیماری کی ویکسین کا ایک انجکشن تھا۔ وہ میرا ہی تیار کردہ ہے۔ اس ویکسین کے جسم میں داخل ہونے کے بعد اس بیماری کے جراثیم جسم پر حملہ آور نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ اگر میں چاہوں تو ابھی تھوڑی دیر میں یہ بیماری یہاں سے ختم ہو سکتی ہے۔ میرے پاس اس کا بھی بندوبست موجود ہے
گویا صرف تم ہی اسے ختم کر سکتے ہو۔ اسمتھ نے پوچھا
ہاں ڈاکٹر نے جواب دیا۔ صرف میں ہی اسے ختم کر سکتا ہوں۔ جانتے ہو اسمتھ میں تمہیں اپنے ساتھ کیوں لایا ہوں۔
اسمتھ خالی خالی آنکھوں سے ڈاکٹر کو دیکھنے لگا

تمہیں اپنی بے پناہ قوت کی ایک جھلک دکھانے کے لیے ڈاکٹر نے کہا۔ میں چاہتا تھا کہ جس وقت میں اپنا یہ تجربہ کروں اس وقت ایک ایسا شخص میرے ساتھ موجود ہو جس پر میں سب سے زیادہ بھروسا کرتا ہوں اور میں نے تمہیں سب سے زیادہ اعتماد کے قابل سمجھا

میں اس اعزاز کے لیے تہ دل سے تمہارا شکر گزار ہوں باس اسمتھ نے سنجیدگی سے کہا

اب تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گے کہ یہ پورا قصبہ کس طرح موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔ آج کی رات اس قصبے میں کوئی انسانی آواز سنائی نہیں دے گی۔ کسی کمرے سے محبت بھری سرگوشیاں نہیں ابھریں گی۔ کہیں سے کوئی قہقہہ بلند نہیں ہوگا۔ ہر طرف موت کا سناٹا ہوگا۔ ریڈیو اور ٹی وی کی بھی کوئی آواز سننے میں نہیں آئے گی۔ سوائے اس صورت کے کہ میں یا تم اسے آن کر دیں

اسمتھ ڈاکٹر کی باتیں سن رہا تھا اور اس کا دل دہل رہا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ باس اس قدر خوف ناک قوتوں کا بھی حامل ہو سکتا ہے

کیا تمہیں معلوم ہے کہ یانگ اور ڈوآن کا کیا ہوا۔ ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے اسمتھ سے پوچھا

نہیں باس اسمتھ نے جواب دیا۔ مجھے نہیں معلوم

میں نے ان دونوں کے زندہ جسموں کو اپنے تجربے کے لیے استعمال کیا ڈاکٹر نے کہا۔ میں ان بے چاروں کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنی موت سے میرے ابتدائی تجربات کی تکمیل کی

تو گویا تم نے سب سے پہلے ان جراثیم کو انہی پر آزمایا تھا۔ اسمتھ نے پوچھا

یونہی سمجھ لو ڈاکٹر نے جواب دیا۔ وہ مینگی کا ذکر جان بوجھ کر نہیں کرنا چاہتا تھا

تم ایک نہایت غیر معمولی انسان ہو باس اسمتھ کو یہ کہنے پر مجبور ہونا پڑا

جراثیم کی پہلی کھیپ کو چھوڑے ہوئے تقریباً" ایک گھنٹہ گزر چکا ہے ڈاکٹر نے کہا۔ آؤ ہم کانفرنس ہال کی طرف چلتے ہیں

وہ دونوں کانفرنس ہال کی طرف روانہ ہو گئے۔ سارے راستے انہیں لوگوں کی چیخیں کراہیں اور سسکیاں سنائی دیتی رہیں۔ بہت سے لوگ بے دم اور بے سدھ ہو کر فٹ پاتھوں پر سڑکوں کے کنارے گرے ہوئے تھے۔ ان میں اٹھنے کی طاقت نہیں تھی۔ مگر وہ بے تحاشا اپنے جسموں کو کھجائے جا رہے تھے۔ ان کے جسموں سے جگہ جگہ سے خون کی دھاریں بہ رہی تھیں۔ اسمتھ کے دل پر جیسے گھونسا سا لگا

پیٹرک ہال کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ سکیورٹی کے عملے کے لوگ گیٹ کے اس طرف بے ہوشی کے عالم میں پڑے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے گردنیں اور جسم کے دوسرے حصے لہولہان ہو رہے تھے اور اسمتھ نے پہلی بار یہ بات دیکھی کہ ان کے جسموں کے کچھ حصوں سے گوشت غائب ہو گیا تھا

انہی لوگوں میں اسمتھ کو کاریشیا بھی ایک طرف پڑی ہوئی نظر آئی۔ اس کے دائیں کان کی آدھی لو غائب ہو چکی تھی

اسمتھ اور ڈاکٹر بلا کسی روک ٹوک کے کانفرنس روم میں چلے گئے۔ تمام مندوبین ان کے نائبین اور عملے کے سارے لوگ فرش اور کرسیوں پر الٹے سیدھے پڑے ہوئے تھے۔ سب کے سب لہولہان ہو رہے تھے

کیا یہ سب مر چکے ہیں۔ اسمتھ نے کمزور آواز میں پوچھا

ابھی نہیں ڈاکٹر نے کہا۔ ابھی تو یہ بے ہوش ہیں لیکن کچھ دیر کے بعد مر جائیں گے اور ان کے جسموں کا گوشت غائب ہو جائے گا

اف میرے خدا!! اسمتھ کی زبان سے بے ساختہ نکلا

یہ میری طاقت کا ایک معمولی سا کرشمہ ہے اسمتھ ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور تم خوش قسمت ہو کر یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو

وہ دونوں وہاں سے نکل آئے اور برابر والے کمرے میں داخل ہو گئے

ڈاکٹر والٹر زخمی حالت میں ایک ہاتھ سے فون کا ریسیور تھامے ہوئے آپریٹر پر چلا رہا تھا۔ لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ شاید ٹیلی فون ایکسچینج کے سارے لوگ بیماری کا شکار ہو کر بے ہوش ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر والٹر کے جسم سے بھی جگہ جگہ سے خون بہ رہا تھا۔ اس کا نچلا ہونٹ پھٹا ہوا تھا اور دائیں طرف کے نتھنے کے گوشت کا کچھ حصہ غائب ہو گیا تھا۔ وہ اپنی زبردست قوت ارادی سے کام لیتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا

بالآخر اس نے ریسیور واپس رکھ دیا اور ان دونوں کی طرف دیکھا

تم.... دونوں.... ابھی تک محفوظ ہو۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ خدا کرے تم محفوظ.... محفوظ رہو ....جہاز آنے والا ہے.... ایئرپورٹ فاصلے پر ہے .... کوئی گاڑی لے کر ایئرپورٹ چلے جاؤ.... ڈاکٹر ....ڈاکٹر... آ رہے ہیں.... آہ.... اف اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا

یہ بھی گیا ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا اور وہ دونوں وہاں سے نکل آئے

کیا ہم ایئرپورٹ جائیں گے۔ اسمتھ نے پوچھا

ہرگز نہیں ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ہمیں اپنے آپ کو ان ڈاکٹروں کی نظروں سے چھپا کر رکھنا ہے ڈاکٹر نے کہا۔ آؤ اسپتال کی طرف چلتے ہیں

اسپتال کے سامنے انہوں نے جو منظر دیکھا اسے دیکھ کر اسمتھ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ حقیقی منظر ہے۔ یوں لگ رہا تھا گویا یہ دوسری عالمی جنگ کا کوئی منظر ہو جس میں نازیوں کے ہاتھوں نظر بند کیمپوں میں ہزارہا کی تعداد میں اکٹھا مرنے والے انسانوں کو زمین پر پڑے ہوئے دکھایا گیا ہو۔ ہزاروں کی تعداد میں مرد عورتیں بچے اور بوڑھے اسپتال کے سامنے اسپتال کے وسیع احاطے میں برآمدے میں اور کمروں میں زخمی اور بے ہوش حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ بہت سے تو مکمل طور پر بے ہوش حالت میں پڑے ہوئے تھا اور بہت سے ایسے تھے جو نیم بے ہوشی کے عالم میں ہاتھ پیر مار رہے تھے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں تھا۔ ان کے زخموں سے خون بہ بہ کر زمین پر گر رہا تھا

اور تب ان دونوں نے فضا میں ایک جہاز کی گڑگڑاہٹ کی آواز سنی۔ پھر انہیں ایک جہاز نیچی پرواز کرتے ہوئے نظر آیا۔ جہاز نے قصبے کی فضا میں کئی چکر لگائے۔ شاید وہ ایئرپورٹ کے ٹاور سے اترنے کا سگنل مانگ رہا تھا۔ لیکن سگنل نہیں مل رہا تھا۔ ایئرپورٹ کا سارا عملہ بے ہوش ہو چکا تھا

آخر کئی چکر لگانے کے بعد جہاز نیچے اتر گیا

اب ان لوگوں کو ایئرپورٹ سے یہاں آنے تک بمشکل دس منٹ لگیں گے ڈاکٹر نے اسمتھ سے کہا۔ وہ ایئرپورٹ پر موجود کسی بھی گاڑی میں بیٹھ کر یہاں آ سکتے ہیں۔ ہم اب واپس اپنے ہوٹل میں چلتے ہیں وہاں ہمیں چھپ جانا ہے۔ اس وقت تک کے لیے جب تک یہ ڈاکٹر بھی اس بیماری کا شکار نہیں ہو جاتے

وہ دونوں اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے اور عین اس وقت ان کے سروں پر ایک بار پھر گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ ان دونوں نے ایک ساتھ سر اٹھا کر دیکھا۔ دو ہیلی کاپٹر فضا میں پرواز کر رہے تھے اور پھر ان سے غبار سا نکل کر فضا میں پھیلنے لگا۔ وہ قصبے پر کسی طاقتور جراثیم کش دوا کا اسپرے کر رہے تھے۔ فضا میں دوا کی بو پھیل گئی۔ ڈاکٹر اس دوا سے واقف تھا۔ وہ گوشت خور جراثیم پر اس کا تجربہ کر چکا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اسے معلوم تھا کہ جراثیم پر اس دوا کا کوئی اثر

نہیں ہوگا

ہیلی کاپٹر پورے قصبے کے اوپر چکر لگا رہے تھے اور دوا کا اسپرے کر رہے تھے۔ ڈاکٹر اور اسمتھ اپنے ہوٹل پہنچ گئے جو اب شہر خموشاں کا منظر پیش کر رہا تھا۔ جگہ جگہ لابی میں برآمدے میں صحن میں زخمی انسان بے ہوشی کے عالم میں پڑے ہوئے تھے

ڈاکٹر نے اپنے کمرے میں پہنچ کر کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا سرکایا اور اسمتھ کو اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ یہاں سے وہ سڑک کو اور سڑک کے دوسری طرف واقع پیٹرک ہال کو بہ خوبی دیکھ سکتے تھے۔ ڈاکٹر کی دور بیں اور دروں بیں نظروں نے دیکھ لیا کہ پیٹرک ہال میں موجود تمام کے تمام لوگ ڈاکٹر والٹر سمیت مکمل بے ہوشی کے عالم میں تھے۔ ان کے جسموں پر سے گوشت تیزی سے غائب ہو رہا تھا

ہر طرف گہرا سناٹا تھا اور اس سناٹے میں صرف اسپرے کرنے والے ہیلی کاپٹروں کی گڑگڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی جراثیم کش دوا کی تیز بو ساری فضا میں بسی ہوئی تھی

اس گڑگڑاہٹ میں ان دو گاڑیوں کی آواز نہ سنائی دے سکی جو ایئرپورٹ کی طرف سے تیزی سے پیٹرک ہال کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھیں

☆☆

سان فرانسسکو میں محکمہ صحت کے افسر اعلیٰ کو جیسے ہی براکن سے ڈاکٹر والٹر کا فون موصول ہوا ویسے ہی اس نے ریاستی وزارت صحت سے رابطہ قائم کیا اور اسے صورت حال سے مطلع کیا۔ براکن میں ہونے والی کانفرنس کے باعث اس معاملے کی نوعیت اور بھی زیادہ سنگین ہو گئی تھی۔ وزیر صحت نے فوری طور پر دس اعلیٰ پائے کے فزیشنوں کو طلب کیا جن میں جلدی امراض کے دو ماہرین بھی شامل تھے اور ان سے اس بارے میں گفتگو کی۔ کوئی وقت ضائع کیے بغیر سب سے زیادہ سن رسیدہ اور تجربے کار فزیشن ڈاکٹر واٹ کے زیر سرکردگی پانچ ڈاکٹروں پر مشتمل ایک ہنگامی ٹیم تیار کی گئی جس میں ڈاکٹر واٹ کے علاوہ ڈاکٹر رابسن ڈاکٹر وارڈ ڈاکٹر واکر اور ڈاکٹر پیریز شامل تھے۔ ڈاکٹر پیریز ایک تجربے کار ماہر امراض جلد تھا۔ ان ڈاکٹروں سے درخواست کی گئی کہ وہ ضروری ادویہ کے بھاری ذخیرے کے ساتھ پندرہ منٹ کے اندر اندر براکن پرواز کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اسی کے ساتھ براکن پر ہیلی کاپٹروں کے ذریعے نہایت زود اثر اور تیز جراثیم کش ادویات کے اسپرے کا بھی بندوبست کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ مکمل ہنگامی صورت حال کی تیاریاں شروع ہو گئیں

میٹنگ ختم ہونے کے بیس منٹ بعد ان کا جہاز سان فرانسسکو کے ہوائی اڈے سے پرواز کر چکا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا طیارہ تھا جس کا کل عملہ چار افراد پر مشتمل تھا۔ عملے کے لیے ہدایت تھی کہ وہ ایئرپورٹ کی عمارت میں ہی رہے گا۔ وہاں سے باہر نہیں جائے گا

طیارہ جب براکن کے ہوائی اڈے کے علاقے میں داخل ہوا تو اس نے کنٹرول ٹاور سے نیچے اترنے کی اجازت مانگی۔ لیکن کنٹرول ٹاور سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ وہاں کوئی سگنل وصول نہیں کر رہا تھا

طیارے کے ہواباز نے اس صورت حال سے ڈاکٹر واٹ کو مطلع کیا۔ ڈاکٹر واٹ کے چہرے کا رنگ بدل گیا

کیا تم اجازت لیے بغیر اترنے کا خطرہ مول لے سکتے ہو۔ اس نے ہواباز سے پوچھا

مجھے رن وے خالی نظر آ رہا ہے ہواباز نے کہا۔ میں اتر سکتا ہوں

اتر جاؤ ڈاکٹر واٹ نے کہا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اترنے کے بعد سان فرانسسکو کے ہوائی اڈے سے رابطہ قائم کر کے انہیں اس صورت حال کی اطلاع دو اور ان سے کہو کہ وزیر صحت مسٹر جون کو فوراً یہ بات بتا دی جائے

ہواباز نے طیارہ رن وے پر اتار دیا۔ کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ سوال یہ تھا کہ طیارے میں سیڑھی کون لگائے۔ اس کا بندوبست بھی عملے کے لوگوں نے کیا۔ وہ لوگ کود کود کر طیارے سے باہر نکلے اور پھر انہوں نے سیڑھی لگا دی جو قریب ہی موجود تھی۔ ڈاکٹر واٹ اپنے ساتھیوں کے ساتھ نیچے اتر آیا۔ وہ سب دہشت زدہ ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگے

ہوائی اڈے کی عمارت میں دور دور تک کوئی زندہ انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ البتہ کہیں کہیں فاصلے پر ایک دو آدمی زخمی حالت میں پڑے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ڈاکٹروں نے اور جہاز کے عملے کے لوگوں نے اپنے چہروں پر حفاظتی ماسک چڑھا لیے تاہم وہ گفتگو کر سکتے تھے

اب یہ احتیاط بیکار تھی کہ عملے کے لوگ ایئرپورٹ کے علاقے سے باہر نہ نکلیں۔ تباہی تو ایئرپورٹ تک پہنچ چکی تھی

یہ سب کیا ہو گیا ڈاکٹر واٹ۔ ڈاکٹر پیریز نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ یہاں تو موت کا راج معلوم ہوتا ہے۔

خدا رحم کرے ڈاکٹر واٹ نے کہا۔ مجھے تو صورت حال کی سنگینی کا بالکل اندازہ نہیں تھا

وہ قریب ترین زخمی کے پاس پہنچے۔ انہوں نے دیکھا کہ اس کا سارا جسم لہولہان تھا۔ وہ بے ہوش تھا اور اس کے چہرے پر جگہ جگہ سے گوشت غائب ہو چکا تھا

انہوں نے جلدی جلدی دوڑ دوڑ کر آس پاس پڑے ہوئے باقی زخمیوں کا بھی جائزہ لیا۔ ان کی حالت بھی مختلف نہیں تھی۔ انہیں اس چھوٹے سے ایئرپورٹ پر کوئی بیس زخمی ملے۔ وہ زندہ تھے مگر بے ہوش تھے

جلدی امراض کے ماہر ڈاکٹر پیریز نے جلدی جلدی کچھ دوائیں نکالیں اور لوگوں کو انجکشن لگانے شروع کیے

ہمیں جلد ہی قصبے کے اندر چلنا چاہیے ڈاکٹر واٹ نے کہا۔ معلوم نہیں وہاں کیا صورت حال ہو گی

وہ لوگ ایئرپورٹ کے مریضوں کو اسی حالت میں چھوڑ کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ڈاکٹر پیریز نے ان سب مریضوں کو انجکشن تو لگا دیے تھے لیکن اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ انہیں کوئی آدمی چلتا پھرتا نظر نہیں آیا۔ ان لوگوں نے خود ہی طیارے کے عملے کی مدد سے ایئرپورٹ پر موجود ایک وین میں دوائیں لا دیں اور پھر واٹ سمیت تین ڈاکٹر ایک دوسری گاڑی میں بیٹھ گئے۔ طیارے کے پائلٹ سے ڈاکٹر واٹ نے کہا کہ وہ سان فرانسسکو سے رابطہ قائم کر کے صورت حال سے مطلع کر دے

کار آگے تھی اور وین اس کے پیچھے۔ وین کو ڈاکٹر واکر چلا رہا تھا۔ وہ لوگ قدم قدم پر دہشت ناک مناظر دیکھتے ہوئے قصبے کے اسپتال کے پاس پہنچے اور یہاں انہوں نے جو کچھ دیکھا وہ انہیں پاگل کر دینے کے لیے کافی تھا

ہم کچھ نہیں کر سکتے ڈاکٹر واٹ ڈاکٹر پیریز نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قصبے پر کوئی آسمانی بلا نازل ہو گئی ہے۔ یہاں تو قصبے کی ساری ساری آبادی تباہی کا شکار ہے۔ آخر یہ ہوا کیا ہے۔

وہ لوگ آپس میں باتیں کرتے ہوئے پیٹرک ہال تک جا پہنچے۔ ڈاکٹر آرتھر فلپ اور اسمتھ نے اپنے ہوٹل کے کمرے کی کھڑکی سے انہیں گاڑیوں سے اترتے دیکھا۔ وہ لوگ عمارت کے اندر داخل ہو گئے

انہوں نے اپنے منہ پر حفاظتی ماسک چڑھا رکھے ہیں ڈاکٹر نے اسمتھ سے کہا۔ لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ یہ جراثیم صرف منہ یا ناک کے ذریعے جسم کے اندر داخل نہیں ہوتے بلکہ یہ جسم کے مساموں کے ذریعے بھی اندر داخل ہو جاتے ہیں۔ ان کی یلغار کو روکا نہیں جا سکتا۔ صرف میں انہیں ختم کر دینے کا نسخہ جانتا ہوں

کوئی بیس پچیس منٹ کے بعد وہ لوگ عمارت میں سے باہر نکلے۔ اب وہ سب کے سب کھجا رہے تھے

وہ گاڑی میں بیٹھے اور ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ڈاکٹر واٹ بڑی مشکل سے گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کے سارے جسم میں جیسے آگ لگ رہی تھی۔ بہرحال

وہ کسی نہ کسی طرح ایئرپورٹ تک پہنچ ہی گئے

جہاز کے عملے کے چاروں اراکین بیماری کا شکار ہو چکے تھے

ڈاکٹر واٹ نے ہوا باز سے کہا کہ وہ جہاز کو واپس سان فرانسسکو لے چلے اور وہاں یہ اطلاع دے دے کہ سخت ترین قرنطینہ کا بندوبست کیا جائے۔ کیونکہ ہم سب لوگ اس پراسرار بیماری کا شکار ہو چکے ہیں

میں صرف پیغام دے سکتا ہوں ہوا باز نے اپنا سینہ کھرچتے ہوئے کہا۔ میں جہاز نہیں اڑا سکتا۔ ہم میں سے کوئی جہاز نہیں اڑا سکتا۔ ہم سب اس موذی بیماری میں گرفتار ہو چکے ہیں

ڈاکٹر واٹ ڈاکٹر رابسن نے کہا۔ ہمیں یہاں کسی اور کو بلانے کی حماقت نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیں صرف سان فرانسسکو اطلاع دے دینی چاہیے اور یہ فیصلہ ان لوگوں پر چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ ہمیں واپس بلانے کے لیے دوسرا جہاز بھیجتے ہیں یا نہیں

سان فرانسسکو کے انتظامی حلقوں میں اس دہشت ناک خبر سے کھلبلی مچ گئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ فیصلہ کیا گیا کہ اب کسی بھی شخص کو براکن نہ بھیجا جائے۔ بلکہ مسلسل فضائی اسپرے کے ذریعے پراسرار بیماری کے جراثیم کو ہلاک کرنے کی کوشش کی جائے

اگلے چار گھنٹوں کے دوران وقفے وقفے سے براکن کی فضا میں ہیلی کاپٹر منڈلاتے رہے اور طرح طرح کی دواؤں کا اسپرے کرتے رہے

ڈاکٹر آرتھر اور اسمتھ نے پورے قصبے کا چکر لگایا۔ ہر طرف موت طاری تھی! کوئی شخص زندہ نہیں بچا تھا۔ لاشوں سے جگہ جگہ سے گوشت غائب ہو رہا تھا۔ اسمتھ سے یہ منظر دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ لیکن وہ دیکھنے کے لیے مجبور تھا۔ سان فرانسسکو سے آنے والے سب لوگ بھی مر چکے تھے۔ قصبے میں موجود پالتو کتے بلیاں اور دوسرے جانور بھی موجود تھے۔ سارے پرندے بھی ہلاک ہو چکے تھے۔ اسمتھ نے موت کی ایسی بے رحم حکمرانی اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی

بیرونی دنیا سے براکن کا رابطہ ہر طرح سے کٹ چکا تھا۔ ریڈیو وائرلیس ٹیلی فون کسی بھی ذریعے سے کوئی رابطہ باقی نہیں رہا تھا۔ کیونکہ پیغام وصول کرنے اور جواب دینے کے لیے کوئی زندہ نہیں تھا

سان فرانسسکو میں حکام ابھی تک اس دہشت ناک خبر کو چھپائے ہوئے تھے لیکن انہیں معلوم تھا کہ وہ زیادہ دیر تک اسے نہیں چھپا سکیں گے۔ امریکہ کے علاوہ سات مغربی ممالک کے مندوبین اپنے اپنے عملے کے ساتھ براکن میں موجود تھے ملکی اور غیر ملکی اخباری نمائندوں کی ایک خاصی بڑی تعداد وہاں گئی تھی اور اب یہ سب کے سب ہلاک ہو چکے تھے

ان گزشتہ چار گھنٹوں کے دوران ڈاکٹر آرتھر فلپ نے اسمتھ کے ساتھ براکن کے قصبے کے دو چکر لگائے لیکن ان دونوں کو کافی احتیاط سے اور بچ بچ کر چلنا پڑ رہا تھا۔ ان کے سروں پر مسلسل کئی ہیلی کاپٹر پرواز کر رہے تھے اور بعض اوقات تو وہ کافی نیچی پرواز کرنے لگتے تھے۔ ڈاکٹر ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ ہیلی کاپٹر میں بیٹھے ہوئے لوگ اسے اور اسمتھ کو دیکھ لیں۔ گو کہ وہ بدلے ہوئے حلیے میں تھے۔ تاہم اصل مسئلہ یہ نہیں تھا۔ بات یہ تھی کہ ڈاکٹر یہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو یہ معلوم ہو کہ براکن میں اس وقت کوئی زندہ انسان بھی موجود ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ اس قصبے کو مکمل طور پر مردہ سمجھ لیا جائے

براکن کی فضا میں طرح طرح کی جراثیم کش دواؤں کی مسلسل بارش ہو رہی تھی اور ان کی تیز بو سے اسمتھ کا سر چکرایا جا رہا تھا۔ لیکن ڈاکٹر ان ساری دواؤں سے واقف تھا اور ان سب کو وہ پہلے ہی گوشت خور جراثیم پر آزما چکا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی دوا ان جراثیم کو ہلاک نہیں کر سکتی تھی

پانچ گھنٹے کے اندر اندر براکن مکمل طور پر ایک مردہ

قصبے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ یہاں اب ہزاروں لاشوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ڈاکٹر آرتھر اور اسمتھ صرف دو زندہ انسان اس مردہ قصبے میں موجود تھے

اسمتھ نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ ہولناک اور دل دہلا دینے والا منظر نہیں دیکھا تھا۔ وہ آگ اور خون میں کھیلنے والا انسان تھا۔ خطرات سے الجھنا اس کی زندگی کا ایک جزو تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں کتنے ہی لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اور اسے کبھی اپنے کیے پر افسوس نہیں ہوا تھا۔ کبھی اس کے دل میں یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے وہ اخلاقی انسانی اور قانونی نقطہ نظر سے کس قدر غلط اور لائق تعزیر ہے۔ لیکن آج جو کچھ ہوا تھا۔ اس نے اس کے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ہزاروں انسان کتے بلیوں کی طرح بے بسی کی موت مر گئے تھے۔ ان کی لاشوں کو دفن کرنے والا بھی کوئی نہیں بچا تھا۔ اسمتھ کو اپنی دیکھی ہوئی وہ بہت سی فلمیں یاد آ گئیں جو دوسری عالمی جنگ کے موضوع پر بنائی گئی تھیں اور جن سے اکثر میں یہ دکھایا گیا تھا کہ نازیوں نے کس طرح مشرقی یورپ کے بہت سے ممالک میں ہزاروں انسانوں کو نظر بندی کے کیمپوں میں طرح طرح کے اذیت ناک طریقوں سے ہلاک کیا۔ ہزاروں انسانوں کو کسی بڑے سے ہال میں جانوروں کی طرح ٹھونس کر اس میں زہریلی گیس چھوڑ دی جاتی تھی اور باہر نکلنے کے سارے راستے بند کر دیے جاتے تھے۔ وہ سب کے سب اس جگہ دم گھٹنے کی وجہ سے ہلاک ہو جاتے تھے۔ اسمتھ کو یہ بھی معلوم تھا کہ نازی ڈاکٹر زندہ انسانوں پر طرح طرح کے خوفناک اور ہلاکت انگیز تجربات کرتے تھے

اسے ایسا محسوس ہوا کہ گویا ڈاکٹر آرتھر فلپ میں ہٹلر کی روح سما گئی ہے۔ انسانی نسلوں کا دشمن ہٹلر ایک بار پھر اپنی تمام تر خباثتوں کے ساتھ جاگ اٹھا ہے

تم دیکھ رہے ہو کہ وہ اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں کہ اس طوفان پر قابو پا لیں۔ ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے اسمتھ سے پوچھا

ہاں ہاں اسمتھ نے جواب دیا۔ وہ طرح طرح کی دوائیں چھڑک رہے ہیں

مگر سب بے سود ڈاکٹر نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ میں ان جراثیم پر ان ساری دواؤں کو آزما چکا ہوں۔ وہ ان سے نہیں مریں گے

پھر یہ کس طرح مریں گے باس۔ اسمتھ نے پوچھا۔ کیا براکن سے باہر تک نہیں پھیل جائیں گے۔

اگر میں چاہوں تو ایسا بھی ہو سکتا ہے اسمتھ ڈاکٹر نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ اس وقت سب کچھ میرے ہاتھ میں ہے۔ میں ان جراثیم کے دائرہ کار کو براکن سے باہر تک پھیلا سکتا ہوں۔ آس پاس کے تمام علاقے اس کی زد میں آ سکتے ہیں اور پھر یہ سلسلہ بڑھتا جائے گا۔ یہاں تک کہ پوری اسٹیٹ پورا ملک اس کی لپیٹ میں آ سکتا ہے اور پھر دوسرے ممالک بھی اور ساری دنیا بھی۔ جہاں جہاں تک جراثیم سے متاثر لوگ اور اشیا پہنچ جائیں گے وہاں وہاں تباہی پھیلتی جائے گی۔ اس تباہی کو روکنے کے لیے ان کے پاس کوئی راستہ نہیں ہے اور شاید اگر وہ اس کا توڑ دریافت کرنے میں کامیاب ہو بھی جائیں تو اس کے لیے انہیں ایک عرصہ درکار ہوگا۔ اس عرصے کے دوران بات کہاں سے کہاں پہنچ جائے گی۔ ہو سکتا ہے کہ توڑ کرنے والے خود ہی سلامت نہ رہیں۔ جیسا کہ یہاں ہوا۔ تم نے دیکھا کہ براکن کے تمام ڈاکٹر اور وہ ڈاکٹر جو باہر سے یہاں آئے تھے۔ سب کے سب اس طوفان کا شکار ہو کر ختم ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے

ڈاکٹر بڑے جوش و خروش کے عالم میں بول رہا تھا اور اسمتھ سحر زدہ سا اس کی باتیں سن رہا تھا

میں۔ صرف میں ڈاکٹر نے فضا میں مکا لہراتے ہوئے کہا۔ اس کرہ ارض پر میں وہ واحد انسان ہوں جسے اس طوفان کو روکنے کا راز معلوم ہے اور میں اس کی پوری پوری قیمت وصول کروں گا۔ ابھی نہیں۔ آئندہ چل کر

لیکن ہاس اسمتھ نے قدرے خوفزدہ آواز میں کہا۔ ہم قصبے کے کئی چکر لگا چکے ہیں اور اب تک یہاں کوئی جاندار زندہ نہیں بچا ہے تمہارے پاس اس طوفان کو روکنے کا جو علاج ہے میرے خیال میں اب اسے آزمانے کا وقت آ گیا ہے۔ اگر تم فی الحال اس طوفان کو براکن سے آگے نہیں بڑھنے دینا چاہتے تو

میں اسے براکن سے آگے نہیں بڑھنے دوں گا ڈاکٹر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ میرے خیال میں تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ اب وقت آ گیا ہے کہ میں اس کی روک تھام کا بندوبست کروں چلو اسمتھ آج تم بہت سی ایسی نئی اور انوکھی چیزیں دیکھو گے جو تم نے اس سے پہلے زندگی بھر نہ دیکھی ہوں گی

وہ دونوں کھلی جگہوں سے بچتے بچاتے اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے

☆☆

سان فرانسسکو اور واشنگٹن میں ایک عجیب و غریب صورت حال پیدا ہو چکی تھی

سان فرانسسکو میں محکمہ صحت کے افسران ڈاکٹر واٹ اور اس کے ساتھیوں سے رابطہ پیدا کرنے میں ناکام ہو چکے تھے۔ ٹیلی فون کے ذریعے تو رابطہ کافی پہلے ہی ختم ہو گیا تھا۔ پورے براکن میں کہیں بھی کوئی شخص کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ سان فرانسسکو کے حکام نے سخت پریشانی اور وحشت کے عالم میں یہ سمجھ لیا کہ براکن میں ٹیلی فون ایکس چینج نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے اور وہاں کوئی شخص ڈیوٹی پر موجود نہیں ہے۔ اس کے بعد انہوں نے متعدد طریقے آزمائے۔ لیکن براکن کی طرف سے مکمل خاموشی تھی۔ کسی ٹیلیکس مشین سے کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ کوئی ٹیلی گراف پیغام موصول نہیں کیا جا رہا تھا۔ کوئی ریڈیائی پیغام موصول نہیں کیا جا رہا تھا۔ براکن میں کسی بھی قسم کا کوئی ریسیونگ سیٹ کام نہیں کر رہا تھا

سان فرانسسکو کے حکام نے ایئر پورٹ سے اس جہاز سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی جس کے ذریعے ڈاکٹر واٹ اور اس کے ساتھیوں کو براکن بھیجا تھا لیکن یہاں سے بھی کوئی جواب نہیں ملا

اس اثنا میں محکمہ صحت کے حکام کی طرف سے محکمہ داخلہ اور محکمہ خارجہ کو اس ہنگامی صورت حال کی اطلاع دے دی گئی۔ فوراً ہی یہ اطلاع واشنگٹن پہنچا دی گئی اور صدر امریکا کو اس سے مطلع کر دیا گیا۔ واشنگٹن میں کئی سرکاری ایجنسیاں آناً" فاناً" حرکت میں آ گئیں۔ ڈاکٹروں سائنسدانوں اور بعض دیگر ماہرین کے علاوہ ایف بی آئی سی آئی اے اور پولیس کے اعلیٰ حکام اور ماہرین کی جماعتیں آدھے گھنٹے کے اندر اندر سان فرانسسکو پہنچ گئیں۔ صورت حال کو سمجھنے جانچنے اور کنٹرول کرنے کا قریب ترین مرکز سان فرانسسکو ہی تھا

سان فرانسسکو کے محکمہ صحت کے حکام نے ابتدائی دو ہیلی کاپٹر بھیجے تھے جن میں نہایت زود اثر جراثیم کش ادویات موجود تھیں تو انہیں یقین تھا کہ اس کارروائی کے نتیجے میں صورت حال قابو میں آ جائے گی۔ لیکن ان کی توقعات کے بالکل برعکس ایسا نہ ہوا۔ ڈاکٹر واٹ کی سرکردگی میں بھیجی جانے والی ڈاکٹروں کی ٹیم کے ارکان سے بھی ان لوگوں کا دوبارہ رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ اعلیٰ حکام کی حیرت اور تشویش کی انتہا نہ رہی اور انہوں نے فوراً ہی واشنگٹن کو اس صورت حال سے مطلع کر دیا اور اس کے ساتھ ہی وہاں سے عارضی طور پر ڈاکٹروں اور سائنسدانوں کی ایک ہنگامی طور پر قائم کردہ کمیٹی کی زیر نگرانی مختلف اقسام کی دواؤں کا ہیلی کاپٹروں کے ذریعے براکن پر چھڑکاؤ کرتے رہے۔ واشنگٹن سے بھی انہیں یہی ہدایات ملیں کہ وہ اس کام کو تسلسل کے ساتھ جاری رکھیں اور کسی اور شخص کو براکن نہ بھیجیں۔ چنانچہ سان فرانسسکو کے حکام نے اپنی کارروائیاں جاری رکھیں۔ دریں اثنا واشنگٹن کے حکام برابر سان فرانسسکو سے رابطہ قائم کیے ہوئے تھے۔ لیکن انہیں کوئی حوصلہ افزا اطلاع نہیں مل رہی تھی

واشنگٹن سے آنے والے اعلیٰ ترین ماہرین نے فوراً ہی سان فرانسسکو کے ان ماہرین سے گفتگو کی جن کی زیر نگرانی اب تک جراثیم کش ادویات کا چھڑکاؤ کیا جا رہا تھا۔ انہوں نے بعض نئی دوائیں تجویز کیں۔ سان فرانسسکو میں دوا ساز کمپنیوں کے گودام تیزی سے خالی ہونے لگے

اب ساری مہم کا نگراں ڈاکٹر برکلے تھا جو واشنگٹن سے آیا تھا اور جس کا شمار دنیا کے چند اعلیٰ ترین ماہرین جراثیم میں ہوتا تھا۔ ڈاکٹر برکلے اب بہ نفس نفیس ساری کارروائیوں کی تنظیم کر رہا تھا۔ وہ اس ہوائی اڈے پر خود موجود تھا۔ جہاں سے ہیلی کاپٹر دوائیں لے کر پرواز کر رہے تھے۔ اس بار جو دوا چھڑکی جا رہی تھی وہ بہت ہی منفرد قسم کی تھی۔ اس ہیلی کاپٹر کو اردن نامی ہوا باز اڑا رہا تھا

اردن ڈاکٹر برکلے نے کہا۔ میں یہیں ہوائی اڈے پر کنٹرول پر موجود ہوں۔ تم ذرا نیچی پرواز کرنا اور شہر کی صورت حال کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد مجھے مطلع کرنا میں کنٹرول پر تمہارے پیغام کا انتظار کروں گا

ٹھیک ہے ڈاکٹر اردن نے کہا۔ ویسے اس سے پہلے ہاورڈ اور کلائن واپس آ چکے ہیں۔ انہوں نے جو رپورٹ دی تھی وہ بڑی ہولناک تھی۔ خدا کرے کہ میں اس سے کچھ بہتر رپورٹ دے سکوں

لیکن اردن نے کچھ دیر کے بعد ڈاکٹر برکلے کو جو رپورٹ دی وہ اس قدر دہشت ناک تھی کہ ڈاکٹر برکلے کے ہوش و حواس گم ہو گئے

میں نے اسپرے کرتے ہوئے پورے قصبے کا جائزہ لے لیا ہے اردن نے کہا۔ اور میں نہایت افسوس کے ساتھ یہ اطلاع دے رہا ہوں کہ مجھے کوئی زندہ چیز حرکت کرتے ہوئے دکھائی نہیں دی۔ کوئی گاڑی کوئی سواری کوئی انسان کوئی جانور کوئی پرندہ کچھ بھی زندہ نہیں ہے

تم کیا دیکھ رہے ہو۔ ڈاکٹر برکلے نے بھاری آواز میں اس سے پوچھا

مجھے نیچے سڑکوں پر گلیوں میں میدانوں میں صرف نیچے پڑے ہوئے انسان نظر آ رہے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ یہ مردہ ہیں یا بے ہوش ہیں۔ اس کے علاوہ جو چیز جہاں ہے ساکت ہے۔ سڑکوں پر گاڑیاں چپ چاپ کھڑی ہوئی ہیں اردن نے کہا

کیا تمہیں فضا میں اڑتا ہوا کوئی پرندہ نظر آ رہا ہے۔ ڈاکٹر برکلے نے پوچھا

نہیں اردن نے جواب دیا۔ مجھے کوئی پرندہ نظر نہیں آ رہا ہے

کیا تم یہاں کی فضا میں کوئی خاص قسم کا رنگ کوئی ایسی بات کوئی ایسی چھوٹی سی بات محسوس کر رہے ہو جو بظاہر غیر اہم نظر آتی ہو۔

یہاں کی فضا بالکل صاف و شفاف ہے۔ اردن نے جواب دیا۔ فضا میں کوئی خاص اور منفرد بات نہیں ہے۔ صرف جراثیم کش ادویات کی تیز اور ناگوار بو پھیلی ہوئی ہے

ٹھیک ہے ڈاکٹر برکلے نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ اپنا کام ختم کر کے واپس آ جاؤ

ڈاکٹر برکلے ایئر پورٹ سے واپس اس عمارت میں آ گیا۔ جہاں حکام اور ماہرین کی جماعت اس کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی

مجھے ڈر ہے کہ براکن میں کوئی زندہ نہیں بچا ہے ڈاکٹر برکلے نے اپنے بھاری بھرکم جسم کو ایک کرسی پر گراتے ہوئے کہا۔ ہمیں ہر طرف سے براکن کی ناکہ بندی کر دینی چاہیے۔ سخت احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ براکن کی فضا میں اب مزید کوئی ہیلی کاپٹر بھی نہ بھیجا جائے۔ فضائی اور زمینی دونوں راستے بالکل مسدود کر دیے جائیں

مگر ڈاکٹر برکلے ڈاکٹر انجیلا نے کہا جو مائیکرو بیالوجی (خورد حیاتیات) کی ایک مشہور عالم ماہر تھیں۔ یہ تو مسئلے کا حل نہیں ہوا۔ اس طرح ہم آگے کس طرح بڑھ سکیں گے

اورہمیں کس طرح معلوم ہوسکے گا کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔

تم ٹھیک کہتی ہو ڈاکٹر انجیلا ڈاکٹر برکلے نے کہا۔ یہ مسئلے کا حل نہیں۔ جن انسانی جانوں کا اتلاف ہو چکا ہے ظاہر ہے ان کے لیے تو ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ لیکن مزید جانوں کے اتلاف کو روکنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم زیادہ سخت احتیاطی تدابیر اختیار کریں۔ ہمارے کام کے دومرحلے ہیں۔ پہلا مرحلہ یہ ہے کہ احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں اور براکن شہر کی فضا یا زمین سے اب کسی دوسرے انسان کا رابطہ قائم نہ ہو۔ کسی صورت میں بھی نہ ہو اور دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ اس سارے عذاب کی تہ تک پہنچا جائے

مگر کس طرح ڈاکٹر برکلے۔ بایوکیمسٹری (حیاتیاتی کیمیا) کے ماہر پروفیسر ڈاکٹر وارنسکی نے کہا۔ کیا تمہارے ذہن میں اس سلسلے میں کوئی تجویز ہے۔ اگر ہے تو بتاؤ

میرے ذہن میں ایک تجویز ہے ڈاکٹر برکلے نے کہا۔ گو کہ اس میں شدید خطرہ ہے لیکن ہمیں یہ خطرہ مول لینا پڑے گا۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ ہم میں سے کسی ایک کو ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر خود براکن جانا ہوگا۔ تمام تر احتیاطی تدبیروں کے ساتھ یعنی سر سے پاؤں تک جراثیم کش اور جراثیم روک لباس پہن کر ہم سب جانتے ہیں کہ اس قسم کے لباس موجود ہیں اور پھر ہم براکن کے قصبے سے وہاں کی فضا کے نمونے اور کسی مردہ انسان کے جسم کا تھوڑا سا حصہ اپنے ساتھ لے کر آئیں گے تاکہ اس کا فوری طور پر لیبارٹری میں تجزیہ کرکے پتا چلایا جاسکے کہ یہ سب کچھ کیا ہے

تمہاری تجویز تو بہت معقول ہے ڈاکٹر ڈاکٹر انجیلا نے کہا۔ اور ہم سب یہ بات جانتے ہیں کہ طبی خصوصیات کے حامل مانع جراثیم لباس موجود ہیں۔ لیکن یہاں دو سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا سوال تو یہ ہے کہ جس شدت کے ساتھ اور جس پیمانے پر براکن میں یہ عذاب نازل ہوا ہے اس کے پیش نظر اس بات کا کس حد تک یقین کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے مانع جراثیم لباس بالکل محفوظ اور قابل اعتماد ثابت ہوں گے اور دوسری بات یہ ہے کہ ہم میں سے کون..... میرا مطلب ہے

یہ کہ ہم میں سے کون جائے گا۔ ڈاکٹر برکلے نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تو اس سوال کا جواب مجھ سے سنو۔ میں جاؤں گا۔ میں خود جاؤں گا

تم۔ ڈاکٹر برکلے تم۔ کئی حیرت بھری آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں

ہاں میں ڈاکٹر برکلے نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔ میں چونکہ اس تنظیم کا سربراہ ہوں اس لیے سب سے زیادہ ذمے داری مجھ پر عائد ہوتی ہے اور میں اخلاقی طور پر اس بات کا پابند ہوں کہ کسی اور شخص کو خطرے میں مبتلا ہونے سے بچاؤں

نہیں ڈاکٹر محکمہ داخلہ کے ایک اعلیٰ افسر نے کہا۔ صرف فضا اور جسم یا خون کے نمونے ہی تو جمع کرنے ہیں اور یہ کام کوئی معمولی آدمی میرا مطلب ہے کوئی بھی عام آدمی انجام دے سکتا ہے۔ اس کے لیے تم جیسے اعلیٰ پائے کے ماہر کی کیا ضرورت ہے۔ تمہیں تو اس سے کہیں زیادہ ضروری کام انجام دینے ہیں

میں سمجھتا ہوں مسٹر راجر کہ مجھے کیا کرنا ہے ڈاکٹر برکلے نے مسکراتے ہوئے کہا۔ صرف فضا اور جسم اور خون کے نمونے جمع کرنے ہیں یہ تو ٹھیک ہے لیکن اس خصوصی موقع پر اس کام کے لیے جس اعلیٰ مہارت اور سائنسی علم کی ضرورت ہے اس کے پیش نظر کوئی عام آدمی یہ کام انجام نہیں دے سکتا۔ میرا خود جانا بہت ضروری ہے

اسی وقت کمرے میں موجود فون کی گھنٹی بجی۔ محکمہ خارجہ کے نائب سیکریٹری نے ریسیور اٹھایا اور غور سے سننے لگا

صدر امریکہ کا فون ہے۔ وہ ڈاکٹر برکلے سے بات کرنا چاہتے ہیں

ڈاکٹر برکلے نے صدر امریکہ کو صورت حال سے آگاہ کیا اور یہ بتایا کہ اب تک کی تمام تدابیر ناکام ہو چکی ہیں

اور آخری اطلاع کے مطابق قصبے میں کوئی شے حرکت کرتے ہوئے نظر نہیں آرہی ہے۔ اس نے صدر امریکہ کو اپنے منصوبے سے بھی آگاہ کیا

کیا تمہارا ہی جانا ضروری ہے ڈاکٹر برکلے۔ صدر امریکا نے پوچھا۔ تم جانتے ہو کہ وزارت دفاع کے سائنسی حصے میں شعبہ جراثیم کو تمہاری کس قدر ضرورت ہے۔ ہم تم جیسے اعلیٰ پائے کے ماہر کی جان کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتے

مجھے یقین ہے کہ میری جان کو خطرہ لاحق نہیں ہوگا ڈاکٹر برکلے نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ مجھے اپنا کام کرنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔ میں پوری طرح محفوظ ہو کر جاؤں گا۔ میرے جانے میں ایک مزید فائدہ یہ ہے کہ میرے ساتھ کسی ہوا باز کو نہیں جانا پڑے گا۔ میں خود جہاز اڑا سکتا ہوں کیونکہ میں ایک تربیت یافتہ پائلٹ بھی ہوں

ٹھیک ہے صدر امریکا نے کہا۔ تمہاری واپسی کے بعد تمہیں اور تمہارے ہیلی کاپٹر کو سخت قرنطینہ میں رہنا چاہیے

ایسا ہی ہوگا ڈاکٹر برکلے نے کہا

دراصل ہم ایک انتہائی پیچیدہ اور ناقابل فہم صورت حال کا شکار ہوگئے ہیں صدر امریکا نے کہا۔ ساری دنیا کو معلوم ہے کہ براکن میں کانفرنس ہو رہی تھی اور کئی ممالک کے مندوبین ان کا عملہ اخباری نمائندے اور دیگر ذرائع ابلاغ کے نمائندے وہاں موجود تھے۔ کانفرنس کے شروع ہوتے ہی یہ عجیب و غریب معاملہ شروع ہوگیا ہم ابھی تک یہ پوری کوشش کر رہے ہیں کہ یہ بات منظر عام پر نہ آنے پائے۔ لیکن اس معاملے کو زیادہ دیر تک چھپایا نہیں جاسکتا۔ کئی حکومتوں کے دارالحکومتوں میں بے چینی پھیلنا شروع ہوگئی ہے

مجھے اس کا احساس ہے جناب صدر ڈاکٹر برکلے نے کہا۔ میں جلد از جلد ضروری انتظامات کی تکمیل کے بعد براکن جانے کے لیے تیار ہو رہا ہوں

تمہاری عدم موجودگی میں ڈاکٹر انجیلا اس مہم کی نگراں ہوں گی صدر امریکہ نے کہا۔ یہ بات مہم کے سارے لوگوں کو بتادی جائے

بہتر ہے جناب صدر ڈاکٹر برکلے نے کہا

میں تمہاری کامیابی کا متمنی ہوں صدر امریکہ نے کہا

شکریہ جناب صدر ڈاکٹر برکلے نے کہا اور فون بند کردیا

صدر امریکہ نے ڈاکٹر برکلے کو جو کچھ بتایا تھا۔ فی الحقیقت صورت حال اس سے کہیں زیادہ خراب ہو چکی تھی براکن کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے جن جن ممالک کے مندوبین اپنے اپنے عملے کے ساتھ آئے تھے۔ ان سب ممالک کے سفارت کار واشنگٹن میں موجود تھے۔ علاوہ ازیں امریکہ اور بیرونی ممالک کے بڑے بڑے اخبارات نیوز ایجنسیوں ریڈیو اور ٹی وی کے نمائندوں کی ایک بھاری تعداد بھی براکن میں موجود تھی۔ واشنگٹن کے غیر ملکی سفارت خانوں میں یہ سمجھا جا رہا تھا کہ دوپہر کے کھانے کے وقفے کے بعد مندوبین اپنے اپنے متعلقہ سفارت خانوں سے رابطہ قائم کرکے انہیں اب تک کی پیش رفت سے مطلع کریں گے اور اگر ضروری ہوگا تو مزید ہدایات حاصل کریں گے یا مشورہ کریں گے۔ لیکن دوپہر کا پورا وقت گزر گیا اور واشنگٹن میں قائم کسی بھی سفارت خانے کو اپنے مندوب کی جانب سے کوئی پیغام نہیں ملا۔ خاص طور سے فرانسیسی سفیر کو فرانس کے مندوب کے پیغام کا بے چینی سے انتظار تھا۔ کیونکہ جن امور پر براکن کانفرنس میں بحث کی جانی تھی۔ ان میں سے کئی ایک ایسے تھے جن کے بارے میں امریکہ اور فرانس کے درمیان سخت اختلافات موجود تھے اور واشنگٹن میں موجود فرانسیسی سفیر کو فرانسیسی حکومت کی جانب سے ساری صورت حال سے اچھی طرح آگاہ کرکے یہ بتادیا گیا تھا کہ وہ کانفرنس کے دوران مندوب سے رابطہ قائم کرکے صلاح مشورہ کرے گا۔ لیکن پوری دوپہر گزر گئی اور

فرانسیسی سفیر کو اپنے ملک کے مندوب کا کوئی پیغام نہیں ملا۔ کافی انتظار کے بعد سفیر نے خود ہی فون کے ذریعے براگمن میں اپنے ملک کے مندوب سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ لیکن براگمن میں کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ آدھے گھنٹے تک پیہم کوشش کرنے کے بعد فرانسیسی سفیر نے واشنگٹن میں امریکی دفتر خارجہ میں رابطہ قائم کیا اور اس بات کی وضاحت چاہی کہ براگمن سے فون کال کا کوئی جواب کیوں نہیں آرہا ہے۔ ایک پہلے سے طے شدہ پالیسی کے مطابق فرانسیسی سفیر کو دفتر خارجہ کی طرف سے بتایا گیا کہ براگمن سے فون کا رابطہ منقطع ہوگیا ہے اور امید ہے کہ جلد ہی بحال ہو جائے گا

کئی اور سفارت خانوں کے ساتھ بھی یہی صورت حال تھی۔ انہوں نے اپنے اپنے مندوبین کی فون کالوں کا انتظار کرنے کے بعد خود براگمن میں ان سے رابطہ قائم کرنا چاہا لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ تنگ آ کر انہوں نے امریکی دفتر خارجہ سے رابطہ قائم کیا اور انہیں وہی گول مول سا جواب دیا گیا جو سب سے پہلے فرانسیسی سفیر کو دیا گیا تھا

فرانسیسی سفیر امریکی دفتر خارجہ کی اس وضاحت سے قطعی مطمئن نہ ہوا۔ اس کا ذہن اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے قطعاً" آمادہ نہیں تھا کہ براگمن جیسے شہر کا جہاں اس قدر اہم نوعیت کی بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہو رہی ہو۔ تمام دنیا سے ٹیلی فونک رابطہ کس طرح ختم ہوسکتا ہے اور وہ بھی گھنٹوں کے لیے۔ اسے اس معاملے میں کسی سخت گڑبڑ کی بو محسوس ہوئی۔ اس نے اندازہ لگایا کہ اصل صورت حال کا امریکی دفتر خارجہ والوں کو علم ہے لیکن وہ اسے جان بوجھ کر چھپا رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ جو بات چھپائی جا رہی ہے وہ ضرور کوئی ناخوشگوار بات ہوگی

چنانچہ اس نے فوراً پیرس میں فرانسیسی دفتر خارجہ سے رابطہ قائم کر کے وہاں اس عجیب و غریب اور ناقابل فہم صورت حال کی اطلاع دے دی

فرانسیسی وزیر خارجہ اس وقت پیرس میں ہی موجود تھا۔ اس نے فوراً امریکی وزیر خارجہ سے رجوع کیا لیکن اسے بتایا گیا کہ امریکی وزیر خارجہ سے گفتگو ممکن نہیں ہے کیونکہ وہ واشنگٹن میں موجود نہیں ہے حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ امریکی وزیر خارجہ واشنگٹن میں ہی موجود تھا اور براگمن کی وحشت ناک اور دہشت ناک صورت حال سے پوری طرح باخبر تھا۔ فرانسیسی وزیر خارجہ کی گفتگو امریکی دفتر خارجہ کے بعض دوسرے افسران سے ہوئی لیکن وہ براگمن کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہ بتا سکے جتنا وہ اس سے پہلے فرانسیسی سفیر کو بتا چکے تھے

اور بھی کئی سفارت خانوں نے امریکی دفتر خارجہ سے معلومات حاصل کرنا چاہیں اور انہیں بھی ایک ہی طے شدہ جواب دیا گیا

سب سے زیادہ خراب صورت حال ذرائع ابلاغ کے محاذ پر تھی

اخبارات اور خبر رساں ایجنسیوں میں بڑی بے چینی سے ان خبروں کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ جو ان نامہ نگاروں کے ذریعے پہنچنے والی تھیں جو ان اداروں کی جانب سے کانفرنس کو کوریج کے لیے بھیجے گئے تھے۔ لیکن دوپہر ہونے کے بعد کسی اخباری نمائندے کی طرف سے کوئی پیغام موصول نہیں ہوا۔ ابتدائی خبریں تک جن میں کانفرنس کے آغاز اور دیگر ابتدائی باتوں کے بارے میں بتایا جانا تھا۔ موصول نہیں ہوئیں۔ یہ ایک عجیب سی صورت حال تھی۔ چنانچہ ان اداروں کی طرف سے براگمن فون کیے جانے لگے۔ لیکن براگمن سے کوئی جواب نہیں آرہا تھا

اخباروں کے ایڈیٹروں اور خبر رساں ایجنسیوں کے متعلقہ شعبوں کے سربراہوں اور ریڈیو اور ٹی وی اسٹیشنوں کے شعبہ ہائے خبر کی جانب سے امریکی وزارت اطلاعات و نشریات کے دفاتر میں ٹیلی فونوں کا تانتا بندھ گیا۔ کئی کئی پریس سیکریٹری فون ریسیو کر رہے تھے اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ایک ہی

جواب دے رہے تھے۔ بعض فنی وجوہات کی بنا پر براگمن سے ٹیلی فون کا رابطہ منقطع ہوگیا ہے جو جلد بحال ہو جائے گا۔ ذرائع ابلاغ کی متجسس اور باوسائل دنیا کو مطمئن کرنے کے لیے یہ جواب بالکل ناکافی تھا۔ چنانچہ اخباری دنیا میں ایک ہل چل مچ گئی۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ فون کیے جانے لگے۔ کہیں سے بھی کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا

بیرونی ممالک کے اخبارات کو براگمن کانفرنس کی خبروں کا انتظار تھا۔ لیکن انہیں اپنے نمائندوں کی جانب سے کوئی خبر نہیں ملی تھی

سان فرانسسکو کے ایڈیٹروں نے آپس میں تبادلہ خیال کیا۔ فاؤسٹ گروپ آف نیوز پیپرز کے تین اخباروں کے ایڈیٹروں نے یہ طے کیا کہ صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے فوری طور پر تین نمائندوں کو براگمن بھیجا جائے۔ یہ تینوں اخبارات ایک ہی ادارے کی ملکیت تھے۔ تینوں ایڈیٹر اس بات پر متفق تھے کہ کوئی نہ کوئی بڑی گڑبڑ ضرور ہے۔ جسے ذرائع ابلاغ سے اور ساری دنیا سے چھپایا جا رہا ہے۔ فوری طور تین اخباری نمائندوں کا جو کہ ماہر فوٹو گرافر بھی تھے۔ انتخاب عمل میں آگیا اور انہیں ہدایت دی گئی کہ وہ فی الفور بذریعہ جہاز براگمن روانہ ہو جائیں۔ تین اخباری نمائندوں کا یہ وفد وارن شلز اور ڈائنا پر مشتمل تھا۔ وہ تینوں ایک ساتھ ایئرپورٹ پر پہنچے۔ انہوں نے وہیں سے براگمن کے لیے ٹکٹ خریدنا چاہے

مجھے افسوس ہے متعلقہ کلرک نے جواب دیا۔ آج کے دن کوئی پرواز براگمن نہیں جاسکے گی

مگر کیوں۔ ڈائنا نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا

ہمیں اطلاع ملی ہے کہ براگمن کے ایئرپورٹ پر کنٹرول ٹاور میں کچھ خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں اس لیے براگمن کے لیے ساری پروازیں روک دی گئی ہیں کلرک نے وہ بات کہہ دی جس کے بارے میں اس کے افسران کی جانب سے اسے ہدایت دی گئی تھی

یہ کیا بکواس ہے ڈائنا بگڑ کر بولی۔ کیا ہم لوگ پتھر کے زمانے میں رہ رہے ہیں۔ کیا ایئرپورٹ کے کنٹرول ٹاور کو چلانے والے ازمنہ وسطٰی کے لوہار اور راج مزدور ہیں۔ کس قسم کی احمقانہ باتیں کر رہے ہو۔

سب فضول باتیں ہیں وارن نے کاؤنٹر کلرک کو گھورتے ہوئے کہا۔ کنٹرول ٹاور میں خرابی پیدا ہوگئی اور اس لیے پروازیں بند کردی گئیں۔ کس قدر مسخروں والی بات ہے یہ۔ ہمیں فوراً براگمن پہنچنا ہے

میں نے تم لوگوں کو بتا دیا ہے کہ کوئی پرواز براگمن نہیں جا رہی ہے کلرک نے خشک لہجے میں کہا۔ اور یہ بھی جان لو کہ اس کی کوئی ذمے داری مجھ پر عائد نہیں ہوتی۔ پروازوں کو روکنا یا جاری کرنا میرے فرائض میں شامل نہیں ہے۔ میرا کام صرف ٹکٹوں کی بکنگ کرنا ہے۔ میں نے تم لوگوں کو وہی بات بتادی ہے۔ جو خود مجھے بتائی گئی ہے۔ اس سے زیادہ میں نہیں جانتا

ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے شلز نے کہا۔ ہم تمہارے منیجر سے بات کرنا چاہتے ہیں

ضرور کرو۔ کلرک نے بیزاری سے کہا۔ وہ اندر بیٹھا ہوا ہے

وہ تینوں منیجر کے پاس پہنچ گئے۔ ڈائنا خاصے غصے میں معلوم ہوتی تھی

ہمیں اپنے پیشہ ورانہ فرائض کی انجام دہی کی غرض سے براگمن جانا ہے اس نے اپنا اخباری نمائندے کا کارڈ نکال کر منیجر کے سامنے میز پر جھکتے ہوئے کہا۔ تمہارا کلرک کہتا ہے کہ براگمن کے لیے پروازیں بند ہیں۔ ٹکٹ نہیں مل سکتا۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ یہ سب کیا ہے۔

میں تمہیں وہی بتا سکتا ہوں مس جو مجھے معلوم ہے منیجر نے بڑے سکون سے کہا۔ اور جو کچھ مجھے معلوم ہے وہ تم کلرک کی زبانی سن چکی ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ اس سے زیادہ مجھے نہیں معلوم

لیکن تم خود ہی بتاؤ کیا اس بات کا یقین کیا جاسکتا ہے

شلز نے کہا۔ کیا یہ عذر انتہائی مضحکہ خیز نہیں ہے۔

شاید منیجر نے جواب دیا۔ لیکن محکمہ شہری ہوا بازی کے حکام نے ہمیں یہی بتایا ہے

تم نے خود براکٹن سے رابطہ قائم کرکے صحیح صورت حال معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وارن نے پوچھا

میرا خیال ہے کہ براکٹن کے لیے روانگی سے پہلے تم لوگوں نے بھی وہاں سے فون ٹیلی پرنٹر یا ٹیلیکس کے ذریعے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی ہوگی منیجر نے وارن کو گھورتے ہوئے کہا۔ کیا تم رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہوسکے۔

ان تینوں کے پاس اب کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہ منیجر کے پاس سے واپس آگئے

ہمیں فوراً اپنے اپنے ایڈیٹروں کو اس بات کی اطلاع دینی چاہیے ڈائنا نے کہا۔ کوئی بہت ہی پراسرار اور شدید قسم کی گڑبڑ معلوم ہوتی ہے۔ اس کی نوعیت اتنی خوف ناک ہے کہ حکومت اسے سب سے چھپا رہی ہے

ضرور کوئی دہشت ناک بات ہوگی وارن نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ یوں لگتا ہے کہ براکٹن کو بالکل الگ تھلگ کردیا گیا ہے خدا جانے کیا معاملہ ہے

اس میں تخریب کاری کے امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا شلز نے کہا۔ وہاں ہونے والی کانفرنس زبردست اہمیت کی حامل تھی

ڈائنا شلز اور وارن ذرائع ابلاغ کے وہ واحد نمائندے نہیں تھے جو براکٹن جانے کے لیے ایئرپورٹ پہنچے اور وہاں سے مایوس لوٹے۔ ان کے علاوہ بھی ذرائع ابلاغ کے بیسیوں اور بھی نمائندے اور سان فرانسسکو میں مقیم بعض سفارتی نمائندے بھی جنہیں واشنگٹن سے اپنے سفارت خانے سے اس بات کی ہدایت ملی تھی ایئرپورٹ پہنچے۔ لیکن ان سب کو ایک ہی جواب دیا گیا کہ براکٹن کا ایئرپورٹ بند کردیا گیا ہے۔ سراسیمگی کی لہر تیز ہوتی جا رہی تھی

ڈائنا شلز اور وارن نے فوراً اپنے ایڈیٹروں سے رابطہ قائم کیا اور پھر اسی وقت تینوں ایڈیٹروں کی میٹنگ منعقد ہوئی جس میں ڈائنا شلز اور وارن بھی شامل تھے

یہ معاملہ اب نہایت تشویشناک صورت اختیار کرگیا ہے ایک ایڈیٹر نے کہا۔ میں وزارت اطلاعات ونشریات کے کئی اعلیٰ افسروں سے اس بارے میں گفتگو کرچکا ہوں لیکن وہ نہایت احمقانہ باتیں کررہے ہیں۔ خود وزیر اطلاعات ونشریات غائب ہیں۔ ان سے رابطہ ہی قائم نہیں ہوسکا۔ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ اس معاملے میں پریس کو اعتماد میں نہیں لیا جارہا ہے

میرا خیال ہے کہ ہمیں اس سلسلے میں کچھ زیادہ ہی صبر و تحمل کا ثبوت دینا چاہیے دوسرا ایڈیٹر بولا۔ آثار و قرائن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قومی سلامتی کا ایک نہایت اہم معاملہ بن گیا ہے اور خود حکومت ابھی تک یہ طے نہیں کرپائی ہے کہ اس سلسلے میں کیا اقدامات کرے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس مرحلے پر ہمیں حکومت کی مشکلات میں اضافہ نہیں کرنا چاہیے اور قومی مفاد کے پیش نظر تعاون کا مظاہرہ کرنا چاہیے

میں تمہاری بات سے متفق ہوں تیسرے ایڈیٹر نے کہا۔ ضرور کوئی انہونی سی بات ہوگئی ہے اور حکومت اسے چھپا رہی ہے۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اصل حقائق سے آگاہی حاصل کریں۔ اس کا فیصلہ تو ہم حقیقت معلوم کرنے کے بعد ہی کرسکتے ہیں کہ کیا چیز شائع کی جائے اور کیا نہ کی جائے۔ حقیقت معلوم ہوجانے کے بعد وزارت اطلاعات ونشریات کے افسروں سے اس کے بارے میں کھل کر گفتگو کی جاسکتی ہے

ٹھیک ہے پہلے ایڈیٹر نے کہا۔ ہم قومی سلامتی کے مفادات کو ہرگز نظر انداز نہیں کریں گے۔ لیکن ہمارے لیے حقائق جاننا بہت ضروری ہے۔ براکٹن سے ٹیلی کمیونی کیشن کے تمام راستے منقطع ہوچکے ہیں۔ وہاں کے لیے ساری پروازیں بند کردی گئی ہیں۔ [illegible] ہی ذریعہ رہ

جاتا ہے اور وہ یہ کہ سڑک کے راستے براکٹن پہنچنے کی کوشش کی جائے

یہی واحد ذریعہ ہے دوسرا ایڈیٹر بولا۔ سان فرانسسکو سے براکٹن کا فاصلہ ایک سو بیس کلومیٹر ہے۔ اگر محتاط رفتار کے ساتھ گاڑی چلائی جائے تو ڈیڑھ گھنٹے میں بہ آسانی براکٹن پہنچا جاسکتا ہے

میرا خیال ہے کہ ہم لوگوں کو فوراً روانہ ہوجانا چاہیے ڈائنا جلدی سے شلز کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ کیوں شلز۔

تینوں ایڈیٹر ڈائنا کی اس حرکت پر مسکرانے لگے

تم نے یہ خود ہی فرض کرلیا کہ تم تینوں کو ہی بھیجا جائے گا۔ ایک ایڈیٹر نے کہا

ہم تینوں سے زیادہ اس معاملے میں اور کون مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔ ڈائنا نے کہا

ٹھیک ہے تم تینوں ہی جاؤ گے دوسرے ایڈیٹر نے کہا

دس منٹ کے اندر اندر وہ تینوں روانہ ہوگئے۔ ان کے پاس جو گاڑی تھی اس میں ٹیلی فون کے علاوہ وائرلیس سسٹم بھی موجود تھا۔ اس کے ذریعے وہ فوری طور پر اپنے اپنے دفاتر سے رابطہ قائم کرکے وہاں صورت حال کی اطلاع دے سکتے تھے۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ ان کے دفاتر میں ان کے پیغام کا بے چینی سے انتظار کیا جائے گا

گاڑی شلز چلا رہا تھا اور وہ کافی محتاط ڈرائیونگ کررہا تھا۔ کیونکہ انہیں جلد از جلد براکٹن پہنچنا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ تیز رفتاری کی وجہ سے کوئی حادثہ پیش آجائے یا پولیس چالان کے نتیجے میں ان کا وقت ضائع ہو یہ وہ واحد گاڑی نہیں تھی جس کے ذریعے کچھ اخباری نمائندے براکٹن جارہے تھے۔ ان کے پیچھے تقریباً "ایک درجن گاڑیاں اور آرہی تھیں! یہ سب کے سب ذرائع ابلاغ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی گاڑیاں تھیں جنہیں ہوائی سفر کے سلسلے میں مایوسی ہوئی تھی اور اب وہ کاروں کے ذریعے براکٹن پہنچنا چاہتے تھے۔ لیکن شلز وغیرہ کی گاڑی سب سے آگے تھے کیونکہ سب سے پہلے وہی لوگ روانہ ہوئے تھے۔ باقی نمائندے بعد میں چلے تھے

راستے میں وہ تینوں موجودہ صورت حال کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے رہے۔ ڈائنا کو اپنے ایڈیٹروں کی یہ بات بالکل پسند نہیں آئی تھی کہ قومی سلامتی کے تقاضوں کے پیش نظر اصل صورت حال کی اشاعت صرف حکومت سے مشورے کے بعد ہی عمل میں لائی جائے

ہمارا کام یہ ہے کہ ہم لوگوں تک صحیح اور اصل اطلاعات پہنچائیں اس نے کہا۔ قارئین اخبارات کی خریداری پر اپنے پیسے اس لیے خرچ کرتے ہیں کہ وہ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں اور دنیا میں کیا ہورہا ہے۔ ان کو صحیح اطلاعات بہم نہ پہنچانا ایک قسم کی بددیانتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر قارئین کو اعتماد میں کیوں نہیں لیا جاتا۔ کسی بری اور ہولناک خبر کو چھپانے سے کہیں بہتر ہے کہ اس کا اظہار کردیا جائے۔ لوگوں کو اس بارے میں بتادیا جائے تاکہ وہ اپنے آپ کو ذہنی طور پر اور اگر ضرورت ہو تو مادی طور پر بھی اس کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرسکیں۔ مگر بیوروکریسی کا رویہ تو عجیب و غریب ہے

تمہاری بات میں بڑی حد تک صداقت بھی ہے اور وزن بھی ڈائنا وارن نے کہا۔ اور یہ بھی حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ آج کل کے دور میں کسی خبر کو چھپانا عملاً" ناممکن ہے لیکن اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اچانک کوئی ہولناک خبر بڑی خرابیوں کا بھی باعث بن سکتی ہے اور براکٹن میں جو کچھ ہوا ہے یا ہورہا ہے اس کے بین الاقوامی مضمرات بھی نہ جانے کیا کیا ہوں۔ ہمیں تو معلوم ہی نہیں کہ وہاں ہوا کیا ہے

لیکن میں وزارت اطلاعات ونشریات کے اس رویے سے ہرگز اتفاق نہیں کرسکتی جو انہوں نے اختیار کیا ہے ڈائنا نے کہا۔ کم از کم وہ لوگ اشارتاً" ہی یہ بتاسکتے تھے کہ کسی سنگین صورت حال کا سامنا ہے اور اس کی

وضاحت بعد میں کی جائے گی

خیر اب براکن پہنچ کر سب کچھ معلوم ہو جائے گا شلز نے کہا۔ تھوڑی دیر میں ساری حقیقت سامنے آجائے گی

لیکن حقیقت ان لوگوں کے سامنے نہ آسکی۔ وہ براکن جانے والی سڑک پر رواں تھے اور جب ان کی گاڑی نے وہ موڑ کاٹا جہاں سے سڑک سیدھی براکن کو جاتی تھی اور وہاں سے براکن کا فاصلہ صرف دس کلومیٹر کے قریب تھا تو دور ہی سے انہیں پولیس کی گاڑیاں کھڑی نظر آئیں جنہوں نے سڑک کو روک رکھا تھا

لو بھئی ہو گیا کام۔ ڈائنا نے زہر خند کی ساتھ کہا۔ یہاں بھی راستہ بند ہے

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر بات کیا ہے۔ شلز نے پریشانی کے ساتھ کہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ پورے شہر کی ہر طرف سے ناکہ بندی کردی گئی ہے۔ کسی شخص کو بھی اندر نہیں جانے دیا جارہا ہے

ان کی گاڑی جیسے ہی قریب پہنچی۔ پولیس کے ایک سارجنٹ نے فوزا ہاتھ اٹھا کر انہیں رکنے کا اشارہ دیا۔ شلز نے جو گاڑی کی رفتار کو پہلے ہی کافی کم کرچکا تھا۔ گاڑی روک دی۔ ڈائنا تیزی سے دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکلی

آخر یہ کیا مذاق ہے۔ ڈائنا بڑے زور سے سارجنٹ پر چلائی۔ کیا براکن پر تابکاری کا حملہ ہوگیا ہے یا کسی دوسرے سیارے کی کوئی مخلوق یہاں اتر پڑی ہے۔ آخر لوگوں کو اس سے دور کیوں رکھا جارہا ہے اور خود براکن کے لوگ

پلیز سارجنٹ نے ڈائنا کی بات کاٹتے ہوئے نرمی سے کہا۔ واپس چلی جاؤ۔ براکن میں داخل ہونے کی کسی کو اجازت نہیں ہے

مگر کیوں۔ ڈائنا زور سے چیخی۔ ایک شہری کی حیثیت سے یہ جاننا میرا حق ہے کہ اپنے ہی ملک کے ایک شہر میں داخل ہونے کے لیے ویزا اور پاسپورٹ کی پابندی کب سے لگا دی گئی۔ ہم لوگ اخباری نمائندے ہیں اور یہ جاننے کے لیے یہاں آئے ہیں کہ آخر براکن پر کیا ایسی افتاد آپڑی ہے۔ جسے ساری دنیا کی نظروں سے چھپانے کی کوشش کی جارہی ہے

یہ ایک عارضی پابندی ہے مس سارجنٹ نے کہا۔ حالات درست ہوتے ہی پابندی اٹھالی جائے گی

کون سے حالات۔ کیسے حالات۔ وارن بولا۔ انہی حالات کے بارے میں تو ہم جاننا چاہتے ہیں

اگر سچ پوچھتے ہو دوست تو یہاں جتنی بھی پولیس فورس موجود ہے مع افسران کے ان میں سے کسی کو بھی نہیں معلوم کہ حالات کیا ہیں۔ ہمیں سختی کے ساتھ یہ ہدایت دی گئی ہے کہ کسی شخص کو کسی قیمت پر بھی براکن کے اندر داخل نہ ہونے دیں

اور اگر ہم زبردستی گھسنے کی کوشش کریں تو۔ ڈائنا نے بھویں چڑھاتے ہوئے پوچھا

تو اس صورت میں ہم زبردستی تمہیں روک دیں گے سارجنٹ نے اپنے ریوالور پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا

لیکن یار کچھ معلوم تو ہو کہ کیا معاملہ ہے۔ وارن نے ڈپلومیسی سے کام لیتے ہوئے سارجنٹ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دوستانہ انداز میں پوچھا۔ ہم تمہاری کسی ہدایت کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ لیکن ہمیں کچھ بتاؤ تو سہی کہ آخر یہ پابندی کیوں لگائی گئی ہے۔ کیا کوئی تخریبی سرگرمی......

مجھے اس بارے میں واقعی کچھ نہیں معلوم سارجنٹ نے کہا۔ اور وہ رابسن آرہا ہے ہمارا باس اس سے پوچھو شاید وہ تمہاری کچھ مدد کرسکے۔

اس دوران رابسن ان لوگوں کے قریب آگیا سارجنٹ نے اسے ان لوگوں کے بارے میں بتایا کہ وہ اخباری نمائندے ہیں

مجھے افسوس ہے دوستو! رابسن نے سنجیدگی سے کہا براکن میں داخلہ فی الحال ممنوع ہے

لیکن اس کی کوئی معقول یا نامعقول وجہ تو ہونی چاہیے ڈائنا نے کسی زخمی ناگن کی طرح پھنکارتے ہوئے کہا

کاش مجھے اس کی وجہ معلوم ہوتی رابسن نے ایک لمبی سی سانس کھینچ کر کہا۔ تم لوگ اخباری نمائندے ہو اور براکن میں بھی اس وقت دنیا کے مختلف ملکوں سے تعلق رکھنے والے سیکڑوں ہی اخباری نمائندے موجود ہوں گے۔ لیکن تم میں آپس میں رابطہ قائم نہیں ہوسکتا۔ دراصل جہاں تک میری اطلاع کا تعلق ہے تو آج صبح کے تھوڑی دیر کے بعد سے براکن ساری دنیا سے کٹا ہوا ہے۔ میں اندازا" یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس شہر میں موجود سارے کے سارے لوگ اچانک کسی تباہی کا شکار ہوگئے ہیں

یقینا قدیم شہر پومپائی کی طرح یہاں کسی زلزلے نے تو تباہی نہیں مچائی ہے ڈائنا نے کہا۔ نہ ہی یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہاں اچانک طاعون یا ہیضہ یا چیچک پھیل گئی ہے۔ پھر آخر اس تباہی کی نوعیت کیا ہوسکتی ہے۔ کسی وجہ سے تابکاری کا حملہ۔ بیرونی خلا سے کسی نقصان رساں شے کا نفوذ۔ کوئی ہلاکت انگیز آلودگی۔ آخر کیا سبب ہوسکتا ہے۔

فی الحال تو ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے رابسن نے کہا۔ جو کچھ ہوا ہے حکومت اس کے بارے میں بالکل خاموش ہے۔ ممکن ہے شام تک حکومت کی جانب سے اس سلسلے میں کوئی اعلان کردیا جائے۔ فی الحال تو ناکہ بندی جاری ہے

کیا ہم لوگوں سے پہلے بھی کوئی اخباری نمائندے یہاں آئے تھے۔ وارن نے پوچھا

ہم ناکہ بندی کے بعد سے تقریبا" پچاس گاڑیوں کو واپس کرچکے ہیں رابسن نے کہا۔ لیکن ان میں سوار کسی بھی شخص نے یہ نہیں کہا ہے کہ اس کا تعلق اخباری دنیا سے ہے۔ تم لوگوں نے ہی بتایا ہے کہ تم اخباری نمائندے ہو

ایک بات رابسن اچانک ڈائنا نے چونک کر کہا۔ تم نے یہ کہا ہے کہ ناکہ بندی کے بعد سے تقریبا" پچاس گاڑیوں کو براکن میں داخل ہونے سے روکا جاچکا ہے۔ ذرا یہ تو بتاؤ کہ ناکہ بندی کے بعد سے تقریبا" کتنی گاڑیاں براکن سے باہر نکلیں۔

براکن سے باہر۔ رابسن جیسے چونک پڑا۔ شاید اس نے صورت حال کے اس دوسرے پہلو پر غور ہی نہیں کیا تھا

ہاں براکن سے باہر۔ وارن نے کہا۔ کیا براکن میں لوگ نہیں رہتے۔

ضرور رہتے ہیں رابسن نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج صبح سے کوئی گاڑی براکن سے نکل کر اس طرف نہیں آئی

تینوں اخباری نمائندوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا

اور کوئی پیدل۔ کوئی سائیکل سوار۔ شلز نے پوچھا

نہیں رابسن نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ کوئی نہیں

تو کیا یہ سمجھ لیا جائے کہ پورے شہر میں کوئی انسان زندہ باقی نہیں بچا ہے۔ ڈائنا نے رابسن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا

میں تو ایسی بات کو سوچتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں رابسن نے جھرجھری لے کر کہا۔ لیکن ہوسکتا ہے تمہارا خیال ٹھیک ہو یا ٹھیک نہ ہو

براکن کے آگے اوہانہ قصبہ ہے وارن نے کہا۔ کیا اوہانہ سے بھی براکن میں داخل ہونے کی پابندی ہے۔

سڑک کے تمام راستوں سے براکن میں داخل ہونے پر پابندی ہے رابسن نے کہا

دوپہر ڈھل چکی ہے وارن نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ہم تھوڑی دیر انتظار کرتے ہیں۔ شاید تم لوگوں کو کوئی نئی ہدایت ملے۔

میں تمہیں انتظار کرنے سے تو نہیں روک سکتا رابسن نے کہا۔ تم ٹھہرنا چاہتے ہو تو ٹھہرو۔ لیکن اس طرف نہیں۔ گاڑی کو سڑک سے اتار کر کچے میں پارک کردو

ٹھیک ہے ڈائنا نے کہا۔ ہم ایسا ہی کرلیتے ہیں اور وہ

لوگ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ شلز نے گاڑی کچے میں اتاردی اور انجن بند کردیا

میں اب یہ بات دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ براکن میں کوئی شخص زندہ نہیں بچا ہے ڈائنا نے بڑی تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ تم لوگوں نے رابسن کی بات پر غور کیا۔ صبح سے کوئی شخص براکن سے باہر نہیں نکلا ہے۔ کیا یہ ناقابل یقین بات نہیں ہے۔

اگر اندر سے بھی براکن کی ناکہ بندی کردی گئی ہے تو ظاہر ہے کہ ناکہ بندی کرنے والے لوگ تو موجود ہوں گے اور اگر وہ لوگ موجود ہیں تو پھر ایسا کیوں ہے کہ ہر قسم کے ٹیلی فونک اور ریڈیائی رابطے بھی منقطع ہوگئے ہیں۔

اس بات کا صرف ایک ہی مطلب لیا جاسکتا ہے اور وہ یہ کہ واقعی وہاں اب کوئی زندہ نہیں ہے۔ خدا کرے ہمارا یہ وحشت ناک خیال غلط ہو وارن نے دکھ بھری آواز میں کہا

میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنے ایڈیٹروں کو اس صورت حال سے مطلع کردینا چاہیے شلز نے کہا۔ فی الحال تو انہیں بتانے کے لیے ہمارے پاس بس اتنا ہی کچھ ہے۔ اگر اس کے بعد کوئی اور بات معلوم ہوتی ہے تو پھر دیکھیں گے

میں اپنے اخبار کے ایڈیٹر مسٹر آئزک سے بات کرتی ہوں ڈائنا نے کہا

شلز اور وارن نے اس کی اس بات سے اتفاق کیا اور ڈائنا نے بذریعہ فون اپنے اخبار کے ایڈیٹر آئزک سے بات کی اور اسے موجودہ صورت حال کے بارے میں ساری باتیں بتاتے ہوئے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے اس اندیشہ کا بھی اظہار کیا کہ شاید براکن میں کوئی زندہ انسان موجود نہیں ہے

تمہارے خیال میں اس مفروضہ بربادی کا کیا سبب ہوسکتا ہے۔ آئزک نے بھاری آواز میں پوچھا۔ تم تو خود ایک بہت کامیاب سائنسی نامہ نگار ہو

میں نے کئی مفروضے قائم کیے ہیں ہاں ڈائنا نے کہا۔ یہ بات میرے علم میں ہے کہ براکن میں ایک خفیہ ایٹمی ری ایکٹر بھی نصب ہے۔ جس کا انتظام وانصرام محکمہ دفاع کے ہاتھ میں ہے اور عام لوگ اس ری ایکٹر کے وجود سے واقف نہیں ہیں۔ مجھے زیادہ امکان اسی بات کا نظر آتا ہے کہ اس ایٹمی ری ایکٹر میں کوئی زبردست گڑبڑ ہوگئی ہے۔ شاید کسی وجہ سے اتنی بڑی مقدار میں اچانک تابکاری کا اخراج ہوا ہے، جس نے فوری طور پر پورے قصبے میں تباہی پھیلادی ہے

لیکن ایٹمی ری ایکٹر سے خارج ہونے والی تابکاری کے نتیجے میں فوری طور پر اتنے بہت سے انسانوں کا لقمہ اجل بن جانا ..... آئزک نے کہا۔ یہ کیا بات دائرہ امکان میں آسکتی ہے۔

اس کے امکانات کو مکمل طور پر رد بھی نہیں کیا جاسکتا ڈائنا نے کہا۔ بہر حال یہ تو ایک مفروضہ ہے اور باتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ فضا میں اچانک کسی شدید قسم کی آلودگی کا ظہور ..... بیرونی خلا کے کوئی انجانے اثرات وغیرہ۔ بہر حال ہم لوگ یہاں بالکل مستعد بیٹھے ہیں۔ اب تک کی حاصل شدہ معلومات سے میں نے تمہیں آگاہ کردیا ہے۔ جیسے ہی کوئی اور بات معلوم ہوگی میں تمہیں آگاہ کروں گی۔ اب ان باتوں کو اخبار میں چھاپنا یا نہ چھاپنا تم لوگوں کی مرضی ہے

ہاں ڈائنا آئزک نے کہا۔ یہ تمہارا درد سر نہیں ہے اور اس نے فون بند کردیا

☆☆

ہوٹل تک پہنچتے پہنچتے اسمتھ کو کئی بار آنکھیں بند کرلینی پڑیں۔ اسے کئی ایسے مناظر دیکھنے پڑے کہ اسے یوں لگا کہ اس کے اعصاب جواب دے جائیں گے

ایک بوڑھی عورت کی لاش اس عالم میں پڑی ہوئی تھی کہ اس کے ایک طرف کی آنکھ کا پورا ڈھیلا پورا ایک نتھنا ایک رخسار اور اسی طرف کی آدھی گردن بالکل غائب تھی۔ اس کا بایاں ہاتھ اس کے سینے پر تھا اور ہاتھ کی انگلیوں پر سے سارا گوشت ادھڑ چکا تھا۔ صرف سفید سفید

ہڈیاں باقی رہ گئی تھیں۔ جن پر جا بجا خون کے دھبے لگے ہوئے تھے

ایک دس بارہ سال کا لڑکا اس عالم میں پڑا ہوا تھا کہ اس کی پوری گردن کا گوشت غائب تھا اور اس کا سر اپنے دھڑ کے ساتھ صرف گردن کی ہڈی کے ذریعے جڑا ہوا تھا

ایک نوجوان عورت کا جسم اس حالت میں پڑا ہوا تھا کہ اس کے دونوں ہونٹ مکمل طور پر غائب ہوچکے تھے۔ گالوں سے بھی جا بجا گوشت اڑ گیا تھا اور ٹھوڑی کی ہڈی نظر آنے لگی تھی

قدم قدم پر ایسے ہی بھیانک اور دل دہلا دینے والے مناظر تھے۔ اسمتھ کہاں تک اپنی آنکھیں بند کرتا! اسے تو یہ سب کچھ دیکھنا ہی تھا۔ اس کا سر سائیں سائیں کررہا تھا اور اسے ہر طرف موت کا بھیانک پیکر رقص کرتے ہوئے نظر آرہا تھا۔ وہ ان مناظر کو نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ یہاں سے فوراً ہی بھاگ جانا چاہتا تھا۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ وہ اس وحشت ناک قصبے سے جس پر اس وقت موت کا راج تھا صرف اسی صورت میں نکل سکتا تھا جب کہ اس کا باس چاہے۔ اگر باس نہیں چاہتا تو پھر وہ نہیں نکل سکتا۔ اسمتھ کو اپنی بے بسی اور کم مائیگی کا اور ڈاکٹر آرتھر فلپ کی بے پایاں قوتوں اور صلاحیتوں کا پورا جائزہ لینے کا موقع مل رہا تھا

ہیلی کاپٹروں کی پرواز مسلسل جاری تھی اور وہ فضا میں دواؤں کا اسپرے کررہے تھے

جس وقت وہ دونوں ہوٹل کے احاطے میں داخل ہوئے تو وہاں بھی جا بجا انسانی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایسی لاشیں جن میں سے جگہ جگہ سے گوشت غائب تھا۔ لابی میں بھی یہی عالم تھا۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ سوائے وقتاً فوقتاً ہیلی کاپٹروں کی گڑگڑاہٹ کے۔ ڈاکٹر نے لفٹ کے سامنے پہنچ کر اس کا بٹن دبا دیا۔ لیکن لفٹ میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی اس کے دروازے جوں کے توں بند رہے۔ ڈاکٹر نے دوبارہ بٹن دبایا۔ لیکن لفٹ کے پینل پر روشنی بھی نمودار نہیں ہوئی اور وہ اسی طرح بند کی بند ساکت و صامت رہی

میرا خیال ہے کہ لفٹ میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی ہے اسمتھ نے کہا۔ اور اسے ٹھیک کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

یہ بات نہیں ہے عزیز من ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ لفٹ میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ یہ بالکل ٹھیک ہے۔ جانتے ہو اصل بات کیا ہے

کیا۔ اسمتھ نے ہونقوں کی طرح ڈاکٹر کو دیکھتے ہوئے پوچھا

اصل بات یہ ہے کہ بجلی نہیں ہے ڈاکٹر نے کہا۔ مقامی پاور ہاؤس میں کام کرنے والا سارا عملہ مرچکا ہے۔ کوئی ٹربائن نہیں چل رہی ہے۔ ٹیلی کمیونی کیشن کے نظام کی طرح بجلی کا نظام بھی معطل ہوچکا ہے

اف میرے خدا اسمتھ کی زبان سے بے ساختہ نکلا

ہم اس وقت بھوتوں کے شہر میں ہیں ڈاکٹر نے بے ساختہ قہقہہ لگایا

ہم دونوں کے علاوہ اس شہر میں صرف لاشیں ہیں۔ آؤ ہم سیڑھیوں کے ذریعے اپنے کمرے میں چلیں گے

پہلی سیڑھی پر قدم رکھنے سے پہلے ان دونوں کو رک جانا پڑا۔ ایک آدمی اور دو عورتوں کی ادھ نچی لاشیں پہلی ہی سیڑھی پر اس طرح پڑی ہوئی تھیں کہ ان کو پھلانگنے یا ان کو وہاں سے ہٹائے بغیر آگے نہیں بڑھا جاسکتا تھا

رک کیوں گئے اسمتھ۔ ڈاکٹر نے پرمسرت لہجے میں کہا یہ مردہ گوشت ہے۔ صرف مردہ گوشت اور مردہ گوشت کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا اور اسی کے ساتھ ڈاکٹر نے نہایت سفاکی اور بے رحمی کے ساتھ ایک لاش کے سینے پر پاؤں رکھا۔ وزن پڑنے سے ہڈیوں کے چٹخنے کی آواز آئی۔ مگر ڈاکٹر اس کی پروا کیے بغیر اگلی سیڑھی پر پہنچ گیا۔ اسمتھ کا دل کانپ کر رہ گیا۔ اس نے لاش کو پیر سے دبانے کے بجائے کود کر سیڑھی پار کی اور اگلی سیڑھی پر قدم

رکھا۔ تین زینے طے کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں پہنچ گئے۔

میں اب اس کھیل کو ختم کرنے جا رہا ہوں ڈاکٹر نے اپنا سوٹ کیس کھولتے ہوئے کہا۔ لیکن اس سے پہلے کہ یہ ختم ہو میں تمہیں چند ایسے مناظر دکھانا چاہتا ہوں جو تم نے بلکہ تم ہی نے نہیں میرے علاوہ دنیا کے کسی انسان نے بھی اس سے پہلے نہ دیکھے ہوں گے۔

ڈاکٹر نے اپنا سوٹ کیس کھول کر اس میں سے ایک خرد بین نکالی اور اٹیچی کیس بند کر دیا۔

آؤ میرے ساتھ اس نے اسمعہ سے کہا۔

اسمعہ کسی فرمانبردار خادم کی طرح بالکل خاموشی سے اس کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔

کمرے کے باہر لابی میں ادھر ادھر کئی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک لاش ایک ایسے نوجوان لڑکے کی تھی جس کے جسم پر ایک جانگیہ تھا۔ شاید وہ لباس تبدیل کرنے کے دوران ہی بے پناہ خارش سے پریشان ہو کر اپنے کمرے سے نکل بھاگا تھا۔ اس کی لاش میں سے جگہ جگہ سے گوشت غائب تھا۔

یہ لو لاش کے قریب پہنچ کر ڈاکٹر آرتھر فلپ نے خرد بین اسمعہ کو تھماتے ہوئے کہا۔ اس مردہ جسم کو غور سے دیکھو

اسمعہ نے دھڑکتے ہوئے دل اور کانپتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ خرد بین اپنی آنکھوں کے ساتھ لگائی اور لاش کو دیکھنے لگا۔ جو کچھ اسمعہ نے دیکھا اسے دیکھ کر اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

خرد بین ہر چیز کو بہت بڑا کر کے دکھا رہی تھی۔ گوشت کے لمبے لمبے ریشوں پر ان گنت لاکھوں کروڑوں کیڑے چمٹے ہوئے تھے۔ یہ نہایت بدشکل اور مکروہ قسم کے کیڑے تھے۔ لمبے لمبے اور موٹے موٹے۔ یہ جلدی جلدی منہ چلا رہے تھے اور گوشت کے ریشوں کے ٹکڑے تیزی سے ان کے منہ میں منتقل ہو رہے تھے۔ یہ اس قدر تیز رفتاری کے ساتھ گوشت کھانے میں مصروف تھے کہ اسمعہ دنگ رہ گیا۔ زیادہ تر کیڑوں کا رنگ سرخ نظر آ رہا تھا کیونکہ وہ خون میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کیڑوں کی تعداد بھی بڑی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ اسمعہ زیادہ دیر تک اس کریہہ اور گھناؤنے منظر کو دیکھنے کی تاب نہ لا سکا اور اس نے خرد بین ڈاکٹر کو واپس کر دی۔

دیکھا تم نے۔ ڈاکٹر نے بڑے فخریہ انداز میں کہا۔ یہ ہیں وہ گوشت خور جراثیم جن کو ہلاک کرنے کا نسخہ صرف میرے پاس ہے۔

یہ تو واقعی بڑی خوف ناک ایجاد ہے اسمعہ نے بمشکل اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

یہ دنیا کی سب سے زیادہ تباہ کن ایجاد ہے ڈاکٹر نے کہا۔ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم سے بھی زیادہ خطرناک ایٹم اور ہائیڈروجن بم تو ہر چیز کو تباہ کر دیتے ہیں۔ عمارتوں کو بھی اور اشیا کو بھی لیکن یہ جراثیم صرف جانداروں کو ہلاک کرتے ہیں۔ بے جان چیزوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتے۔

اب ان کا تدارک کس طرح ہو گا؟ [illegible] اسمعہ نے اپنی [illegible] بحال کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

میں [illegible] ڈاکٹر نے کہا۔ میرے ساتھ آؤ۔

......جاری ہے......

☆......☆......☆

●......●......●